XF/ST
29.9.07

ST = 82

جاری شدہ ۱۹۱۲ء

جوبلی نمبر



سہ روزہ مدینہ

بجنور - یوپی

(ہندوستان)

مدینہ کا پیشگی چندہ
سالانہ چھ روپے ۔۔۔/
ششماہی تین روپے آٹھ آنے ۸/۳
سہ ماہی دو روپے ۲/
ممالک غیر سے
سالانہ نو روپے آٹھ آنے ۸/۹
ششماہی پانچ روپے ۵
برما کے لئے
سالانہ آٹھ روپے ۸/
ششماہی چار روپے آٹھ آنے ۸/۴

مدینہ
جوبلی نمبر

ادارہ
مسئول:- ابو سعید بزمی ایم اے
حمید حسن فکر
ابو اللیث ندوی اصلاحی

تاریخہائے اشاعت
ہر ماہ عیسوی کی
یکم، ۵، ۹، ۱۳، ۱۷، ۲۱، ۲۵، ۲۸ کو
ٹھیک وقت پر شائع ہوتا ہے
نمبر خریداری
خریداران اخبار خط وکتابت اور کوپن منی آرڈر پر اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کریں تاکہ تعمیل میں تعویق نہ ہو
خط وکتابت و ارسال زر کا پتہ
منیجر اخبار مدینہ بجنور یوپی

نمبر ۲۹ — سنہ ۱۳۵۸ھ مطابق سنہ ۱۹۳۹ء — جلد ۲۸

فہرست مضامین

نظمیں

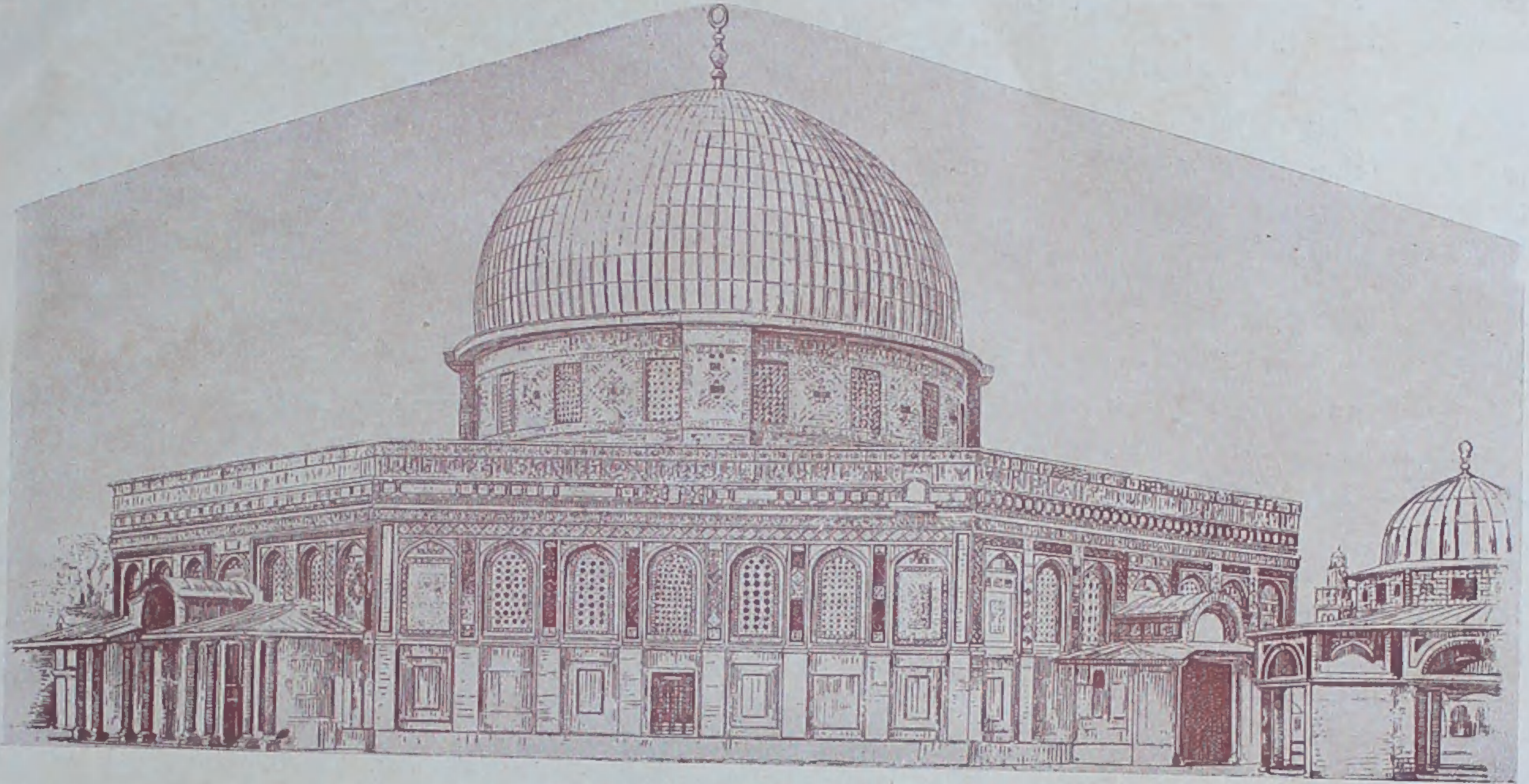
فوٹو



خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ



مدینہ منورہ کے دروازہ پر حجاج کا پڑاؤ



بیت المقدس میں مسجد حضرت عمرؓ



قاہرہ کا عام منظر مع قلعہ و مسجد محمد علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مدینہ

سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

مدینہ کا پہلا پرچہ یکم رمئی ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا۔ وہ زمانہ اخبارات کے لئے کوئی خوشگوار زمانہ نہ تھا۔ یوں تو آج کل بھی اخبار پڑھنے والے افراد ہمارے اندر دوسرے آزاد ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں لیکن ۱۹۱۲ء میں تو اتنے بھی نہ تھے۔ پھر بات بات پر حکومت کے قہر و عتاب کی بجلیاں بھی اخبارات کے دفتروں کو ندتی رہتی تھیں۔ اس لئے اُس زمانہ میں اخبار نکالنے کا تصور دل میں لانا کوئی دلچسپ مشغلہ نہ تھا۔ بنابریں ایسے ناموافق و ناساعد زمانہ میں مدینہ کا جاری ہونا اور پھر باقاعدگی کے ساتھ آج تک مسلسل جاری رہنا خدائے ذوالجلال کی عنایات بے غایات کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے مولوی مجید حسن صاحب فرماتے ہیں کہ مدینہ کو جاری کرتے وقت ایزد متعال کی چشم کرم پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی ظاہری ساز و سامان نہ تھا، اخلاص و خدمت اور توکل علی اللہ کے جذبات کے سوا باقی ہر سرمایہ سے میرا دامن خالی تھا۔ پھر اس بے سر و سامانی کے علاوہ مدینہ کو اپنی زندگی میں ابتلا و مصائب کا مقابلہ بھی بارہا کرنا پڑا ہے۔ مولانا نورالرحمٰن، مولانا بدر جلالی اور مولانا نصراللہ خاں عزیز نے مدینہ کے صفحات سے حقگوئی کا جو اعلان کیا اُس کی پاداش میں اُنھیں حکومت کے ایوان سے قید و بند کا تحفہ پیش کیا گیا۔ ایک زمانہ میں پنجاب کے سارے صوبہ میں (از ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء) مدینہ کا داخلہ بند رہا۔ اور آج بھی سچ بولنے کے اسی جرم کی بنا پر ریاست بھوپال میں اس کا داخلہ ممنوع ہے متعدد بار کئی کئی ہزار کی ضمانتیں اس سے طلب ہوئیں۔ غرض ابتلا و آزمائش کی کوئی پُرخار وادی ایسی نہیں ہے جس نے مدینہ کو آبلہ پائی کی دعوت نہ دی ہو۔ اور اسی حقیقت کو قادر مطلق کی تائید و عنایت کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ مشکلوں، مصیبتوں اور آزمائشوں کی یہ تمام طوفان خیزیاں نہ تو اسے حق کی ڈگر سے ڈگمگا سکیں اور نہ فنا کے گھاٹ اُتار سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مبدء فیاض کی اس تائید و توفیق پر سپاس گزار ہونا مدینہ کے امکان میں نہیں۔

بنابریں مسرت و شادمانی سے زیادہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ گذشتہ ۲۵ سالہ زندگی کی خوشگوار اختتام پر مدینہ کا یہ نقرئی جوبلی نمبر قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔

یکم رمئی ۱۹۱۲ء سے آج تک مدینہ مسلسل وقت کی پوری پابندی کے ساتھ اپنے سرپرستوں کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ ابتدائی چار سال یہ ہفتہ وار رہا اور یکم جنوری ۱۹۱۶ء سے ہفتہ میں دوبارہ ہوا۔ اس دوران میں کبھی کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب عارضی یا غیر عارضی طور پر اس کی زندگی کا رشتہ منقطع ہوا ہو۔ مدینہ کی یہ خصوصیت ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں شاید ہندوستان کا کوئی اخبار اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں وہ حضرات جو تسلسل کے ساتھ مدینہ کا مطالعہ فرماتے رہے ہیں (اور خدا کے فضل و کرم سے مدینہ کے ایسے سرپرستوں کی تعداد کچھ کم نہیں) اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مدینہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید، آزادی طلب جماعتوں کی حمایت اور اسلامی آثار و روایات کی حفاظت کی جس پالیسی کا آغاز روز اوّل سے کیا تھا اُسی پر پوری سچائی اور بے لوثی کے ساتھ آج تک قائم ہے۔ اس سلسلہ میں نہ اُسے کبھی ستائش کی تمنا رہی اور نہ صلہ کی پروا۔ اس پر مدحیہ قصیدے بھی پڑھے گئے، اور اسے جلایا اور پھاڑا بھی گیا، اس کے ساتھ تولّا بھی ہوا اور تبرّا بھی لیکن نہ تو دوستی و محبت کے نشہ سے کبھی اس کا دماغ بہک سکا اور نہ عناد و منافرت کے نظارہ نے اسے آپے سے باہر کیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک بید کا الخیر والشر

غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر قارئین مدینہ کو اس عجیب واقعہ سے باخبر کیا جائے کہ ابھی مدینہ کے چند ہی پرچے نکلے تھے کہ مولوی مجید حسن (مالک اخبار) نے خواب میں آسمان پر چودھویں رات کا چمکتا ہوا چاند اور دفتر مدینہ کے ایک طاق پر ٹمٹماتا ہوا چراغ دیکھا۔ اور اس خواب کی حالت ہی میں مولوی سید نورالحسن ذہین نے، جو اُس وقت مدینہ کے ایڈیٹر تھے، ان کو بتلایا کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ اخبار مدینہ کی موجودہ حالت ہے اور یہ بدر کامل اس کی ترقی یافتہ شکل۔ اس کے چار سال بعد جب مدینہ کو ہفتہ میں دوبار جاری کرنے کا ارادہ ہوا تب بھی اسی قسم کا ایک دلچسپ تجربہ ہوا یعنی بیگم مجید حسن نے خواب کی دنیا میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ چودھویں رات کے چاند میں سے سورج نکلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا سورج اُس میں سے نکل آیا اور چاند ماند پڑ گیا۔ اس خواب کی تعبیر بھی خواب ہی میں مولوی سید نورالحسن ذہین نے یہ دی کہ یہ سورج جو چاند میں سے نکلا ہے ہفتہ میں دوبار مدینہ ہے اور اب ہفتہ وار مدینہ کی ضرورت نہیں رہی۔

اُردو صحافت میں مدینہ کی یہ ایک خاص خصوصیت ہے کہ اس کا تجارتی اور ادارتی پہلو ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ اس چیز کا تصور وہ لوگ ذرا مشکل سے کرسکتے ہیں جو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک یا کم از کم ہندوستان کی انگریزی صحافت کے اصول کار سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لیکن مولوی مجید حسن صاحب نے اس چیز کی اہمیت کو پہلے ہی دن سے پوری شدت کے ساتھ محسوس کرلیا تھا۔ اگرچہ قانونی لحاظ سے مدینہ کی حیثیت اسٹیٹسمین وغیرہ کی طرح ایک لمیٹڈ کمپنی کی سی نہیں ہے لیکن عملاً اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو صحافت کی موجودہ زبوں حالیوں کے باوجود ملک کے ممتاز اہل قلم نے مدینہ کے ادارتی فرائض انجام دینے میں ہمیشہ مسرت محسوس کی۔ اور اس لئے راقم الحروف کو چھوڑ کر جسے اپنی ہیچمدانی کا دوسروں سے زیادہ علم و اعتراف ہے، اس موقعہ پر مدینہ کے پچھلے تمام ایڈیٹروں کی جناب میں عقیدت و احترام کے جذبات پیش کرنا مدینہ کا سب سے زیادہ خوشگوار فرض ہے۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی زمانۂ ادارت کی ترتیب کے لحاظ سے یہ ہیں۔

(۱) حافظ نورالحسن ذہین مرحوم (۲) آغا رفیق بلند شہری (۳) مولانا مظہرالدین مرحوم (۴) مولوی نصیرالحق دہلوی بی اے ایل ایل بی (۵) مولوی احفاد حسین بریلوی مرحوم (۶) حافظ علی بہادر خاں مرادآبادی (۷) شاہ خلیل الرحمٰن بہاری (۸) قاضی محمد عدیل عباسی بستی۔ ایم۔ ایل اے۔ (۹) قاضی بدرالحسن جلالی بی اے (۱۰) مولانا امین حسن اصلاحی (۱۱) مولوی شبیرالحسن چاندپوری ایم اے۔ (۱۲) مولوی نورالرحمٰن بچھرایونی (۱۳) مولوی محمد احسن بچھرایونی۔ (۱۴) مولانا نصراللہ خاں عزیز بی اے (۱۵) مولانا حامد الانصاری غازی

ہم نے کوشش کی تھی کہ اس نمبر کے ذریعہ وقت کے اہم مباحث پر اہل علم کے بہترین رشحات قلم کو مدینہ پڑھنے والوں تک پہنچا دیں چنانچہ ہم نے اس مقصد کے لئے ملک کے ممتاز اہل قلم سے درخواست کی کہ وہ اُردو میں کچھ لکھ دیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری اس درخواست پر بہت کم توجہ کی گئی۔ سب نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا حالانکہ اس کے بعد اُن میں سے اکثر نے ریڈیو اسٹیشن سے بار بار اپنے مضامین نشر کرنے کی فرصت نکال لی۔ ہماری طویل غلامی نے ہمارے اندر اپنی ہر چیز کو حقیر سمجھنے کے جذبات اتنے قوی کردئے ہیں کہ "بڑے آدمی" صرف اُسی زبان میں لکھنا پسند کرتے ہیں جو "صاحب بہادر" یا "صاحب بہادر" کے حاشیہ نشینوں کی سمجھ میں آسکے۔ اُردو بیچاری کی قسمت اگر کبھی چمکتی بھی ہے تو صرف ریڈیو اسٹیشن پر کم از کم وہاں کی آواز کوٹھیوں اور بنگلوں تک تو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اُردو اخبار پڑھنے والے چونکہ زیادہ تر شہر کے ٹوٹے ہوئے مکانوں یا قصبوں اور گاؤں کے جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے چاہے وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، ہمارے ممتاز ادیب، اُن کے لئے کچھ لکھنا کیسے گوارا کرسکتے ہیں بہر حال یہ ہماری قومی بدنصیبی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے مذکورہ بالا مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکے۔ تاہم جن حضرات نے ہم پر احسان فرمایا ہے ہم اُن کے سامنے سراپا سپاس ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کی عنایت سے اس اشاعت میں جو مقالات درج ہوئے ہیں وہ ملک کے موجودہ اہم مباحث پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض تو خصوصیت کے ساتھ بہت ہی بلند پایہ و گراں مایہ ہیں۔

آخر میں ہم اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے اپنے پُرخلوص پیامات سے ہمیں نوازا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تحریر کیا کہ "مدینہ نے ہماری جنگ آزادی میں ایک معقول حصہ لیا ہے۔ میں اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس سے فائدہ اُٹھائیں"

"آنریبل بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے لکھا کہ" مجھے مدینہ کی سیاسی خدمات و جذبات کا پتہ ہے۔ میں ضرور اس کیلئے کچھ لکھنے کے لئے وقت نکالتا لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹروں نے ہر کام کے کرنے سے منع کر رکھا ہے یہاں تک کہ اسمبلی میں بھی نہیں جاسکتا"

پنڈت سندر لال ایم اے (الٰہ آباد) نے تحریر فرمایا کہ "میں اس سے ناواقف نہیں ہوں کہ آج جبکہ ملانے والوں کی نسبت پھاڑنے والوں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے مدینہ قومی اتحاد و یکجہتی کے پودے کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے۔ ان حالات میں مجھے اپنے خاص مداحوں اور قدردانوں میں شمار کیجئے۔ ان اللہ یحب المحسنین"

مسلمان کیا کریں؟

مدینہ پڑھنے والوں کے لئے یہ عنوان مسلسل چھ سات مہینہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اور اس دوران میں ہمارے ملک میں جتنے سیاسی عقیدے پائے جاتے ہیں ان سب پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ہندوستان کی ممتاز ہستیوں اور مایۂ ناز مفکروں نے اس بحث سے جو دلچسپی لی ہے اس کی وجہ سے اس مسئلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جو بے نقاب ہو کر سامنے نہ آگیا ہو۔ اور اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جن حضرات نے اس سلسلہ کے تمام مضمونوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کے لئے ہندوستان کی موجودہ سیاست کو سمجھنا اور سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنا نہایت آسان ہو گیا ہے "مسلمان کیا کریں؟" کا سوال کوئی ایسا سوال نہیں جو کسی ایک شخص، کسی ایک جماعت یا کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کے برخلاف اس کا تعلق ہندوستان کے طول و عرض میں بسنے والے پورے آٹھ کروڑ انسانوں سے ہے۔ پھر یہ آٹھ کروڑ انسان بھی دوسروں سے بے تعلق نہیں ہیں۔ بلکہ حکومت، تجارت، معاشرت اور معیشت کے ہر میدان میں وہ قدم قدم پر ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ تین حرفی سوال جتنا آسان ہے، اس کا جواب اتنا ہی مشکل ہے۔ جس طرح ایک بڑی مشین میں ہزاروں کل پرزے ہوتے ہیں اور جب تک ان سب سے واقفیت نہ ہو، کوئی شخص مشین کو نہیں چلا سکتا، اسی طرح یہ سوال ایک ایسا بڑا سوال ہے جس کے اندر بے شمار ضمنی سوالات چھپے ہوئے ہیں۔ پس اگر ہم کسی ایک ضمنی سوال کی طرف سے بھی نظر ہٹا لیں تو ہرگز ہرگز صحیح جواب تک نہ پہنچ سکیں گے۔ جو سوال نو کروڑ انسانوں سے بلاواسطہ اور سارے ہندوستان کے رہنے والوں سے بالواسطہ تعلق رکھتا ہو، وہ کوئی ایسا آسان سوال نہیں ہو سکتا کہ ہم لاپرواہی کے ساتھ اس کا جواب دے سکیں۔ جس شہر میں لاکھوں آدمی بستے ہیں، وہاں کسی چھوٹے سے قصبہ یا گاؤں کی طرح صرف دو تین ہی سڑکیں نہیں ہوتیں، بلکہ انہیں بیشمار سڑکیں، گلیاں، کوچے اور کوچے در کوچے ہوتے ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر شہر سے واقف ہونا ناممکن ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس سوال کا تعلق کروڑوں آدمیوں سے ہے، وہ کوئی ایسا آسان سوال نہیں ہو سکتا کہ آدمی ذرا سی دیر میں اس کا جواب دیدے۔ اگر آپ کلکتہ اور بمبئی کی گلیوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کئے بغیر، منہ اٹھا کر کسی طرف چل دیں گے تو یقیناً بھٹک جائیں گے۔ اس سوال کی نوعیت بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ یعنی اگر اس کے تمام پہلوؤں پر کافی غور کئے بغیر آپ اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے تو یقیناً بہک جائیں گے۔ اور اس لئے آپ کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو اس سوال کو خود پرکھیئے، اس پر غور کیجئے، اور پھر ہر ایک چیز کو ذہن میں رکھ کر کوئی نتیجہ نکالئے اور یا پھر کسی رہبر کا ہاتھ پکڑ لیجئے اور آنکھیں بند کر کے اس کا پیچھا شروع کر دیجئے۔ لیکن اتنا واضح رہے کہ ایسے موقعوں پر بہت سے رہزن، رہبروں کے روپ میں پھرا کرتے ہیں، بہت سے رہنما، دراصل بٹ مار ہوتے ہیں اور گرہ کشائی کا دعوی کرنے والوں میں سے اکثر گرہ کاٹنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ اس لئے جو بھولا بھالا، سیدھا سادھا ناواقف آدمی راستہ کے جھگڑوں سے بالکل بے خبر ہو، اس کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے کسی کی انگلی کے اشارے پر چلنا اگرچہ آسان ضرور ہے لیکن خطرات سے بھی خالی نہیں۔ پھر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو رہنما بننا چاہئے۔ رہنما بننا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ آدمی کو کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہونی چاہئے کہ وہ دھوکہ دینے والوں کو پہچان سکے اور اگر اُسے دھوکہ دیا جائے تو اس سے بچ سکے۔

بنا بریں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم میں کا ہر شخص موجودہ سیاسی حالات کے تمام پہلوؤں سے تھوڑی بہت واقفیت رکھے۔ اگر ہمیں ہندوستان میں زندگی گذارنا اور ہمیں اپنے کاروبار چلانا ہیں تو پھر چاہے ہم سرکاری ملازم ہوں یا صناع و تاجر، کھیتوں میں کاشتکاری کرتے ہوں یا لائبریریوں میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف، ہمارے لئے اپنے ملک کے حالات، اور ان حالات سے پیدا ہونے والے نتائج کو سمجھنا اور سمجھ لینے کے بعد ان کے بموجب اپنی زندگی کے پروگرام کو ترتیب دینا بیحد ضروری ہے۔ آپ کی ذات قوم سے جدا کوئی چیز نہیں۔ اس لئے اگر آپ کو اپنے سوا کسی اور کی فکر نہیں تب بھی آپ کو قوم کی مجموعی حالت کو سمجھنا پڑے گا۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو قومی حیثیت سے نہیں، خود آپ کو ذاتی حیثیت سے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اب سیاست و حکومت عوام کی مرضی اور ان کی قوت ارادی کا نام ہے۔ وہ زمانہ گیا جب "رموز مملکت" کو صرف بادشاہ جانتے تھے اور جب سیاست پر گفتگو کرنا صرف وزیروں امیروں کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اب تو سیاست کا تعلق ہر اس شخص سے ہے جو ووٹ کا حق رکھتا ہے یا ووٹ کا حق رکھنے والوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جب تمام ووٹ دینے والے ہی ملکر حکومت بناتے ہیں، تو پھر ہر ووٹ دینے والا اپنی جگہ پر حکومت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ایسا نہیں سمجھتا تب بھی اس کی یہ حیثیت بدل نہیں سکتی۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ ایسی صورت میں دوسرے لوگ اس کی اس ناواقفیت و بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ روپیہ کی قیمت سے ناواقف ہیں تو ہوا کریں۔ اس طرح روپیہ کی قیمت نہیں بدل سکتی۔ صرف یہ ہو گا کہ آپ کی اس ناواقفیت کی بنا پر، دوسرے واقفکار لوگ آپ کی گرہ سے رقم کھلوا کھلوا کر اپنی چاندی کرتے رہیں گے۔

بدقسمتی سے آجکل ہمارے وطن میں یہی چیز ہو رہی ہے۔ جاہلوں کو تو چھوڑ دیجئے کہ وہ کسی حد تک معذور ہیں لیکن اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ابھی تک سیاسی مسائل پر غور کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ ساری ابتری صرف اسی چیز نے پھیلا رکھی ہے۔ جب کسی بازار میں بہت سے ایسے گنوار آجائیں جن کی جیبوں میں روپیہ تو ہو لیکن وہ روپیہ کا مصرف نہ جانتے ہوں تو پھر قدرتاً عیار و مکار لوگ اُن پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ بالکل یہی حال آجکل ہو رہا ہے۔ ہم خود سیاسی معلومات سے کورے ہوتے ہیں، اس لئے نہ تو اچھے برے میں تمیز کر سکتے ہیں اور نہ رہبر و رہزن کا فرق دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری حالت حیران و پریشان دیہاتیوں کی سی ہو کر رہ گئی ہے جن کو لندن کے کسی بڑے مارکیٹ میں لا کر چھوڑ دیا جائے اور پھر چاروں طرف سے دلالوں کا دل کا دل انہیں ترنوالہ سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ اب اگر اس ہجوم میں دو چار سچے ہمدرد انہیں سچی بات بتانے کی کوشش بھی کریں تب بھی ان کی سمجھ میں کچھ نہ آئیگا۔ ایسی حالت میں تو جیت اسی کی ہوگی جو زیادہ سے زیادہ شور مچائیگا، اور زیادہ سے زیادہ جھوٹی باتیں بنا کر اُن کو بڑی سے بڑی اُمیدیں دلائیگا۔ آج کچھ اسی طرح کا نقشہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ خود نہ تو سیاست کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس نے ذرا بڑھ چڑھ کر باتیں کی، وہ بھی اسی کی کہنے لگے۔ ایسے موقعوں پر سچوں کی بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ سچ بات میں وہ لذت نہیں ہو سکتی جو جھوٹ میں ہوتی ہے طلسم ہوشربا میں جو بات ہے وہ بھلا تاریخ ہند میں کہاں ملے گی۔ پس اگر کوئی احمق طلسم ہوشربا کو سچی داستان سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ پھر تاریخ ہند پڑھنے کی طرف وہ کیوں مائل ہوگا۔ اگر سچ کی جگہ جھوٹ کو سچ سمجھنے والے لوگ پیدا ہو جائیں تو پھر سچوں کے لئے بڑی آفت آ جاتی ہے۔ وہ جھوٹوں کی طرح طلسم ہوشربا تو بنا نہیں سکتے۔ اس لئے اپنی آنکھوں سے فریب کاروں کو فریب دیتا دیکھ کر بھی خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔

سیاست سے ناواقفیت نے ٹھیک اسی قسم کی کیفیت ہمارے اندر پیدا کر دی ہے۔ یعنی چونکہ ہم بذات خود سیاست کے راستوں سے واقف ہونا پسند نہیں کرتے، اس لئے ہماری یعنی رائے عامہ کی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کا ایک اچھا خاصہ گروہ ہمارے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ جو ہمیں دیہاتی سمجھ کر کلکتہ و بمبئی کے دلالوں کی طرح چاروں طرف سے ہم پر ٹوٹ پڑا ہے۔ ان حالات میں قدرتاً صحیح آدمی دور کھڑے حیرت سے منہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ دلالوں کی صف میں گھس کر ان کی طرح آپ کا دامن گھسیٹنا مناسب نہیں سمجھتے اور آپ اپنی ناواقفیت کی بنا پر ان میں اور ناجائز فائدہ اٹھانے والوں میں تمیز نہیں کرتے۔

مدینہ نے اسی چیز کو محسوس کر کے "مسلمان کیا کریں؟" کا یہ عنوان قایم کیا تھا۔ اور ہم اُس خالق کونین کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہماری اس حقیر کوشش کو مشکور فرمایا اور ان مضمونوں کی وجہ سے ملک میں سیاسی صورت حال کے تمام پہلوؤں پر ٹھنڈے دل کے ساتھ سنجیدگی سے غور کرنے کا ایک مبارک رجحان پیدا ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جو مضمون مدینہ کے صفحات پر شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ہر ایک میں کامل اخلاص و دردمندی کے ساتھ زیر بحث سوال پر غور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس لئے اب ان پر کوئی اضافہ کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا لیکن چونکہ ان مضمونوں میں مختلف سیاسی عقیدے پیش کئے گئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے ہی عقیدہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے عام پڑھنے والوں کے دماغ میں ایک قسم کا انتشار سا پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی بہت سے لوگ ان مضمونوں کو پڑھ کر کچھ گڑبڑا سے گئے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہاں مختصر طور پر ان تمام اختلافی باتوں کو ایک جگہ جمع کرنے، اور پھر انہیں چھانٹ چھانٹ کر پچھوڑنے کی کوشش کریں گے تاکہ اُن مشغول و مصروف لوگوں کو بھی کوئی صحیح رائے قائم کرنے میں سہولت ہو جو سیاسیات پر غور و فکر کرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے۔

سیاسی عقیدے کتنے ہیں؟

اس وقت مسلمانوں میں بہت سے سیاسی عقیدے پائے جاتے ہیں لیکن اگر چھوٹے چھوٹے جزئی اختلافوں سے نظر ہٹالی جائے تو دراصل صرف تین سیاسی عقیدے ہیں جن میں مسلمان بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے عقیدہ کے ماتحت مسلم لیگ کا وجود قائم ہے، دوسرے عقیدے کے ماننے والوں کو ہم جمعیت علمائی کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں ان میں وہ احراری اور کانگریسی مسلمان بھی داخل ہیں جو باقاعدہ طور سے جمعیت علماء کے ممبر نہیں ہیں لیکن چونکہ نقطہ نظر کے اعتبار سے یہ سب متفق ہیں اس لئے ان سب پر جمعیۃ علمائی کی اصطلاح کا اطلاق آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے عقیدے کو ماننے والے وہ چند سوشلسٹ مسلمان ہیں جو کانگریس کے بائیں بازو میں نظر آتے ہیں اور جو جمعیت علمائی حضرات کے ساتھ ضرور

اُس حد تک تعاون کرنے کے روادار ہیں جہاں تک برطانی شہنشاہیت کو تَس نہیں کرنے میں یہ حضرات ان کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی اور سیاسی، سماجی، معاشی، اور معاشرتی مسائل میں وہ اپنا ایک بالکل جداگانہ نظریہ رکھتے ہیں، اور اس باب میں ان کے خیالات جمیعۃ علمائی مسلمانوں کے خیالات سے بالکل لاگ نہیں کھاتے۔

سوشلسٹوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب کے مخالف نہیں ہیں، لیکن وہ مذہب کے مخالف ہوں یا نہ ہوں اتنا یقینی ہے کہ وہ قرآن کو خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل ترین پروگرام نہیں سمجھتے۔ ان کے سامنے زندگی کا جو اعلیٰ نمونہ (Idealogy) ہے، اس کا سرچشمہ خاتم النبیین کے ارشادات نہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے تقریباً تمام مسلم سوشلسٹوں کی نجی زندگیاں اسلام سے بیگانہ ہیں اور ان کے قول و عمل سے کبھی کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوتی جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ اسلام و بانی اسلام کی محبت کی آگ ان کے سینوں میں جل رہی ہے۔ اسی وجہ سے عام مسلمانوں میں سوشلسٹوں کی آواز پر لبیک کہنے والے شاذ و نادر ہی ملیں گے اس چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اپنی بحث سے سوشلزم کے عقیدہ کو خارج کر دیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں سوشلزم کے عقیدہ کے حامی ابھی اتنے کم ہیں کہ بحیثیت جماعت ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ خود سوشلسٹ بھی اس چیز کو محسوس کرتے ہیں اور اسی لئے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں جو کچھ کہتے ہیں، عوام کے جذبات و احساسات کا خیال رکھ کر کہتے ہیں۔

سوشلزم کو بحث سے خارج کر دینے کے بعد اب ہمارے سامنے صرف دو سیاسی عقیدے رہ جاتے ہیں۔ ایک وہ جسے ہم نے مسلم لیگی کا لقب دیا ہے اور دوسرا وہ جسے ہم جمیعۃ علمائی کے نام سے یاد کریں گے یہی دو عقیدے ہیں جو حقیقت میں مسلمانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کئے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے آج ہماری سیاست نے ایک عجیب و غریب رنگ اختیار کر لیا ہے۔ پھر سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے لوگ اسلام کی عزت و عظمت کے دعویدار ہیں، دونوں کے ہاتھ میں قرآن ہے، دونوں قرآن کی بتائی ہوئی راہ پر عمل کرنے کا اعلان کرتے ہیں، دونوں ہندوستان میں اسلامی اصول کو سربلند و سرفراز دیکھنا چاہتے ہیں، دونوں محمد عربیؐ کے نام پر کٹ مرنے کو زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ دونوں ہندوؤں میں ضم ہو کر اپنی امتیازی شان کو کھو دینے کے سخت خلاف ہیں، دونوں اپنا کلچر، اپنی زبان، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے آداب و اخلاق کو باقی رکھنا بیحد ضروری سمجھتے ہیں، غرض دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی کے ہر نقشہ کو اسلامی اصول کے مطابق کھینچنا چاہیئے لیکن منزلِ مقصود کے اس اتحاد کے باوجود راستہ کے انتخاب میں دونوں کا اختلاف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ الامان و الحفیظ! ایک نے جو راستہ منتخب کیا ہے دوسرا اُسے تباہی کا راستہ بتلاتا ہے۔ اور اپنے اس قول پر ہر ایک کو اتنا اصرار ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نیتوں کی طرف سے مشکوک ہیں۔ مسلم لیگی کہتا ہے کہ جمیعۃ علمائی ہندوؤں کے ہاتھوں بک چکے ہیں، انھوں نے چند ٹکوں کے عوض اسلام کو بیچ دیا ہے۔ اور اسلئے اگرچہ ان کی زبان پر اسلام ہے مگر ان کے دل میں کفر کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے مقابلہ میں جمیعۃ علمائی بھی بالکل یہی طعنہ مسلم لیگیوں کو دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ انگریزوں کے پٹھو ہیں اور اسلام کے نام سے عوام کو دھوکے میں مبتلا کر کے صرف اُن مفاد کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو انگریزوں کی وجہ سے ان کو پہنچ رہے ہیں۔ غرض ہر ایک، دوسرے کو منافق، ریاکار، جھوٹا اور مکار کہتا ہے، ہر ایک اسلام کا مدعی ہے اور دوسرے کو اسلام کے نام پر دھوکا دینے والا بتلاتا ہے۔

اس چیز نے عوام کے دماغوں میں ایک عجیب الجھن پیدا کر دی ہے۔ جب لوگ مسلم لیگ کے پنڈال میں تقریریں سنتے ہیں تو ان کے سوئے ہوئے احساسات جاگ اُٹھتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے محافظ صرف یہیں جمع ہیں، لیکن جن لوگوں کو مولانا ابوالکلام اور مولانا حسین احمد جیسے بزرگوں سے قربت ہے وہ ان کی تقریریں سننے اور ان کی زندگیوں کو دیکھنے کے بعد صرف ان ہی کو اسلام کا سچا پرستار سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا ہو کیوں رہا ہے؟

مسلم لیگیوں کا صرف یہ کہدینا کہ جمیعت علمائی تو ہندوؤں کے ہاتھوں بک گئے ہیں یا جمیعت علمائیوں کا یہ کہدینا کہ مسلم لیگی تو انگریزوں کے اشارے پر ناچتے ہیں، اصل سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں طرف جو جوش و خروش پایا جاتا ہے اُسے کسی صورت سے مصنوعی اور جعلی نہیں کہا جا سکتا۔ جھوٹ کو زیادہ دن تک فروغ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ان دو گروہوں کا اختلاف عارضی اور وقتی نہیں بلکہ بہت پرانا اور قدیم ہے۔ اور آیندہ بھی اس کے جلد تر فنا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی حقیقی چیز تو ہونی ہی چاہیئے۔

وہ چیز کیا ہے؟

اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں سوا سو برس پیچھے ہٹنا پڑیگا۔

انگریز اور ہندوستان

سوداگروں کی حیثیت سے تو ہندوستان میں انگریز کا وجود بہت پرانا ہے یعنی آج سے تین چار سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے کلکتہ و مدراس میں ان کی کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب پورے جاہ و جلال کے ساتھ چمک رہا تھا، انگریزی تاجروں نے شاہی دربار میں جو درخواست پیش کی وہ منظور ہوئی۔ اُس وقت کسی کے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ سات سمندر پار کے یہ دس بیس مسکین صورت انسان ایک دن ہندوستان کے طول و عرض پر چھا جائیں گے۔ اور نہ خود ان انگریزوں کے خواب میں بھی کبھی یہ خوشگوار تصور آتا تھا۔ لیکن جب مغلیہ سلطنت کی چھاؤں ڈھلنے لگی تو آہستہ آہستہ انگریزوں کے لمبے لمبے سائے ہندوستان میں بڑھتے ہوئے نظر آئے پھر بھی شروع میں لوگوں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ مگر ہندوستان کی سیہ بختی روز بروز زور پکڑتی گئی۔ انگریزوں نے بھی مکاری، دغا بازی، جعلسازی، عہد شکنی اور غداری کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو استعمال نہ کر دیا ہو۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ہندوستان کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں سے انگریزوں کے ان گھناؤنے کچھنوں کی کہانیاں جان بوجھکر نکال دی گئی ہیں تاکہ نوجوان ہندوستانیوں کے دل میں انکی طرف سے نفرت نہ پیدا ہو۔ لیکن سچائی کو کتنا ہی چھپایا جائے، وہ کبھی نہ کبھی ابھرتی ہے۔ چنانچہ اب خود انگریزوں کی لکھی ہوئی ایسی بیسیوں تاریخیں ہیں جو اگرچہ کسی یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل نہیں ہیں لیکن ان میں بڑی صفائی کے ساتھ انگریزوں کی عیاریوں کی پول کھولی گئی ہے۔

بہرحال اس وقت انگریزوں کی اِن تاریخی کرتوتوں کا تذکرہ کرنا ہمارے پیش نظر نہیں۔ اِسوقت تو ہمیں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان کے تخت و تاج پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تو مسلمانوں نے بڑی ہمت سے ان کا مقابلہ کیا لیکن عیاری و مکاری میں وہ انگریز کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انگریز ایک بیرحم، چالاک اور بے ایمان کھلاڑی کی طرح اپنے حریف کو ہر طرح سے زک دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں سے چونکہ ابھی تک بوئے حکمرانی فنا نہ ہوئی تھی اس لئے وہ شجاعت و جوانمردی کے آئین سے ایک انچ پیچھے ہٹنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ بخلاف اس کے انگریز ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھا۔ اس نے ہزاروں عہد کئے اور پھر ان کو توڑ دیا، جھوٹی اور جعلی دستاویزیں تک بنائیں، ہزاروں بے گناہ لوگوں کو بیرحمی و بیدردی کے ساتھ قتل کیا، جہاں موقع ہوا رعایا کو لوٹا، ہزاروں کوٹھیوں اور تہ خانوں کی دولت پر قبضہ جمایا، غرض جس طرح بھی ہوا اپنا فائدہ کیا۔

لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی دہشت انگریز کے دل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس لئے وہ یہ سب کچھ کر تو رہا تھا مگر ظاہر میں حکومت کی باگ ڈور کسی مسلمان فرمانروا ہی کے ہاتھ میں تھی۔ انگریز صرف یہ کرتا تھا کہ فرمانروا کو اپنے ہاتھ میں رکھے اور اگر بس چلے تو اپنی مرضی کے مطابق کسی فرمانروا کو تخت پر بٹھلا دے لیکن جب آہستہ آہستہ اس کا اثر بڑھتا گیا تو پھر اس نے حکومت کی باگ ڈور براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لینے کی ٹھانی۔ چنانچہ پہلے بنگال، بہار، مدراس و بمبئی وغیرہ میں اس نے اپنی حکومت کا اعلان کیا لیکن پھر بھی جہاں کہیں لوگوں کے جذبات کو زیادہ مشتعل پایا وہاں خود کو دہلی کے تخت کا ماتحت ظاہر کیا۔

۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب

اس وقت تک چونکہ دہلی کے تخت پر مغلیہ خاندان کا جانشین موجود تھا اس لئے لوگوں میں زیادہ بے چینی نہ پھیلی لیکن جب انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی اور اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور شاہی محل پر انگریزی جھنڈا لہرایا گیا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ سی لگ گئی۔ پھر چونکہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی گئی تھی اس لئے اس آگ کے شعلے مسلمانوں ہی کے دل میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ بلند ہوئے۔ اور وہ سر پر کفن باندھ کر اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے میدان جہاد میں کود پڑے۔ پنجاب میں حضرت اسمٰعیل شہید وغیرہ نے اپنا خون بہایا لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو آخرکار ۱۸۵۷ء میں سارا ہندوستان، انگریز کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ انگریز کے خلاف لوگوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے، چنانچہ ۱۸۵۷ء کے اس انقلاب میں جہاں جو انگریز ملا، مارا گیا۔ ہندوستان کا چپہ چپہ انگریز کے لئے دوزخ بن گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اسوقت ہندوستانی ریاستوں کے تاجدار (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں داخل ہیں) انگریز کی مدد نہ کرتے تو آج ہندوستان کی زمین انگریز کے منحوس قدموں سے پاک ہوتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے دربار سے ہندوستان کی بدنصیبی پر مہر لگ چکی تھی ورنہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جد و جہد میں ہندوستان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگرچہ یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ مگر انگریز نے اس سے ایک سبق ضرور سیکھا یعنی اسے یہ معلوم ہو گیا کہ ہندوستان کا مسلمان اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔ ہندو سے چونکہ حکومت نہیں چھینی گئی تھی اس لئے اُس کے دل میں انگریز کے خلاف وہ نفرت ہرگز نہیں تھی جو مسلمان کے دل میں پائی جاتی تھی۔ اس لئے اب انگریز نے مسلمان کو تباہ و برباد کرنے کی پالیسی بنائی۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے بدظن کیا، کروروں روپے کی جائدادوں کو مسلمانوں سے چھین کر ہندوؤں کو دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض انگریز نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہندوستان میں حکومت کی جا سکتی ہے تو صرف ہندو کو اپنا بنا کر ہی کی جا سکتی ہے مسلمان کی طرف سے وہ پہلے ہی مایوس تھا لیکن اب تو اس مایوسی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ وہ مکر و فریب کے کتنے ہی جال پھینکے، مگر مسلمان کے دماغ سے حکومت کا نشہ نہیں اتر سکتا۔ البتہ ہندو کو درغلا لینا بہت آسان تھا۔ چنانچہ مسلمان فرمانرواؤں کے ظلم و زیادتی کی داستانیں قلمبند کر کر کے ہندو کو پڑھائی گئیں، مسلمانوں کو ظالم و جابر اور غاصب و ڈاکو ثابت کیا گیا اور ان کے مقابلہ میں انگریزوں کو ہندو کے لئے رحمت کا فرشتہ بتلایا گیا ہندو سے کہا گیا کہ مسلمانوں نے ویدوں کی اس مقدس زمین کو نجس کر دیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ایکبار ہندوستان پھر راجہ اشوک اور چندر گپت کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ انگریزوں نے ہندو کو سمجھایا کہ "تم عربی فارسی کیوں پڑھتے ہو۔ یہ تو تمہارے دشمنوں کی زبان ہے، اس کے بجائے انگریزی پڑھو جس کے صلہ میں ہم تمہیں عہدے دیں گے، عزت و دولت دیں گے حتیٰ کہ آہستہ آہستہ اس ہندوستان کو تمہارے سپرد کر کے خود واپس اپنے وطن انگلستان چلے جائیں گے"۔

قدرتاً ہندو اس فریب میں آ گئے۔

انگریز سے مسلمان کی نفرت

غرض انگریز نے گویا ہندو سے ایک قسم کی سازش کی اور ہندوستان میں مسلمان کو پیس کر رکھ دینے کی باقاعدہ کوشش شروع ہو گئی لیکن مسلمان میں ابھی جان باقی تھی۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء میں جو کاری زخم اس کے لگ چکا تھا اس سے ابھی خون بہہ رہا تھا لیکن تاہم اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر غنیم کی صف پر ٹوٹ پڑنے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ انگریز کے خلاف خفیہ سازش کی گئی، خفیہ انجمنیں بنیں اور ہندوستان و افغانستان کے بیچ کے آزاد علاقہ کو ان سازشوں کا مرکز بنایا گیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس خفیہ تحریک کی خفیہ شاخیں قائم ہوئیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی یعنی یہ راز فاش ہو گیا اور پٹنہ اور انبالہ میں تحریک کے بانیوں کو پکڑ پکڑ کر ان پر مقدمے چلائے گئے، انہیں جلا وطن کیا گیا، ان کا مال و اسباب قرق کیا گیا اور انہیں پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔

لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں انگریز کے خلاف نفرت بڑھتی ہی رہی۔ انگریز نے مسلمان کو مٹانے، کچلنے اور تباہ و برباد کرنے کی تمام کوششوں کو عملی جامہ پہنا دیا، جن کے گھر ہاتھی جھومتے تھے وہ پھوٹا کٹورا لیکر در در بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے، شاہی خاندان کی پھول جیسی بیگمیں پھٹی چادریں سر پر ڈالکر گھروں میں کھانا پکانے کی نوکریاں کرتی پھریں، بڑے بڑے قابل و فاضل انسان دانہ دانہ کو محتاج ہوئے، معاہدہ کے بالکل خلاف سرکاری دفتر کی زبان کو فارسی سے انگریزی کر کے مسلمانوں کو چن چن کر سرکاری ملازمتوں سے نکالا گیا اور ان کی جگہ انگریزی داں ہندو بابو نوکر رکھے گئے۔ غرضکہ تباہی و بربادی کا کوئی بھیانک منظر ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو نہ دکھا دیا گیا ہو۔ مگر اس کے باوجود انگریز کی نفرت ان کے دل سے نہ نکل سکی، بلکہ جیسے جیسے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، ان کی نفرت بڑھتی ہی گئی۔

اب انگریز سخت پریشان ہوا۔ آٹھ نو کروڑ انسانوں کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دینا تو اس کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ جہاں تک ان کو کمزور کرنے کا تعلق تھا وہ اپنی ساری کوششیں صرف کر چکا تھا۔ مگر ان تمام کوششوں کا اثر مسلمان کے دل پر کچھ نہ ہوا۔ اس کے دل کا قلعہ ابھی تک انگریز کی حکومت سے آزاد تھا۔ اس لئے اب انگریز نے مسلمان کے قلعۂ دل پر حملہ آور ہونے کی اسکیم بنائی۔ چنانچہ عیسائی مشنریوں کی خدمات حاصل کی گئیں اور مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام حکومت کی درپردہ امداد و اعانت سے شروع ہوا۔ مسلمانوں کو انگریزی پڑھانے کی ترغیب دی گئی، جس نے مڈل بھی پاس کر لیا اسے ڈپٹی کلکٹری دیدی گئی۔ انٹرنیس پاس کی تو وہ وقعت ہوئی کہ جس کی کچھ انتہا نہیں، عربی فارسی کے عالموں کے لئے شمس العلماء کا ایک نیا خطاب گھڑا گیا اور جو عالم ذرا بھی انگریز کا موافق ہوا یا موافق نہ سہی کم از کم پُرجوش مخالف نہ پایا گیا، فوراً اُس کی دستار پر شمس العلماء کی کلغی چپکا دی گئی۔ انگریزی کالجوں میں انجیل کو نصاب میں داخل کیا گیا ——— غرض اب مسلمان کے قلعۂ دل پر پوری طاقت کے ساتھ دھاوا بولدیا گیا۔ اب تک دشمنی کر کے اس کے جسم کو لہولہان کیا گیا تھا، مگر اب یہ اسکیم ناکام سمجھی گئی اور اس لئے محبت اور نرمی کے جادو سے اُس کے دل کو غلام بنانے کی کوششیں ہونے لگیں۔

مسلمان کی مایوسی

یہ آزمائش بڑی سخت تھی۔ بہت سے مسلمان اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔ علاوہ ازیں اس وقت کچھ حالت بھی ایسی ہی ہو گئی تھی کہ مسلمان کو نجات کے سارے دروازے بند نظر آتے تھے ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب کے بعد ہندوستان کا مسلمان خوب اچھی طرح پیس دیا گیا تھا، مگر پھر بھی اسے ہندوستان کے باہر سے کچھ کمک ملنے کی توقع تھی۔ پٹنہ اور انبالہ کے مقدموں (۱۸۶۴ء و ۱۸۷۱ء) کے بعد یہ امید بھی جاتی رہی۔ ادھر افغانستان خود نہایت کمزور ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اپنی حیلہ تراشیوں سے اُسے اور بھی بیدم کر دیا۔ اسکے مقابلہ میں انگریزوں کے اقبال کا ستارہ پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کا زمانہ تھا جو انگریزی حکومت کی تاریخ میں "سنہرا زمانہ" کہلاتا ہے، دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک انگلستان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یورپ کی حکومتیں بھی انگلستان کے جاہ و جلال کو دیکھ دیکھ کر سہمی جا رہی تھیں۔ رہ گئیں مسلمان حکومتیں سو اُن کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایران کی حالت افغانستان سے بھی بری تھی یعنی افغانستان پر انگریز جونک بنکر لپٹے ہوئے تھے تو ایران پر روس نے پنجے جما رکھے تھے۔ خلافت عثمانیہ کی حالت اور بھی خراب تھی۔ یہاں کا سارا معاشی نظام اور تجارتی کاروبار یورپی قوموں کے ہاتھوں میں تھا۔ خلیفہ کی حیثیت شاہ شطرنج کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ملک میں جگہ جگہ بغاوت کی چنگاریاں اٹھتی رہتی تھیں۔ خود ترکوں میں سلطان کے خلاف سخت مخالفانہ جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ غرض دنیا بھر میں مسلمان کو کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا۔ وہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتا تھا، اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہندوستان میں وہ پِسا جا رہا تھا لیکن کوئی نہ تھا جو اسکی حمایت میں ہلکی سی آواز بھی بلند کر سکے، باہر سے کسی امداد کی توقع بالکل ختم ہو چکی تھی، ساری دنیا میں اسلامی سلطنت کے قلعۂ معلیٰ کی بنیادیں ہل رہی تھیں ہر جگہ اسلامی شان و شوکت کے قصر بلند میں بھونچال سا آ گیا تھا، ہر مقام پر مسلمان کمزوری و پریشاں حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے ———

ایسے زمانہ میں قدرتی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے دل حزن و ملال کے جذبات سے لبریز تھے، اور اس لئے جب انگریز نے ان کی طرف محبت و ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے اسے غنیمت جانا اور اپنی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کے لئے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانا ضروری سمجھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد مرحوم جیسے حضرات پیدا ہوئے اور مسلمانوں میں انگریزی پڑھنے، انگریزوں سے ربط ضبط بڑھانے اور انگریزی علوم و فنون سیکھنے کا پروپیگنڈا بڑے زور شور سے کیا گیا۔ یہ چیز صحیح تھی یا غلط، یہاں اس سے بحث نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ سرسید مرحوم اور اُن کے رفیقوں کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر مسلمانوں کی جو حالت ہو رہی تھی اس کا فطری تقاضا ہی یہ تھا کہ مسلمانوں میں سرسید مرحوم کی لائنوں پر سوچنے والے افراد پیدا ہوں۔ اور اس لئے سرسید یا سرسید کے ساتھی اُس زمانہ کی بالکل فطری، قدرتی اور نفسیاتی پیداوار تھے۔ ان لوگوں پر انگریزوں سے سازباز رکھنے، مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دینے یا اسلام کے ساتھ غداری کرنے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف یہ لوگ مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور ان کے زبردست خیرخواہ تھے۔ ان لوگوں کا دل مسلمانوں کی بیکسی و بے بسی کو دیکھ کر خون کے آنسو رو رہا تھا، اور انھوں نے جو کچھ کیا محض اسی جذبہ کے ماتحت خالص نیک نیتی کے ساتھ کیا۔

اس کا ردّ عمل کیا ہوا؟

لیکن مسلمانوں کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت و عداوت کا جذبہ اتنا سخت تھا کہ اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انگریز کی ہر چیز کے نام سے ان کے تن بدن میں آگ لگتی تھی۔ انگریز کی قوت سے وہ مرعوب ضرور ہو گئے تھے مگر دل میں وہ اُسے سوئر سے بھی زیادہ ناپاک سمجھتے تھے بعض لوگ تو اپنے اس عقیدہ میں اتنے شدید تھے کہ اگر کبھی ان کو کسی انگریز افسر سے مصافحہ کرنا پڑ جاتا تھا تو اگرچہ مارے ڈر کے مصافحہ تو کر لیتے تھے لیکن اس کے بعد اس ہاتھ کو نجس سمجھکر الگ لٹکائے رہتے تھے اور ملاقات کے فوراً ہی بعد اُسے خوب رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ انگریزی صابن، انگریزی کپڑا، انگریزی برتن، انگریزی مصنوعات غرض انگریزی تمام چیزوں کے خلاف (خواہ وہ اچھی ہوں یا بری) نفرت کا یہی عالم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک انگریز سوئر کھانیوالے ہی نہ تھے بلکہ وہ خود بھی سوئر کی طرح نجس تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریز نے جس بیدردی کے ساتھ مسلمانوں کو بلا امتیاز سربازار قتل کیا تھا، جس بیرحمی کے ساتھ اچھے اچھے خاندانوں کو تباہ و برباد کیا تھا، جس جبر و ظلم کے ساتھ لوگوں کو گھر سے بے گھر کیا تھا، جس سنگدلی کے ساتھ شریف عورتوں کے گلے میں بھیک کی جھولی ڈالکر در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا تھا ———

وہ سب منظر مسلمانوں کے سامنے تھے۔ انھوں نے اپنا ہرا بھرا چمن اپنی آنکھوں سے لٹتا دیکھا تھا، ان کی ہنستی کھیلتی محفل ان کی نظروں کے سامنے اُجاڑی گئی تھی، ان کے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کے خون کی ندیاں ان کی آنکھوں کے آگے بہائی گئی تھیں۔ پھر وہ انگریز سے کیسے محبت کر سکتے تھے؟ وہ تو انگریز کو خدا کا عذاب سمجھتے تھے، اسے ابلیس سے زیادہ خبیث اور نمرود سے زیادہ مردود خیال کرتے تھے، غرض نفرت و حقارت کا کوئی تصور ایسا نہ تھا جو انگریز کے خلاف عام مسلمانوں میں نہ ہو۔

عام مسلمانوں کے ان جذبات کا اثر یہ تھا کہ جو شخص انگریز کی تعریف کرتا تھا وہ اس سے بھی نفرت کرنے لگتے تھے۔ ان کے نزدیک انگریز میں کوئی خوبی ہی نہ تھی۔ یہاں تک کہ اگر ان کو ہوا کے کسی جھونکے کے متعلق یہ گمان ہو جاتا کہ یہ انگریز کے بدن کو چھو کر آ رہا ہے تو وہ اس سے بھی کترانے لگتے ... ان ہی جذبات کا نتیجہ تھا کہ مسلمان علماء نے انگریزی پڑھنا حرام قرار دیا، انگریز کی نوکری کرنے کو ناجائز سمجھا اور ہر اُس چیز کے

خلاف آواز بلند کی جسے انگریز سے کوئی دور کی نسبت بھی ہو۔ تو بیہ سے ہاتھ صاف کرنا یا چمچہ سے کھانا کھانا کونسی بری بات ہے، مگر چونکہ یہ چیز ہندوستان میں انگریز کے ساتھ آئی اس لئے مسلمانوں نے اس کو بھی بُرا جانا۔ غرض مسلمانوں کو انگریز سے اتنی نفرت تھی کہ وہ انگریز کی اچھی باتوں کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں کام انگریز کی نظر میں بُرا ہے تو پھر صرف اسی کو کرتے تھے۔

پھر انگریز جتنا جتنا ظلم کرتا تھا، نفرت کی یہ آگ اتنی ہی زیادہ بھڑکتی جاتی تھی لیکن جب انگریز نے مارنے کے بجائے چمکارنے کی پالیسی پر عمل کیا تب بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ ہو سکی۔ اب مسلمان اور زیادہ چوکنے ہو گئے عیسائی مشنریوں سے بچنے اور انگریزی تعلیم کے اثرات کو مٹانے کے لئے انھوں نے پیش بندیاں شروع کیں۔ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے اسی پیش بندی کی وجہ سے وجود میں آئے۔

نئی کروٹ

لیکن جب انگریز نے چمکارنے کی پالیسی شروع کی تو مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہونے لگا جو نفرت وحقارت کی اس اندھا دھند پالیسی کو مسلمانوں کے لئے نقصان کا باعث سمجھتا تھا۔ سر سید احمد خاں مرحوم کو اس طبقہ کا میر قافلہ سمجھنا چاہیئے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اب زمانہ کی ہوا بدل چکی ہے اس لئے اب وہ پرانی باتوں کا خیال دل سے نکالکر نئے ہتھیاروں سے نئی چیزوں کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ سر سید احمد مرحوم نے سارے ہندوستان میں پھر کر اپنا یہ پیغام مسلمانوں کو سنایا، انہیں انگریزی علوم پڑھنے اور انگریزوں کی اچھی باتوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ حالی مرحوم نے اپنی مسدس لکھکر مسلمانوں کو اسی طرف مائل کیا اور انہیں بتلایا کہ یہ چیز صحیح نہیں کہ

ہنر اور پیشہ کو اک عار سمجھو
فرنگی کے پیسہ کو مردار سمجھو

سر سید مرحوم کی اس کوشش کا نتیجہ ضرور نکلا اور مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے پیچھے ہو گئی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ انکی مخالفت بھی بڑے زور شور سے ہونے لگی۔ انگریزی تعلیم کو الحادی تعلیم اور انگریزی طور طریق کو ملحدانہ طور طریق کہا ہی جا چکا تھا۔ اس لئے سر سید مرحوم کی مخالفت کرنے والوں کو زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ اس وقت تک مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج بالکل نہ تھا۔ پڑھے لکھے لوگ صرف عربی فارسی ہی پڑھتے تھے اور سارے علوم کو صرف ان ہی زبانوں میں محصور سمجھتے تھے چنانچہ جب انگریزی تعلیم کا پرچار شروع ہوا تو وہ اس کی علمی قدر وقیمت کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے صرف یہی سمجھا کہ اس طرح مسلمانوں کو مذہب سے بیگانہ کر کے انہیں ملحد بنایا جا رہا ہے۔ پھر یہ بات بالکل غلط بھی نہ تھی۔ کلکتہ ومدراس وغیرہ کے ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کے اثر سے عیسائیت کی طرف جو شدید میلان پیدا ہو چکا تھا، وہ مسلمانوں کے سامنے تھا۔ علاوہ ازیں جن مسلمانوں نے رائے عامہ کی مخالفت کر کے اپنے بچوں کو انگریزی پڑھوائی تھی ان میں سے بھی اکثر کو تلخ تجربے ہوئے تھے۔ وہ شروع شروع زمانہ تھا۔ انگریزی پڑھے لکھے کی بے انتہا قدر ہوتی تھی۔ پھر انگریزی کی تعلیم بذات خود انگریز ہی دیتے تھے، اس لئے ان حالات میں مسلمان طالب علموں کا بہک جانا کچھ بعید از قیاس نہ تھا۔

بہر حال اس وقت کی آب وہوا کا بالکل قدرتی تقاضا یہی تھا کہ ہر اس چیز کو خوف وخطرہ کی نظر سے دیکھا جائے جسے انگریز سے کوئی دور کی نسبت بھی ہو۔ اور اس لئے سر سید احمد مرحوم اور ان کے رفیقوں کی مخالفت بڑے زور شور سے شروع ہو گئی۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں سر سید کے ہمخیالوں کا پیدا ہونا بھی بالکل قدرتی طور پر ضروری تھا۔ مسلمان یہ سوچتے تھے کہ جو کچھ انقلاب آنا تھا وہ تو آ چکا، ہماری سلطنت مٹ گئی، تخت وتاج لٹ گیا بساط حکومت الٹ گئی۔ اب اگر رو رو کر ہم آنکھیں ہی سُجاتے رہے تو اس سے کیا ہوگا۔ انگریزوں کو نکالنے کی جتنی ممکن تدبیریں ہو سکتی تھیں وہ سب کی جا چکی تھیں۔ مگر سب کی سب ناکامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ پھر انگریز نے مسلمانوں میں خوف ودہشت پھیلانے کے لئے جو ہیبتناک ظلم کئے تھے ان کی وجہ سے سارے ملک پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا لوگوں کے دل میں انگریز سے نفرت ضرور تھی۔ مگر انگریز کے خوف نے زبانوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔ انگریز کا نام سنکر عام لوگوں پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ اُس وقت کے انگریز میں آج کے انگریز سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ جدھر کو کوئی انگریز نکل جاتا، لوگ راستہ چھوڑ چھوڑ کر الگ ہو جاتے تھے۔ پولیس کے معمولی معمولی سپاہیوں، عدالت کے ادنیٰ ادنیٰ چپراسیوں اور "صاحب" کی کوٹھی کے حقیر سے حقیر اردلیوں تک سے لوگ ڈرتے تھے۔ انگریز نے غدر سے پہلے اور غدر کے بعد جس بیدردی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے مسلمان کو لوٹا تھا اس کا لازمی اثر یہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔

غرض نفرت، خوف اور کمزوری کے تین احساسات اس وقت مسلمانوں میں عام تھے یعنی وہ انگریز سے نفرت کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس سے بے انتہا خوف بھی کھاتے تھے۔ اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ انگریز کے مقابلہ میں بیحد کمزور ہیں ——— یہ تینوں جذبات جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے نتائج بہت ہی برے پیدا ہوتے ہیں، نفرت، خوف اور کمزوری کے مجموعہ سے انسان میں تنگ دلی، پست ہمتی اور کمینہ فطرتی کی صفات آہستہ آہستہ پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اُن میں بُرے غلاموں اور سرکش نوکروں کی سی وہ بدترین خاصیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد وہ آقا کے سامنے تو کچھ نہیں کہتے لیکن یا تو دل میں کڑھتے رہتے ہیں یا پیٹھ پیچھے اُسے کوستے ہیں۔ اُس وقت مسلمانوں کی حالت بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی جا رہی تھی۔

ان ہی چیزوں کی اصلاح کے لئے سر سید مرحوم کی زیر قیادت مسلمانوں میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔

ایک نئی تقسیم

اب ایک عجیب حالت پیدا ہو گئی۔ سر سید مرحوم کے ہمنوا کہتے تھے کہ اگر اسلام کو بچانا ہے تو اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ یورپ کے اسلحہ خانہ میں جو نئے ہتھیار تیار ہو رہے ہیں ان سے واقفیت حاصل کر کے ان کا استعمال سیکھو اور پھر ان ہی سے ان کی کاٹ کرو۔ اس کے مقابلہ میں سر سیدؒ کے مخالف کہتے تھے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو نمک کی کان میں جا پڑنے والے کا ہوتا ہے۔ سر سید کہتے تھے کہ یورپ ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ اس لئے جب تک ہم ان باتوں کو نہ سمجھیں گے جنھوں نے اسے ترقی کی اس منزل تک پہنچایا اس وقت تک ہم انگریز کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس کے جواب میں سر سید کے مخالف کہتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ یورپ کے علوم وفنون نے اُسکو ترقی کی اس منزل پر پہنچایا ہے۔ بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ چونکہ ہم نے اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلنا چھوڑ دیا اسلئے یورپ ہم سے بازی لے گیا، اگر آج ہم پھر اپنے قدیم طریقہ کو اختیار کر لیں تو ایک بار پھر دنیا بھر میں اپنی دھاک بٹھا دیں۔ سر سیدؒ کہتے تھے کہ ہماری تباہی کی وجہ ہی در اصل یہ ہے کہ ہم علوم سے بے پروائی اختیار کر رہے ہیں، ور سینکڑوں نئی چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں لیکن اسکے جواب میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے اُسکے سوا کوئی نئی چیز دنیا میں ہے ہی نہیں۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں سب کچھ دیدیا ہے اس لئے اب اسپر کسی اضافہ ... کی مطلق حاجت نہیں۔ تم جس چیز کو نئی کہتے ہو وہ در اصل کفر وبیدینی ہے ——— غرض آہستہ آہستہ مسلمانوں میں اس نوع کے دو گروہ بننا شروع ہو گئے۔ دونوں گروہ اسلام کے حامی وحافظ بننا چاہتے تھے۔ دونوں کے دل میں اسلام کا درد تھا، دونوں مسلمانوں کو تباہی کے غار سے نکالنے کے لئے بیقرار تھے، لیکن ایک یہ کہتا تھا کہ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ پرانی لکیر کے فقیر بنے رہو اور انگریز کی بتائی ہوئی ہر نئی چیز کو ٹھکرا کر "سلف" کا نمونہ بنجاؤ اور دوسرا یہ کہتا تھا کہ ٹھیک نہیں، ہم کو نئے نئے تجربوں اور مشاہدوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور نئی آب وہوا کے مطابق اپنے گھر کی تعمیر میں مناسب ترمیمیں کرنی چاہئیں۔

سر سید مرحوم نے اپنے اس مقصد کی تکمیل کیلئے اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں علیگڈھ میں ایک انگریزی مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی اسی زمانہ میں اس کے بالمقابل دیوبند میں عربی دارالعلوم کی نیو رکھی گئی۔ ایک طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ انگریز کی جو باتیں اچھی ہیں ان کو اختیار کرو، دوسری طرف سے یہ آواز اٹھی کہ خبردار! اس فریب میں نہ آنا۔ اگلے لوگ جو کچھ کہہ گئے ہیں اُسکے سوا سب دھوکا ہے۔ اگر تم اپنے بزرگوں کے اصول سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہوئے تو پھر اسلام وایمان کی خیر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ باتیں دونوں ٹھیک کہتے تھے لیکن چونکہ انگریز کا پاؤں بیچ میں اڑا ہوا تھا اسلئے دونوں طرف افراط تفریط کے نمونے نظر آرہے تھے۔ دیوبند کو ہر نئی چیز میں انگریز کا مکر وفریب نظر آتا تھا۔ اسلئے وہاں سے ہر نئی چیز کی مخالفت کا فتویٰ صادر ہوتا تھا۔ اسکے برعکس علیگڈھ کے نزدیک ... نئی باتوں کو اپنائے بغیر اصلاح محال تھی، اسلئے وہاں سے ہر نئی چیز کے جواز کا پروانہ نکل رہا تھا۔ انگریز کو قدرتاً علیگڈھ سے ہمدردی تھی اور کھلے طور سے اس کی اعانت کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں اسی زمانہ میں عیسائی مبلغین نے مسلمانوں میں تبلیغ کا کام بھی شروع کیا۔ ان مشاہدات نے دیوبند کو اور زیادہ مشکوک بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے مسلمانوں میں دو ممتاز گروہ پیدا ہو گئے ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ علیگڈھ ... نجات کا راستہ دکھلایا ہے اور دوسرا یہ کہتا تھا کہ دیوبند نے اسلام کی لاج رکھ لی۔

جب دو گروہ بنجاتے ہیں تو پھر قدرتاً دونوں اپنے خیالات پر اصرار کرنے اور ان کے منوانے میں مبالغہ اور غلو سے کام لیا کرتے ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کے ان دو گروہوں کا ہوا۔ ایک طرف سے یہ کہا گیا کہ علیگڈھ مسلمانوں کو الحاد کی طرف لے جا رہا ہے۔ دوسری طرف سے کہا گیا کہ علیگڈھ تو مسلمانوں میں اسلام کے سچے اصولوں کو پھیلا کر اسلام کی سچی عظمت دلوں میں بٹھا رہا ہے۔ اسلام کو تباہ تو دیوبند کر رہا ہے جو ہر نئی سچائی کی طرف سے صرف اسلئے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے کہ وہ نئی کیوں ہے۔ دیوبند نے کہا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو مسلمان، مسلمان نہ رہتے۔ علیگڈھ نے کہا کہ اگر ہم نہ ہوتے تو اسلام صرف مسجد کے چند ملاؤں میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ دیوبند نے کہا کہ تم انگریز کے پٹھو ہو اور انگریز سے الحاد کی باتیں سیکھتے ہو، علیگڈھ بولا، یہ غلط ہے بلکہ ہم تو انگریز کے دل پہ اسلام کا سکہ بٹھاتے ہیں ——— غرض بات بڑھتی ہی رہی۔ پھر چونکہ کسی نہ کسی حد تک صداقت دونوں طرف تھی اسلئے مسلمان دونوں فرقوں میں بٹنے لگے مسٹر اور مولوی کی دو اصطلاحیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں وضع ہوئیں مسٹر نے کہا مولوی کچھ نہیں جانتا مولوی بولا مسٹر کو خاک نہیں آتا۔

مخالفت کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھا کہ دیوبند مسلک کے لوگوں نے نئی طرز سے کتابیں چھاپنا، چھوٹی تقطیع کی جلدیں رکھنا، سلیس و شگفتہ قسم کی عبارت لکھنا بغیر تمہید و مقدمہ کے مضمون شروع کرنا، شعر و شاعری میں گل و بلبل کی بجائے ملکی مناظر و کیفیات کے نقشے کھینچنا، رسائل و اخبار پڑھنا، غرض اسی قسم کی سینکڑوں مفید یا کم از کم بے ضرر باتوں کو بھی فتنہ سے تعبیر کیا۔ اور ان کے خلاف بھی ایک محاذ بنایا۔ اسکے مقابلہ میں علیگڈھ مسلک کے پیروؤں نے مولوی کی ہر چیز کے ساتھ تمسخر کیا۔ داڑھی رکھنے کو حماقت کی نشانی قرار دیا اور مولوی کی رفتار، گفتار، کردار سب چیزوں کی ہنسی اڑائی۔

تجدد و قدامت

اگر انگریز کا منحوس قدم درمیان میں نہ ہوتا تو اختلاف کی یہ خلیج اول تو اتنی بڑھتی ہی نہیں، اور اگر بڑھ بھی گئی تھی تو جلد ہی پاٹ دیجاتی۔ پانچویں چھٹی صدی ہجری میں جب یونان و روما کے نئے علوم مسلمانوں میں پھیلے تب بھی اسی قسم کا ہنگامہ بپا ہوا تھا۔ واصل بن عطا، بو علی سینا اور عمر خیام جیسے فلسفی پیدا ہوئے تھے اور اعتزال کی ہوائیں بڑے زوروں کے ساتھ چلنے لگی تھیں لیکن چونکہ "بھس میں چنگاری ڈالکر تماشہ دیکھنے والی جمالو" موجود نہ تھی، اسلئے یہ ہنگامے جلد ہی فرو ہو گئے۔ امام رازیؒ و امام غزالیؒ جیسے بزرگ پیدا ہوئے اور انھوں نے دونوں گروہوں میں سمجھوتہ کرادیا۔ مگر ہندوستان میں تو حالت ہی دوسری تھی۔ یہاں تو انگریز یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مسلمان کے دل سے نفرت کا جذبہ نکالے۔ اور اس مقصد کے لئے وہ علیگڈھ کو بہرحال دیوبند سے اچھا سمجھتا تھا۔ اس چیز نے دیوبند کے دماغ سے علیگڈھ کے محاسن کا تصور بالکل نکالدیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جیسے جیسے علیگڈھ سے تجدد و اصلاح کی آواز بلند ہوتی گئی، دیوبند میں "جادۂ سلف" پر قائم رہنے کی کوشش کی گئی۔ اسی بنا پر دیوبند کے حامیوں نے نصاب تعلیم کی اصلاح کو بھی پسند نہ کیا اور قدیم نصاب کو قدیم طریقہ ہی سے پڑھانا ضروری ٹھیرایا۔ فلسفہ و حکمت یا منطق و ریاضی کو اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر محض "جادۂ سلف" کی اتباع میں یہاں بھی قدامت ہی کو پیش نظر رکھا گیا۔ یہانتک کہ علما نے زمین کے سکون اور آسمان کی گردش جیسے بالکل غیر مذہبی غیر اسلامی مسائل پر بھی اتنی ہی شدت برتی جتنی فقہ و تفسیر کے مسائل میں برتی گئی ہے۔ فلسفہ و سائنس کے بطلان میں کتابیں لکھی گئیں اور ان کے لکھنے میں بھی عبارت و انشاء کے قدیم طرز ہی کو ملحوظ رکھا گیا۔ صاف و سلیس عبارت کو ناولوں کی عبارت کہا گیا اور اس سے پرہیز کرنیکی نصیحت کی گئی۔ اس افراط و تفریط کے بیچ میں ایک معقول و معتدل راہ اختیار کرنے کے لئے علامہ شبلی مرحوم کے زیر اثر لکھنؤ میں ندوۃ العلما کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ مگر دونوں طرف کی کھینچا تانی کا یہ عالم تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اسے پسند نہ کیا۔ دیوبند نے اسے علیگڈھ کا بچہ سمجھا اور علیگڈھ نے اسے دیوبند کی شاخ ٹھیرایا۔

یہاں ایک بات خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ چیز پیدا صرف انگریز سے نفرت کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، انگریزی مظالم کے بھیانک نقشے لوگوں کے دماغ میں دھندلے پڑتے گئے مگر اس کے باوجود "قدامت و اتباع سلف" اور "تجدد و روشن خیالی" کے نام سے جن خیالات کی تبلیغ مسلمانوں میں کی گئی تھی، وہ روز بروز شدید سے شدید تر ہی ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی ایک مستقل حیثیت اختیار کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرز معاشرت، طرز تعلیم اور طرز فکر و نظر وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے مسلمانوں میں دو مستقل گروہ پیدا ہو گئے جنکی ابتدا یقیناً انگریز سے نفرت کرنے اور نہ کرنے کی بنا پر ہوئی تھی لیکن بعد میں سوال بیچ سے اٹھ گیا۔ اب یہ دونوں گروہ باہم ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھنے لگے۔ آج آپ کو علیگڈھ مسلک کے حامیوں میں ایسے لوگ کافی تعداد میں ملیں گے جو انگریز سے نفرت کرنے میں بانیانِ دیوبند سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں۔ اس کے برخلاف دیوبند مسلک کے حامیوں میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو انگریز کے مخالف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود دیوبند مسلک کے حامیانِ انگریز، علیگڈھ مسلک کے حامیانِ انگریز کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں دیوبند مسلک کے مخالفینِ انگریز ہی سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ ایک گریجویٹ اور ایک فاضل دیوبند باہم کتنے ہی گہرے ہمخیال و ہم عقیدہ دوست کیوں نہ ہوں، پھر بھی وہ ایک دوسرے سے کچھ اجنبیت محسوس کرتے ہی ہیں۔

علیگڈھ اور انگریز

شروع شروع میں جب مسلمانوں نے انگریزی پڑھی تو انگریز نے ان کی بے انتہا حوصلہ افزائی کی۔ ہر انگریزی امتحان کی سند، سرکاری ملازمت کا پروانہ بن گئی۔ جس نے انگریزی پڑھ لی، اُسے کوئی نہ کوئی عہدہ ضرور ملگیا۔ نوکریوں میں مسلمانوں کا تناسب بڑھایا گیا کونسلوں اور اسمبلیوں کے انتخاب میں مسلمانوں کے لئے بہت ہلکی شرطیں رکھی گئیں، خطابات تقسیم کرنے میں مسلمانوں کا خاص خیال رکھا گیا۔ ان حالات میں علیگڈھ مسلک کے لوگوں میں انگریز کی طرف سے ایک قسم کی الفت کا پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ چنانچہ سرسید مرحوم کا یہ حال تھا کہ وہ انگریز کی مخالفت میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے لئے بھی تیار نہ ہو سکتے تھے۔ اس زمانہ میں آئی سی ایس کی ملازمتوں کیلئے مقابلہ کا امتحان لندن میں ہوتا تھا سریندر ناتھ بنرجی نے اسکے خلاف آواز اٹھائی اور حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ آئی سی ایس کا امتحان ہندوستان میں بھی ہو۔ اس مطالبہ کی تائید میں مسلمانوں کو بھی شامل کرنے کے لئے انھوں نے سرسید مرحوم کی حمایت... چاہی لیکن سرسید مرحوم نے اسکی حمایت کرنے سے بھی انکار کردیا۔ اسی زمانہ میں کانگریس قائم ہوئی تھی اور نہایت ہی وفادارانہ قسم کی تجویزیں پاس کرنیوالوں کی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی چونکہ اس میں حکومت کے کاموں پر کسی نہ کسی حد تک نکتہ چینی ہوتی تھی اس لئے سرسید مرحوم نے اسکی حمایت بھی گوارا نہ کی۔ چنانچہ مسٹر اے۔ سی ہیوم نے (جو کانگریس کے بانیوں میں سے تھے) اپنے ایک پمفلٹ (مشتہرہ ۱۸۸۸ء) میں یہ الفاظ لکھے تھے:۔

> "سرسید احمد خاں کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ کانگریس کے موضوع پر گفتگو کرتے وقت عقل سے عاری ہو جاتے ہیں"

انگریزوں نے بھی علیگڈھ مسلک کے اس "جذبۂ وفاداری" کا صلہ دینے میں کافی فیاضی سے کام لیا لیکن آخر اسکی بھی ایک حد تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسلمان زیادہ تعداد میں پڑھ پڑھ کر یونیورسٹیوں سے نکلنے لگے تو انہیں نوکریاں ملنے میں دقتیں پیش آئیں۔ جبتک گریجویٹ تھوڑے سے ہوتے تھے ہر گریجویٹ "صاحب" کا دوست ہوتا تھا لیکن جب انکی تعداد بڑھنے لگی تو یہ بات بھی مشکل ہو گئی۔ اب ان لوگوں کی آنکھیں کچھ کھلنا شروع ہوئیں۔ مگر پھر بھی وہ انگریز سے بالکل مایوس نہ ہوئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان کو اگر کچھ عزت و حرمت مل سکتی ہے تو وہ صرف انگریز ہی کے طفیل سے ملسکتی ہے۔ اسوقت ہندوؤں میں سیاسی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور وہ جمہوریت کے اصول پر نمایندہ جماعتیں اور ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرنے لگے تھے لیکن علیگڈھ نے اس کا ساتھ بالکل نہ دیا۔ اس لئے خیال کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت کی بنیاد پڑی اگر کچھ خوف ملے بھی تو مسلمان، اقلیت میں ہونے کی بنا پر خسارے میں رہیں گے اس لئے خواہ مخواہ انگریز کو ناراض کیوں کیا جائے! غرض علیگڈھ کو انگریز پر اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں اس کی مخالفت کرنے کو خودکشی کے ہم معنی سمجھتا تھا۔ لیکن آخرکار وہ وقت آیا کہ اس طلسم کا تانا بانا بکھرنا شروع ہوا۔ یعنی جنگ بلقان و جنگ عظیم کے زمانہ میں اسلامی ممالک کو ملیامیٹ کرنے کی سازشیں کرکرکے خود انگریز ہی نے علیگڈھ کو نیند سے جگایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علیگڈھ کے وہی فرزند جو انگریز سے صرف درخواستیں کرنا کافی سمجھتے تھے للکار کر اس کے مقابلہ میں آگئے۔ اور اسکے بعد تحریک خلافت کے دنوں میں انھوں نے جو کچھ کیا اُسے بتانے کی ضرورت نہیں۔

ناکام اتحاد

تحریک خلافت کے زمانہ میں علیگڈھ اور دیوبند کا اختلاف بالکل ہٹ گیا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاکر میدان عمل میں سرگرم جہاد نظر آنے لگے لیکن افسوس ہے کہ یہ چیز عارضی اور وقتی ثابت ہوئی۔ جب ۱۹۲۴ء میں مصطفےٰ کمال نے خلافت کے منصب کو توڑ دینے کا اعلان کیا تو قدرتاً ہندوستان کی تحریک بھی ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے ختم ہونیکے بعد پھر وہی صورت پیدا ہو گئی جو اس تحریک سے پہلے تھی یعنی مسلمانوں کے سامنے پھر یہ سوال آیا کہ آیا انگریز کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں۔ اگرچہ اب علیگڈھ بھی کافی "باغی" ہو چکا تھا مگر پھر بھی دیوبند کے دل میں انگریز سے جو نفرت بیٹھی ہوئی تھی اسکی برابری نہ کرسکتا تھا۔ اور ہونا بھی یونہی چاہئے تھا اسلئے کہ علیگڈھ کو تو اس دوران میں انگریز نے کافی نوازا تھا، سینکڑوں سرکاری عہدوں پر اس مسلک کے لوگ قابض تھے۔ لیکن دیوبند تو ہر اعتبار سے محروم ہی رہا۔ نہ اس کے پاس عزت رہی تھی نہ دولت، نہ وجاہت نہ حکومت۔ انگریز نے یہ چاہا تھا کہ اسے عیسائی پادریوں کی قسم کا ایک گروہ بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ مگر چونکہ اسلامی اصول و روایات کی رو سے مذہب و سیاست کو کاٹ کر الگ نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے ہزار کوششوں کے باوجود بھی انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی بنا پر دیوبند کی فضا میں بار بار بگولے اُٹھتے تھے۔ گذشتہ اسلامی تاریخ کا ہر ہر ورق انکو پیغام بغاوت دیتا تھا۔ اگر انگریز نے ان کے ساتھ کوئی سلوک کردیا ہوتا تب بھی شاید علیگڈھ کی طرح ان کے دل کے زخم کچھ بھر جاتے لیکن اب تو ان کی محرومی و ناکامی اور بیکسی و کس مپرسی آئے دن ان کے دل کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتی رہتی تھی۔ اور اسلئے جب خلافت کی تحریک ختم ہوئی تو علیگڈھ تو ہندو سے الجھ کر آزادی ہند کی جد و جہد سے پیچھے ہٹنے لگا لیکن دیوبند اس کے لئے تیار نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں انگریز کے خلاف نفرت و انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ اسے کسی اور چیز کے سوچنے کا موقعہ ہی نہ دے سکی۔

گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران میں علیگڈھ اور دیوبند یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یونیورسٹی اور مدرسہ نے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو کر جو ترقی کی تھی اس نے ان دونوں کی باہمی بدظنی کو راسخ تو کر ہی رکھا تھا، اس لئے تحریک خلافت کے بعد جب جمعیۃ علمائی افراد نے کانگریس کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تو ان کے حریفوں نے انہیں وہی جہالت و نادانی کا پرانا الزام دیا۔ اس کے مقابلہ میں جمعیۃ علما کی طرف سے بھی ان کی طرف انگریز دوستی اور بے دینی کا پرانا طعنہ پھینک دیا گیا۔ ———— اور یہی وہ جذبات ہیں جو آج ہم کو اپنی سیاست میں نظر آ رہے ہیں۔

پہلے کی طرح آج بھی سوال یہ ہے کہ زمام قیادت کس کے ہاتھ میں رہے۔ انگریزی مدرسۃ العلوم کے یا عربی دارالعلوم کے؟ پہلا دوسرے کو جاہل کہتا ہے اور دوسرا پہلے کو بے دین۔ لیکن بزعم خویش دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہ اپنے کو جاہل سمجھتا ہے اور نہ بے دین۔

مشکل کا حل کیسے ہو؟

یہاں تک جو کچھ کہا گیا اُس سے موجودہ صورت حالات کا ایک واضح نقشہ آپ کے دماغ میں آگیا ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مشکل کیسے حل ہو۔ کوتاہیاں اور سچائیاں دونوں طرف ہیں۔ اس لئے ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگوں کے سامنے ایک کی کوتاہیاں ہوتی ہیں اور بعض کے سامنے دوسرے کی۔ بس کوئی اِس کا خیرخواہ بن جاتا ہے اور کوئی اُس کا۔ جمعیت علمائی حضرات کو جوش و جذبہ اور اخلاص و ایمان سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ان کے اسلحہ خانہ میں جو ہتھیار ہیں وہ اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ اس زمانہ میں وہ کام نہیں دے سکتے۔ آجکل انگریز سے آئینی جنگ لڑنے کا عزم لے کر گھر سے نکلنا لیکن انگریزی پر ماہرانہ دسترس نہ رکھنا نہایت مضحکہ خیز ہے۔ آجکل کی جنگ میں دنیا کی رائے عامہ کو اپنے موافق بنانا اور غیر متعلق لوگوں کی اخلاقی امداد حاصل کرنا بے انتہا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے علما دنیا کی بین الاقوامی زبانوں میں سے کسی ایک زبان پر بھی عبور نہیں رکھتے اس لئے نہ وہ دوسروں کو اپنی سنا سکتے ہیں اور نہ دوسروں کی سن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا جواہر لال اور گاندھی کو تو جانتی ہے اور اُن کی رائے کا وزن محسوس کرتی ہے لیکن حسین احمد کفایت اللہ جیسے بزرگوں کو نہ جانتی ہے اور نہ اُن کی کوئی اہمیت محسوس کرتی ہے۔

جمعیت علمائی بزرگوں کی ذہنی تربیت جس انداز سے ہوتی ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ آجکل کے جمہوری و دستوری مسائل کی بہت سی اُلجھنوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ اسلام کا تحفظ ضرور چاہتے ہیں لیکن چونکہ اپنے تعلیمی ماحول میں اموی اور عباسیہ خلافت ہی تک اُن کی نظر رہتی ہے اس لئے اُن گتھیوں کو سلجھانا اُن کے امکان سے باہر ہوتا ہے جو فسطائیت، نازیت، جمہوریت، اشتراکیت اور دستوریت کے تصادم اور تصادم در تصادم سے دنیا میں پیدا ہوگئی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں یونیورسٹیوں کا وہ گروہ ہے جو فقہ و حدیث سے بالکل کورا ہے۔ وہ بھی اسلام کا تحفظ چاہتا ہے لیکن اس تحفظ کے وقت اُس کے دماغ میں صرف یورپ کی قوموں کا سا تحفظ ہوتا ہے۔ وہ جرمنی کے جرمنوں کی طرح مسلمانوں کو آزاد و سربلند تو ضرور دیکھنا چاہتا ہے لیکن خلافت راشدہ کے صحابیوں کی طرح ایمان و روحانیت سے دل کو روشن رکھنا اُس کے بس کی بات نہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس مشکل کا حل کیا ہو۔ علم دین و علم دنیا، یونیورسٹی و مدرسہ یا علیگڈھ و دیوبند کیسے گلے ملیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے دینی مدارس **نصاب تعلیم** کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دینی مدارس کے فاضلوں کو یورپ بھیجنے کا اہتمام کیا جائے۔ جس دن دیوبند کے دس بیس فاضل بھی جناح و جواہر کی ٹکر کے ہوگئے اُسی دن یہ سارا اختلاف مٹ جائے گا۔

اسلام کا محافظ کون ہے؟

لیکن یہ مبارک دن تو جب آئیگا، آئیگا۔ اس وقت تو ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ جمعیت علمائی اور مسلم لیگی مسلمانوں میں اسلام کا واقعی محافظ کون ہے۔ اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ہندوستان کی سیاست میں انگریز نے جو الجھن پیدا کردی ہے اُسکی بنا پر ہمارے یہاں دو قسم کے "محافظین اسلام" کا پیدا ہوجانا بالکل قدرتی بات ہے۔ ان دونوں "محافظین اسلام" میں سے کسی کو بھی نہ تو بالکل جھوٹا کہا جاسکتا ہے اور نہ بالکل سچا۔

دیوبند کی کوتاہی یہ ہے کہ اُس نے "قدامت و اتباع سلف" پر اتنا زور دیا کہ ہر نئی سچائی کو دیس نکالا دیدیا۔ اس کے مقابلہ میں علیگڈھ کا قصور یہ ہے کہ اُس نے "تجدد و روشن خیالی" کے جنون میں ہر پرانی چیز کی طرف سے پیٹھ پھیرلی۔ یہ صورت حالات ہندوستان کے سوا دنیا کے اور کسی ملک میں آپ کو نہ ملے گی۔ یہاں چونکہ تجدد و قدامت کی مناسب آمیزش کرنے کے بجائے اُن کو ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رکھا گیا اس لئے یہاں قدرتاً دو ایسے گروہ پیدا ہوگئے کہ اگر آپ ایک کی باتیں سنیں تو فوراً بول اُٹھیں گے کہ "واقعی تو سچا ہے"۔ لیکن اگر دوسرے کی گفتگو آپ کے کان میں پڑے تو اس پر بھی آپ کو یہی کہنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر مسلم لیگ کا اثر ہے وہ جمعیت علما کو مخالف اسلام سمجھتے ہیں اور جن پر جمعیت علما کا اثر ہے وہ مسلم لیگ کو اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

جمعیت علمائی لوگوں کے دماغ میں اسلام کا تصور جب آتا ہے تو روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ اور تہجد و اشراق کی شکل میں آتا ہے، اس کے برخلاف مسلم لیگی کے ذہن میں اسلام کا تصور سرکاری، نیم سرکاری اور جمہوری اداروں پر قبضہ کرنے کی صورت میں آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو سوال غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ آیا ہندوستان میں اُن کو اسلامی ارکان و عبادات ادا کرنے کی آزادی ہوگی یا نہیں؟ اور دوسرے یہ کہ آیا آیندہ ہندوستان میں ان کے تہذیبی اور لسانی امتیازات محفوظ رہیں گے یا نہیں؟ جمعیت علمائی حضرات کی توجہ زیادہ تر پہلے سوال تک محدود رہتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کے سامنے صرف دوسرا سوال ہوتا ہے۔ اور اس لئے ایک بے نمازی بے روزہ خور مسلمان بھی اس اعتبار سے پُرجوش مسلم لیگی بن سکتا ہے لیکن جمعیۃ علمائی حضرات میں اس قسم کے افراد کی گنجایش ذرا مشکل سے نکل سکتی ہے۔ پھر جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، ہندوستان کا ہندو اُسے منظور کرنے میں تامل نہیں کرسکتا۔ لیکن دوسرا سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ ہندو کی یہ خواہش ہے کہ ہندوستان میں اب تک ہندو مسلم تہذیب و معاشرت کا جو نمایاں امتیاز رہا ہے ▪ باقی نہ رہے بلکہ سب معاشرتیں اور تہذیبیں مل ملاکر ایک ہو جائیں۔ پھر چونکہ اکثریت ہندو کی ہے، اس لئے اسے یہ اطمینان ہے کہ اس ملی جلی تہذیب میں غالب اثر ہندو تہذیب ہی کا رہے گا۔ اسی لئے وہ جداگانہ انتخاب یا کمیونل ایوارڈ کو کسی صورت سے گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ مسلمان سے اُس کے مذہبی عقائد چھیننا نہیں چاہتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ ہندوستان کے ترانے، جھنڈے، وردی، یونیفارم، لباس و پوشاک جیسی تمام چیزوں میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ وہ ہندوستان میں مسلمان کو اچھوت کی طرح ایک فرقہ دیکھنا چاہتا ہے، ایک قوم دیکھنے کا روادار نہیں۔ اور اس لئے ارکان مذہب کے تحفظ کے علاوہ ہمارے سوال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آیا ہم تہذیبی، لسانی و معاشرتی حیثیت سے اسی طرح رہیں گے جس طرح اب تک رہتے چلے آئے ہیں یا مستقبل کے ہندوستان میں چین کے چینی مسلمانوں کی طرح ہوکر رہ جائیں گے کہ معاشرت وغیرہ کے لحاظ سے ہم میں اور دوسرے ملکی باشندوں میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔ ہندو یہی چاہتے ہیں اور علانیہ اس کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں۔ مشترکہ انتخاب کو رائج کرنے سے بھی اُن کا یہی مقصود ہے۔ اڑیسہ میں مسلم ممبر کو لینے سے جو احتراز کیا گیا وہ بھی اسی "دوئی" کو مٹانے کے لئے تھا۔ غرض ہندو کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح آج تک مسلمان اور ہندو مذہبی اعتبار سے الگ رہے ہیں اس طرح نہ رہیں بلکہ ہندوستان کی ہندوستانیت میں اس طرح ضم ہو جائیں کہ مذہبی عقائد کو چھوڑکر جن کا تعلق صرف دل سے ہو، اُن کی ہر چیز میں "من تو شدم تو من شدی" کا منظر نظر آئے۔ مسلم لیگ کے حامی اسی چیز کی مخالفت میں۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اُسی امتیاز سے رکھنا چاہتے ہیں جس امتیاز سے وہ اب تک رہے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندو مسلمان میں سمجھوتہ تو ہو لیکن دونوں کی معجون مرکب نہ بنے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کلچر اور زبان جیسے مسائل پر زور دیتے ہیں اور اس لئے ارکان اسلام کے پابند نہ ہونے کے باوجود بھی جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے اُن کو "محافظ اسلام" کہا جاسکتا ہے۔

جمعیۃ علمائی حضرات بھی اس چیز کے حامی ہیں لیکن یہاں پھر بیچ میں انگریز سے نفرت کرنے نہ کرنے کا سوال آجاتا ہے۔ یعنی جمعیۃ علمائی حضرات انگریز کے مقابلہ کے سوال کو درجہ اول کی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مسلم لیگ کے حامی ہندو کی مخالفت کو یہ اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ پھر چونکہ جمعیت علمائی حضرات آجکل کے قومی اور بین الاقوامی سوالات کے نئے نئے پہلوؤں اور اُن سے پیدا ہونیوالے نتائج پر کماحقہ عبور نہیں رکھتے اسلئے قومی تہذیب و تمدن اور زبان و رسم خط کے سوال کی اہمیت کو وہ پوری طرح محسوس بھی نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سوالوں کو چھیڑنے کے بجائے زیادہ تر **محکمۂ قضا** کے قیام پر زور دیتے ہیں حالانکہ محکمہ قضا اگر قایم بھی ہو جائے تب بھی مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی امتیاز کا سوال حل نہیں ہوتا اس کے لئے تو دوسرے ہی قسم کے آئینی تحفظات کی ضرورت ہے۔

بہر حال جمعیت علمائی مسلمان نہایت راسخ العقیدہ قسم کے پُرجوش پُراخلاص مسلمان ہیں اور اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود قومی خصائل و خصائص کے اُس خمیر کو جو مذہبی روایات و تاریخ کے پس منظر میں سالہا سال کے اندر تیار ہوتا ہے اور جو شعر و ادب اور آداب معاشرت و رہائش وغیرہ کی شکل میں جلوہ آرا ہوا کرتا ہے اُس کو پوری طرح سمجھنا ہمارے علما کے لئے بہت دشوار ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اس چیز کو براہ راست مذہب سے واسطہ بھی نہیں۔ کلچر اور زبان کے اعتبار سے ہر ملک کا مسلمان دوسرے ملک کے مسلمان سے مختلف ہوسکتا ہے۔ مذہب تو صرف چند عقائد و عبادات کا نام ہے لیکن اس کے باوجود ایک خاص قسم کے تہذیبی ماحول، ایک خاص قسم کی تمدنی آب و ہوا اور ایک خاص قسم کے معاشرتی خمیر کو اگر کسی قوم سے چھین لیا جائے تو پھر اُس کے عقائد و عبادات میں بھی زلزلہ آجاتا ہے۔ اور اس لئے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جس چیز کو مسلم لیگ کے حامی کلچر اور زبان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اُسے بلاواسطہ مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے مگر پھر بھی مسلمانوں سے اس کا چھین لیا جانا، گویا اُن کے مذہب کو اُن سے چھین لینا ہوگا۔

مسلم لیگ کے حامیوں کے سامنے مذہب کا نہیں بلکہ کلچر اور زبان کا ہی سوال ہے اور اس لئے ان کی جماعت کو خالص مذہبی نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ کے ارباب اقتدار اس جماعت میں دوسری اقلیتوں کو شامل ہونے کی دعوت دیتے رہتے ہیں لیکن جمعیت علمائی بزرگوں کے سامنے خالص مذہبی سوال ہے۔ گویا پہلی جماعت کو

اسلامی عقائد و عبادات پر اتنا اصرار نہیں جتنا مسلمانوں کے قومی خصائص خصائل کے تحفظ پر ہے اسی لئے تو نماز کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس برخاست کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ اسی قسم کے کسی اور مذہبی فریضہ کی بجاآوری پر وہاں زور دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسری جماعت کو قومی خصائص و خصائل کے مقابلہ میں اسلامی عقائد و عبادات کے تحفظ پر اصرار ہے۔

کرنا کیا چاہیئے ؟

لیکن مسلمان کے لئے تو دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ اس لئے وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ پس اس مشکل کا بہترین حل تو یہی تھا کہ ان دونوں جماعتوں کو ملا دیا جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک جماعت بھی آسانی کے ساتھ اپنی قیادت کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوگی۔ پھر جب سے مسلم لیگ نے خود کو "مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت" کہنے پر اصرار کیا ہے، یہ سوال اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ اگر مسلم لیگ کے ارباب کار کے سامنے قیادت کا سوال نہ ہوتا تو اس دعوے سے قبل ان کا فرض تھا کہ جمعیت علمائی مسلمانوں سے اتحاد کر لیتے۔ لیکن سالہاسال کے غرور قیادت کی بنا پر انھوں نے اسے گوارا نہ کیا۔

بہر حال ہمیں مسلمانوں کے سوال پر غور کرتے وقت ہندوستان کی مجموعی قسمت کے سوال کو نظروں سے اوجھل نہ کر دینا چاہیے۔ اس وقت دنیا کی جو حالت ہو رہی ہے اس کی بنا پر انگریز کی حیثیت سخت خطرہ میں ہے۔ مسولینی ہٹلر اور فرانکو کی فتوحات نے انگریز کی پوزیشن کو بہت ہی نازک بنا دیا ہے۔ خدا جانے کب اور کس وقت جنگ چھڑ جائے۔ پھر جنگ چھڑنے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ انگریز کو مصروف پاکر جاپان ہندوستان پر دھاوا بول دے۔ یا جاپان کے علاوہ کوئی اور حکومت ایسا کرے۔ پھر یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے پاس اسلحہ نہیں ہیں، لیکن اگر ہمارا قومی شعور کافی طاقتور ہو جائے تب بھی بیرونی حملہ آور کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ بفرض محال اگر کسی بیرونی حملہ کے اس خطرہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تب بھی جنگ چھڑ جانے پر انگریز کو ہندوستان سے ڈھکیل دینا بہت ہی آسان ہو جائیگا۔ لیکن یہ بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب ہندوستان کے تمام باشندوں میں کم از کم غیر ہندوستانی جابر و غاصب طاقت کے مقابلہ میں کامل اتحاد و اتفاق ہو یعنی جہانتک غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں یکدل یکجان ہو جانے کا تعلق ہے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ متحدہ قومیت کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہونا چاہیے۔ اسی بنیاد پر مولانا حسین احمد نے فرمایا تھا کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قومیت سے تعلق رکھتے ہیں پس جب تک ہندوستان کے سر پر غیر ہندوستانی طاقت کا بھوت منڈلا رہا ہے، ہندوستان کے تمام فرقوں کا کوئی ایک متحدہ محاذ ضرور قائم رہنا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں اس مقصد کے لئے **کانگریس** سے زیادہ بہتر متحدہ محاذ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے کانگریس میں شریک ہونا از بس ضروری ہے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ یہ شرکت کیسے ہو۔ آیا پہلے مسلمان الگ سے اپنی تنظیم کر لیں اور پھر ایکدم سے داخل ہو جائیں یا فرداً فرداً داخل ہوتے رہیں۔ سو اسمیں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک جداگانہ تنظیم ہونی چاہیئے لیکن تنظیم کے اس سوال پر کانگریس کی شرکت کو معلق کر کے اسے راد ھا کی نومن تیل والی شرط نہ بنا دینا چاہیے۔ یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ پہلے مسلمانوں کی تنظیم ہو جائے اور پھر وہ سب کے سب کانگریس میں داخل ہوں بلکہ کانگریس میں مسلمانوں کا داخلہ جاری رہے اور اسی کے ساتھ ان کی جداگانہ تنظیم کا کام بھی ہوتا رہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جداگانہ تنظیم کے اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمان کس جماعت میں شریک ہوں۔ سو جب کانگریس میں شریک ہونے کا سوال طے ہو گیا تو یہ سوال کچھ مشکل نہیں رہتا اس لئے کہ کانگریس میں شریک ہونے والے پر مسلم لیگ کے دروازے تو بند ہو ہی چکے ہیں۔ بس اب صرف **جمعیۃ علما** ہی رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اسی میں شامل ہونا چاہیے۔ اور اسمیں شامل ہو کر علما کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اسے علما کی مخصوص جاگیر نہ بنائے رکھیں بلکہ اس کے کاروبار کو پوری طرح عوام کے ہاتھوں میں سونپ دیں۔ علم دین کے نام سے کسی پبلک ادارہ کا چند مخصوص افراد کے ہاتھ میں سونپ دینا خود علم دین کو نقصان پہنچاتا ہے۔ عوام کے ادارے میں ہر چیز صرف عوام کے ہاتھوں میں رہنی چاہیئے۔ پھر عوام کو پروپگنڈے یا ترغیب و تحریص کے ذریعہ کسی خاص شخص کے منتخب کرنے پر تو آمادہ کیا جا سکتا ہے لیکن آئینی طور پر ایسی پابندیاں عاید کرنا جس کے بعد کوئی ایک ذمہ داری بھی عوام کے ہاتھ سے چھین کر خواص کے ہاتھ میں دیدی جائے، جمہوری اصول کے بالکل خلاف ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر رائے عامہ کا دباؤ جمعیت علما کو اس اصول پر کاربند ہونے پر مجبور کرے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہر اعتبار سے عوام کی نمائندہ جماعت نہ بن جائے جس کے بعد **مجلس احرار** کا اس کے ساتھ متحد ہو جانا بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کا سوال بالکل آخری اور قطعی طور پر حل ہو جاتا ہے۔

تہذیب و زبان کا تحفظ کیسے ہو ؟

لیکن اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی معاشرت و تہذیب کی حفاظت کیسے ہو۔ سو اس کے لئے ہمیں نہایت صفائی کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ اس بات کا اعلان کر دینا چاہیے کہ جہانتک غیر ملکی حملہ آوروں کے حملہ کو روکنے یا برطانوی شہنشاہیت جیسی جابر و غاصب حکومت کا مقابلہ کرنے کا تعلق ہے، مسلمان اپنے کو ہندوستانی قومیت سے علیحدہ تصور نہیں کرتے۔ لیکن اس **دفاعی قومیت** کے علاوہ باقی اور ہر لحاظ سے **مسلمان ایک بالکل جداگانہ قوم ہیں**۔ اور اس لئے ہندوستان کے ہر آئین و نظام کی ترتیب میں ان کی نمائندگی ایک قوم کی حیثیت سے ہونی چاہیے نہ کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جمعیت علما میں داخل ہو کر اس چیز کا صاف طور سے اعلان کرا دیں جس کے بعد وہ تمام خطرات رفع ہو جاتے ہیں جو آجکل مسلمانوں کو پیدا ہو گئے ہیں ہندو کی یہ خواہش اب بالکل راز نہیں رہی کہ ہندوستان میں صرف ہندو کلچر، ہندو تمدن، ہندو زبان، ہندو رسم خط اور ہندو معاشرت کے سوا اور کچھ نہ ہو اور اگر ہو تو ہندویت سے مغلوب و مقہور ہو کر ہو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ علانیہ طور سے اسکے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیں۔ البتہ موجودہ حالات میں تہذیبی تقسیم کے سوال کو اٹھانا اور ہندوستان کو مختلف ہندو مسلم علاقوں میں تقسیم کر دینے کا مطالبہ کرنا نہ صرف قبل از وقت ہے بلکہ ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں کے لئے بے انتہا مضر بھی ہے۔ اسوقت دنیا کی حالت ایسی ہو رہی ہے کہ انگریز خود کو ہندوستان میں چند دن کا مہمان سمجھ رہا ہے ایسی حالت میں اگر اس قسم کا تفرقہ انداز سوال اُٹھایا گیا تو اس کا نتیجہ انگریز کے قدموں کو ہندوستان میں مضبوط کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ انگریز کو مسلمان سے عشق تو ہے نہیں کہ وہ یہ سوچ کر جانے سے پہلے مسلمانوں کے ساتھ کوئی سلوک کرتے چلو۔ وہ تو اگر اس سوال سے دلچسپی لیگا بھی تو صرف اسلئے ممکن ہے اسطرح، ہندوستان میں ٹکنے کی کچھ اور مہلت اسے مل جائے۔

اصل چیز قومی شعور اور قومی بیداری ہے۔ اگر مسلمانوں میں یہ پیدا ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انکو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی پس ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ دفاعی حیثیت کے علاوہ باقی اور ہر حیثیت سے خود کو ایک قوم سمجھیں اور جہانتک ہو سکے اس چیز کا تحفظ کرتے رہیں لیکن اتنا یاد رہے کہ انگریز کے مقابلہ والے متحدہ محاذ کو کسی سوال پر بھی قربان کر دینا ٹھیک نہیں مسلم لیگ نے آجکل جو صورت اختیار کر رکھی ہے وہ نہایت افسوسناک ہے۔ انکو موجودہ طرز عمل نے اس جماعت کو انگریز کے لئے بالواسطہ طور سے ایک مفید ادارہ بنا دیا ہے۔

مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندو سے وہ کتنے ہی لڑیں، جبتک انگریز یہاں موجود ہے وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے۔ لیکن جس دن انگریز یہاں سے چلا گیا پھر یہ تمام جھگڑے بڑی آسانی سے طے ہو جائینگے ہندوستان کی تہذیبی تقسیم یا **پاکستان** کے سوال کو اٹھانے کا موزوں وقت بھی وہی ہوگا۔ اسوقت تو ان سوالوں کو اٹھانا وقت اور طاقت کو ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے

مسلم لیگی دوستوں سے

ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے وہ ہماری بالکل مخلصانہ اور ہمدردانہ رائے ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ پارٹی بازانہ فضا میں ہماری اس گذارش پر وہ لوگ بہت کم متوجہ ہونگے جنھوں نے مسلم لیگ کیساتھ عہد رفاقت باندھ رکھا ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری گذارش صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر آپ اپنی کسی غرض کو حاصل کرنے یا اپنے کسی حریف کی ضد میں، یا کسی شخص کو نیچا دکھانے یا محض لیڈری کی ہوس پوری کرنے کیلئے لیگ کے ممبر نہیں ہوئے ہیں بلکہ واقعی ایمانداری و دیانتداری کیساتھ آپ نے مسلمانوں کی بہی خواہی کے لئے لیگ ہی کو موزوں جماعت سمجھا ہے تو پھر آپ کوشش کیجئے کہ لیگ کی طرف سے جمعیۃ علمائی مسلمانوں کیساتھ مصالحت کی گفت و شنید ہو۔ ہم لیگ کے ارباب اقتدار کی طرف سے اس سلسلہ میں بالکل مایوس ہیں لیکن پھر بھی رائے عامہ کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسلئے کچھ عجب نہیں کہ جسطرح رائے عامہ کے دباؤ نے لیگ کے بانکے چھبیلے لیڈروں سے مکمل آزادی کو بطور نصب العین اور سول نافرمانی کو بطور پالیسی منظور کرا لیا، اسی طرح کل کو رائے عامہ کا دباؤ "مسلمانوں کی اس واحد نمائندہ جماعت" کو جمعیت علمائی مسلمانوں سے گفتگو و مصالحت کرنے پر بھی مجبور کر دے

اس کے بعد اپنے مسلم لیگی دوستوں سے ہماری درخواست یہ ہوگی کہ خدا کے لئے صرف سچائی اور راستبازی کو اپنا مطمح نظر بنایئے۔ دوسروں پر طعن طعن کرنا، دوسروں کا تمسخر اڑانا، اور انکو ہوا کر دکھانا اسلام و انسانیت دونوں کی توہین ہے قوم کی اصلاح سے پہلے آپکو خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔ اگر آپ خود عیوب سے پر ہیں اور خود آپ کی زندگی اسلام و انسانیت کا نمونہ نہیں ہے تو پھر آپکو کیا حق ہے کہ اسلام کی حفاظت کرنے کے مدعی بنیں۔ آپکو سوچنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی قوم دوسروں کو سنے پیٹنے یا برا بھلا کہنے سے نہیں بنی ہے۔ قوم کو بنانے کے لئے ٹھوس تعمیری کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کرنیوالے تو دوسروں کی گالیوں کے جواب میں بھی "عفاک اللہ نکوگفتی" کہدیتے ہیں چہ جائیکہ خود کسی کو برا بھلا کہنے کا پیشہ اختیار کریں مسلم لیگ سے ہمیں بنیادی طور پر اختلاف ہے لیکن اسکے باوجود بھی ہم اپنے ان تمام دوستوں کا دل سے احترام کرتے ہیں جو خلوص نیت کیساتھ اسمیں شریک ہیں۔ اگر یہ لوگ کسی ایک جاہل مسلمان کو بھی پڑھا دیں، محلہ کی کسی ایک جاہل لڑکی کو بھی نوشت و خواند سکھا دیں،

"میں دیکھ رہا ہوں کہ عربی فارسی کے عام فہم الفاظ کی جگہ سنسکرت ٹھونسی جا رہی ہے"

"زبان کا معیار دیہاتی محاورہ پر نہیں بلکہ شہری محاورہ پر قائم کیا جاتا ہے"

"اُردو زبان ہندو مسلمان کی مشترک تہذیب کا نتیجہ ہے"

(از رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ ایل ایل ڈی صدر آل انڈیا انجمن ترقی اُردو۔ الہ آباد)

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے اس مختصر مگر مدلل مقالہ کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں آپ نے بتلایا ہے کہ

(۱) یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں بلکہ درحقیقت ہماری تہذیب کا مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب سے ہے۔ اس لئے اگر اس زبان کو مٹا دیا گیا تو پھر ہندو مسلم اتحاد کا سوال خواب و خیال بنکر رہ جائے گا۔

(۲) اس وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ اہم اور نازک مسئلہ صرف اُردو زبان کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت بمقابلہ اور تمام اسباب اختلاف کے بہت زیادہ ہے۔

(۳) شمالی ہند کے شہروں میں عام طور پر جو زبان بولی جاتی ہے وہ اُردو ہی ہے۔

(۴) ہندی کے حامیوں کی طرف سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کو وہ زبان بولنا چاہئے جو دیہاتی سمجھ سکیں۔ یہ خیال بالکل غلط اور مہمل ہے۔ زبان کا معیار دیہات کے محاوروں پر نہیں بلکہ شہر کے محاوروں پر قائم کیا جاتا ہے اس لئے زبان کے مسئلہ میں ہم کو شمالی ہند کے شہروں کی تقلید کرنی چاہئے نہ کہ دیہات کی۔ علمی اور ادبی زبان بازاری زبان سے مختلف ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ ہم صرف وہی لفظ بولیں جن کو ہر گنوار سمجھ سکے بالکل ناممکن بات ہے۔ اگر ہندی کے پرچارکوں کے دل و دماغ میں موجودہ زبان کو مٹا کر اس کی جگہ سنسکرتی ہندی رائج کرنے کا منصوبہ نہ ہوتا تو وہ خود شہروں ہی کی زبان کو معیار تسلیم کرتے اور کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم کو علمی، ادبی، فلسفیانہ و شاعرانہ خیالات کو بیان کرنے کے لئے بھی صرف وہی لفظ بولنے چاہئیں جن کو گنوار بھی سمجھ سکیں۔ یہ بات بالکل بدیہی طور پر عقل کے خلاف ہے۔

(۵) افسوس ہے کہ آجکل عربی فارسی کے عام فہم الفاظ کی جگہ پر سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو استعمال کرنے کی کوشش ہو رہی ہے جس کے لئے اگرچہ سرکاری طور سے کوئی حکم تو جاری نہیں کیا گیا لیکن عملی طور پر اندر اندر یہ کارروائی بڑی قوت کے ساتھ جاری ہے۔

(۶) چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے اس لئے اگر موجودہ اُردو زبان بگڑی تو اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک ہندوؤں ہی کے سر ہوگی۔

(۷) اُردو زبان کا تعلق ایک ایسی تہذیب سے ہے جسے نہ مسلمانوں کی تہذیب کہا جا سکتا ہے، نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ اس کا تعلق ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب سے ہے۔ اس لئے اگر اردو کو مٹا دیا گیا تو پھر ہندو مسلم اتحاد کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہے گا۔ (ایڈیٹر)

ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ بہرحال میں اُمید کرتا ہوں کہ اگر وہ لوگ جن کو اُردو سے دلچسپی ہے۔ اور جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں، اپنی کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے تو وہ باوجود اُن حملوں کے جو عملی طور پر اس زبان پر اس وقت ہو رہے ہیں اُس کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ اس کی توسیع بھی کر سکینگے میں اور صوبہ جات کی نسبت تو اس وقت تذکرہ نہیں کروں گا، مگر یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ صوبہ جات متحدہ، بہار اور پنجاب میں یہ زبان عام طور پر کم از کم تعلیم یافتہ طبقوں میں تو اس وقت تک مروّج رہی ہے اور یہی رشتہ باہمی اتحاد کا ہندو مسلمانوں کے درمیان رہا ہے۔ اگر اس رشتہ کو اس وقت توڑ دیا گیا تو میرے خیال میں ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلافات ملک کی بدنصیبی سے اس وقت پیدا ہو گئے ہیں اُن کا رفع کرنا قریب قریب غیر ممکن ہو جائیگا۔ میں اُردو کے مسئلہ کی اہمیت بمقابلہ اور اسباب اختلاف کے بہت زیادہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ہر ملک میں ———— اندرونی خیالات اور جذبات کے اظہار کرنے کا ایک ذریعہ مشترک زبان ہی ہوتا ہے۔

یہ میں جانتا ہوں کہ اُردو کے مٹانے کے لئے کوئی احکام منجانب حکومت صادر نہیں ہوئے ہیں اور اب بھی عدالتوں اور دفتروں میں اس صوبہ میں اُردو ہی مستعمل ہوتی ہے لیکن عملی طور پر میں آجکل دیکھ رہا ہوں کہ معمولی عام فہم الفاظ جن کا تعلق اب بھی تعلق فارسی یا عربی سے ہے وہ گفتگو اور تحریر سے خارج کئے جا رہے ہیں اور ان کی بجائے سنسکرت کے الفاظ جن سے کان آشنا نہیں ہیں داخل کئے جا رہے ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ جس طرح یہ اعتراض ہندوؤں پر وارد ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مسلمانوں پر بھی ایک حد تک ضرور وارد ہو سکتا ہے یعنی اُردو کے بعض اخباروں اور رسالوں میں بجائے عام فہم الفاظ کے عربی و فارسی کے مشکل اور ادق الفاظ استعمال کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کشاکش میں وہ اردو جس نے دہلی اور لکھنؤ میں نشو و نما پائی اور جس کے گرویدہ تمام ہندو اور مسلمان تھے تباہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

میں اُن دلائل سے بخوبی واقف ہوں جو آجکل ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں کسی ملک میں زبان کی ترقی کا معیار دیہاتی محاورہ پر قائم نہیں کیا جاتا۔ ہر ملک کی شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہوتا ہے اگرچہ بنیاد ایک ہی ہوتی ہے پس یہ کہنا کہ ہم کو وہ زبان بولنی چاہئے جو کہ دیہات میں سمجھی جاتی ہے، میرے خیال میں نہ صرف اُردو کو بلکہ ہندی کو بھی تباہ کرنا ہے۔ اگرچہ میں خود پسند کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو عام فہم الفاظ استعمال کئے جائیں، لیکن یہ بھی میں جانتا ہوں کہ علمی اور ادبی زبان بازاری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ اور علم و ادب فلسفہ و شعر و سخن کے لئے لازم ہے کہ زبان کا ذخیرہ بہت کافی و وافی ہو۔ اور اس لئے میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ جو الفاظ صدہا سال سے مقبول عام ہو گئے ہیں اُن کو اس وقت زبان سے خارج کیا جائے۔

چند دنوں کی بات ہے کہ ایک قانونی دستاویز میرے سامنے مشورہ کے واسطے رکھی گئی۔ یہ آٹھ دس صفحہ کی دستاویز تھی، مگر اس میں مشکل سے صرف دس پندرہ الفاظ ایسے تھے جن کو میں سمجھ سکتا تھا۔ باقی الفاظ کے سمجھنے کے لئے مجھے ایک ادھ صاحب کی امداد کی ضرورت ہوئی جو سنسکرت سے بخوبی واقف تھے۔ اس دستاویز میں "جائداد منقولہ" اور "غیر منقولہ" جیسے عام فہم الفاظ کے بجائے "چل سمپتی" اور "اچل سمپتی" درج تھے جن کو میں نے اپنے چالیس برس کے تجربہ میں کسی قانونی دستاویز میں آج تک نہیں پڑھا تھا۔ ایک اور لفظ ہے کہ جس کی طرف میں آپ کی توجہ دلاؤنگا۔ خزانچی کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کو صرف ضلع بجنور کے دیہاتی ہی نہیں بلکہ بلیا، بستی، اور گورکھپور کے اضلاع کے دیہاتی بھی سمجھ جائیں گے۔ مگر اس کے بجائے جو لفظ آجکل ایک طبقہ میں رائج کیا جا رہا ہے وہ "کوشادھیکش" ہے چنانچہ میں نے اپنے چند دوستوں کے سامنے دو ملازموں کو جن میں سے ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص ہے اور جو روزمرہ ہندی اخبار پڑھتا ہے بلایا اور کہا کہ "جاؤ کوشادھیکش، کو بلا لاؤ۔" یہ سنکر ملازم نے بار بار مجھ سے کہا کہ "میں سمجھا نہیں کہ آپ کس کو بلانا چاہتے ہیں۔" اس کے بعد اس ہی کے سامنے میں نے اپنے ایک عیسائی ملازم سے جو کہ گوا (Goa) کا رہنے والا ہے کہا کہ "جاؤ خزانچی کو بلا لاؤ۔" وہ یہ سنتے ہی فوراً میرے اُس محرر کو بلا لایا جو روپیہ پیسہ کا حساب رکھتا ہے۔ مجھے 'کوشادھیکش' کے لفظ پر اعتراض نہیں ہے ممکن ہے کہ پچاس ساٹھ برس بعد یہ لفظ مقبول عام ہو جائے۔ مگر یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کون سی ایسی قومی یا لسانی ضرورت لاحق ہوئی ہے جس کی بنا پر خزانچی جیسے عام فہم لفظ کو چھوڑ کر کوشادھیکش کو رائج کیا جا رہا ہے۔

اب میں اس کے مقابلہ میں ایک اور مثال دوں گا۔ لفظ تھرمامیٹر (Thermometer) اگرچہ انگریزی لفظ ہے، لیکن ہر متوسط طبقہ کے گھر میں یہ لفظ سمجھا جاتا ہے، مگر میں نے اپنے ایک مسلمان دوست کے ...

بجائے آلۂ مقیاس الحرارت، کہتے ہوئے سُنا۔ ممکن ہے یہ لفظ عرب میں اس وقت رائج ہو۔ لیکن ہندوستان میں تو میں اس کو اُردو کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جیسے کہ ہم نے ہزار ہا الفاظ عربی، فارسی سنسکرت اور ہندی کے اردو میں داخل کرلئے ہیں اسی طرح انگریزی کے الفاظ بھی ہماری زبان میں داخل ہوگئے ہیں اور وہ عام فہم ہوگئے ہیں۔ مثلاً اس صوبہ میں کلکٹر، کمشنر، جج، ہائیکورٹ، ریلوے، اسٹیشن، بائسکل، موٹر، ایسے الفاظ ہیں جو ہر شخص سمجھتا ہے۔ اور جو ہماری زبان میں جذب ہوگئے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے الفاظ کا ترجمہ عربی، فارسی، سنسکرت یا ہندی کے الفاظ میں کرنا زبان کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے۔ اور اس کی روز افزوں ترقی اور وسعت کو روکنا ہے۔

مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ ہندو ہندی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور نہ اس پر اعتراض ہے کہ مسلمان عربی یا فارسی پڑھتے ہیں مگر اس پر ضرور اعتراض ہے کہ اس زبان پر جس کی بنیاد ہندو اور مسلمان دونوں نے ڈالی ہے اور جس کی ترقی میں دونوں نے پچھلے زمانہ میں کوشش کی اور جس کو میں مشترکہ زبان ہندو اور مسلمانوں کی سمجھتا ہوں اُس کو ہندو اور مسلمان اپنی تنگ نظری اور تنگ خیالی کی وجہ سے تباہ کریں۔ میرے خیال میں اس میں ہندوؤں کی محض اس وجہ سے کہ اُن کی تعداد زیادہ ہے زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی طرف سے عملی طور پر اُردو کو کہ جس کو میں مشترکہ زبان سمجھتا ہوں خراب نہ کریں۔ اس زبان کا تعلق اُس تہذیب سے ہے جس کو نہ میں اسلامی تہذیب کہتا ہوں اور نہ ہندو تہذیب، بلکہ وہ ہندو مسلمانوں کی ایک مشترکہ تہذیب ہے جو مغلوں کے وقت میں پیدا ہوئی۔ اس تہذیب نے ہندو مسلمانوں کے درمیان ہم مذاقی کا لطف پیدا کردیا جو اب تک باوجود دیگر انقلابات کے قائم ہے۔

ہمیں یہ بات بھول نہ جانا چاہئے کہ اُردو کا یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر اور درحقیقت تہذیب کا مسئلہ ہے (میں اس لفظ تہذیب کو اس کے وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں) بس اکابران قوم کا فرض ہے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ اگر ہم نے یہ تہذیب مٹادی تو پھر اس کے بجائے کون سی تہذیب قائم کرنے کے لئے تیار ہیں؟

ہندوستان کی قومی زبان

ایک یا دو ——؟

(از آنریبل مسٹر سمپورنانند، وزیر تعلیم۔ یوپی)

ذیل کا مضمون ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم کا ہے۔ ہندی اُردو کے قضیہ میں آپ کے نام نامی کو جو خصوصیت حاصل ہے اُسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اس مضمون میں یہ فرمایا ہے کہ ہندوستانی زبان سے مراد وہ زبان ہے جسے شمال میں دہلی سے پٹنہ تک اور وسط ہند میں جبل پور اور جبل پور کے اطراف کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں۔ گویا آپ نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ زبان کا معیار وہی ہے جو پڑھے لکھے طبقہ میں رائج ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا ہے کہ ہماری اس زبان کو کسی نے جبراً ہم پر تھوپا نہیں ہے بلکہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے یہ قدرتی طور پر ہماری زبان بن گئی ہے۔ آپ نے اس کی تدریجی ترقی پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ چندر، بردائی، کبیر، سور، تلسی اور ودیاپتی کی زبان ہی ترقی کرتے کرتے آہستہ آہستہ میر، ذوق، اور غالب کی زبان بنی ہے۔ لیکن بعد میں آپ نے زبان کے دو ٹکڑے کرکے میر و ذوق کو ایک طرف اور سور اور تلسی کو دوسری طرف کھڑا کردیا ہے۔

آپ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بیچ میں یہ طریقہ چل پڑا کہ جس زبان میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ ملے ہوئے ہوں اُسے ہندی کہا جائے اور جس میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہو اُسے اُردو کہا جائے لیکن یہ بتانے سے احتراز کیا ہے کہ اس طریقہ کو چلانے کی ذمہ داری کس پر ہے یعنی وہ کون سی تحریک تھی جس نے ہندوؤں میں چکبست، پریم چند اور رتن ناتھ سرشار جیسے لوگوں کو پیدا کرنا بند کردیا۔ آپ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ آجکل سیاسی یا مذہبی بنیادوں پر ایسے الفاظ کا استعمال بھی ہوتا ہے جو عام طور پر نہیں بولے جاتے لیکن اس کی ذمہ داری آپ نے ہندی بولنے والوں کے ساتھ ساتھ اُردو بولنے والوں پر بھی ڈالی ہے حالانکہ اگر اُردو ہندی کے گذشتہ پچاس سالہ لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُردو لکھنے والے روز بروز عام فہم زبان لکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہندی لکھنے والے دن بدن زبان کو سنسکرت بناتے چلے گئے۔ اور اب بھی جو لوگ سازش کو سازش کہتے ہیں وہ آج نہیں آج سے پچاس برس پہلے بھی یہی لفظ بولتے تھے۔ البتہ اب ایک طبقہ نے "مت بھید" بولنا شروع کیا ہے، اس لئے یہ فیصلہ کچھ مشکل نہیں کہ سیاسی اور مذہبی باتوں کا خیال کس طرف پایا جاتا ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ پرانی اُردو یا پرانی ہندی کے حامی ہیں وہ ملک کی ادبی ترقی کے دشمن ہیں لیکن شاید اس پر غور نہ فرمایا کہ ہندی نام ہی اُس زبان کا ہے جو روز بروز پیچھے کی طرف لیجائی جائے۔ حالانکہ اُردو لٹریچر کا اگر سرسری مطالعہ بھی کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پچاس برس پہلے کی جو اُردو تھی وہ آج بالکل بدل گئی ہے۔ لیکن ہندی روز بروز سنسکرت کی طرف دوڑی چلی جارہی ہے۔

آخر میں آپ نے فرمایا ہے کہ ہمیں سنسکرت کے الفاظ بھی ہم معنی الفاظ کے طور پر زبان میں لے لینا چاہئیں۔ حالانکہ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ اس وقت سوال دس بیس مرادف الفاظ کا نہیں بلکہ زبان کے سارے کے سارے الفاظ کا ہے۔

اگرچہ شروع میں آپ نے ہندوستان کی قومی زبان وہ زبان قرار دی ہے جو شمال میں دہلی سے پٹنہ تک اور وسط ہند میں جبل پور کے پڑھے لکھے حلقوں میں بولی جاتی ہے لیکن آہستہ آہستہ آپ نے اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ ہندوستانی زبانیں دو ہیں۔ ایک وہ جسے ہندو بولتے ہیں اور دوسری وہ جسے مسلمان بولتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون آپ نے غالباً مسلمانوں کی ہندوستانی میں لکھا ہے۔ اپنی اس رائے کو آپ نے یوں ثابت کیا ہے کہ مسلمان بچہ ابتدا ہی سے عربی فارسی کے الفاظ سنتا ہے اور ہندو بچہ سنسکرت کے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتلایا کہ یہ اختلاف گذشتہ بیس پچیس سال ہی سے کیوں ہوا۔ اس سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں تحریر و تقریر ہر لحاظ سے ایک ہی زبان کیوں بولتے تھے۔

بہرحال اس مضمون کے مطالعہ سے موجودہ ہندی تحریک کے ایک سب سے بڑے ذمہ دار رہنما کے خیالات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ (ایڈیٹر)

کوئی بھی ملک ہو اس کی قومی زبان تو وہی زبان ہوسکتی ہے جسکو وہاں کے زیادہ تر رہنے والے سمجھتے اور بولتے ہوں۔ اسی زبان کو ملک کی سرکاری اور عدالتی زبان ہونے کا بھی حق ہے۔ مگر کبھی کبھی حکومتیں اس قدرتی حق کو ٹھکرا کر کسی دوسری زبان کو یہ درجہ بخش دیا کرتی ہیں بلکہ یہ بھی اُمید کرتی ہیں کہ اُن کی سرکاری زبان ملک کی قومی زبان بن جائیگی۔ اس کی مثالیں ہمارے ملک کی تاریخ سے بھی مل سکتی ہیں۔ پٹھان اور مغل بادشاہوں کا فارسی کو درباری اور عدالتی زبان بنانا اور انگریزوں ... ی کو دفتروں، عدالتوں اور تعلیم گاہوں میں رائج کرنا اسی قسم کی کوششیں ہیں۔ یہ کوشش عموماً ناکامیاب ہوتی ہے۔ مگر سرکاری زبان رعایا کی زبان پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔

ہماری ملکی زبانوں میں ہندوستانی زبان ہی (جس سے میری مراد اُس زبان سے ہے جسے اُتری ہندوستان یعنی دہلی سے پٹنہ اور دکھن میں جبلپور تک پڑھے لکھے آدمی بولتے ہیں) قومی زبان ہوسکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ زبان آپ ہی آپ قومی زبان بن گئی ہے۔ اس کو قومی زبان بنانے کی کچھ کوشش ضرور ہوئی ہے۔ آریہ سماج، ریاست حیدرآباد، ہندی ساہتیہ سمیلن اور کانگریس نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمت

بھکاری؟

(از جناب عرش تیموری شیانتی نکیتن)

"سفر میں کاٹے ہیں سب زندگی کے صبح و مسا
کہ تیرے واسطے لوں تیری خلق سے تحفہ
پھر برسے عیش کے اُڑتے ہیں کاخ و ایواں پہ
گماں بہشت کا ہوتا ہے ساز و ساماں پر
ترے خلیفہ، ترے بندے، زادگانِ خاک
ترے "فرشتۂ سرکش" کی طرح ہیں بیباک
کہ تجھ سے رحم کے خواہاں ہیں اور خود بے رحم
یہ بندگانِ خدا ہو رہے ہیں بندۂ وہم
غریب و مفلس و بیکس سے ہے جدا یہ قوم
ہے بھوکے بھیڑیوں کی طرح بے وفا یہ قوم"
یہ شکوہ کر ہی رہا تھا خدا سے اک سائل
کہ اک امیر نے سن کر کہا کہ "او جاہل!
خدا کے نام پہ رسم سوال جاری ہے!
تو کیا خدا بھی تری طرح سے بھکاری ہے"

کی ہے۔ مگر دراصل یہ زبان کچھ تو اپنی خوبیوں اور کچھ تاریخی واقعوں کی بدولت ہی اس درجہ پر پہنچ گئی۔ یوں اس ملک میں کچھ اور زبانیں (مثلاً تامل) بھی ہیں جن کا لٹریچر اچھا ہے۔ مگر کسی زبان کا خزانہ اتنا بھرپور نہیں ہے۔ ہزار سوا ہزار برس ہوئے سنسکرت کا سہرا اس کے سر پر چڑھا۔ بڑے بڑے فقیروں اور شاعروں مثلاً چند بردائی، کبیر، سور، تلسی، ودیاپتی، کیشو، ملک محمد جائسی، رحیم، بھوشن، سکھان، نانک، پدماکر، آتش، میر، ذوق، غالب، سودا، داغ، ہریشچندر، نسیم، وغیرہ نے اپنے خیالات کا اس کے ہی ذریعہ سے اظہار کیا۔ اس خطہ میں ہندوؤں کے بڑے بڑے تیرتھ ہیں۔ لہٰذا لاکھوں آدمی ہر سال یہاں آتے ہیں اور کچھ نہ کچھ یہاں کی زبان اپنے ساتھ ملک کے کونے کونے تک لیجاتے ہیں۔ یہی صوبہ آج ہزاروں برس سے شہنشاہیت کا مرکز رہا ہے۔ اس نے موریا اور شنگ، گپت اور ہرش وردھن، پٹھان اور مغل اور سلطنتوں کا عروج اور زوال دیکھا ہے۔ یہی وہ کھنڈر ہیں جو پانڈوؤں کی شان و شوکت کی شہادت دیتے ہیں۔ یہیں دہلی اور آگرہ کے قلعے ہندوستان کی اس عظمت کی یاد دلاتے ہیں جو چراغ سحری کی طرح بجھ کر پھر روشن نہ ہوئے۔ یہیں آج بھی ہندوستان کے بدیشی حاکموں کا دار السلطنت ہے، اس لئے یہاں کے تمدن، یہاں کی تہذیب اور یہاں کی زبان کا سارے ملک میں پھیل جانا ایک قدرتی بات تھی۔ اس لئے اگر کوئی زبان یہاں کی ملکی زبان ہونے کی اہلیت رکھتی ہے تو وہ یہ ہندوستانی زبان ہی ہے۔

اس زبان کے لئے یہ نام نیا ہے۔ دراصل اس کا نام کیا ہونا چاہئے اس کی بابت دو قسم کی رائیں سنی جاتی ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اسے ہندی کہنا چاہئے تھا، ملک کی زبان میں غیر ممالک کے الفاظ کے مل جانے سے اس کا نام نہیں بدلا کرتا۔ ہزاروں فرنچ اور لاطین اور گریک لفظ کے باوجود بھی انگلستان کی زبان انگریزی ہی کہلاتی ہے۔ عربی الفاظ کے اس میں داخل ہونے پر بھی ایران کی زبان ایرانی یا فارسی کہلاتی ہے۔ برما سے پورب کی طرف سیام کی زبان میں قریب ۴۰ فیصدی سنسکرت کے الفاظ ہیں، مگر وہ زبان سیامی ہی کہلاتی ہے۔ اسی طریق پر ہماری زبان کو بھی چاہے اس میں کتنے ہی غیر ہندی لفظ شامل ہوں ہندی کہنا ہی مناسب تھا۔ مگر بیچ میں یہ دستور چل پڑا کہ اگر اس زبان میں سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ کچھ زیادہ استعمال کئے جائیں تو اسے ہندی کہا جائے۔ اور فارسی عربی کے الفاظ اگر کچھ زیادہ استعمال کئے جائیں تو اُردو کہا جائے۔ اسی عصبیت سے بچنے کے لئے ہندوستانی نام رائج کیا جا رہا ہے اور میں بھی اسے بحالت مجبوری منظور کرتا ہوں۔

زبان کے الفاظ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی کی صورت کیا ہو۔ محض اتنا کہنا کافی نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی وہ زبان ہے جسے یہاں کے عوام بولتے ہیں۔ اگر عوام سے مطلب دیہات کے لوگوں سے ہو تو یہ ماننا ہوگا کہ سب جگہ دیہاتوں میں ایک ہی طرح کی بولی رائج نہیں ہے۔ بلیا، بنارس، لکھنؤ، الہ آباد، جھانسی، متھرا، میرٹھ اور گڑھوال میں مادہ ایک ہوتے ہوئے بھی فعلوں تک کی صورتوں میں فرق ہے۔ پھر ان لوگوں کی بول چال کا مضمون بھی معمولی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی خاص ادبیت نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم کو پڑھے لکھوں کی زبان کی طرف ہی توجہ دینی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ سب پڑھے لکھے آدمی سب کاموں کے لئے ایک ہی قسم کے الفاظ سے کام نہیں لیتے۔ عدالتی کاموں کے لئے بھی لوگ مدعی، مدعا علیہ وغیرہ لفظوں سے کام لیتے ہیں۔ روزگاری باتوں میں بہی کھاتہ، درشنی ہنڈی وغیرہ لفظ مستعمل ہوتے ہیں۔ دقت اُس وقت پڑتی ہے جب سیاسی یا فلسفی یا سائنس سے تعلق رکھنے والے مضامین یا ادبی مضامین پر لکھنا بولنا ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کچھ لوگ تو سنسکرت اور کچھ لوگ عربی فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں اس میں کبھی کبھی تصنع بھی ہوتا ہے۔ اپنی قابلیت دکھلانے یا مذہبی یا سیاسی تعصب کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے مگر بسا اوقات تو یہ بات فطرتی طور پر ہی ہوتی ہے مسلمان بچہ شروع سے عربی فارسی کے لفظ سنتا ہے۔ شادی، غمی، روزہ، نماز، زکوٰۃ، میلاد ہر موقعہ پر ایسے لفظوں کو سنتا اور بولتا ہے۔ وہ ان لفظوں سے بھری ہوئی زبان کو ہی درست اور عام فہم سمجھنے لگتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بچپن سے سنتے سنتے ہندو بھی سنسکرت آمیز زبان کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ وہ مسلمان اس ہندو کی زبان کو اور یہ ہندو اس مسلمان کی زبان کو بناوٹی تصور کرتا ہے۔

دو زبانیں

آخر اس کا کیا علاج ہے؟ ایک تو جاہلوں کا طریقہ ہے کہ جہاں کوئی ہندو اپنے طریقہ پر بولے مسلمان ٹوک دیں اور کہیں کہ ہم آپ کی بات نہیں سمجھتے ہندوستانی بولئے۔ ادھر مسلمان کو روک کر ہندو ایسا ہی کہنا شروع کر دیں۔ لیکن یوں تو معاملہ کبھی بھی حل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا طریقہ کمزوری کا ہے یعنی زبان میں سے چن چن کر عربی فارسی یا سنسکرت کے لفظ نکال دیئے جائیں۔ تیسرا طریقہ وہ ہے جس کو میں پسند کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میں دونوں کو ہندوستانی سمجھتا ہوں۔ یکم فروری کے مدینہ میں ایک صاحب نے منظوم شکایت پیش کی ہے کہ اردو کی جگہ ہندی کے لفظ زبردستی رکھے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی زبردستی کرنا چاہتا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ ساتھ ہی اگر کوئی یہ کہنا چاہتا ہے کہ زبان میں کسی خاص معنی میں کوئی ایک ہی لفظ رہے گا خواہ وہ سنسکرت سے نکلا ہو یا عربی فارسی سے، تو یہ اس کی حماقت ہے۔ اسی نظم میں دی ہوئی مثالوں کو لیکر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں تو علم اور ودّیا، تعلیم اور شکشا، رسم و رواج اور پرتھا، انتظار اور پرتیکشا دونوں کو ہی ہندوستانی مانتا ہوں۔ یہ کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ فلاں صاحب اپنی تقریر یا تحریر میں ایسی زبان بول جاتے ہیں جس کو بہت سے ہندو نہیں سمجھتے ہیں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ بہت سے مقررین اور نامہ نگاروں کی اردو ایسی ہوتی ہے کہ اسے بہت سے مسلمان نہیں سمجھ سکتے۔ مگر یہ مسئلہ یوں طے نہ ہوگا۔ آخر انگریزی میں فرنچ، گریک اور اینگلو سیکسن سے نکلے ہوئے ایک ہی معنی کے کئی لفظ مستعمل ہوتے ہیں یہی ہم کو بھی کرنا ہوگا۔ اس سے ادب کو ترقی ہوتی ہے۔ کسی مضمون میں بار بار ایک ہی لفظ کو دُہرانے کے مقابلہ میں مختلف لفظوں کے استعمال کرنے سے زبان کی خوبصورتی بڑھتی ہے۔

اس سلسلہ میں اُن لوگوں کی جو اخبار نویس یا سیاسی جماعتوں کے لیڈر ہیں بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ آواز اٹھانا کہ ہندی یا اُردو پر حملہ ہو رہا ہے غلطی ہے۔ جو لوگ پرانی ہندی یا پرانی اردو کے حامی ہیں وہ ملک کی ادبی ترقی کے دشمن ہیں۔ ہم کو تو اس ہندوستانی کی ترقی کرنی ہے جس میں دونوں دھاریں ملتی ہیں اور ملکر ایک ہو جاتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستانی کی ترقی میں اس وقت سب سے زیادہ مدد وہ لوگ دے سکتے ہیں جو سنسکرت اور فارسی دونوں سے واقف ہیں۔

کیفیات!

(از جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی)

قفس والوں سے مٹ جائے نزاعِ آشیاں اب بھی
اگر زنداں کا رُخ ہو جائے سوئے گلستاں اب بھی

مزاجِ حسن میں کچھ ہیں تلون کیشیاں اب بھی
اگر یہ جھوٹ ہے، تو عشق کیوں ہے سرگراں اب بھی

تصور میں کیا کرتا ہوں سیرِ دو جہاں اب بھی
پہونچ جاتی ہیں نظریں ماورائے آسماں اب بھی

نہ ہنس اے آسماں کے چاند حالِ زارِ مسلم پر
ہلا سکتا ہے یہ نعروں سے اپنے آسماں اب بھی

میں ہوں وہ بندۂ آزادِ گلشن جب گذرتا ہوں
تو جُھک کر سجدہ کرتی ہیں چمن کی ڈالیاں اب بھی

یہ لاکھوں بار ٹھکرایا گیا ہے اُن کی محفل میں
دلِ ناکام کو ہے جرأتِ عرض و بیاں اب بھی

بنا رکھی ہے دوشِ برق پر تو کیا ہوا ہمدم
مری نظروں میں ناقص ہے نظامِ آشیاں اب بھی

سلامت ذوقِ سجدہ، دیر ہے تو سر کے جُھکنے کی
جبینِ شوق کر سکتی ہے پیدا آستاں اب بھی

گمان و وہم میں بھی اب نہیں دنیا و مافیہا
قیامت ہے جو وہ ہو جائیں مجھ سے بدگماں اب بھی

مرا اُس شاخ کی رفعت پر اب تک آشیانہ ہے
جہاں سے لوٹ آتی ہے نگاہِ باغباں اب بھی

بساطِ دہر کیا، دونوں جہاں کو پھونک سکتا ہوں
مری ہستی میں پوشیدہ ہیں وہ چنگاریاں اب بھی

اُٹھا لاؤ، میں اُس سے اک نیا گلشن بنا دوں گا
یہیں ہوگی کہیں موجود خاکِ آشیاں اب بھی

شفق کے سُرخ ...
پہونچتی ہے فلک پر باغ والوں کی اذاں اب بھی

ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک خونخوار، ظالم اور

ہندوستان میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی

اور اس کے نتائج

(از آنریبل ڈاکٹر سید محمود۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ وزیر تعلیم صوبہ بہار)

ہندوستانی تعلیم، ذریعۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کا موضوع آنریبل ڈاکٹر سید محمود کا خاص موضوع ہے۔ آپ کی مصروف علمی زندگی کا بیشتر حصہ ان ہی مسائل کی اُدھیڑ بُن میں صرف ہوا ہے اور جب سے آپ کی وزارت تعلیم کی مسند پر آپ جلوہ افروز ہوئے ہیں آپ کے خیالات نے عملی جامہ پہننا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ آئین جدید کے ناقص اور ادھورے اختیارات کی مدد سے کسی بنیادی تبدیلی کا کرنا تو ممکن نہیں مگر پھر بھی جو کچھ کام اس آئین کے محدود دائرہ میں رہ کر کیا جا سکتا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں پوری طاقت کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔ ذیل کے مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت موثر و پر زور زبان میں یہ ثابت کیا ہے کہ انگریزی کی موجودہ تعلیم نے ہماری روحانی بصیرت کو فنا کر دیا ہے۔ اس تعلیم نے ہم سے ہماری جدت تخلیق چھین لی ہے، ہم دوسروں کا جھوٹا کھاتے ہیں اور دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے چباتے ہیں۔ اس تعلیم نے ہم کو دوسروں کے دسترخوان پر مہمانوں کی طرح نہیں بلکہ بھکاریوں اور غلاموں کی طرح بٹھا رکھا ہے اور اگر ہم نے جلد ہی اس غلام ساز تعلیمی پالیسی میں مناسب ترمیمیں نہ کیں تو ہم اپنی جودت فکر، جدت پسندی، ذاتی اُپج اور جوش و اُمنگ سب کو خیرباد کہہ دیں گے۔ (ایڈیٹر)

غلامی دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ہندوستان کے مسائل کا اُلجھاؤ اسی مصیبت کے سبب ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے۔ ہندوستان کا سب سے خطرناک روگ یہی ہے کہ اس کی قسمت کا قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا خط تقدیر اعداء کی سنگینوں کی نوک سے لکھا جاتا ہے جب سے ہندوستان بدیسیوں کے ماتحت ہوا ہمارا سارا نظام زندگی درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

ماہرین حیات انسانی اس بات کو اچھی طرح بیان کر چکے ہیں کہ ہماری زندگی کے مختلف مسئلے آپس میں ایک دوسرے سے ملے جُلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کا تعلیمی مسئلہ، ہمارے معاشی، معاشرتی، سماجی، اور سیاسی مسئلوں سے وابستہ ہے۔ مختلف مسائل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی ایک مسئلہ کو علٰحدہ طور پر سلجھایا نہیں جا سکتا۔ ہر وہ ملک جو کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اس کے قومی اور سماجی مسئلوں میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا تعلیمی نظام ملک کے دوسرے نظاموں سے علٰحدہ اور غیر آہنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ بد ترتیبی صرف تعلیمی نظام ہی کے ساتھ محدود نہیں۔ ہمارے سارے قومی مسئلے انگریزی عہد میں بد ترتیب، غیر مربوط اور بے میل ہو کر الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ ابتدائی غلطی کے سبب تمام مسئلوں میں ایسی گرہیں اور ایسی گتھیاں پڑ گئی ہیں کہ ان کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں۔ ہمارے تعلیمی نظام کی نیو ایسی غلط پڑی کہ اوپر اُٹھنے والی دیوار کج ہو کر سماج کے لئے خطرناک ہو گئی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ میکالے نے ذریعہ تعلیم کو بدیسی زبان یعنی انگریزی قرار دے کر تعلیمی وسعت اور پھیلاؤ کے لئے زہر بویا، بلکہ ساری تعلیمی اسکیم ہی جو انگریزوں نے ہندوستان میں جاری کی وہ ناقص، بے میل اور غیر فطری تھی۔ انگریزوں کی بے جوڑ، غیر ضروری بلکہ بعض لحاظ سے مہلک تعلیمی پالیسی کا افسوس ناک انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ موجودہ زمانہ کے انگریز اہل نظر اور صاحبان رائے بھی ہمارے تعلیمی نظام کے غیر فطری اور بے نتیجہ ہونے کے قائل ہیں۔ سر کورٹنی ٹیری آنجہانی سابق چیف جسٹس پٹنہ ہائیکورٹ نے ایک دفعہ پٹنہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے خطبہ میں کہا تھا کہ ہماری یونیورسٹیاں فارغ تعلیم طلبا نہیں بلکہ چلتی پھرتی مصیبتیں (Walking Calamities) پیدا کرتی ہیں۔ اور اب تو یہ روگ دن بدن نمایاں تر ہوتا جاتا ہے۔ ہماری ساری تعلیمی کوششیں لاحاصل اور رائیگاں ہو رہی ہیں۔ سرکاری تعلیمی کمیشنوں کی رپورٹوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صرف بیکاری (Unemployment) ہی کا رونا نہیں بلکہ ماتم تو یہ ہے کہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے نتیجہ میں ہندوستان کی درسگاہوں سے اچھے شہری بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

تریاق کے بجائے زہر

اس موقع پر ایک بات اور بیان کر دینی چاہتا ہوں بعض حضرات یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ اسی موجودہ تعلیم کی برکت ہی سے تو ہندوستان کے دور حاضر کی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ یہ استثنا ہیں اور استثناؤں سے ہی کُلیہ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر انگریزوں کی تعلیمی پالیسی نے ہندوستان کو سخت نقصان پہنچایا اور اسی پالیسی کی پیدا کردہ محکومانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ حقائق ہمیں نظر نہیں آتے۔ اسی تعلیم نے ہماری روحانی اور ذہنی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ اگر ہمارا تعلیمی نظام صالح ہوتا تو ہمارا ملک خالص علمی میدان میں بھی ان ممالک سے پیچھے نہ رہتا جنھوں نے ہم سے بعد عصری (Modern) تعلیم کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ مصر، ترکی، اور جاپان کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جاپان نے تیس چالیس سال کے اندر اندر وہ ترقی کر لی کہ اہل یورپ بھی اس پر رشک کر رہے ہیں۔ جنگ عظیم کے بعد کی ترکی اور روس کی ترقیاں ساری دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کئے ہوئے ہیں لیکن بدنصیب ہندوستان سو سال کی تعلیمی پالیسی کے باوجود ابھی تک جہاں سے چلا تھا تقریباً وہیں ہے۔ تعلیم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ملک کے محض پانچ فیصدی باشندے پڑھے لکھے ہیں۔ اونچی تعلیم کا ذکر چھوڑیئے، سائنس اور صنعت کی ایجادوں کو بھول جائیے معمولی لکھنے پڑھنے کے لحاظ سے بھی ہمارا ملک اب تک جاہل ہے۔ علم و دانش کا چرچا اور سائنس و حکمت کی ترقی تو محض خواب و خیال ہیں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی تریاق ہونے کے بجائے زہر ثابت ہوئی۔ اسی بدانجام پالیسی نے ہمارے ملک کو ذلت اور پستی کے گڑھے میں گرا دیا ہے اور غلامی کی زنجیروں کو سخت سے سخت تر کر دیا ہے۔ فقر و فاقہ، جہالت، نکبت، افلاس، کم ظرفی، کوتاہ نظری، فرقہ پروری، خود فراموشی، اغیار پرستی، سب کی سب انگریزوں کی جاری کی ہوئی تعلیمی پالیسی کی برکتیں ہیں۔

کسی ملک کی تعلیمی پالیسی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ملک کی قومی سماجی، معاشی، اخلاقی، ذہنی اور روحانی ضروریات کے مطابق ہو۔ ملک کی تعلیمی تنظیم اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے آگے بڑھتے والے نظاموں کے ساتھ اچھی طرح مربوط ہو۔ پوری مشین کے اندر وہ ایک چلتا پرزہ ہو۔ تعلیم کو قومی مطالبے (National Demand) کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تعلیمی نظام یا تو ناکافی اور نامکمل ہوگا یا بیکار اور رائیگاں۔ ان دونوں صورتوں میں بد ترتیبی اور زوال لازمی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر تعلیمی نظام اور دوسرے ملکی اور ملی نظاموں میں ہم آہنگی اور توازن قایم ہو جائے تو عروج اور ترقی یقینی ہے۔ قومی مطالبے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے مقدم اقتصادی اور معاشی مطالبہ ہے، اس کے بعد روحانی، معاشرتی اور ذہنی مطالبے ہیں۔ قومی اور ملی روایات کا خیال بھی ضروری ہے لیکن اس کے معنی فرسودگی اور اسلاف کی کورانہ تقلید نہیں۔ زندگی ایک دریائے رواں ہے، ایک چڑھتی ہوئی ندی ہے۔ حیات انسانی چوکھٹے میں لگی ہوئی تصویروں کی طرح ساکت و جامد نہیں بلکہ فلم کی طرح رواں و رقصاں ہے۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی!

زندگی ہر آن نئی صورتوں کو سامنے لاتی ہے اور نئے مطالبے پیش کرتی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کو زندگی کے نت نئے مطالبوں کو پورا کرتے رہنا چاہئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہماری تعلیمی پالیسی ترقی پسند اور آگے بڑھنے والی (Progressive) ہو۔ اسے متحرک (Dynamic) ہونا چاہئے۔ کیونکہ زندگی حرکت کا نام ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی محض سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے جاری کی گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کے معاشی، روحانی اور ذہنی مطالبوں کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں۔ انگریز اپنے دفتروں کے لئے معمولی قسم کے اہلکار اور کرانی (Clerks) اور اپنی صنعتی پیداواروں کے لئے ایک نیم مغربی طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ ولایت سے آئے ہوئے مالوں کی کھپت ہو سکے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ ہندوستان میں انگریز تاجرانہ مقاصد لے کر آئے اور اس کے بعد انہیں قیام حکومت کا شوق ہوا۔ اور وہ بھی اسی لئے کہ

حکومت کے سہارے تجارت کو فروغ دیا جائے۔ انگریزوں کی جاری کی ہوئی تعلیمی پالیسی، اُن کی دوسری پالیسیوں کی طرح، تاجرانہ سامراجیت (Commercial Imperialism) کے مقاصد کی تکمیل کے لئے تھی۔ یہ پالیسی سستے، بے زبان اور محکومانہ ذہنیت رکھنے والے کلرک پیدا کرنا چاہتی تھی اور ہندوستان میں ایک ایسے طبقہ کی پیدائش کی خواہشمند تھی جو مغرب زدہ ہو جائے تاکہ وہ مغربی مال خریدے اور فیشن ایبل بنکر اکڑتا پھرے۔ اور ملک میں یہی معیار قائم کر دے۔ ہندوستان کے اسکول اور کالج ایسے کارخانے تھے جہاں سستے داموں کے اہلکار اور ولائتی مال کے خریدار بنائے جاتے تھے۔ اور اب تک کم وبیش بنائے جاتے ہیں۔ نئی روشنی کے شیدا نقلی قسم کے صاحب بہادر بھی ان ہی فیکٹریوں میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ یہ پالیسی استحصالی (Policy of Exploitation) تھی اور ہے۔

ہم دوسروں کا جھوٹا کھاتے ہیں

ظاہر ہے کہ جو نظام تعلیم اس نیت اور ارادہ سے جاری کیا جائے اُس میں تو ادن کہاں ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کا رائج کیا ہوا نظام تعلیم ہندوستان کے دوسرے نظاموں سے میل نہیں کھاتا۔ یوں تو یہاں کے سارے نظام بے جوڑ اور ابتر ہیں۔ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی ہمارے قومی مطالبوں کو پورا نہیں کرتی۔ نہ معاشی مطالبوں کو اور نہ روحانی و ذہنی مطالبوں کو۔ اکثر موقعوں کے لئے یہ ناکافی اور نامکمل ہے اور کہیں کہیں رائیگاں اور لاحاصل۔ یہ متحرک اور ترقی پسند بھی نہیں بلکہ رجعت پسند اور فرسودہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ملک کی معاشی بدحالی اور افلاس ہے، نیز قومی اور ملی روح کی تباہی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ جاپان اتنی قلیل مدت میں سائنس انجینرنگ، معاشیات، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت وغیرہ کی تعلیم میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ روس کتنی منزلیں طے کر چکا لیکن ہندوستان سَو سال سے کولھو کے بیل کی طرح جہاں سے چلا تھا وہیں ہے۔ اب روحانی و ذہنی تعلیم کو لیجئے۔ فلسفہ، اخلاق، تہذیب، تمدن، شاعری، موسیقی، مصوری، ادب وغیرہ کی تعلیم بھی کتنی ناقص اور غیر فطری طور پر ہو رہی ہے بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ یہ تعلیم تعلیم ہی نہیں کہی جا سکتی۔ ہماری روحانی اور ذہنی پیداوار بین الاقوامی مقابلہ میں کتنی پست دکھائی دیتی ہے۔ ایک دو مشہور آدمی کو چھوڑ کر مجموعی پیداوار کو دیکھئے تو وہ مبتذل نظر آئے گی۔ معیار پست ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ ہماری بنیادوں میں زہر ملایا گیا تھا۔ ہم دوسروں کا جھوٹا کھاتے ہیں اور چبائے ہوئے نوالے دوبارہ چباتے ہیں۔ ہماری روحانی بصیرت کو انگریزوں کی تعلیمی پالیسی نے فنا کر دیا ہے۔ ہماری ذہنیت ہر شعبۂ زندگی میں غلامانہ ہو گئی ہے۔ ہم اپنی روایات، اپنی تہذیب وتمدن، اپنے فلسفہ، اپنے ادب سے بیگانہ رہ کر دوسروں کے دسترخوان پر مہمان کی حیثیت سے نہیں بٹھائے گئے بلکہ گداگروں اور غلاموں کی طرح۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصری (Modern) علم وحکمت، فلسفہ وادب تہذیب وتمدن سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ہم ترقی کی روح سے آشنا نہیں ہوئے بلکہ تقلید سے آشنا کئے گئے۔ اس بے روح تعلیمی پالیسی، اس بے جان تعلیمی نظام کے مہلک اثرات نے ہندوستانیوں کی جدتِ تخلیق فنا کر دی۔

ہماری روحانی بصیرت کا گلا گھونٹ دیا گیا

اس زہرناک تعلیمی پالیسی کے تحت ہم اپنے علم وادب سے ناواقف رکھے گئے۔ اور اغیار کے علم وادب کی تلاوت محض طوطے کی طرح کرتے رہے اور ہمیں کچھ نہ آیا اور نہ آ سکتا تھا۔ ہم اپنے فلسفہ وحکمت، اپنے اخلاق ومذہب سے بھی بیگانہ رہے۔ اور ہمیں جو کچھ سکھایا گیا محض کورانہ طور پر۔ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی بے میل ہونے کے سبب نہ تو ہمارے علم کی پیاس کو بجھا سکی اور نہ ہمارے پیٹ کی بھوک کو دور کر سکی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس پالیسی کے نتیجے میں ہم انگریزی سامراج کے استحصالی مظالم کے شکار ہوتے رہے۔ اس تعلیم کے ذریعہ ہماری قومی وملی صلاحیتوں کو مٹایا گیا۔ ہمارے معاشی ذرائع کو تباہ کیا گیا۔ اور ہماری روحانی زندگی کا گلا گھونٹا گیا۔ ہماری صنعتیں مٹیں۔ ہماری زبان بے مایہ ہوئی اور ہماری روحیں مضمحل کی گئیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے سچ کہا ہے۔

یوں قتل سے اولاد کے بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ہندوستان کی تاریخ میں وہ دن کتنا منحوس تھا جب میکالے نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہوگی۔ غیر ملکی زبان میں تعلیم وتعلّم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملکی زبانوں سے لوگوں نے غفلت برتنی شروع کی۔ اور ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ نہ ہو سکا۔ ہم میں نقّالی اور اغیار پرستی کی روح پرورش پانے لگی اور جدتِ طبع سے ہم محروم ہو کر رہ گئے۔ خواندگی کی تحریک جو عصری رجحانات کے ماتحت ساری دنیا میں بڑھ رہی تھی وہ ہمارے ملک میں پنپ نہ سکی اور ہمارا ملک اَن پڑھ کا اَن پڑھ ہی رہا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ اُن پڑھ ہو گیا۔ کیونکہ ملکی زبانوں اور ملکی علوم کی قدر وقیمت نہ رہی۔ سائنس اور دوسرے علوم حاضر کی ترقی بھی ناممکن ہو گئی۔ کیونکہ غیروں کی زبان ہمارے لئے پُر تصنع تھی اور غیر فطری جس طرح دوسروں کے ہاتھ سے کھانے میں مزہ نہیں آتا بالکل ویسے ہی دوسروں کی زبان کے ذریعہ ہمیں علوم کا لطف نہیں ملتا۔ غیر زبانیں ہماری روح کو اتنا متاثر نہیں کرتیں جتنا اپنی زبان کرتی ہے۔ لہٰذا بدیسی زبان میں تعلیم دی جانی سخت مضر ثابت ہوئی۔ غیر زبان ہماری روح کے لطیف ترین اجزا کو چھو نہیں سکتی۔ لہٰذا یہ بدیسی ذریعہ تعلیم ملک میں تعلیم عامہ اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کا محرک نہ بن سکا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک میں اختلافِ زبان کی وجہ سے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ یہ عذرِ لنگ ہے۔ کم از کم شمالی ہند کے ایک بہت بڑے حصہ میں ہندوستانی زبان رائج تھی اور اسے آسانی کے ساتھ ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا تھا۔

آپ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا سب سے خطرناک اور مہلک نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو اس قسم کی غلط، بے بنیاد اور مبالغہ آمیز تاریخیں پڑھائی جانے لگیں جن سے فرقہ وارانہ ذہنیت اور منافرت کے زہریلے اثرات دماغوں میں پیدا ہو گئے۔ غلط، نیم غلط اور اکثر بے بنیاد تاریخی واقعات کی تعلیم ہماری تعلیم گاہوں میں پلیگ کے کیڑوں کی طرح تباہی وبربادی پھیلا رہی ہیں۔ ملک کے مختلف فرقوں میں منافرت کی ترویج ان ہی سے ہوئی ہے۔ اسمتھ نے اپنی تاریخ ہند انڈیا آفس (Indian Office) کے اشارے اور امداد سے لکھی۔ اور وہی کتاب ہندوستان میں اسکولوں اور کالجوں کی تاریخ کا ماخذ قرار پائی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمان جو صدیوں کے تعلقات اور ہمسائیگی کی وجہ سے بہت حد تک متحد ہو چکے تھے آہستہ آہستہ علیٰحدہ ہونے لگے اور اب ان دونوں جماعتوں کے درمیان منافرت کی خلیج اس قدر وسیع ہو گئی ہے کہ اس کا پاٹنا کوئی آسان کام نہیں۔ اسکولوں اور کالجوں سے جو ہندو بچے یہ غلط اور منافرت انگیز تاریخیں پڑھ کر نکلتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک خونخوار، ظالم اور وحشی قوم ہے جس کا کام فقط قتل وخون، غارتگری اور مندروں کو لوٹنا ہے۔ وہ یہ بالکل نہیں جانتے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں رہ کر اسے کیسی کیسی علمی، ذہنی، تمدنی، معاشرتی دولتوں سے مالامال کر دیا۔ اسی طرح مسلمان بچے ہندو تمدن اور تہذیب سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں اور ان کے دماغوں میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ہندو ایک محض بُت پرست قوم ہے جس کے اندر کوئی خوبی نہیں۔ یہی ہیں وہ خیالات جو فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد بنتے ہیں۔ انگریزوں کی لکھی ہوئی یا ان کے ماخذ سے لکھی ہوئی تاریخوں نے اختلاف پیدا کر کے حکومت کرنے کے نظریہ کو بڑی تقویت پہنچائی اور آج ان ہی تاریخوں کے زہریلے اثر سے ہندوستانی فضا خراب ہو رہی ہے۔

انگریزوں کی تعلیمی پالیسی نے فورٹ ولیم کلکتہ کے سیہ خانے میں اُردو اور ہندی کا مسئلہ بھی پیدا کیا جو آج ہمارے لئے ایک مستقل مصیبت بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک کی زبانوں کے ساتھ ایک سلوک تھا۔ اور ہندوستانی زبانوں کی ترقی کی کوشش تھی۔ میں اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ۔

آپ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

مختصر یہ کہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کے نتائج ہمارے لئے تباہ کن، مہلک، روح فرسا اور جاں گسل ثابت ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان سے محفوظ رہنے کے لئے کونسی تدبیر اختیار کریں۔ نتائج کے اثرات پیدا ہو چکے۔ نقصانات ہو چکے۔ اب وہ کونسی صورت ہے جس سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو اس تباہی وبربادی سے بچا سکتے ہیں۔ اس کے متعلق میں مندرجہ ذیل خیالات تک پہنچا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ علاج ہے جو ہمارے ملک کو آئندہ بربادی سے بچا سکتا ہے۔

ذریعۂ تعلیم دیسی زبان کو قرار دیا جائے۔ شمالی ہند میں ہندو اور مسلمانوں کی متفقہ اور متحدہ زبان "ہندوستانی" ہے جو اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم اسی زبان کے ذریعہ دی جائے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں انگریزی زبان کی تعلیم کا مخالف ہوں۔ انگریزی زبان ایک نہایت ہی عمدہ اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہمارے بچوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یورپ کے علوم وفنون سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان سیکھیں۔ اس لئے بہ اشد ضروری ہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم ایک ثانوی زبان کی حیثیت سے ہندوستان کے تمام بچوں کو لازمی طور پر دی جائے۔ تاکہ وہ یورپ اور اس کے علوم وفنون سے باخبر رہیں۔ لیکن دیگر علوم وفنون کے لئے ذریعۂ تعلیم "ہندوستانی" ہو۔

مسرت کا مقام ہے کہ ہماری پٹنہ یونیورسٹی نے مٹریکولیشن تک کی تعلیم کے لئے "ہندوستانی" کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی۔ میں نے بحیثیت وزیر تعلیم یونیورسٹی کی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے اور ایک کمیٹی زیر صدارت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد قائم کر دی ہے تاکہ "ہندوستانی" کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے جن امور کی ضرورت ہے اُن پر یہ کمیٹی غور کرے اور انھیں انجام دینے کے لئے علی تدابیر اختیار کرے۔ اس کمیٹی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین جامعہ ملیہ، غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر۔ ڈاکٹر تاراچند سکرٹری ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ پروفیسر نریندر دیو۔ مسٹر سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی۔ مولانا سید سلیمان ندوی (دارالمصنفین اعظم گڈھ)، وغیرہ جیسے اہل الرائے، مفکر اور ادیب

حضرات ممبر ہیں۔ یہ کمیٹی اپنا کام کر رہی ہے اور حکومت بہار تمام اخراجات کے لئے روپے دے رہی ہے۔ مندرجۂ ذیل امور بہت تیزی کے ساتھ انجام دیئے جا رہے ہیں:-

(۱) مولانا عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو اور ڈاکٹر تاراچند سکرٹری ہندوستانی اکاڈمی کی نگرانی میں "ہندوستانی لغت" تیار کی جا رہی ہے۔

(۲) تمام انگریزی اصطلاحی الفاظ کے لئے ہندوستانی الفاظ بنائے جا رہے ہیں۔

(۳) ہندوستانی قواعد (گرامر) تیار کی جا رہی ہے۔

(۴) اسکولوں کے نصاب کے لئے ہندوستانی کتابیں تیار کی جا رہی ہیں۔

مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ یہ تمام کام بہت جلد انجام پا جائینگے اور اس کے بعد ہمارے بچوں کی تعلیم کی صحیح بنیاد قائم ہو سکے گی اور وہ خرابیاں جو بدیسی زبان میں تعلیم پانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں بہت جلد دور ہو جائینگی۔ تاریخی کتابیں ایسی لکھی جائیں گی کہ بجائے فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کے متحدہ قومیت کا رجحان پیدا کر سکیں۔ غلط اور بے بنیاد روایات کو چھانٹ کر صحیح واقعات اس طرح پیش کئے جائیں گے کہ رواداری اور اتحاد کی ذہنیت پیدا ہو سکے۔

دوسرا اہم مسئلہ عام فہم عام تعلیم کا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی برطانوی حکومت کے بعد بھی ہندوستان میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد ۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ برطانوی حکومت میں عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس اہم ملکی اور قومی فریضہ کو انجام دیں۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے صوبہ نے سب سے پہلے جہالت عامہ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ ملک کے مختلف اخبارات میں صوبہ بہار کی تعلیم عامہ (Mass Literacy) ______ کی جدوجہد کے متعلق کثرت سے خبریں اور مضامین شائع ہو رہے ہیں اور پڑھے لکھے حضرات اس تحریک سے ناواقف نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہم نے تعلیم یافتہ لوگوں میں جہالت کے خلاف ایک عام جوش اور ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ ہزاروں نوجوان دیہاتوں میں رضاکارانہ طور پر کام کر رہے ہیں اور عوام کو نوشت و خواند کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حکومت اس کام کے لئے روپے صرف کر رہی ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ جلد از جلد اس صوبہ میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے۔ یہ کہنا ہرگز غلط نہیں کہ اب تک ہزاروں بلکہ لاکھوں اَن پڑھ، پڑھنا لکھنا سیکھ چکے ہیں۔ وزارت تعلیمات بہار اس تحریک کو چلا رہی ہے اور اس کی طرف خاص توجہ دیئے ہوئے ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ صوبہ بہار میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کافی ہو جائے۔

الغرض انگریزی تعلیمی پالیسی کے جو برے نتائج پیدا ہو چکے ہیں انھیں دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم سے جہاں تک ہو سکیگا اسے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ کامیابی خدا کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمارا فرض عملی جدوجہد اور مسلسل سعی ہے، وہ انشاء اللہ ہم کرتے رہیں گے۔

دو راہیں!

قومیت متحدہ یا جمہوریت متحدہ؟

از حضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ

ذیل کا مضمون ملک کے مایۂ ناز ادیب و فقیہ اور مورخ و مفسر علامہ سلیمان ندوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس میں آپ نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریک پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ اس وقت ملک کے سامنے دو نظریے ہیں، ایک وہ جسے مختصراً گاندھی جی کے رام راج سے تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا وہ جو ہمیں روس کی سوشلزم (اشتراکیت) کی طرف لیجاتا ہے لیکن بہت سے سیاسی اختلافات کے باوجود اس مسئلہ میں یہ دونوں متفق ہیں کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کو وجود میں لایا جائے جس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ سوچنے اور غور کرنے کا انداز، اظہار خیال کا ذریعہ، اور پڑھنے پڑھانے کی وضع ایک ہو۔ چنانچہ آجکل تعلیم، دیہات سدھار اور ہندی وغیرہ کے ذریعہ اسی مقصد تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ متحدہ قومیت کی یہ راہ صحیح راہ نہیں۔ بالخصوص مسلمانوں کے لئے تو یہ راہ بے انتہا خطرناک ہے۔ اس راہ پر چلنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے تمام مخصوص امتیازات کو خیرباد کہہ کر صرف "ہندوستانیت" میں مدغم ہو کر رہ جائیں۔ بنابریں اسوقت ضرورت اس کی ہے کہ قومیت متحدہ کے بجائے ہندوستان میں ایک ایسی جمہوریت متحدہ قایم ہو جس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کو بھی پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اور جس میں ہر قومیت کو کلچرل آٹانومی (تہذیبی خود اختیاری) حاصل ہو۔

مولانا نے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ اسوقت آزادی کے حصول سے زیادہ اہم سوال یہی ہے۔ جب تک یہ سوال طے نہ ہوگا ہم آزادی کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔

مسلمان چونکہ اقلیت میں ہیں اس لئے اُن کے ارباب سیاست کے لئے اس سوال پر سنجیدگی کیساتھ غور کرنا بیحد ضروری ہے۔ - ایڈیٹر

بدگمانی بہت بری چیز ہے۔ اور بدگمانی ہی عقلمندی کی پہلی منزل ہے، دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ نری بدگمانی تو بے شبہ بہت بری بات ہے۔ مگر جس بدگمانی کے ساتھ کچھ دلیلیں بھی ملیں اور کچھ نشانیاں بھی پائی جائیں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کی تحقیق کر لی جائے، تاکہ سفر کی پہلی ہی منزل میں قدم غلط راستہ پر پڑ کر منزل مقصود سے دم بدم دوری ہوتی نہ چلی جائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کی نسبت مختلف رائیں ہیں اور یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان خود ابھی تک کسی بات پر جمے ہوئے نہیں ہیں، اور جو شور و غل برپا ہے افسوس ہے کہ اُس میں "حب علیؓ" کی جگہ "بغض معاویہؓ" کا زور نمایاں ہے، کاروانِ سفر تو آمادہ ہے، مگر نہ ابھی تک سفر کی راہ متعین ہے۔ نہ سفر کا مقصد طے ہے، اور نہ راہ کے موانع پر نظر ہے، غرض اس وقت جو کچھ ہے وہ سلبی جذبات کا ابھار ہے اور ابھی تک ایجابی خواہشوں کا پتہ نہیں، یعنی یہ تو معلوم ہوا کہ ہم کو یہ یہ نہیں چاہئے۔ مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ پھر چاہئے کیا، ضرورت ہے کہ غیظ و غضب اور جوش و خروش، کو روک کر ہم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ مسئلہ کی اصلیت پر غور کریں۔

جہاں تک مجھے علم ہے ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں نے جب ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی اتحاد کے لئے قدم اٹھایا ہے، اُس وقت اُن کے . . . سامنے جو نصب العین تھا وہ ملک میں ہندوستانی قوموں کا ایک ایسا جمہوریہ تھا جسمیں ہر قوم کے حقوق اور اُس کے قومی و ملی امتیازات محفوظ رہیں، اُس وقت کانگریس صرف ایک سیاسی جماعت تھی، لیکن اس کے بعد ۱۹۲۶ء سے جیسے جیسے مسلمان اُس سے ہٹتے گئے اور خالص ہندو بھائی اُس میں بھرتے گئے، اُس کا رنگ بدلنے لگا، یہاں تک کہ چند سال کے بعد وہ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ نو عیجز زدہ بدلنے والوں نے کانگریس کو مذہب کا رنگ دیا اور پنڈت موتی لال نے سوراج پارٹی بنا کر اُس کو محض سیاسی رکھا، پنڈت جواہر لال نے اُس میں سوشلزم کا رنگ بھر کر ایک اور صورت پیدا کی۔

اب اس وقت کانگریس دو طاقتوں کے بیچ میں ہے، گاندھی جی کی پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی، ان دونوں پارٹیوں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ گاندھی پارٹی کے سامنے ملک کا وہ نقشہ ہے جس کو گاندھی جی نے بنایا ہے، جسمیں برہمو سماج قسم کا ایک مذہب ہے، ساتھ ہی اسکی دو ناقابل تبدیل بنیادی تعلیمیں ہیں۔ اچھوتوں کو اپنے میں ملانا، اور اہنسا یعنی عدم تشدد، ساتھ ہی اہل ملک کی تعلیم اور اخلاق و معاشرت کی نسبت کچھ ہدایتیں ہیں،

جواہر لال اور اُن کے ساتھیوں کے سامنے روس کا نقشہ اور مارکس کا مذہب ہے، لیکن اس اختلاف کے باوجود یہ دونوں اس پر متفق ہیں، کہ کانگریس اب تنہا نظام سیاست نہیں بلکہ وہ ایک نظام معاشرت ایک نظام اخلاق، ایک نظام تعلیم، اور ایک نظام قومیت ہے،' دونوں کا منتہائے نظر ہندوستان میں ایک ایسی قومیت متحدہ کو وجود میں لانا ہے، جس کا طرز تمدن، طرز معاشرت، طرز خیال، طرز تعلیم، زبان، اور وہ تمام عنصر ایک ہوں جو ایک قومیت کے لئے ضروری ہیں۔ گو اس وقت کانگریس کی طاقت گاندھی جی کی پارٹی کے ہاتھوں میں ہے اور انھیں کے لفٹنٹ ہائی کمانڈ کا مرتبہ پا کر ملک پر حکمراں ہیں، اور گاندھی جی کے خیال کے مطابق ملک کو چلانے کے درپے ہیں، لیکن اگر طاقت کا پلہ دوسری جماعت کے ہاتھوں میں ہوتا تو وہ اپنے نظام خیال کے مطابق ملک کو چلانے کی کوشش کرتے، اور اس کوشش سے وہ غافل نہیں ہیں، جیسا کہ موجودہ صدارت کے انتخاب نے فیصلہ کر دیا، اور آئندہ کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہے، بہرحال اس وقت تک جو صورت حال ہے اُس سے یہ ظاہر ہے کہ ملک میں ایک متحدہ قومیت ہو، جس کی زبان، تمدن معاشرت، اقتصاد، اور ہر قسم کے قومی امتیازات ایک ہوں، البتہ اس یکسانی کے تخیل میں گاندھی جی کی پارٹی کا مرکز گاندھی جی کا ہندی فلسفہ ہے، اور دوسری پارٹی کا قبلہ یورپ کا سب سے آخری نظام معیشت

رباعی

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

(اقبال)

دسوشلزم یا بولشوزم اہے'

اس وقت چھ مختلف صوبوں کی حکومت گاندھی جی کے حامیوں کے ہاتھوں میں ہے، اور گاندھی جی کے فلسفہ خیال کے مطابق ملک کی تعمیر کا کام شروع ہے، اور ایک عقلمند کی حیثیت سے سب سے پہلے انھوں نے تعلیم وتبلیغ کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ تاکہ آیندہ نسل اُن کے نظام فلسفہ کے مطابق نشو ونما پائے اور تشدد کا ذرا سا بھی مظاہرہ کئے بغیر ملک کے سارے باشندے ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں، وہ ایک ہی خیال سوچیں ایک ہی عقیدہ کو مانیں اور ایک متحدہ قومیت کا ظہور ہو جس میں رنگ برنگ کے مطالبات طرح طرح کی خواہشیں اور علیحدہ علیحدہ نظائر ہو

تعلیم کی اہمیت پرانے زمانہ میں اسی قدر تھی کہ لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ کر بزرگوں کے پرانے علمی ذخیرہ سے فائدہ اُٹھا سکیں، لیکن موجودہ زمانہ میں تعلیم کا فلسفہ صرف علم یا ہنر سیکھنا نہیں رہا ہے۔ بلکہ وہ قوموں کی تربیت، اور دماغوں کی ساخت کا اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ یورپ نے اپنے غلام ملکوں میں ایسی تعلیم جاری کی کہ محکوم قوموں نے اپنے دین وملت اور قومی امتیاز اور خو بو کو چھوڑ کر خود اپنی ہی رضا و رغبت سے حاکموں کے آئین وتمدن کو اپنے لئے رحمت سمجھ کر قبول کیا، اور اس طرح تلوار کے بغیر اُنکے جسموں کی طرح اُنکے دل بھی اُنکے حاکموں نے فتح کر لئے۔

ہندوستان کے ہندو مسلمانوں نے پوری ڈیڑھ صدی اسی طلسم میں پھنس کر بسر کر دی، اور مرغِ اسیر کی طرح اپنے نقرئی و طلائی پنجروں ہی کو اپنے لئے فخر کا سامان ٹھیرایا، ہندوؤں میں رفتہ رفتہ سیاست کی چاٹ نے قومیت کا مذاق پیدا کیا، اور باوجود اس کے کہ اُن کا اندرونی جات پات کر جھگڑوں سے زخمی ہے، اُن زخموں کے اوپر قومیت کی ایک چادر ڈال کر اُن کو آنکھوں سے چھپا ڈالنے کی کوشش ہے اسی طرح اُن کی یہ بھی کوشش ہے کہ ..... قومیت متحدہ کا ایک پُل بنا کر ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کو بھی بھلا دیں، دونوں کا ایک تمدن، ایک لباس، ایک زبان ایک مذاق، اور ایک طرز خیال ہو جائے اور دوئی کا دور ختم ہو کر اس طرح دونوں یک جان و دو قالب ہو جائیں کہ ع

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری،

ہندو مسلمان ایک ہزار برس کی یکجائی اور میل جول کے بعد یقیناً دونوں اپنی اپنی جگہوں سے ذرا آگے بڑھ کر اس طرح ایک ہو گئے تھے کہ اکثریت پر اقلیت کا اور اقلیت کا اکثریت پر کچھ کچھ رنگ چڑھ گیا تھا، دونوں کی زبان ایک ہو گئی تھی، تمدن ایک ہو گیا تھا، خیالات ایک سے ہو گئے تھے، پہننا اوڑھنا ایک ہو گیا تھا، دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو گئے تھے لیکن انگریزی تعلیم نے آکر یہ کیا کہ اُن کے اتحاد کے ذریعہ کو ہندوستانی کے بجائے انگریزی کر دیا، اور گو دیکھنے میں وہ اب بھی ایک لباس (کوٹ پتلون) میں تھے ایک ہی بولی (انگریزی) بولنے لگے تھے، اور ایک ہی یورپین تمدن میں رنگ گئے تھے مگر ان کے دلوں میں بڑا فرق پیدا ہو گیا تھا، اب ایک کا دکھ دوسرے کا سکھ اور ایک کا سکھ دوسرے کا دکھ بن گیا،

سیاست کے انقلاب اور قومیت کے نئے خیال نے نیا روپ بھرا اب یہ کوشش ہے کہ ہندوستان کے رہنے والوں اور خاص طور سے ہندو مسلمانوں کو اس طرح ایک کر دیا جائے، کہ اقلیتوں پر اکثریت کا رنگ وروغن چڑھ جائے اور وہ اپنی اصل ونسل اور دین وملت کو بھول کر اکثریت میں ہضم ہو جائیں۔ چنانچہ کہنے والے کہتے ہیں کہ واردھا اسکیم، ودیا مندر، سمپورنانند جی اور ٹنڈن جی کی ہندی، اور گاؤں سدھار کی موجودہ صورتِ حالات اصلی مقصد کی بلندی تک پہنچنے کے زینے ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اُن کی بدگمانی کو مضبوط کرتی، اور یہی وہ نشان ہیں جن سے اُن کے نزدیک موجودہ کاروان سیاست کی سمت راہ کا پتہ چلتا ہے،

صوبہ متوسط کے مسلمانوں کی کوشش سے ودیا مندر اسکیم کی صورت گو اب بدل گئی ہے، مگر روح نہیں بدلی ہے، پھر بھی صوبہ متوسط کے مسلمانوں کو اس صورت کی تبدیلی پر کچھ زیادہ خوش نہیں ہونا چاہئے اُن کی خوشی کا اصلی وقت وہ ہو گا جب وہ مدینۃ العلوم کی تجویز کو عمل میں لے آئیں گے، اور اُس کی شاخیں گاؤں گاؤں میں قایم کر سکیں گے۔ اور مسلمان بچوں کو ودیا مندر کے جال سے نکال لیں گے،

واردھا اسکیم کی اُن اصولی باتوں سے جن کو ہمارے دوست پیش کرتے ہیں ہمیں اختلاف نہیں، ہمیں اس اسکیم کے اُس "کا سو فلاثر" یعنی ہمہ رنگ سبزہ دام سے وحشت ہے، جسمیں اہمسا اور برہمو سماجی رنگ کے مذہب کی تعلیم ہوگی اور اُس میں کعبہ وبتخانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے والوں کے سوانح پڑھائے جائیں گے،

میرے نزدیک بچوں کی تعلیم خالص مذہبی ہونی چاہیئے یعنی مذہب کا رنگ اُس میں نمایاں ہونا چاہئے۔ تعلیمی نصاب ہی کے سانچے میں بچوں کا دماغ ڈھلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے بچوں کا پہلا مدرسہ یعنی ہمارے گھروں کا نظام مذہبی خود ہی بگڑ گیا ہے اور اس کی اصلاح سب سے پہلے ضروری ہے، لیکن اسکی اصلاح بھی تو اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آیندہ اپنے بچوں کا پہلا مدرسہ بنانے والوں کو سدھارنے کی کوشش کی جائے،

بہرحال اس اسکیم پر یہ چند حروف جملہ معترضہ سے زیادہ نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اس وقت کانگریس کے دونوں بازوؤں کا مقصد قومیت متحدہ کی تشکیل ہے البتہ ان دونوں کے نزدیک اس قومیت متحدہ کی نسبت دو الگ الگ تصور ہیں، اور انھیں سے مسلمانوں کو وحشت ہوتی ہے،

میرے نزدیک کانگریس کی صحیح راہ وہ تھی جس پر وہ ۱۹۲۰ء میں گامزن تھی یعنی ہندوستان کی قومیت متحدہ کی تشکیل کے بجائے، ہندوستانی اقوام کی جمہوریت متحدہ کی تشکیل، ایسی جمہوریت متحدہ، جس میں اس ملک کی ہر چھوٹی سے چھوٹی قومیت کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اُس کی تہذیب اس کا مذہب، اسکی زبان اور اُس کا مقصد زندگی محفوظ رہے، غرض ہندوستان کی کامیابی کی راہ "قومیت متحدہ ہند" نہیں بلکہ "جمہوریت متحدہ اقوام ہند" ہے اسی لئے میں نے اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں "کلچرل اٹانومی" کی دعوت بار بار دی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان کی ساری قوموں یا فرقوں کو توڑ پھوڑ کر ایک قوم بنا دینے کی پالیسی اختیار کی جائے جس سے ہر ایک کے قومی یا فرقہ وارانہ امتیازات مٹ جائیں، یہ بہتر ہو گا کہ ہم ان سب کو ایک متحدہ ہندوستانی جمہوریت کی وفاداری کے جھنڈے کے نیچے جمع کریں اور ان میں سے ہر ایک کی ہستی کو اُس کے علحدہ خصوصیات کے ساتھ قایم اور باقی رکھیں،

اس میں شک نہیں کہ یہ مشکل کام ہے۔ لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا وہ کام ہے جس کے لئے ہم سب کوشاں ہیں یعنی کامل سوراج، جب اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ہر قسم کی کوششیں کرنے پر ہم آمادہ ہیں تو پھر یہ مشکل کیوں حل نہیں ہو سکتی، صحیح اور مضبوط عزم و ارادہ نے ہر مشکل کو حل کیا ہے اور وہی اس کو بھی حل کر سکتا ہے۔

اس خاکہ کے بہت سے حواشی اور گوشے تفصیل اور تشریح کے محتاج ہیں، وقت آئے گا جب اُس کی ساری گرہیں کھلیں گی، اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ ہونگے اور ایک معتدل وعادل جمہوریت کے سایہ تلے ایک ہوں گے۔

اسلامی تہذیب
یہ ہے کیا؟

(از جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

ذیل کا مقالہ ہمارے وطن کی اُس درد مند پُر خلوص ہستی کے قلم کا نتیجہ ہے جس کی قومی تڑپ کا ثبوت "مسلمانوں کا روشن مستقبل" جیسی بیش قیمت تصنیف کی شکل میں ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس وقت یہ سوال خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کیا ہے اور اس کا تحفظ کیسے ہو۔ فاضل مقالہ نگار نے نہایت اختصار کے ساتھ اسی سوال پر بحث کی ہے۔ اس مقالہ میں جن چیزوں کو اجمالی طور پر پیش کیا گیا ہے وہ خاص طور سے ہمارے غور و فکر کی محتاج ہیں۔ (ایڈیٹر)

"اسلامی تہذیب کیا ہے؟" مختصر طور پر اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "اسلامی تہذیب نام ہے بانیٔ اسلام کے نقش قدم پر چلنے کا" حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم کی تہذیب اس قوم کے مذہبی رہناؤں اور پیشواؤں کے اعمال واقوال اور ان کے طرز معاشرت کی بنا پر قایم ہوتی ہے۔ مگر اس بارے میں مسلمان کا مسئلہ ایک بڑی حد تک دوسری قوموں سے جُدا ہے مسلمانوں کے پیغمبر و رہنما کی تعلیمات، احکام، سیرت و آثار اور روزمرہ کی معاشرت کے حالات جس صحت و احتیاط کے ساتھ محفوظ کئے گئے ہیں۔ اُس طرح کسی دوسرے مذہبی پیشوا کی زندگی کے حالات یا احکام محفوظ نہیں ہیں۔ اس لئے آج ہر قوم کے لئے یہ تقریباً ناممکن ہے کہ وہ اپنے مذہبی رہنما کے نقش قدم پر چلنے میں کامیاب ہو سکے کیونکہ یہ نقش اس قدر دھندلے اور مٹے ہوئے ہیں کہ صاف طور پر نظر نہیں آتے۔

یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ فخر صرف مسلمانوں ہی کے حصہ میں آیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف بانیٔ اسلام کے ارشادات کا ایک ایک لفظ محفوظ رکھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ اہتمام بھی کیا کہ آپ کی روزمرہ کی معاشرت اور معمولات زندگی کی تمام جزئیات کو بھی صحیح ترین تاریخی معیار پر مستند ذرائع اور سلسلۂ روایت کے ساتھ ترتیب دیا۔ اسی مجموعۂ اقوال و اعمال کا نام شریعت اسلامیہ کی اصطلاح میں "حدیث" ہے اور اسی کو "سنت" بھی کہتے ہیں، اس کا مرتبہ قرآن مجید کے بعد تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ احادیث رسول اللہ صلعم کے ارشادات اور آپ کے روزمرہ کے اعمال زندگی کا صحیح ترین مرقع ہے جو نہایت معتبر سلسلۂ روایت کے

ساتھ مسلمانوں کے پاس محفوظ موجود ہے۔ اس سلسلۂ روایت کی چھان بین کرنے میں علمائے حدیث نے اتنی محنت و کوشش کی ہے کہ دنیا کے کسی نہایت مشہور و مسلمہ تاریخی واقعہ کے متعلق بھی ایسی چھان بین نہیں کی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری قوموں نے بھی اپنے رہنماؤں کی زندگی کے مرقعے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں مگر بدنصیبی سے وہ اتنے دھندلے اور بے رنگ ہیں کہ اون میں ان مذہبی رہنماؤں کی تصویریں صاف طور پر نظر نہیں آتیں اور اُن کی روزمرہ کی زندگی کے اعمال و معمولات کا صحیح طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس پر مزید کوتاہی یہ ہے کہ ان کی "تعلیم" بھی کسی صحیح سلسلۂ روایت کے ساتھ محفوظ نہیں ہے۔ حضرت مسیحؑ ہوں یا گوتم بدھ۔ رامچندر ہوں یا کرشن مہاراج، سب کی زندگی تاریکی میں ہیں اور اُن کے جو حالات کہیں کہیں ملتے ہیں انکی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

جو لوگ اسلامی تعلیمات سے باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ "احادیث" یعنی "سنت نبوی" کا مرتبہ آسمانی کتاب کے بعد سب سے زیادہ بلند تسلیم کیا گیا ہے۔ گویا مذہب اسلام کا مدار کتاب (قرآن مجید) اور سنت (حدیث) پر ہے اور اس لئے یہی دو چیزیں اسلامی تہذیب کا سرچشمہ ہیں، اور پیغمبر اسلام، انسانی پیکر میں اس سرچشمہ کا مکمل نمونہ! خدا نے قرآن مجید میں صراحۃً رسولؐ کی پیروی کا حکم دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ اپنی خواہش نفس کی بنا پر نہیں بلکہ احکام الٰہی کی بنا پر فرماتے ہیں۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر نہیں کہتے ہیں بلکہ یہ تو وحی ہے جو اُن پر خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے)

اسی طرح ایک اور موقع پر آپ کی زندگی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ تمہارے سامنے رسول کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے دوسرے مذہبوں کی طرح اسلام صرف چند عقائد مخصوصہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل ضابطہ یا بالفاظ دیگر مکمل تہذیب بھی ہے۔

صحابہ کرام جو رسول اللہ صلعم کے اولین پیرو تھے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اتباع سنت کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اور اُن کی یہ پیروی زندگی کے ہر شعبہ میں تھی یعنی رسول اللہ کا چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سب چیزیں ان کے لئے پیروی کے قابل تھیں۔ اس کے بعد بھی تمام علماء کا یہ مسلک رہا ہے کہ مسلمانوں کو ان کی روزمرہ زندگی میں رسول اللہؐ کی پیروی کی ترغیب دیں نیز اسلام کے ہر دور میں جو مصلح اور ہر صدی میں جو مجدد پیدا ہوئے اُن سب کے وعظ و تبلیغ کا اولین مقصد بھی یہی احیائے سنت تھا۔

خود رسول کا ارشاد ہے کہ "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ" تم پر میرے طور طریق کی پابندی ضروری ہے۔ گویا اس طرح آپ نے مسلمانوں کو اپنے طریقۂ حیات کی پیروی کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اسی بنا پر وہ تمام مصلح و مجدد جو اپنے اپنے زمانہ میں آئے مسلمانوں کو اتباع سنت کی تاکید کرتے رہے۔ ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی نے یہ خدمت بڑے اہتمام کے ساتھ انجام دی تھی۔ اس زمانہ میں اس کی بڑی سخت ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمان دوسری قوموں کے اختلاط سے صحیح راستہ سے ہٹ گئے تھے اور شریعت سے بہت ...

لیکن جیسے جیسے زمانۂ نبوت سے دوری ہوتی گئی، مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم و رواج داخل ہوتے گئے۔ ہندوستان کے آخری مسلمان بادشاہوں یعنی مغلوں کے تمدن کو دیکھا جائے تو اس میں بمقابلہ زمانہ سابق کے کافی تبدیلی نظر آئے گی۔ اس خاندان کے بادشاہوں اور درباریوں کی تصویریں اس وقت بکثرت موجود ہیں جن میں صورت اور لباس کے اعتبار سے مسلم و غیر مسلم میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح شاہی محل میں بکثرت غیر مسلموں کے طریقے اور رسمیں اختیار کر لی گئی تھیں۔ جب یہ چیز حد سے زیادہ بڑھ گئی تو مسلمان عالموں نے اُن کا قلع قمع کرنے میں جدوجہد کی اور نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات تک میں گھوم پھر کر سنت نبوی اور تہذیب اسلامی کو زندہ کیا۔ اگر دہلی میں شاہ عبدالرحیم کا خاندان اس خدمت کو انجام دے رہا تھا تو بنگال کے دیہات میں مولوی شریعت اللہ وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کو نہ صرف پابند صوم و صلوٰۃ بلکہ انہیں مسلمان صورت بھی بنا رہے تھے۔ مولوی شریعت اللہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں مکہ معظمہ جا کر سالہا سال تک وہاں رہے اور ۱۸۲۰ء میں ہندوستان واپس آ کر اسلامی معاشرت و تہذیب کے پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ مولوی شریعت اللہ کے بعد حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی ۱۸۲۰ء میں حج کو گئے اور دو سال بعد وہاں سے ہندوستان آ کر اسلامی تہذیب و معاشرت کی اشاعت و تبلیغ کے کام میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کے اثر سے نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات تک میں مسلمانوں نے اسلام کی حقیقی تہذیب کو زندہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے حکام وقت نے انہیں مذہبی مجنون اور وہابی قرار دیکر اُن پر بغاوت کے مقدمات چلائے۔ بنگال کے ہندو زمینداروں نے حکومت کا یہ رُخ دیکھ کر مسلمان رعایا پر، جن کے مسلمان ہونے کی شناخت داڑھی قرار دی گئی تھی، فی کس ڈھائی روپیہ ٹیکس لگایا اور جب ان لوگوں نے عدول حکمی کی تو حکومت کی مدد سے انہیں فوج کی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ باوجود ان مظالم کے مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی قدیم طرز معاشرت اور تہذیب پر قائم رہا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ایسے بدنصیب مسلمانوں اور مسلمانوں کے عالموں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، مگر پھر بھی مسلمانوں کی کافی تعداد ایسی نہ تھی۔ قدرتاً اس قسم کے برگزیدہ لوگ حکومت کے نزدیک مشتبہ سمجھے گئے اور انہیں جانی اور مالی نقصانات اُٹھانا پڑے۔ اسی قسم کے "مشتبہ" علماء کے ایک طبقہ نے اپنی مذہبی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے جب دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا تو حکومت اُن سے اور زیادہ مشکوک ہو گئی۔ اسی طرح جب لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد قائم ہوئی تو اس پر سرکاری نگرانی قائم کی گئی۔ اسی کے ساتھ انگریزوں کے ایک نمکخوار اور خیرخواہ طبقہ نے جو انگریزی لباس و معاشرت کو اپنی اور اپنی قوم کی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا مذہبی جماعت پر اخبارات و رسائل کے ذریعہ حملے کئے، ان کے جبہ اور عمامہ پر، ان کے طریق رہائش اور نشست و برخاست پر جو سنت نبوی کے مطابق یا اس کے مشابہ تھی، پھبتیاں اُڑائیں۔ جہاد کو جو مذہبی حفاظت کا ذریعہ ہے صرف قلمی جہاد میں محدود کیا۔ اور ان طریقوں سے غیر ملکی حکومت کے محبوب بن کر بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کئے اور خوب خوب ترقیاں کیں۔

اسی نہج کے لوگوں کی نسبت نواب صدیار جنگ بہادر نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ منعقدہ اٹاوہ میں فرمایا تھا کہ جب ڈپٹی کلکٹری لینے کا وقت ہوتا ہے تو یہ انگریز صورت اصحاب مسلمان بن جاتے ہیں۔ لیکن جب نماز کا وقت آتا ہے تو غائب ہو جاتے ہیں۔

ان اصحاب نے اسلامی معاشرت و تہذیب پر قائم رہنے والوں اور سنت نبوی پر چلنے والوں کی تحقیر اور تذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ ان غریبوں کے متعلق . . . حکومت سے یہ رپورٹیں کی گئیں کہ یہ سرحد سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح ان پر سرکاری نگرانی قائم کرائی گئی۔ انگریزی صورت و سیرت پر جان دینے والا جو طبقہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل رہا تھا اس کی طرف سے کہا گیا کہ ان "ملّاؤں" کی وجہ سے مسلمانوں کی خیرخواہی سلطنت پر حرف آتا ہے۔ یہ مسجد کے مینڈھے ہیں۔ غرضکہ اس جماعت پر دو طرفہ مار رہی۔ لیکن باوجود ان تمام مصائب کے "اسلامی تہذیب" کی جو کچھ محافظت کی انھوں نے ہی کی۔ تمام دنیوی فائدوں پر لات مار کر اپنے مذہبی علوم پڑھے۔ سخت افلاس اور عسرت کی زندگی بسر کی لیکن حکومت وقت کے آگے اپنی زبان اور تہذیب کی حفاظت کے لئے گداگری کا دامن کبھی نہ پھیلایا۔ مگر اب اس قسم کے اہل دل حضرات پر پہلے سے کہیں زیادہ سخت وقت آیا ہے۔ یعنی انگریزی صورت اور انگریزی تمدن اختیار کرنے والے اور انگریزی زبان میں نہ صرف لکھنے اور بولنے والے بلکہ اسی زبان میں سوچنے پر فخر کرنے والے اصحاب اپنے کو مسلمانوں کی تہذیب کا محافظ قرار دے رہے ہیں۔ اور سنت نبوی کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے قربانیاں کرنے والے طبقہ کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیا جا رہا ہے۔ العظمۃ للہ!

ایک اور مصیبت ہے اور وہ یہ کہ بدنصیبی سے ہمارے برادران وطن میں بھی تنگ خیال افراد کی ایک ایسی جماعت کچھ دنوں سے پیدا ہو گئی ہے جو اسلامی تہذیب سے خواہ مخواہ بیزار ہے اور اس کا نام و نشان بھی باقی رکھنا نہیں چاہتی۔ اس لئے بحیثیت ایک مستقل اور شاندار تاریخ رکھنے والی قوم کے مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و روایات کو زندہ رکھنے کی جان توڑ کوشش کریں اور اپنی اسلامی و قومی تہذیب کو دشمنوں کے نرغے سے (جنھوں نے اپنی کوتاہ اندیشی سے اپنی قدیم زبان اور تہذیب کو تمام ملک میں پھیلانے کا تہیہ کر لیا ہے) بچانے کی جدوجہد کریں۔ مگر یہ کام وہ اصحاب کیا کر سکتے ہیں جو خود سات سمندر پار کے رہنے والوں کی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور جو اپنے سیاسی جلسوں کی تقریروں میں سنت نبوی کی پیروی کرنے والوں کی طاقت توڑ دینے پر فخر کرتے ہیں درآنحالیکہ آج ان ہی کی بدولت "اسلامی تہذیب" کے کچھ آثار باقی ہیں۔

لیکن اگر واقعی خدا نے ہمارے "انگریزیت زدہ" نوجوانوں کے دل پھیر دیئے ہیں اور اب وہ سچے دل سے اسلامی تہذیب کے دلدادہ ہو گئے ہیں اور دیگر اقوام کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کرنا اور اسے قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیئے کہ سب سے پہلے خود اس تہذیب کو اختیار کر کے خود کو ایک نمونہ بنائیں۔ ورنہ خیالی باتیں بنانے سے کیا حاصل؟

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

اصلاح کا پہلا قدم گھر سے شروع ہونا چاہیئے۔ لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکلے وہی اس کی رفتار و کردار سے ظاہر ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ آج مسلم کلچر کے تحفظ کے دعویداروں میں اکثریت ایسے لوگوں کی نہیں ہے۔ کاش یہ صورت حالات بدل سکتی!!

سوشلزم کیا نہیں ہے

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

جناب ڈاکٹر محمد اشرف ایم اے۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ۔ ڈی۔ الہ آباد

(۱)

اکثر لوگ سوشلسٹوں کے بارے میں بیہودہ اور غلط باتوں کے حسب ذیل خیالات کا اظہار انتہائی متانت اور ذمہ داری سے کیا کرتے ہیں:۔

"دنیا میں محنت کشوں اور مزدوروں کا ایک معاشی نظام قائم کرنے کے نصب العین پر سوشلسٹ دنیا کے تمام معتقدات و خیالات کو قربان کرسکتے ہیں یعنی اگر اس قسم کا نظام حکمرانی قائم کرنے میں انہیں مذہب کی بھینٹ دینا پڑے تو وہ مطلق تامل نہ کریں گے۔ علیٰ ہذالقیاس اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو وہ معاشرت و تہذیب کے موجودہ ڈھانچہ کو بھی نہایت بیباکی کے ساتھ اس کے راستہ میں قربان کردینگے۔ غرض محنت کشوں اور مزدوروں کے مضبوط و مستحکم معاشی نظام حکمرانی کے علاوہ سوشلسٹوں کے نزدیک ہر چیز ہیچ ہے"

لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے معترض اپنے بیان کی تائید میں کسی سوشلسٹ مفکر کا قول نقل کرنے یا کسی مستند یا غیر مستند کتاب کا حوالہ دینے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

یہ غیر ذمہ دارانہ تنقید کچھ بعض کرمفرماؤں کا ہی خاصہ نہیں بلکہ علمائے دین کا عام دستور ہوگیا ہے اور میں نے مدینہ، انصاری، الجمعیۃ، الاصلاح اور دوسرے اخبار ورسالے پڑھ کر بارہا انتہائی تکلیف کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ دنیا کے اہل علم میں صرف علمائے اسلام کی ہی ایک ایسی جماعت ہے جو ہر بات کا جواب دینا ضروری سمجھتی ہے۔ ممکن ہے ہر امکانی مسئلہ پر استفتا کی وجہ سے یہ عادت ہوگئی ہو۔ اس سے زیادہ یہ اغلب ہے کہ خوش عقیدہ لوگوں نے ہمہ دانی کا خیال دلادیا ہو مگر میں ذمہ دارانہ طریقہ پر اور ہلکی سی بصیرت رکھتے ہوئے اس کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی رائے زنی سوشلزم کے بارے میں قطعًا لاعلمی پر مبنی ہے اور میری مودبانہ گذارش ہے کہ کم از کم سماجی اور سیاسی مسائل پر میرے محترم بزرگ بغیر مطالعہ اور واقفیت کے رائے دینے اور تنقید کرنے سے احتراز فرمائیں تو ہماری علمی روایات اور مسلمانوں کے تاریخی مذاق پر بڑا احسان ہوگا۔

ظاہر ہے کہ میرے الفاظ میں تلخی اور میرے دل میں غم و غصہ ہے۔ میں نے مدینہ یا انصاری اور الجمعیۃ کا محض اس لئے حوالہ دیا ہے چونکہ ان اخبارات کے معیاری ہونے کے علاوہ میرے دل میں ان کے مدیروں سے تھوڑی بہت عقیدت، آیندہ کے لئے رفاقت کا جذبہ اور ساتھ کام کرنے کا شوق ہے۔ میں نے عمدًا طلوع اسلام کا یا علامہ مودودی یا مولانا ظفر علی خاں اور "حضرت علامہ" مظہر الدین وغیرہم کا حوالہ نہیں دیا اسلئے کہ سوشلزم کی بحث میں ان حضرات کو کسی سنجیدہ بحث کا اہل نہیں سمجھتا۔ بعض کی تجارت پیشگی اس درجہ عریاں ہے کہ تنقید و تبصرہ کی محتاج نہیں ہے اور بہر نوع انہیں سوچنے اور غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ہے۔

اس بحث کی ضرورت اس لئے اور بھی ہے کہ میرے نزدیک اس ملک کے تمدن اور آزادی کے علاوہ سب مذاہب کے پیروؤں اور بالخصوص محنت کش دنیا کی روحانی قدروں کا اس سوال سے گہرا تعلق ہے۔ حال میں ایک ماہنامہ چنگاری کے نام سے اردو میں سہارنپور سے نکلا ہے جس میں سوشلزم کے بارے میں نظری مضامین نکل رہے ہیں۔ ڈاکٹر احمد اور دوسرے سوشلسٹوں نے الہ آباد میں ایک ادارہ سوشلسٹ ادب کے لئے قائم کیا ہے جس سے اردو کتابیں بھی شائع ہونگی اور حلقۂ ادب لکھنؤ اور پولیٹیکل بک ڈپو لاہور نے اس سلسلہ میں انقلابی نظمیں اور افسانے شائع کئے ہیں۔ غرضکہ جگہ جگہ سوشلسٹوں کو ایڈیٹر مدینہ اور دوسرے رفیقوں سے ملکر اس کا احساس ہوا ہے کہ سوشلزم کے عقائد اور پروگرام کے بارے میں عجیب وغریب غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں اور انکی فوری تلافی کی ضرورت ہے۔ اب تک ہمارا دیانتداری سے یہ خیال تھا کہ روس کے مظالم کے افسانوں کی اشاعت اور سوشلزم اور لامذہبیت کو یکجا و ہم معنی و ہموزن کرنے میں برطانوی سامراج کا ہاتھ ہے مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ اس پست سرزمین میں برطانوی سامراج کا کامیاب پروپیگنڈا اسلئے ممکن ہے کہ ایک صدی کی آبیاری سے سامراج نے اس خطہ کو زیادہ سے زیادہ مدت تک حکومت کرنے کے قابل بنالیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری سوشلزم کے بارے میں ناواقفیت اسی عام جہالت کا ایک رُخ ہے جو مسلمان کو ہندو سے حتیٰ کہ شیعہ کو سنی سے اور سناتن دھرمی کو آریہ سماجی سے اجنبی بنادیتی ہے۔ سوشلزم خصوصیت سے بدنصیب ہے اس لئے کہ اس کا ادب زیادہ تر مغربی زبانوں میں ہے اور کانگریسی حکومتوں سے پہلے اور مسلم لیگی صوبوں میں اب بھی اس کی مستند کتابوں کا خریدنا، پڑھنا اور فروخت کرنا قانونی جرم ہے۔ اس لئے میرے محترم دوستوں اور بزرگوں کی غلط فہمیاں سمجھ میں آسکتی ہیں گو غلط خیالات کے اظہار پر اصرار سمجھ میں نہیں آسکتا۔

(۲)

اخبار کی محدود وسعت اور خود میری مصروفیتیں مجھے مفصل مضمون لکھنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بغیر مبسوط مضمون بلکہ ایک سلسلۂ مضامین کے سوشلزم کی مبادیات اور اصول و پروگرام سمجھ میں نہیں آسکتے اس لئے میں اس فرصت میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سوشلزم کیا نہیں ہے۔ اس سے میرا کام ہلکا ہوجاتا ہے اور میرا فوری منشا بھی پورا ہوجاتا ہے یعنی بعض غلط العام باتیں جو مروج ہوکر "فصیح" سمجھی جانے لگی ہیں ان کا کسی حد تک ازالہ ہوجاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان سطور کے مطالعہ کے بعد بعض احباب سوشلزم کا باضابطہ مطالعہ بھی شروع کردیں۔

مگر پڑھنے والے اور بالخصوص "مذہبی" لوگ ایک بات کو پہلے سے صاف کرلیں۔ "دینداروں" کی نگاہ فی نفسہٖ کسی سوال کے خارجی مطالعہ پر بہت کم جاتی ہے۔ ان کے ذہن دائمی مظاہر سے مانوس ہیں۔ اُن کے اکثر سوالات دین و مذہب کو مرکز مان کر پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کے مفکروں نے برابر بدلنے والی سماج کی تقسیم بھی مسلم و کافر میں کردی ہے وہ جب سوشلزم۔ سوراج۔ نازیزم یا کسی جدید سماجی سوال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معًا انہیں پہلے ذہن میں یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ اسلام کا حامی ہے یا مخالف اور اس کے بعد دیگر جزئیات پر متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کی منطقی ترتیب کی آسانیاں بہت ہیں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دنیا کے چاروں طبق تھوڑی سی توجہ اور غور و فکر سے روشن ہوجاتے ہیں اور کوئی ایسا مرحلہ نہیں آتا جہاں یہ فارمولا نہ چلتا ہو۔ اسی کا کرشمہ ہے کہ مسلم لیگ کے ہر رضاکار کو علم لدنّی حاصل ہے اور ایک طرح سے اس دنیا میں چالیس کروڑ بقراط اور فلاطون بستے ہیں یا کم از کم تھوڑی کوشش سے بن سکتے ہیں۔

لیکن بدنصیبی سے فطرت بڑی ستم ظریف ہے۔ وہ برابر نئی طاقتیں پیدا کرتی رہتی ہے جس سے پُرانی دنیا مانوس نہ تھی۔ فرض کیجئے کہ ہم آپ کسی بجلی یا ریل یا طیارہ سازی کے کارخانہ میں جا پہنچیں اور اسی نسخہ کو ذہن میں رکھ کر سوچیں کہ بجلی یا ریل کا استعمال از روئے شرع جائز ہے یا نہیں تو ذرا مشکلات پیدا ہونگی کچھ ایسا ہی عالم سماجی قوتوں کا بھی ہے۔ کل تک ہمارا سود و زکوٰۃ کا مسئلہ صاف اور قابل عمل تھا۔ آج تجارت اور بنکوں کے نئے رواج نے خود دولت کی حیثیت ہی بدلدی۔ کل تک ہم معتزلہ اور اشاعرہ کا جواب علم کلام میں ڈھونڈ نکالتے تھے۔ آج ان سوالوں کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب نظری اور تصوری فلسفہ کی جگہ زندہ سماجی فلسفہ نے جنم لیا اور یہاں پہنچکر ہمارے پُرانے بنیادی تصورات پھر دور از کار ہوگئے۔

میرا منشا ان سطور سے یہ ہے کہ پڑھنے والے سوشلزم کے بارے میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرلیں کہ سوشلزم حکیمانہ حیثیت سے ایک تاریخی فلسفہ ہے۔ مذہب نہیں ہے . . . . اس لئے مذہب کی حمایت اور مخالفت کے دونوں پہلو غلط ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جملہ سماجی مظاہر کی طرح سوشلسٹوں نے مذہبی زندگی اور خود مذہبی عقائد کا بھی تاریخی جائزہ لیا ہے یعنی اس واقعہ کو تاریخی طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ کن مخصوص حالات میں ایک مذہبی سماج نے ایک خاص قسم کی معاشرتی زندگی پیدا کی اور اس کے بعد اس مذہبی سماج کی زندگی کیونکر بدلی۔ اس کا مادی گرد و پیش و ماحول کیا تھا؟ فرض کیجئے خلافت راشدہ کے مطالعہ کا سوال ہے۔ آپ کے ہی لئے نہیں بلکہ خود علامہ شبلی و سلیمان ندوی کے لئے خلفائے اسلام کے درخشاں کارنامے گنادینا تاریخ دانی کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ علم تاریخ کا منشا اس طرح پورا ہوجاتا ہے۔ لیکن سوشلسٹ مورخ کا مطمح نظر اس سے مختلف ہے۔ یعنی ایک سوشلسٹ کو ان کارناموں سے اتنی بحث نہیں ہوگی جتنی اُس مخصوص مادی اور تاریخی ماحول سے جس نے اس بابرکت سماج کو جنم دیا اور اسی اعتبار سے وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ ہم اپنے موجودہ تاریخی ماحول کا خیال کرتے ہوئے کن ترقی پسند سماجی تحریکوں کا ساتھ دے سکتے ہیں اور کن طبقوں سے ہم کو احتراز واجب ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ زبان میں انگریزی حکومت انگریزی حکومت نہیں بلکہ "سامراج شاہی" ہے اور ہماری تحریک اسی نسبت سے "سامراج دشمن" ہے۔ وہ ذہنی محرکات کو سمجھنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر اس کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم سماجی ماحول ہے جس میں یہ محرکات موثر ہوتے ہیں یا بعض اوقات (مثلًا دور حاضر میں) موثر نہیں ہوتے۔ یہ سوشلسٹ نقطہ نظر کی ایک مثال ہے۔

ممکن ہے آپ اس قسم کی ذہنیت کو سرے سے "الحاد" سے تعبیر کریں۔ کم از کم مسلم لیگ نے اس کا فیصلہ کردیا ہے۔ چنانچہ اسی منطقی ترتیب کے مطابق آج ان کے نزدیک ۔ سوشلسٹ ہی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی بھی

خیال کئے مسلمان دشمن اسلام ہیں۔ اس منطق کی آخری کڑی یہ ہے کہ جو مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہے (یعنی جو جناح صاحب کا تابع فرمان نہیں ہے)، وہ دشمن اسلام ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کانگریسی ہونا ایک نئی اور متصادم ذہنیت کا ثبوت ہے یا نہیں، اور اس نئی ذہنیت کا اسلام سے تعلق ہے یا یہ چیز بذاتہ ایک آزادانہ حیثیت رکھتی ہے؟ یہی حال غریب سوشلسٹ کا ہے اس کے سامنے زندگی اور بالخصوص سماج کے متعلق ایک فلسفہ ہے جو جماعتی جدوجہد کے اصول پر انسان کے تاریخی ارتقا کی تشریح کرتا ہے۔ وہ دور حاضر میں جدید سرمایہ کے ساتھ سامراج کا اقتصادی نظام اور ہماری محکومی کو محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں سوشلزم میں سرمایہ کا انحطاط اور آزادی کے امکانات دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر ایک سوشلسٹ اسوقت تمام ترقی پسند سماجی قوتوں کے متحدہ محاذ کا طالب اور خواہاں ہے۔

یہ قطعاً ضروری نہیں کہ آپ سوشلسٹ کے فلسفہ اور منطق یا تاریخی تشریح سے اتفاق کریں لیکن اس بحث میں آپ کی اور اس کی سطح عقائد واعمال کے احتساب یا عذاب وثواب اور کفر واسلام کی سطح نہیں ہوگی بلکہ اسے خالصاً نظری اور تاریخی یا فلسفی سطح ہونا چاہیئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں تاریخ میں کارل مارکس کا نہیں بلکہ ابن خلدون کا مقلد ہوں لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں کارل مارکس کے مقابلہ میں مولانا اشرف علی یا ڈاکٹر اقبال کے عقائد کو ترجیح دیتا ہوں اس لئے کہ یہ دونو حضرات اس سطح اور موضوع میں خارج از بحث ہیں ان سے سینٹ فرانسس یا گوئٹے کا موازنہ کیجئے تو بہتر ہے۔

بعینہ اسی طرح ایک سوشلسٹ یا سوشلزم کو اسلام کا ہموزن سمجھنا صریحاً غلطی ہے۔ یہ ممکن بلکہ حقیقت ہے کہ بہت سے سوشلسٹ از روئے عقیدہ مسلمان ہیں بعض پختہ کار صرف معقولین میں شمار ہونگے۔ اور ایک دو خالصاً فلسفی نکلیں گے، مگر مذہبی عقائد سے نفسہٖ سوشلزم کے پروگرام اور سیاسی عمل کو بحث نہیں ہے۔ ایک حکیمانہ فلسفہ کے راسخ ہوجانے کے بعد بالخصوص جب اُس سے زندہ سماجی مسائل کی تشفی بخش تشریح بھی ہوتی ہو کسی دوسرے فلسفہ کی گنجایش کم رہتی ہے۔ یہ عالم اشراقی اور رازی پر ہی نہیں بہت سے صوفیا اور جلد فقہائے اسلام پر بھی گذرا ہے لیکن دوسروں کے ساتھ کام کرنے میں اسوقت تک کوئی روک نہیں ہوتی جب تک آپ کا اور دوسروں کا کسی عملی پروگرام پر اتفاق ہے یا سامراج دشمن حیثیت سے باہم ساتھ ہے۔

خود سوشلسٹ اصطلاح بڑی ہمہ گیر ہے جس میں مختلف رجانات پائے جاتے ہیں۔ البتہ اتفاق صرف اس امر پر ہے کہ سب کے سب فرد کی بجائے سماج یا معاشرہ (سوسائٹی) سے بحث کرتے ہیں اس کے بعد اُن میں آپس میں بہت سے اختلافات ہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ اور لینسبری کٹر عیسائی تھے۔ کمیونسٹ بالعموم فلسفہ مادیت کے قایل اور "تصور پرستی" کے مخالف ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت ابھی سے ہندوستان میں بھی ہے۔ راہل جی بدھ مت کے ماننے والے، سمپورنانند ویدانت کے قایل اور مسٹر ادھکاری مادیت کے پُرجوش حامی ہیں۔ فرض کیجئے کہ جمیعت العلمار کے عالم سوشلسٹ پروگرام مان کر سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہوجائیں۔ اس کے بعد کیا ہوگا میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ جس طرح کانگریس کی شرکت سے اُنکے ایمان کو ضعف نہیں پہنچا اسی طرح سوشلسٹ پارٹی کی شرکت یا کمیونسٹوں کے ساتھ کام کرنے سے اُنکی عاقبت کے تباہ ہوجانے کا بہت زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ ویسے اللہ کے اختیار میں ہے جسے چاہے حشر میں ذلیل یا عزیز کرے۔

(۳)

اس سرسری مگر ضروری ابتدائی بحث کے بعد اب غور فرمائیے کہ سوشلزم کیا نہیں ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ سوشلسٹ تشدد پرست، مذہب دشمن اور کم از کم قدیم تمدن اور کلچر کے خلاف ہیں۔ فرد جرم گنانا مشکل ہے میں نے یہاں تک سنا ہے کہ روس میں کمیونسٹ مردم خور ہیں اور ازدواجی تعلقات میں قطعاً حرام وحلال کی تفریق نہیں کرتے!!! واقعہ یہ ہے کہ میں کمیونسٹوں سے ملنے سے پہلے آسانی سے باور کرسکتا تھا کہ کمیونسٹ ایک خاص قسم کا مردم نما حیوان ہوتا ہے جو غالباً سر کے بل چلتا ہے اور اس کے اول وآخر محرکات صرف شہوانی وجسمانی ہی ہوسکتے ہیں۔ بھلا مادیت کے فلسفہ کو ماننے کے بعد یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان میں مذہبی لوگوں جیسا اخلاق، روحانی لوگوں جیسی فرشتہ خصلتی اور مہذب مسلمانوں جیسا تمدن وآداب مجلس ہوں!! لیکن مجھے شرمندگی کے ساتھ اس واقعہ کا اعلان کرنا پڑتا ہے کہ بدقسمتی سے کمیونسٹ اور سوشلسٹوں کے بھی ہمارے آپ جیسے صرف دو ہاتھ اور پاؤں ہوتے ہیں۔ یہ حضرات بھی ہماری آپ کی طرح ہندوستان کے قصبوں اور شہروں کے محلوں اور مکانوں میں رہتے ہیں اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستانی ماں باپ نے انھیں پیدا کیا ہے اور وہ بھی مروجہ ازدواجی تعلقات کے بعد۔ دنیا میں بجز اس کے کہ کمیونسٹ تحریک کی بدولت روس کے نظام حکومت میں زار روس اور اس کے اُمرا کی جگہ مزدوروں نے لی اور کوئی حیرتناک اور بنیادی انقلاب نہیں ہوا، نہ خاوندوں کی بیوی کی محبت کم ہوئی، نہ بڑوں کا چھوٹوں سے محبت وشفقت کا جذبہ رخصت ہوا، نہ فنون لطیفہ اور شاعری میں کمی آئی۔ حتیٰ کہ روحانیت بھی بدستور باقی اور بارآور ہے صرف مظاہر تھوڑے سے بدل گئے ہیں۔ یعنی پہلی بار انسانیت بلکہ محنت کش اور آزاد انسانیت کا نصب العین اور کامیاب نقشہ دنیا کے سامنے آیا ہے۔ دوسری طرف محکوم قوموں اور ہر ملک کے کمزور سماجی طبقوں میں اپنے حقوق کے لئے لڑنے اور باہمی بلکہ بین الاقوامی تنظیم کا جذبہ اُبھرا ہے جس کا نتیجہ چین اور اسپین کے عوام کی جمہوری جدوجہد ہے۔

میرا خیال ہے کہ کوئی اور خاص ہیبتناک تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ بے بس مقہور اور مجبور دنیا کو استبداد واستحصال کے دفع کرنے کا کارگر نسخہ مل گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے سرمایہ دار اور با اقتدار طبقے آتش زیر پا ہورہے ہیں۔ یہ غاصب جماعتیں اور ان کے ہوا خواہ بلا لحاظ ملک ومذہب سوشلزم کو مٹانے اور اپنے مفاد کو محفوظ رکھنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

۱۔ سوشلسٹوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تشدد پرست ہیں یہ سرتا پا غلط الزام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ عدم تشدد کو مذہبی عقیدہ کی طرح نہیں مانتے اور تاریخی حیثیت سے اس کے قائل ہیں کہ با اختیار سماجی طبقے صرف طاقت سے (by force forcibly) بے دخل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن "طاقت" کے یہ معنی نہیں کہ وہ انفرادی تشدد کے بھی قائل ہوں۔ یا مہاتما گاندھی کی طرح عدم تشدد کو انفرادی طور پر بھی واجب قرار دیدیں۔ "طاقت" سے ان کی مراد محنت کشوں اور محروموں کی جماعتی تنظیم اور ریاست کے وسائل پر قابض ہونے کی صلاحیت ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ روسی انقلاب میں خود انتقال حکومت کے وقت ایک قطرہ خون کا نہیں گرا۔ اور خونریزی اور خانگی جنگوں کی ابتدا معزول شدہ اُمرا اور بیرونی سامراج نے اسی طرح کی جس طرح اسپین میں فرانکو نے ہنگامہ کر رکھا ہے۔

۲۔ سوشلسٹوں کو مذہب دشمن ان معنوں میں کہنا کہ وہ آپ کو کسی مخصوص عقیدہ کا پابند کریں گے یا خدا کی توحید یا عبادت سے روکیں گے یا معابد کو نقصان پہنچائیں گے ایک صریح بہتان ہے۔ آج کمیونسٹ علانیہ طور پر جرمنی کے رومن کیتھولک طبقہ کی مذہبی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں اور فلسطین میں درجنوں یہودی کمیونسٹ عربوں کی حمایت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ عوام اور ان کے ساتھ کمیونسٹ بھی اس کا مطالبہ ضرور کریں گے کہ مذہبی اوقاف ذاتی تصرف سے نکالکر عام مسلمانوں کی بہبودی اور تعلیم کے کاموں پر صرف کئے جائیں یعنی جو واقف کا منشا تھا۔

۳۔ قدیم تمدن اور کلچر کا سوشلسٹوں کو مخالف قرار دینا یہ آپ کی نادانی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدیم تمدن اور کلچر کے بہترین عناصر کے صحیح وارث سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہی ہیں۔ حق وصداقت اور انسانیت واخلاق کے بقا کے لئے وہ آج اپنی جان دے رہے ہیں۔ البتہ آپ کو غور کرنا پڑیگا کہ کلچر وتمدن کے کون سے پہلو اب انسانیت کے لئے مہلک یا کم از کم مضر ہیں۔ مثلاً آپ اسلامی شریعت کے معنوں میں بھی کسی کو غلام نہیں بنا سکتے، ہندو عورت کو ستی نہیں کرسکتے۔ امرار کے حرم میں ہزاروں بے بس عورتوں کو نفس اور جاہ پرستی کے لئے مقید نہیں کرسکتے۔ سوشلسٹ موجودہ تمدن سے ان چیزوں کو ضرور خارج کریں گے لیکن اسکا فیصلہ بھی جمہور کی رائے سے ہی ہوگا۔ وقس علی ھذا۔

اعتراضات اسی نوعیت کے اور بھی ہیں جنھیں میں طوالت کے خیال سے چھوڑتا ہوں لیکن اُن کی نوعیت اسی قسم کی ہے۔ مختصر الفاظ میں بنیادی بات یہ سمجھ لیجئے کہ سوشلسٹوں کے تمدنی اور سماجی فیصلے کسی مفتی، قاضی، مہاتما، قائد اعظم یا کسی دوسرے فرد واحد کے تابع نہیں ہوتے۔ اس سماج میں مزدور اور محروم لوگ کامیاب انقلاب کے بعد اور انقلابی جدوجہد سے تربیت پاکر تمام فیصلے جمہوری طور پر کرتے ہیں اور میری تسکین کے لئے یہ حدیث کافی ہے کہ

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ

یعنی امت گمراہی پر جمع نہیں ہوتی۔ اجتماعی فیصلے شخصی اور مستبد حکومتوں یا محدود طبقۂ اُمرا کے فیصلوں سے بہر نوع زیادہ بہتر اور مفید ہوں گے۔ اور اس لحاظ سے سوشلزم کا نظام جمہوریت اور انسانیت کی تکمیل اور اخلاق وروحانیت کی آخری منزل ہے۔ اس کی بنیاد ذہنی منصوبے یا تصورات نہیں بلکہ سماجی جدوجہد کے حقائق اور زندگی کے صحیح اور ترقی پسند تقاضے ہیں۔

عقل

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد!
گوارا ہے اُسے نظارۂ غیر
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد!

بہ افرنگی بتاں خود را سپردی
چہ نامردانہ در بتخانہ مُردی
خرد بیگانۂ دل، سینہ بے سوز
کہ از تاکِ نیاگاں می نخوردی

(اقبال)

ہم کیا چاہتے ہیں؟

(از جناب منظر رضوی، اسسٹنٹ سکریٹری بہار سوشلسٹ پارٹی)

سوشلزم کے اصول کا رنصب العین اور اس کی ضرورت و اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ مضمون بہت مفید ہو سکتا ہے مضمون نگار عملی سوشلسٹ ہیں اور اس لئے یہ مضمون سوشلسٹوں کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ایڈیٹر)

بظاہر یہ سوال کچھ معنی نہیں رکھتا، کیونکہ دنیا میں سبھی لوگ ایسے ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں جو کچھ چاہتے ہیں اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر اسے حاصل کرنے کی اندھی کوششیں ضرور کرتے رہتے ہیں، مثلاً ہر شخص ہے کہ روٹی کا متلاشی ہے، روٹی کے ساتھ ساتھ اسے بیٹی (یعنی عورت) کی بھی جستجو ہے۔ زر، زن، زمین کے قصے تو ہم اپنے باپ دادا کی زبانی سنتے ہی آئے ہیں، زر اور زمین روٹی کا مرادف ہے اور زن، بیٹی کا۔ تو روٹی اور بیٹی کا قصہ آج کچھ نیا نہیں۔ ہم جو اس کے چرچے کرتے ہیں اس میں بھی نہ کوئی جدت ہے، نہ مغربیت کا جذبہ اور نہ لامذہبیت کا جوش۔ بات سیدھی سادی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے رہنے کو گھر پختہ ہو، کھانے اور پہننے کو اتنا ہو کہ تکلیف نہ ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ حوا کی ایک بیٹی بھی ہو جو رفاقت کا ثبوت دے، انیس مونس اور غمگسار بن سکے۔ اتنی سی بات ہے جس کے لئے ایک مفسر اور محدث سے لیکر معمولی درجہ کا آدمی بھی کوششیں کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک محدث کی کوششوں سے توحید پرستی، خدا ترسی، الوہیت، تصوف، روحانیت وغیرہ جیسے تمام تصورات وابستہ ہوتے ہیں اور ہمارے جیسے ادنیٰ درجہ کے انسان میں دہریت، نیچریت، مغربیت، اور سب سے زیادہ الوہیت اور خدائی کے وجود سے انکار کا "جذبہ"؛ ایک لفظ میں وہ مذہبی اور ہم لامذہب ہیں۔ بات مزے کی ہے مگر اس بحث کو چھوڑیے۔

ایک پردہ پوشی

سوال یہ ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ جو کچھ چاہتے ہیں وہ صاف ہے۔ روٹی اور بیٹی۔ مگر آپ اپنا لٹریچر پڑھئے، اردو اخبارات اور رسائل، بڑی بڑی کتابیں، شعر و شاعری کے دیوان، افسانوں کی جلدیں۔ ان میں اس چاہ کی جھلک ملتی ہو یا نہ ملتی ہو مگر نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس چاہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو "مسلمانوں کا روشن مستقبل" یا "مسلمانوں کی سیاست وطنی" پڑھ ڈالئے۔ تمدن اور کلچر نہایت بلند اصطلاحیں ہیں اور ان کی برکات سے ہر سماج اور سماج کا ہر فرد فیضیاب ہونے کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن جس سماج کو ضرورت بھر روٹی اور بیٹی نہ ملتی ہو اس کا تمدن اور کلچر کی باتیں کرنا حماقت ہے۔ کلچر اور تمدن کی ابتدائی اور بنیادی منزل یہ ہے کہ سماج میں خوشحالی ہو۔ گھر میں چراغ جل چکے تو مسجد کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ سوکھی ہوئی انتڑیاں یونیورسٹیوں اور درسگاہوں کو آباد نہیں کر سکتی ہیں۔ بھوکے پیٹ کی تسکین ارسطو کے فلسفوں اور مذہب کی تعلیم سے نہیں ہو سکتی۔

ہمارا سماج

ہم نے شروع ہی میں کہا ہے کہ ہم اپنی چاہ کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے حاصل کرنے کی اندھی کوششیں ضرور کرتے ہیں۔ اس کوشش اور اسکے بنیادی . . . مفہوم کو ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کوشش کیا ہے، اور کس چیز کے لئے ہے؟ اس کو آپ بھی سمجھ لیجئے تو مجھ سے آپ اتفاق کریں گے۔ ہمارے سماج میں اقتصادی حالات کے اعتبار سے کئی سیڑھیاں ہیں۔ سب سے نیچے ایسے لوگ ہیں جن کی اپنی کوئی ملکیت نہیں ہے، انکے پاس دولت بھی نہیں، گھر بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ کھیتوں میں ڈیڑھ آنے سے تین آنہ روزانہ مزدوری تک کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی کچھ مادی ضرورتیں ایسی شدید ہیں کہ یہ مسجد و مندر کے جھگڑوں سے آزاد ہو کر ڈیڑھ آنہ سے تین آنہ تک کمانا ہی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ صنعتی مزدور بھی ہیں ان کی حالت بھی کم و بیش یہی ہے اور وہ بھی کچھ کمانے کو ہی اپنا فریضہ تصور کرتے ہیں۔ اس طبقہ کے اوپر کسان ہیں جن کی اپنی کچھ چھوٹی موٹی ملکیت ہے۔ مگر زمینداروں، پولیس اور حکومت کے دباؤ سے یہ بہت چور اور خستہ حال ہیں۔ یہ بھی محنت ہی کر کے اپنی مادی ضرورتوں کو حاصل کرنا جانتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں اکثریت، تقریباً ۹۰ فیصدی کی اکثریت، اسی طبقہ کی ہے۔ اسی سماج میں ہمارے رجواڑے بھی ہیں۔ تعلقدار، زمیندار، مہاجن، بنیے، چھوٹی حیثیت کے تاجر اور دکاندار۔ ان سب کی بنیادی مانگ مادی ضرورتوں پر مبنی ہے۔ روٹی، کپڑے، آرام و آسائش کی چیزیں اور جنسی لطافتوں کے لئے عورت بھی تو چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ لگان لینے کی کوشش، مزدوروں کو کم سے کم اجرت دینے اور زیادہ سے زیادہ کام لینے کا رواج، سود پر قرضے کا انتظام، منافع پر چیزوں کو بیچنا اور عورتوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان چاہے خدا ترس اور دیندار ہو اور رہا ہے ان چیزوں سے بے پروا، اس کی نیت، اس کا حوصلہ، اس کی آرزو، تمنا، چاہ صرف ایک ہی شے کے لئے ہوتی ہے۔ روٹی اور بیٹی کے لئے۔ اس چاہ کو پورا کرنے کی شکل میں اور اس کے طریقوں میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن خود چاہ میں، مقصود بالذات میں، کوئی فرق نہیں۔ مثلاً ایک زمیندار یا مل مالک کو لے لیجئے۔ دونوں ہی اپنے حوصلے، اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے مزدوروں کو کم سے کم اجرت دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں، کسانوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں، اگر آسانی سے وصول نہ ہوں تو قانونی کارروائیوں سے لے کر لاٹھی ڈنڈوں پر اتر آتے ہیں۔ وہ حکومت کی مشنری پر حاوی ہونے کے لئے الکشن لڑتے ہیں، اپنی وزارت بناتے ہیں اور اپنی برادری —— سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ —— کے مفاد کو سامنے رکھ کر قوانین بھی بناتے ہیں۔ ان کے بیٹے بھتیجے سرکاری ملازمتوں میں ہوتے ہیں اور قانون کی تفسیر اور اس کا نفاذ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ ان کی برادری ابدالآباد تک خوشحال اور پھلتی پھولتی رہے۔ وہ ایک ایسے فلسفے کی تدوین کرتے ہیں جس کو پڑھ کر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ جائز، درست اور روا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ان تمام اعمال کو مشیت ایزدی کا نتیجہ بتا کر انھیں مذہبی تقدس کا درجہ دیدیتے ہیں تاکہ عام لوگ اس کی مخالفت کرنا گناہ سمجھیں اور اس کے سامنے سر جھکا دیں۔

طبقاتی کشمکش

لیکن ان سب کے باوجود نچلے یعنی محکوم طبقے وقتاً فوقتاً ان قوانین اور نظام سے سرکشی کرتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں زمینداروں کے خلاف بلوے ہوتے ہیں، لگان بندی ہوتی ہے، اور کہیں سرمایہ داروں کے خلاف بڑی بڑی ہڑتالیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محکوم طبقہ اس حاکمی اور خدائی کے سامنے سر جھکانے کے لئے تیار نہیں۔ اس کی مادی ضرورتیں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اڑا دے۔ ملکیت والے طبقہ کا اقتصادی جبر اور دباؤ (جو سیاسی شکل اختیار کر لیتا ہے) بے ملکیت والے طبقہ کی سرکشی اور بغاوت کا ذمہ دار ہے۔ ایک طرف جبر اور دباؤ کی قوتیں ہیں جن کے ساتھ مٹھی بھر لوگ قانون، انصاف اور "مذہب" کی آڑ پکڑ کر ایک بے پناہ اور لاتعداد اکثریت پر جبر اور ظلم کرتے ہیں اور دوسری اس جبر و ظلم کا سدباب کرنا چاہتی ہے۔ دونوں قوتوں میں کشمکش ہوتی ہے، جنگ و پیکار ہوتی ہے۔ اسی کشمکش، اسی جنگ و پیکار، کو ہم طبقاتی کشمکش یا طبقاتی جنگ کہتے ہیں۔

اس کشمکش کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ وجہ تو نہیں ہو سکتی کہ چند آدمیوں نے ملکر ایک حکومت قایم کر لی اور ایک نظام کی بنا ڈالدی اور ساری دنیا اس سے بگڑ گئی اور اسے غارت کر دینے پر آمادہ ہو گئی۔ حکومت کا قائم ہونا یا کسی نظام کا بن جانا تو دوسری حقیقتوں کی شکل ہے۔ وہ خود کوئی حقیقت نہیں۔ سماجی نظام تو ایک کھوپڑی ہے جس میں ایک خاص قسم کا مغز ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مغز کیسا ہے؟ اس کھوپڑی کے اندر پہلی خصوصیت جو ہمیں نظر آتی ہے وہ نابرابری —— سماجی نابرابری —— ہے۔ آپ اسے اسلامی اصطلاح میں عدم مساوات بھی کہہ سکتے ہیں۔ درجہ اور رتبہ کی نابرابری، کلچر اور تمدن کی نابرابری، ترقی کے مواقع کی نابرابری، زندگی کی نعمتوں اور برکتوں کے تقسیم میں نابرابری —— غربت، بھوک، گندگی، بیماری اور جہالت ایک طرف انسانیت کی ان گنت اکثریت کے لئے۔ اور دوسری طرف دولت، راحت، عشرت، مستی، شباب، کلچر، رتبہ، اختیار اور اقتدار انسانیت کی ایک چھوٹی سی اقلیت، ایک چھوٹی سی انسانی آبادی کے لئے۔ دولت اور غربت، عزت اور ذلت کا یہ فرق آپ کو اس بدنصیب ہندوستان سے زیادہ کہاں نظر آسکتا ہے؟

نابرابری کی یہی حقیقت ہمارے سماج کا مرکزی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش ہر زمانہ اور ہر ملک میں کی گئی ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں گذرا جس نے ان سماجی حقیقتوں کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ نبیوں اور رسولوں سے لیکر روسو، والٹیر اور ہیگل تک نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات اسی پر قربان کئے۔ مساوات، عدل، انصاف، سچائی، ہمدردی، خیرات وغیرہ اسی جذبہ انسانیت کے نتیجے ہیں۔ غربت اور غریبوں کی شان میں اچھی اچھی رنگین اور سکون بخش اصطلاحات اور امیری کی مذمت اسی کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ سود کی حرمت خود ایک عملی کوشش ہے اس فرق کو مٹانے کی، گو کہ غیر موثر!

لیکن سوشلسٹ اس مسئلہ کو نئے ڈھنگ سے دیکھتا ہے۔ وہ سماج کے اس مرض کی جڑ کو تلاش کرتا ہے تاکہ اسے اکھاڑ کر نابرابری کی پیدائش ہی کو روک دے۔

دولت کا ذریعہ

یہ نابرابری کیوں ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے ہمیں دولت کے پیدا اور اسکے جمع ہونے کے طریقہ کو سمجھنا پڑے گا۔ ایک اور سوال اُٹھتا ہی، دولت کے وسائل کیا ہیں؟

ہم جانتے اور دیکھتے ہیں کہ ایک طرف آدمی ہے، اور اس کی محنت اور عقل بھی ہے۔ دوسری طرف قدرت ہے جس کی گود میں دولت پوشیدہ ہے۔ انسان کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے قدرت کا سینہ چاک کرنا پڑتا ہے۔ اسے اپنی قوت، محنت کی قوت صرف کرنی پڑتی ہے جتنی اتنی ہی زیادہ دولت پیدا ہوگی۔ دولت کی کثرت، پیدا کرنے کی قوت پر منحصر ہے۔ یعنی اوزار کی نوعیت اور کام کرنے کے طریقہ پر۔ اگر آدمی اپنی ضرورت بھر ہی دولت پیدا کرتا تو دولت خرچ کرکے بچ نہیں سکتی تھی۔ یعنی بچت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے دولت جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ضرورت سے زیادہ پیدا کی جائے۔ یعنی انسان کی پیدا کرنے کی قوت (Productive Power) اتنا ترقی کرجائے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ پیدا کرسکے۔

پرانے سماجوں میں جب انسان قدرت کی اندھی قوتوں سے خائف ہو کر اس کے سامنے سرنگوں ہوجاتا تھا تو اس وقت، دولت اتنی کم پیدا ہوتی تھی کہ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد کچھ بچتی ہی نہ تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ شکار، ماہی گیری اور باغبانی کے طریقوں میں ترقی ہوئی تو انسان اتنا پیدا کرنے لگا کہ اس میں سے کچھ بچا لینے کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔ وہ کچھ نہ کچھ بچا کر جمع کرنے لگا۔ مگر اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ اس وقت افراد کو کام کرنے کی آزادی تھی۔ وہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی روک ٹوک کے قدرت کا سینہ چاک کر سکتا تھا۔ اس کے اپنے اوزار بھی ہوتے تھے۔ اور وہ جو کچھ پیدا کرتا تھا اسے اپنے لئے رکھ لیتا تھا۔ اس طرح ہر صحیح اور توانا شخص کم سے کم اپنی ضرورت بھر دولت پیدا کر لیتا تھا۔ دولت کا جمع ہونا پیداوار اور خرچ کے فرق پر منحصر ہے۔ کوئی اپنی سب دولت خرچ کر دیتا تو اس کو کچھ نہ بچتا۔ اور کوئی کم سے کم خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ بچا لیتا۔ اس سماج میں کوئی بھوکوں نہیں مرسکتا تھا بشرطیکہ وہ کام کرتا ہو، اپنے اوزار رکھتا ہو اور اپنی پیداوار کو اپنی ہی ذات پر خرچ کرتا ہو۔

لیکن آج حالت دوسری ہے۔ دولت پیدا کرنے کا طریقہ نہ صرف بدل چکا ہے بلکہ اپنی ترقی اور عروج کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ بھاپ اور بجلی کی قوت نے اس طریقہ میں انقلابی تبدیلیاں کردی ہیں۔ جو کام دن بھر میں ہوتا تھا وہ ایک گھنٹہ میں ہو رہا ہے۔ ایک آدمی نہایت آسانی سے اپنے خرچ سے زیادہ پیدا کرسکتا ہے حالانکہ زندگی کی ضرورتیں اب بڑھ گئی ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہندوستانی کسان بھی اپنی ضرورتوں سے زیادہ پیدا کر لیتا ہے حالانکہ وہ ٹریکٹر بھی استعمال نہیں کرتا اور نہ اسے آبپاشی کی آسانیاں حاصل ہیں۔ لیکن اس کثرت پیداوار کے باوجود بھی ہم اسے غربت اور افلاس ہی میں مبتلا پاتے ہیں دوسری طرف ہم ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جو کچھ کرتے دھرتے نہیں تاہم نہ صرف ان کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں بلکہ وہ نہایت ہی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

دولت پیدا کرنے کی قوتوں میں جو ترقی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے ہونا یہ چاہیے تھا کہ نہ صرف زندگی کی ضرورتیں پوری ہوجائیں بلکہ کچھ جمع بھی ہوتا رہے لیکن صورت یہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اب اپنے لئے کام نہیں کرتے، دولت کے وسائل تک اب انکی رسائی نہیں ہے، اوزار پر بھی زیادہ تر ان کا قبضہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ وہ پیدا کرتے ہیں اسے اپنے لئے رکھ نہیں پاتے۔ ایسی تبدیلی کیسے ہوئی؟ یہ تو ایک لمبی کہانی ہے جسے اس وقت چھوڑیئے۔ اس وقت تو ہمارے لئے صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ حقیقت ہے، ایک ایسی حقیقت جسے ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکثریت کی غربت کی وجہ یہ ہے کہ دولت کے وسائل اور (کان، کھیت، سمندر وغیرہ) اوزار (یعنی مشینیں وغیرہ) وغیرہ ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ انھیں اسکی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور جتنا زیادہ وہ ادا کرتے ہیں اتنا ہی کم حصہ ان کو ملتا ہے۔ مثلاً کسان کو لیجئے۔ اسے مالگذاری اور لگان سے لیکر موٹرانے، نذرانے اور منتھیانے تک ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مہاجنوں، پنڈتوں، پروہتوں اور مولویوں کا حصہ الگ ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ قیمتیں ادا کرسکتے ہیں انھیں کو زمینیں مل سکتی ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس صرف محنت کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ اس طاقت کو کسی کان، کارخانے یا کھیت میں جا کر فروخت کرتے ہیں۔ اگر دولت کے وسائل ہر شخص کو حاصل ہوتے تو سماج میں غربت اور دنیا خالی نہ ہوتی۔

اقلیت کا اقتدار: استحصال

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر امیر لوگوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنی محنت سے حاصل کی تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ اول تو وہ کبھی کوئی کام کرتے ہی نہیں۔ اور اگر کرتے بھی ہوں تو ایک شخص میں اتنی صلاحیت نہیں ہو سکتی کہ دوسرے شخص کے مقابلے میں لاکھ گونہ اور کروڑ گونہ زیادہ پیدا کرلے۔ فرق ہو سکتا ہے، مگر ایسا نمایاں نہیں۔ کیونکہ دونوں جب ایک ہی سماج کی ایک ہی حالت میں رہ کر کام کرتے ہیں تو اتنا بڑا فرق کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کفایت شعاری کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے، کیونکہ کفایت شعاری اور اقبال مندی کسی خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ چلنے والی چیز نہیں۔ اور نہ صرف کفایت شعاری سے اتنی بڑی دولت جمع ہو سکتی ہے۔ آجکل جن لوگوں کو ہم دولت کا مالک دیکھ رہے ہیں وہ ان کے باپ دادا کے ترکوں کا نتیجہ نہیں ہے، خاصکر کے صنعتی دولت کے متعلق تو یہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ دولت کا راز نہ تو نسل و خون میں پوشیدہ ہے اور نہ شخصی لیاقت اور صلاحیت میں۔ دولت، **استحصال** پر مبنی ہے۔

فاضل دولت

ہمارے سماج میں امیروں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک زمینداروں کی اور دوسرے صنعتی سرمایہ داروں کی۔ کسی نہ کسی طرح زمینداروں نے کھیتوں پر اپنا اجارہ قایم کرلیا ہے۔ اس اجارہ کی وجہ سے وہ کسی کو زمین پر اس وقت تک غلّہ اپجانے نہیں دیتا جب تک غلّہ اپجانے والے یہ وعدہ نہ کرلیں کہ وہ پیداوار کا ایک معقول حصہ اس کو ادا کریں گے۔ اس طرح وہ زمین کے ٹکڑے کرکے بہت سے کسانوں کو دیدیتا ہے۔ اب جو لوگ غلہ اپجاتے ہیں وہ زمین کے اس "خدا" کو بڑی بڑی رقمیں ادا کرتے ہیں۔ ایک اکیلے کسان کے مقابلہ میں اس زمیندار کی دولت، جسے کئی کسانوں سے ایک وقت میں بہت سی رقمیں ملجاتی ہیں، کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح ایک کارخانہ دار ہے جو، فرض کیجئے، دو سو آدمیوں کو اپنے کارخانہ میں نوکر رکھ لیتا ہے۔ ان سے خوب کام لیتا ہے اور انہیں بہت تھوڑی سی رقم نان نفقہ کے لئے دیتا ہے۔ اور انہیں ادا کرنے، اور مال پیدا کرنے پر جو اور دوسری مدات میں رقمیں خرچ ہوتی ہیں ان سب کو ادا کرکے جو فاضل رقم بچتی ہے وہ سب خود کارخانہ دار رکھ لیتا ہے۔ اس طرح اس کارخانہ دار کی دولت دو سو گنا زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اب جتنے زیادہ مزدور اس کے ہاں ہوں گے اتنا ہی زیادہ دولت اس کی بڑھیگی۔

دولت حاصل کرنے کے اسی طریقہ کا نام **استحصال** ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ دنیا اتنی بیوقوف کیوں ہے کہ چند آدمیوں کی اس چالاکی کا شکار ہو جاتی ہے؟ اور اپنی محنت کے پھل کو اس طرح گنوا دیتی ہے؟ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا کی اکثریت بیوقوف ہے جو ایسا ہونے دیتی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ کوئی شخص خوشی سے اپنی محنت کے پھل کو ضائع ہونے دینا نہیں چاہتا۔ یہ اکثریت کی مجبوری اور بیچارگی ہے جو ایسی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ اس مجبوری و بیچارگی کی وجہ جاننی ہو تو انسانیت کی سماجی اور سیاسی تاریخ اور سماجوں کی نشو و نما کی کہانی پڑھئے۔

انسانی سماجوں میں جہاں کہیں جنگل کاٹنے، اور کاشتکاری کرنے کی آزادی تھی کہیں بھی کوئی شخص دوسرے کے لئے محنت مزدوری نہیں کرتا تھا۔ ہاں یہ ہوتا تھا کہ کسی نے غلہ اپجایا ہے تو اس میں سے کچھ غلہ جولاہے کے ہاں لیجا کر کپڑوں سے بدل لیا۔ یہ باہمی دوستی اور امداد کا نتیجہ تھا۔ طبقاتی لوٹ اور ڈکیتی کا نتیجہ نہیں لیکن رفتہ رفتہ ان وسائل دولت پر اجارے قایم ہونے لگے۔ ایک گھرانے نے دوسرے گھرانے پر تشدد کیا اور اپنی طاقت سے زمین کے بڑے بڑے رقبوں پر چھا گیا۔ گھرانوں نے خاندان کی شکل اختیار کی، خاندانوں نے قبیلہ کی اور قبیلوں نے قوم کی۔ مالک بنکر قدرت پر چھائے، دولت پر چھائے، آدمیوں کو غلام بنایا، انسانوں کا بیوپار کیا۔ یا زیادہ مہربان ہوئے تو "آزاد" لگان دہندی کا رواج قایم کیا۔ جیسے جیسے پیداوار میں ترقی ہوتی گئی، اور شہر پیدا ہوتے گئے ویسے ویسے صنعت میں بھی یہ افراتفری مچنے لگی۔ غلام اور انفرادی دستکاروں کو ایک آقا کیلئے کام کرنا پڑا کیونکہ اقتصادی بربادی کا تقاضا تھا کہ کسی طرح پیٹ بھرے۔ انفرادی کارگاہوں کی اب گنجائش نہیں تھی۔ لوگوں کی یہ حیثیت تھی ہی نہیں کہ اپنا اوزار رکھ سکیں۔ کام تو کر سکتے تھے مگر اوزار کہاں سے آتے۔ روٹی تب ہی مل سکتی تھی کہ محنت کو اوزار سے نتھی کیا جائے، اسکے لئے نوکری کرنا ضروری تھا۔ استحصال کا سلسلہ جاری تھا کہ صنعتی انقلاب ہوا۔ بھاپ کی قوت نے استحصال کی اس زنجیر کو اور بھی زیادہ سخت کر دیا۔

ہمارے سماج میں کچھ اور طبقے بھی ہیں جو نہ تو مزدوروں کی محنت کا استحصال کرتے ہیں اور نہ کسانوں سے لگان وغیرہ وصول کرتے ہیں جب بھی وہ دولتمند ہیں اور بڑے عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں تاجر، ساہوکار، دلال، وکیل، بیرسٹر وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ حضرات نہ تو خود دولت پیدا کرتے ہیں اور نہ کسی کا براہ راست استحصال ہی کرتے ہیں۔ ان کے پاس دولت کہاں سے آتی ہے؟ ان لوگوں کی دولت فوری طور پر چاہے کسی ذریعہ سے آتی ہو لیکن وہ ہوتی ہے سماج ہی کی دولت کا حصہ۔ یہ طبقے اس استحصال کے نظام کی حمایت اور حفاظت کرتے ہیں، استحصال کی مشینری کو متحرک رکھتے ہیں اور جو فاضل رقم بچتی ہے اسی میں سے انکو ملتا ہے۔

سرمایہ داری کا کھیل

دولت، جیسا کہ کہا جا چکا ہے، محنت اور وسائل پیداوار کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے۔ دولت کا جو حصہ محنت کرنے والوں کو دیدینے کے بعد بچ جاتا ہے وہ مالک اور استحصالی طبقہ کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ طبقے ان چیزوں کو جو محنت کرنے والے (مزدور) پیدا کرتے ہیں خود استعمال نہیں کر سکتے۔ ان چیزوں کو فروخت کرنا اور دوسری چیزوں کو خریدنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسی خرید و فروخت سے ملکیت والا طبقہ مزید مال کو تیار کرنے اور اپنے کارخانہ کو چلانے کا کام جاری رکھتا ہے وہ اس خرید و فروخت کے چکر میں نہ پڑتا اگر اسے اپنے فائدہ کا یقین نہ ہوتا۔ اب ملکیت والے طبقہ کو اپنا کام جاری رکھنے کے لئے اپنی فاضل رقم میں سے ان تاجروں کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ساہوکاروں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ سود سے ان کو جو منافع ہوتا ہے وہ بھی دراصل مال کے تیار ہونے کے سلسلہ (Process of manufacture) میں نکلتا ہے یعنی ملکیت والوں کی فاضل رقم میں سے آتا ہے۔ تاجروں اور دکانداروں کے منافع، بینک والوں اور مہاجنوں کا سود اور دوسرے درمیانی لوگوں مثلاً ایجنٹ وغیرہ کا کمیشن بھی اسی فاضل دولت سے آتا ہے۔ روپیہ خود روپیہ نہیں پیدا کرتا ہے اور نہ کسی طرح مالیاتی یا تجارتی جوا بازی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ کاروبار کے ان سارے کھیل تماشوں میں ہر شخص کی (یعنی نظام سرمایہ داری کے ہر بازو کی) یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ فاضل دولت کا بڑے سے بڑا حصہ خود ہڑپ کر لے۔ سرمایہ دارانہ مقابلہ اور اس کے پیچیدہ کاروباری طریقے کا راز اسی میں (یعنی فاضل دولت کے استعمال میں) پوشیدہ ہے جس کی تعلیم ہماری بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے۔ اور جس کی وکالت عدالتوں میں کی جاتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ یہ درمیانی حضرات روپیے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے "روپیے پیدا کرنے" کا راز صرف اسی قدر ہے کہ وہ سماج کی پیدا کی ہوئی دولت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔ اور اس دوران میں بڑے سے بڑا حصہ خود ہتھیانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ سماجی نابرابری کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دولت کے تمام وسائل پر چند لوگوں کی شخصی ملکیت قائم ہو گئی۔ اسی سے اب اقتصادی استحصال ہو رہا ہے۔ مزدور جو کچھ پیدا کرتا ہے اس میں سے اسے بہت کم ملتا ہے، اتنا کم کہ زندگی کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ بقیہ دولت سے وہ محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس اقتصادی استحصال کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو بلاواسطہ جیسا کہ صنعتی اداروں میں ہوتا ہے اور دوسرا بالواسطہ جیسا کہ زراعت اور کاشتکاری میں ہوتا ہے۔

عورت!

روٹی کی محتاجگی کی تاریخی وجہ یہی ہے۔ رہ گیا بیٹی کا سوال سو اسکی ثانوی اہمیت ہے کیونکہ ہماری بیٹیاں سماجی حیثیت سے انہیں دو طبقوں میں سے کسی ایک نہ ایک سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض حالات میں وہ خود استحصالی ہیں اور بعض حالات میں مستحصل لیکن عورت ہونے کی حیثیت میں ان کا ایک مخصوص مسئلہ ہے۔ آج کل کے سماج میں ہماری عورتوں کی جس طرح عصمت ریزی اور آبرو کی خرابی ہو رہی ہے اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سماج میں عورتوں کا درجہ اتنا گرا ہوا ہے کہ انکی حیثیت تقریباً غلاموں کی سی ہے کیونکہ عورتیں اپنے معاش کے لئے مردوں کی محتاج ہیں۔ وہ ان کی محکوم ہیں۔ عورت پیدائش کے بعد سے موت تک کسی نہ کسی حیثیت میں مردوں کی محتاج ہوتی ہے۔ ان کی شادی بیاہ کی فکر خاص طور پر اس لئے کی جاتی ہے کہ ان کی زندگی کی مادی ضرورتوں کو مہیا کرنے والا کوئی مرد پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ماں باپ کے سامنے ہر وقت یہی سوال رہتا ہے کہ بیٹی کا بوجھ کیسے ہلکا ہو۔ نوجوانوں کو ہمیشہ یہ فکر رہتی ہے کہ بیوی ایسی ملے جس کے ماں باپ انگلینڈ کا خرچ دے سکیں یا کم سے کم زر و جواہر ہی ہاتھ لگے۔ اسی کو ہم عصمت فروشی کہتے ہیں جس میں عورت اور مرد سے لیکر ماں باپ تک شامل ہوتے ہیں۔ خود عورتوں کے سامنے ایک محکوم اور مایوس زندگی کے بعد دوسری محکوم اور مایوس زندگی کے نقشے ہوتے ہیں۔ اب اگر بیاہ کے بعد یعنی کابک کے کبوتر اور کبوتری کی طرح بند کر دیے جانے کے بعد، ان جوڑوں میں بن نہ سکی، جیسا کہ عام طور پر (تقریباً نوے فیصدی حالات میں) ہوتا ہے، تو ساری زندگی تباہ، یہ بد نصیب خود طلاق نہیں لے سکتیں کیونکہ نہ تو انکو بیاہ کرنے والا کوئی دوسرا ملتا ہے اور نہ خود ان کے پاس ضروریات زندگی کی کفالت کے سامان ہی ہوتے ہیں۔ اور اگر شوہر نے طلاق دیدی (جو اتفاقاً کبھی نہیں دیتا) تو ساری زندگی کلفت کے عالم میں آہیں بھرتے بسر ہوتی ہے۔ اس محکومی اور مجبوری کی وجہ سے عورت کی ہمارے سماج میں کوئی وقعت نہیں ہے اور وہ مردوں کے عیش و عشرت کا سامان بن کر رہ جاتی ہے۔ کسبیوں کا وجود عورتوں کی سماجی پستی اور نسوانیت کی تذلیل کی ایک بدترین اور نہایت ہی تکلیف دہ مثال ہے جس کی بنیادی وجہ اس کی معاشی محتاجی اور بیچارگی ہے۔

ہم انہیں دونوں مسئلوں کے حل کے تلاشی ہیں۔ یہ دونوں مسئلے دراصل ایک ہی ہیں، کیونکہ یہ دونوں سماج کی اقتصادی نابرابری کے نتائج ہیں۔ اگر ہم اس اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو زندگی کی ازسرنو تعمیر ہو سکے گی۔ نہ صرف غربت اور ازدواجی زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے بلکہ ان سے ایک سچے تمدن اور کلچر کی بنیاد پڑ سکے گی۔ جس سے سماج کا ہر فرد بشر متمتع ہو سکے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حالات کو پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کے دو ممکن جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سماج کی ازسرنو اس طرح تشکیل کی جائے کہ اس میں ہر شخص اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے محنت کرے۔ وہ کھیت (بغیر لگان اور مالگذاری وغیرہ کے) جوتے یا اپنی کارگاہ میں اوزار کے ذریعہ کوئی چیز بنائے۔ اس سماج میں کسی شخص کو دولت اور پیداوار کے بڑے بڑے وسائل پر قبضہ رکھنے کا موقع نہ ہو مشینوں، کارخانوں، ملوں ——— اور بجلی اور بھاپ کے اوزاروں میں آگ لگا دی جائے۔ ان کے بجائے اگلے زمانہ کی طرح ہر شخص اپنا اپنا کام معمولی معمولی اوزاروں سے کرے۔

لیکن ——— ایسا کرنے کے لئے بڑی بڑی تبدیلیاں اور افراد پر بڑی بڑی پابندیاں عائد کرنا پڑیں گی۔ اس میں ایسے ایسے قوانین اور ضابطے بنانے پڑیں گے جو موجودہ قدیم طرز کے اقتصادی نظام میں نہیں بنتے اور نہ بن سکتے ہیں لیکن اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سماج میں رہ کر ہم بہت سی اچھی اور مفید چیزوں سے محروم ہو جائینگے۔ مثلاً اس سماج میں ریل گاڑیاں، ہوائی جہاز، تار برقی، ریڈیو، بولتی تصویر ان سب میں سے کسی کا وجود نہیں ہوگا۔ فوجی نقطۂ نظر سے اگر دیکھئے تو یہ صاف بات ہے کہ ایسا سماج آزاد بھی نہیں رہ سکتا۔ اعلیٰ درجہ کے صنعتی مالک اسے لوٹ کر اپنا غلام بنالیں گے جیسے ابی سینیا بنالیا گیا (حالانکہ وہ ہمارے اس مفروضہ سماج سے زیادہ جان رکھتا تھا) پھر ہماری زندگی بھی کچھ عجیب منحوس لوگوں کی سی ہوگی۔ ہم سب لوگ نیم برہنگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ قدیم زمانوں کے وحشی انسانوں کی طرح یا ہمالہ کے رشیوں کے مانند۔ کیونکہ ہم مشینوں کو چھوڑ کر دولت کم ہی پیدا کر سکینگے جس کا اوسط فی کس اتنا کم ہوگا کہ ایک بہت کم معیار کی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ اور اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے سوال کا یہ جواب کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اصل سوال کا جواب تلاش کرنے سے بھاگنا اور جی چرانا ہے۔ آجکل جو لوگ رام راج اور تنظیم زکوٰۃ کی باتیں کرتے ہیں وہ بھی جی چرانے والے اور حقیقت سے چشم پوشی کرنیوالے حضرات ہیں۔

ترقی اور تمدن کی راہ

اقتصادی نابرابری یا دولت کے مخصوص ہاتھوں میں اکٹھا ہونے کا جو تجزیہ ہم نے پیش کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں، ہم کس طرح اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے:

وسائل دولت کی شخصی ملکیت کی منسوخی اور سماج کی اجتماعی یا مشترکہ ملکیت کا قیام۔

شخصی ملکیت کی منسوخی اور سماجی ملکیت کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اقتصادی استحصال کو ختم کر دیتے ہیں، اقتصادی نابرابری کی لعنت کو دور کر دیتے ہیں جس کے بعد سماج کی تمام برائیوں اور بیماریوں کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں دولت اور وسائل دولت کے اکٹھا ہونے سے ہی استحصال ہوتا ہے، اور استحصال ہی کی وجہ سے اکثریت میں غربت اور فاقہ کشی آتی ہے۔ لیکن شخصی ملکیت کو اڑا کر سماجی ملکیت کو قائم کر دینے کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی آدمی کا اور اسکی محنت کا شکار نہیں کر سکے گا۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے لئے کام نہ کریگا بلکہ ہر آدمی اپنے اپنے لئے کام کریگا۔ وہ بھی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ اجتماعی طور پر۔ اور جو کچھ سب آدمی ملکر پیدا کرینگے وہ کسی ایک مالک کے منافع کیلئے نہیں ہوگا، اور نہ تھوڑی سی اجرت حاصل کرنے کے لئے ہوگا بلکہ اپنی مشترکہ سماجی ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے ہوگا۔ اس سماج میں ساری دولت مشترک ہوگی اور اسکی تقسیم ہر آدمی کے کام اور ضرورت کے مطابق ہوگی۔ ہر آدمی اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق کام کریگا۔ بوڑھے، لنگڑے لولے لوگ بیٹھکر کھائینگے۔ زچگی کے زمانوں میں عورتوں کے وظیفے مقرر ہونگے انہیں کوئی کام کرنا نہیں پڑیگا۔ سماجی دولت کا تھوڑا سا حصہ راج کلج، اسکول اور یونیورسٹی، ہسپتال، آرام اور سیر و تفریح کے پارکوں، اقتصادی ترقی اور دوسرے سماجی مفاد پر صرف ہوگا۔ عورتیں عصمت فروشی کے لئے نہیں بیاہی جائینگی۔ اقتصادی آزادی حاصل کرکے وہ برابری کا درجہ پائینگی۔ اسی وقت عورتوں اور مردوں میں اصلی رفاقت اور سچی محبت پیدا ہوگی۔ ازدواجی محکومی اور غلامی ختم ہو جائیگی اور انکے باہمی تعلقات میں ایک اطمینان بخش استقلال اور رشتہ میں مسرت آفریں مضبوطی پیدا ہوگی۔ عورتوں میں ایک مستقل شخصیت اور ایک جاندار انفرادیت پیدا ہوگی۔ زندگی کے ہر شعبہ کی ترقی میں، تمدن کی آرائش اور علم و ادب کی سجاوٹ میں وہ مردوں کا ہاتھ بٹائینگی۔ ایسے ماحول میں یہ بات وہم و گمان میں نہیں آسکتی کہ کوئی عورت روپے کی خاطر اپنے جسم اور عصمت کو کسی مرد کے ہاتھوں فروخت کر دے۔

اس سماج میں آج کی سماجی قیمتیں فنا ہو جائینگی۔ اسوقت نئی نئی قیمتیں ہونگی قیمتوں کے نئے تصورات ہونگے ان تصورات کے تحت ہمارے سامنے نئے نئے مسائل پیدا ہونگے۔ وہ مسائل غریبی، فاقہ کشی، غلامی، نسوانی پستی، اور عصمت فروشی کے نہیں ہونگے۔ یہ سارے مسائل تو شروع میں ہی حل ہو جائینگے۔ وہ مسائل

اشتراکیت یا سوشلزم
دولت کی تقسیم و پیداوار کا اصول کیا ہو؟

(از جناب محمد صدیق تاؤنی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

اشتراکیت کے بنیادی اصول، اور اس کے نظام زندگی کو سمجھنے اور جمہوریت، فسطائیت اور آمریت نے زندگی کے جو نظام پیش کئے ہیں اُن کے مقابلہ میں اشتراکیت کو جانچنے کے لئے ذیل کا فاضلانہ مضمون بہت مفید ہو سکتا ہے۔ اس میں مذہب اور اشتراکیت کے باہمی تعلق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ایڈیٹر)

دنیا مختلف سیاسی نظام دیکھ چکی ہے۔ دور جدید میں آکر بعض ممالک میں صنعتی انقلاب ہوا، جس کے باعث سرمایہ داری پیدا ہوئی۔ سرمایہ داری کی برکات میں سب سے بڑی اور قابل ذکر برکت معاشی پیداوار کی بے انتہا بڑھی ہوئی قوت ہے۔ انسان اب اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ تھوڑے وقت میں بہت زیادہ ——— اپنی ضروریات سے بھی زیادہ ——— پیدا کرے۔ مگر سرمایہ داری صرف معاشی پیداوار کا ایک ترقی یافتہ نظام ہے۔ پیدا شدہ معاشی قوت کو سماج کے افراد میں "کس طرح "تقسیم کرنا چاہیئے، یہ سوال کبھی اس کے پیش نظر نہیں رہا ——— اس نظام میں حکومت کی ہیئت سماج کی معاشی ضروریات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ جماعتی تفریق، شخصی ملکیت اور سرمایہ دار کا تسلط، معاشی قوت کی غیر مساوی تقسیم کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔

اشتراکیت اس غیر مساوی تقسیم کو مٹانا چاہتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اشتراکی تخیل بہت پرانی چیز ہے۔ افلاطون کے زمانہ سے بعض مفکرین کی یہ مبہم سی خواہش رہی ہے کہ ایک ایسا سماجی نظام قایم کیا جائے جس میں تقسیم کار کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار پر کسی ایک شخص یا جماعت کا قبضہ ہو اور معاشی تفریق نہ پائی جائے۔ مگر اس وقت اس کے اصول کسی مخصوص معاشی فلسفہ کے مطابق ترتیب نہیں دیئے گئے تھے۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس نے ان نظریوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُس نے اشتراکی تخیل کو ایک ممکن العمل نظریہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ تاریخ عالم کے مختلف انقلابات اور انسانی تمدن کی مختلف صورتوں کی معاشی توجیہ کرتے ہوئے اس نے ثابت کیا کہ نظام سرمایہ داری کے بعد معاشری ارتقا کی کڑی، اشتراکیت ہے۔ دنیا کو اس سے مفر نہیں، سرمایہ داری کیسی ہی ماؤف صورتوں میں ظاہر ہو مگر ہمارے سماج کی آخری اور ناگزیر صورت اشتراکیت ہو گی۔ کیونکہ ہماری معاشی ضروریات کا اقتضا یہی ہے۔

اس مطمح نظر کی بنیاد چند اصول ہیں جو کارل مارکس نے دنیا کے معاشری اور سیاسی حالات کا ایک مخصوص نظریہ "تاریخی مادیت" (Historical Materialism) کے مطابق مطالعہ کرنے کے بعد وضع کئے۔

کارل مارکس کا خیال ہے کہ انسانی ارتقا، فلسفیانہ نظریوں کی بجائے انسان کی معاشی ضروریات سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر زمانہ کی معاشی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ اور اسی اختلاف کے مطابق ہماری معاشرت، حکومت اور دوسرے خیالات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک سوسائٹی کے نشوو ارتقا میں جزو اعظم ہمارا معاشی ماحول ہے لیکن یہ فرض کر لینا کہ حیات انسانی کے عروج و زوال پر فقط یہی ایک چیز اثر انداز ہوتی ہے، بالکل گمراہ کن خیال ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان تمام اثرات میں سے جو انسان اور انسان کے اعمال پر غالب ہوتے ہیں معاشی اثر سب سے نمایاں ہے یہی وجہ ہے کہ اشتراکی اسکو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اور وہ انسان اور اس کے مختلف سماجی مسائل کا حل اسی "اثر" میں ڈھونڈتے ہیں۔

خونیں انقلاب

کارل مارکس جماعتی یعنی طبقہ داری جنگ کا سبق دیتا ہے۔ اس کے نزدیک سوسائٹی میں ہمیشہ دو باہم لڑنے والے گروہ موجود رہے ہیں۔ ایک غاصب ہے اور دوسرا محروم۔ اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کے پیش نظر اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے اس لئے ان میں برابر جنگ ہوتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار کی منفعت طلب پالیسی اس کو اتنا خود غرض بنا دیتی ہے کہ وہ دوسرے سرمایہ دار کی رقیبانہ سرگرمیوں کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ تجارتی مسابقت کا جوش اُسے قومی و غیر قومی سرمایہ دار کی تمیز سے بھی بے گانہ بنا دیتا ہے۔ اس کا اصول نفع اٹھانا ہے اور وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ یہ نفع اسکو کیسے حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اپنا حریف نہیں دیکھ سکتا۔ لہذا ایک طرف تو اس میں اور مزدور میں جنگ ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف اس میں اور دوسرے سرمایہ داروں میں رقابت زور پکڑتی رہتی ہے۔ آپس کی اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور سرمایہ دار مقابلہ کی تاب نہ لا کر مزدوروں کی صف میں آشامل ہوتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی یہ جنگ ایک ملک تک محدود نہیں ہوتی بلکہ غیر ملکی سرمایہ داروں سے بھی وہ اسی طرح جنگ کرتا ہے۔ اس طرح سرمایہ داروں کی طاقت اور تعداد کم ہوتی رہتی ہے۔ اور تمام سرمایہ چند لوگوں کے پاس جمع ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی عمل دنیا بھر کے مزدوروں میں ہوتا رہتا ہے۔ مگر ان میں رقابت کے بجائے رفاقت کا جذبہ کام کرتا ہے۔ وہ سرمایہ دار کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ مزدور بھی قومی اور ملکی حدود چھوڑ کر تمام دنیا کو میدانِ کارزار سمجھتے ہیں۔ اور اپنی مشترکہ اغراض کے باعث سرمایہ داروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں۔

"دنیا کے مزدور و متحد ہو جاؤ" کارل مارکس نے یہ فقرہ اسی عالمگیر اتحاد کی پیش بینی کرتے ہوئے لکھا تھا۔ مزدوروں کی یہ ہمہ گیر تنظیم، کارل مارکس کے نزدیک، دنیا کے چند بظاہر طاقتور سرمایہ داروں کو بہت جلد شکست دے سکتی ہے لیکن یہ شکست صرف ہڑتالوں یا پارلیمنٹری اصلاحوں سے نہیں دی جا سکتی، اس کے لئے ضروری ہے کہ مزدور ایک انقلاب کیلئے تیار رہیں۔ اسی انقلابی نظریہ کی بدولت کارل مارکس کی اشتراکیت انقلابی اشتراکیت کہلاتی ہے اور یہی اشتراکیت جدید روس کے رہنماؤں کا مطمح نظر ہے۔

اشتراکیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں سیاسی رنگ ڈھنگ کو سماج کی معاشی ضروریات کے ماتحت کیا گیا ہے۔ اب تک سیاست ایک ایسا کھیل تھا جو زیادہ سے زیادہ شخصی آزادی کی ذمہ داری کرتا تھا۔ حکومت ایک ایسے ادارہ کا نام تھا جو لوگوں کی جان اور ملکیت (جائداد وغیرہ) کی حفاظت کے لئے آئینی فضا پیدا کر دے ——— مگر اشتراکیت نے یہ سب کچھ بدل دیا۔ اُن کے ہاں حکومت کا قیام اس لئے ضروری ہے کہ وہ سماج کے افراد میں معاشی قوت کو اس طرح تقسیم کرے کہ معاشری تفریق باقی نہ رہے ——— اس لحاظ سے اشتراکیت کے دو پہلو ہیں (۱) معاشی (۲) سیاسی۔

۱۔ اشتراکیت کے پہلے سیاسی پہلو کا مقصد یہ ہے کہ شخصی ملکیت اُڑا دی جائے اور ذرائع پیداوار کسی خاص جماعت یا شخص کے بجائے ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں ہوں جسے عوام کی قوت اور عوام کی رائے حاصل ہو۔

۲۔ اشتراکیت کا دوسرا سیاسی پہلو اس جماعت سے متعلق ہے۔ اشتراکی چاہتے ہیں کہ یہ جماعت عوام کی نمائندہ ہو۔

ان دونوں نظریوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار یعنی ملک کی تمام معاشی پیداوار پر جمہور یعنی عوام کا قبضہ ہو گا۔ کیونکہ خود حکومت عوام کے نمایندوں پر مشتمل ہو گی۔

الغرض اشتراکیت کا مطمح نظر ایک ایسا سماج قائم کرنا ہے جس میں حکومت عوام کی نمائندہ ہو اور جو تمام افراد کی معاشی ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکی نظام میں حکومت کی حیثیت ایک سرمایہ دار کی سی ہو گی، یہ صحیح ہے۔ مگر یہ سرمایہ دار ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی اغراض یا شخصی مفاد کے بجائے عوام کی فلاح کے لئے استعمال میں لائے گا۔ کیونکہ حکومت کی یہ سرمایہ داری صرف اسی وقت تک قائم رہے گی جب تک وہ عوام کی معاشی ضروریات کو پورا کر سکے گی۔

دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ:۔

سرمایہ داری ایک معاشی نظام ہے پیداوار دولت کا!
اشتراکیت ایک معاشی نظام ہے تقسیم دولت کا!

فسطائیت

آپ نے فسطائیت کا نام بھی سنا ہو گا۔ یہ نظام صرف ایک سیاسی نظام ہے جو معاشی پیداوار و تقسیم کی طرف کم توجہ دیتا ہے اور زیادہ تر "قوم" کے سیاسی استحکام کو مدنظر رکھتا ہے، اشتراکی کہتے ہیں کہ موجودہ نظام، جدید ضروریات پوری نہ کر سکنے کے باعث فائدہ پہنچانے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ نظام حکومت چاہے جمہوری ہو یا آمرانہ (یعنی وہ جس میں ایک شخص مختار کُل ہو) اصل خرابی معاشی پیداوار کی غیر مساوی تقسیم ہے، اگر تمام ملک کی معاشی قوت اس طرح سے تقسیم کی جائے کہ سماج کی معاشری تفریق اُڑ جائے اور سماج کے ہر فرد کو اپنے رہناؤں پر وہ قوت حاصل ہو جائے جو ایک جمہوری حکومت میں ہر آزاد اور "صحیح" رائے رکھنے والے کو ہونی چاہیئے تو وہ اپنے خواب کی عملی تکمیل دیکھ سکیں گے۔

دنیا اب اس شاہراہ پر پہنچ چکی ہے جہاں عوام اپنی قوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ یہ احساس بھی کہ نظام سرمایہ داری فرسودہ ہو چکا ہے ترقی پکڑ رہا ہے۔ معاشری تربیت اور سیاسی شعور رکھنے والے عوام ایک نئے تمدن کی بنا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کارل مارکس اُن کے سامنے ایک خونیں انقلاب پیش کرتا ہے جس کی ایک ہی کروٹ دنیا کا نقشہ پلٹ دے سکتی ہے۔ اور پھر اس کی تعمیر اُن کے مخصوص نظریہ کے مطابق کی جا سکتی ہے ——— فسطائیت سرمایہ داری کی بُرائیوں سے واقف ہے۔ فسطائی جانتے ہیں کہ سرمایہ دار اور مزدور کے متضاد مفاد ایک مسلسل جنگ کا باعث ہیں۔ مگر وہ سرمایہ داری کو، اشتراکیوں کی

طرح، بالکل ختم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ایک ایسا سماج قائم کیا جائے جس میں جماعتی اور معاشری تفریق نہ ہو ــــ اُن کا خیال ہے کہ وہ ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر سکتے ہیں جس میں سرمایہ دار اور مزدور کے مفاد کی آئینی حفاظت کی جا سکے، وہ دُنیا کے معاشی احول کو بدلنا نہیں چاہتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ذرائع پیداوار پر شخصی تصرف موجودہ برائیوں کا باعث نہیں ــــ وہ صرف حکومت یا ریاست (State) کے تخیل کو بدلنا چاہتے ہیں۔ عوام کی کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے کی ضروریات اُن کے نزدیک اتنی اہم نہیں جتنا ریاست کا مقدس تخیل!

فسطائیت کا کوئی مخصوص فلسفہ نہیں۔ اس کے اصول موقع اور محل کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اٹلی کی فسطائیت امپیریلزم (شاہیت) کی قائل ہے۔ وہ نئے ممالک فتح کر کے اپنی قوت کا ثبوت دینا چاہتی ہے جرمنی صرف نوآبادیات کا مطالبہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب جرمن خواہ وہ کسی ملک میں آباد ہوں ایک ہی سیاسی نظام کے ماتحت ہو جائیں۔ لیکن ان سب سے مختلف انگلستان میں فسطائی پارٹی کا پروگرام ہے۔ وہ نہ تو نوآبادیات چاہتی ہے اور نہ نئے ممالک کی فتوحات، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انگلستان کی سلطنت پہلے ہی سے اتنی بڑی ہے کہ اُس پر آفتاب غروب نہیں ہوتا اس لئے اب زیادہ کی ہوس کیوں ہو۔ فسطائی سیاست کے متعلق یہ بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس کی بنیاد جذبۂ نفرت پر ہے۔ اپنی قوم، اپنی نسل، اپنے کلچر سے محبت اور ہر غیر قومی چیز سے نفرت فسطائیت کا اہم اصول ہے۔ اپنی قوتوں کے عمل و اظہار کو جغرافی حدود میں محدود کر کے وہ دنیا اور انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔

اشتراکیت ایک بین القومی نظام ہے۔ اُس کا مطمح نظر ایک پُرامن اور خوشحال دنیا ہے۔ جس طرح ایک سماج میں وہ معاشری تفریق نہیں چاہتے اس طرح وہ ایک دنیا میں جغرافی حدود میں گھری ہوئی مختلف سلطنتیں دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک انسان کو اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی کرنا چاہئے اسی طرح وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر ایک قوم اپنی مخصوص تہذیب اور زبان وغیرہ کے معاملہ میں آزاد ہو ــــ برعکس اِس کے فسطائیت ایک ایسا نظام ہے جس کے عناصر اعلیٰ قومیت اور عسکریت ہیں۔ وہ ہر بین القومی تحریک کے دشمن ہیں۔ قوت کا مظاہرہ، اُن کے نزدیک، زندگی کی دلیل ہے۔ امن پرستی بزدلی ہے اور سکون و آرام کی زندگی موت!

سیاسی نظریوں میں فسطائیت اعتدال پسندانہ خیالات کی سخت دشمن ہے۔ جمہوریت یعنی یہ خیال کہ ہر کس و ناکس کو حکومت کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق دیا جائے فسطائیت کے نزدیک مفید نہیں اس کی وجہ مسولینی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "چند اشخاص کا ایک مقررہ جگہ پر وقتاً فوقتاً جمع ہونا اور بڑے بڑے مسائل پر گفتگو کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا" کیونکہ "از مغز صد انسانی نمی آید" ــــ لہٰذا اس کا ریاستی تخیل ایک ایسی جذباتی اور مبہم چیز ہے جو انسان کے دماغ کے بجائے اُس کے "اعتقاد" کو اپیل کرتی ہے۔ ہر فرد ریاست کے ماتحت ہے۔ اُس کے اعمال کی سخت نگرانی کی جاتی ہے تقریر و تحریر کی آزادی اُسی حد تک دی جاتی ہے جس حد تک مناسب ہو۔

کی پیداوار ہے۔ اور اٹلی و جرمنی میں یہ ایک ایسے اصول کے ماتحت ظاہر ہوتی ہے جو بذاتِ خود ایک مطمح نظر ہے۔ اشتراکی روس کا مطمح نظر اکثریت کی حکومت ہے۔ مگر فسطائی اٹلی اور فسطائی جرمنی ایک مختصر مگر منظم جماعت کو عسکری قوت کے سہارے پر تمام ملک میں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ دنیا کے مصائب غیر مساوی تقسیم دولت اور معاشری تفریق کے باعث رونما ہوتے ہیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا واحد حل ایک ایسی معاشرت ہے جس میں یہ تفریق اور ناانصافی نہ پائی جائے ــــ اشتراکیت چاہتی ہے کہ ایک ایسی ہی معاشرت تیار کی جائے۔ اِس کے لئے وہ سرمایہ دار و مزدور کی تخصیص اُڑا کر ہر شخص کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنی قابلیت و صلاحیت کے مطابق کام کرے اور اس کے لئے مناسب اُجرت لے۔

لیکن فسطائیت یہ نہیں چاہتی۔ وہ معاشری تفریق کے قیام کو حق بجانب تصور کرتی ہے۔ وہ کسی ایسے نظام کو جس کی بنیاد "مساواتِ تکلم" پر ہو انسانی ارتقا کے لئے ضرر رساں سمجھتی ہے۔ اِسی لئے اس کی ریاست ایسے ثالثی اِدارے قائم کرتی ہے جو سرمایہ دار اور مزدور کے ہمیشہ رہنے والے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے رہیں۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، مگر فسطائیت کی یہ کوشش کہ مزدوروں میں سیاسی قوت کا احساس کچل دیا جائے اور ان کی قوتوں کو اسی جانب مائل کر دیا جائے جہاں وہ ایک قومی خطرہ نہ بن سکیں ایک ایسا فعل ہے جسے تمام دنیا اور انسانیت کے لئے ایک خطرۂ عظیم سمجھنا چاہئے۔ فسطائیت نے مزدوروں اور عوام میں قومی عصبیت جیسے خطرناک جذبہ کو پوری طرح مشتعل کر دیا ہے "اُن کا ملک بے حد خوبصورت ہے، اُن کی قوم روئے زمین پر شجاع ترین ہے، اُن کا کلچر سب سے افضل ہے، اُن کی سائنس نے دنیا کو بہت فائدہ پہنچایا ہے....."

یہ اور اسی قسم کے دوسرے تصورات تمام افراد کے دماغوں میں اس طرح داخل کر دیئے جاتے ہیں کہ ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ سے بھی یہی احساس برتری ظاہر ہوتا ہے۔ ایک نوخیز قوم کو عسکریت کا سبق دے کر اُس کو دنیا کی تہذیب پر مسلط کر دینا کیسے ہولناک نتائج پیدا کر سکتا ہے، اس کی مثالیں ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔

جمہوریت اور اشتراکیت

مختصراً فسطائیت، سرمایہ داری ہی کی ایک مسخ شدہ صُورت ہے۔ سرمایہ دار اس نظامِ معیشت میں حاکمانہ حیثیت رکھتے ہیں، مزدوروں سے یہ حق بھی چھین لیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوتِ تنظیم کا اظہار ہڑتال کے ذریعہ کریں، کیونکہ اُن کی ہر شکایت کا فیصلہ حکومت کا مقرر کردہ ثالثی ادارہ کرے گا۔ قومی مفاد کو بین القومی امن اور اشتراکِ عمل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیابی کا ذریعہ جنگ کو سمجھتے ہیں۔ جس قوم کو عہدِ طفلی سے خود پسندی، جنگ و جدل اور دوسروں سے نفرت کا سبق دیا جاتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کے اپنے ملک سے باہر ایسے "مشاغل" پیدا کئے جائیں جو اُن کے برانگیختہ جذبات کی تسکین کر سکیں۔ یہ مشاغل، استعماری جنگیں ہیں قومی نقطۂ نظر سے غیر تربیت یافتہ مگر معاشی قوتوں سے بہرہ ور ممالک اُن کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں لیکن دنیا میں اور سرمایہ دار بھی ہیں۔ وہ ان حریفانہ سرگرمیوں کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھ کر ان کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں۔ اور اُن کی حکومت فوجی طاقت سے اُن کی مدد کرتی ہے۔ اِس طرح سے فسطائیت ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا نام ہے! یہ ناممکن ہے کہ جو قومیں فسطائی فلسفہ سے متاثر ہیں وہ ایک ایسی دنیا آباد کر سکیں جس میں ان کا قومی تفاخر اور عسکری نظام کسی عالمگیر اتحادِ انسانی کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سیاسی مصلحتیں فسطائی حکومتوں کو کسی خاص مدت کے لئے ایک متحدہ محاذ پر لا کر کھڑا کریں۔ مگر ہمیشہ کے لئے ان میں مستقل رشتۂ محبت پیدا نہیں ہو سکتا۔ اُن کی جغرافی حدود اور ان کے ساتھ ساتھ اُن کے مخصوص، ناگزیر، قومی و معاشی، حالات فسطائی حکومت پر ایسی

ذمہ داریاں عاید کر دیتے ہیں جو بین القومی آئین اور امن کے متضاد ہوتی ہیں اشتراکیت اگرچہ ایک خونیں انقلاب کی طالب ہے۔ مگر انقلاب کے بعد ان کا لائحۂ عمل ایک ایسے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو ہمیں اُس دُنیا میں لے جائے جہاں جغرافی حدود صرف پہاڑ اور سمندر رہوں۔ اور جہاں مختلف تہذیبوں کی مالک قومیں اشتراکِ عمل اور بین القومی آئین و امن کے اصول پر عمل پیرا ہوں ــــ اشتراکی چاہتے ہیں کہ سماج میں معاشری تفریق نہ ہو اور دنیا میں انسانی تفریق نہ ہو!

جمہوری طرزِ حکومت کے بنیادی اصول شخصی آزادی اور سیاسی مساوات ہیں۔ جمہوری حکومت رائے عامہ کے مطابق ترتیب دی جاتی ہے چند شرطوں کے ماتحت ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ رائے دے سکے، ہر شخص کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی قابلیت سے فائدہ اُٹھا کر جمہوریت میں سب سے بڑا عہدہ حاصل کر لے۔ مگر جمہوریت پر بھی وہی اعتراض عائد ہوتا ہے جو فسطائیت پر۔ کیونکہ جمہوریت صرف ایک سیاسی نظام ہے۔ یہ عوام کی اصل خرابی کی طرف توجہ نہیں کرتا شخصی ملکیت اور سرمایہ داری نظام کے قیام کو ضروری سمجھتا ہے۔ گو بین القومی امن و آئین کے لئے کوشش کرتا ہے مگر سماجی امن کی پروا نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک معاشری تفریق جائز ہے مزدوروں کو مراعات ضرور دی جاتی ہیں۔ انہیں حق رائے دہی بھی حاصل ہے، اوقاتِ کار میں تخفیف بھی کر دی جاتی ہے مگر یہ سب کچھ اِس طرح ہوتا ہے کہ تمام سیاسی و معاشی قوت "سرمایہ کاری" ہی مسلط رہتی ہے۔

سیاسی مساوات کے ساتھ ساتھ معاشی مساوات ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی اُڑا دی جائے تو دوسری کی عملی اہمیت کچھ بھی باقی نہیں رہتی ــــ اشتراکیت جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اِن دونوں پہلوؤں کی اصلاح کرتی ہے۔ وہ ہر شخص کو معاشی و سیاسی مساوات دینے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ اشتراکیت میں طرزِ حکومت جمہوری ہوگا اور سماج ایسا جس میں معاشری تفریق نہ ہو۔ لیکن اس کے مقابلہ میں جمہوریت صرف سیاسی مساوات عطا کرتی ہے۔ اور فسطائیت نہ شخصی آزادی دیتی ہے اور نہ سیاسی مساوات!

عہدِ تغیّر

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اشتراکیت ایک انقلاب کے بعد فوراً ہی از خود پیدا نہیں ہو جائے گی۔ اشتراکیوں کا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ــــ پرولتاری (یعنی کسانوں اور مزدوروں کے) انقلاب کے بعد انہیں ایک "عہدِ تغیّر" سے گزرنا پڑے گا۔ اِن درمیانی منزلوں کی چند اپنی خصوصیات ہیں جو اشتراکی مطمح نظر سے یقیناً مختلف ہیں۔ جدید روس عہدِ تغیّر کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ روس کے اشتراکی رہنماؤں کی کوشش یہی ہے کہ وہ مارکسی اشتراکیت کی تشکیل کریں۔ مگر سامراجی قوتوں کی ریشہ دوانیاں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنی روش میں موقع و وقت کے لحاظ سے کچھ تبدیلی کریں سرمایہ دار ممالک سے گھرا ہوا ایک ملک خالص اشتراکی اصولوں پر عمل نہیں کر سکتا۔ علمی اور تخیلی اشتراکیت کے بجائے عملی اشتراکیت زیادہ اہم ہے مگر سرمایہ دارانہ فضا میں اشتراکیت کے لئے جد و جہد کرنا ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے جن کو نظر انداز کرنا اشتراکیت کے مستقبل کو بہت تاریک کر سکتا ہے۔ لہٰذا جدید روس پر نکتہ چینی کرنے والوں کو ضروریاتِ زمانہ، وقت اور موقع کا ضرور خیال رکھنا چاہئے۔

مثال کے طور پر "عہدِ تغیّر" کی ایک اہم خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے غیر اشتراکی کہتے ہیں کہ روس میں معاشی مساوات اِسی طرح غائب ہے جس طرح فسطائی اور جمہوری ممالک میں۔ وہاں بھی کسی مزدور کو ۱۰۰ روبل (روسی سکہ) ملتے ہیں اور کسی کو ۳۰۰ روبل۔ مگر یہ اعتراض کرتے وقت

یہ خیال کہ جماعتی مفاد سب سے اہم ہے اور اس کے لئے افراد کی قربانی جائز ہے اشتراکیت اور فسطائیت دونوں میں پایا جاتا ہے۔ دونوں شخصی آزادی کو سیاسی مصلحتوں کے زیر اثر محدود کر دیتے ہیں۔ مگر ان دونوں میں سب سے بڑا فرق اُس وقت محسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ روس میں یہ چیز عہدِ تغیّر (Transition Period)

وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشی مساوات اشتراکی دور کی خصوصیت ہے، نہ کہ "عہد تغیر" کی۔ تاہم بالشویکی حکومت کی یہ کوشش کہ وہ ہر شخص کے لئے ایک ایسی سازگار فضا پیدا کر دے جس میں اُس کی قوتوں کی ترقی اور شگفتگی ممکن ہو، ایک ایسا اقدام ہے جو اسی معاشی مساوات کی طرف رہبری کرتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جمہوری اور فسطائی ممالک میں، باستثنائے چند، تقریباً ہر شخص کا مستقبل اُسکی، پیدائش سے وابستہ ہے۔ ابی ابتداً سے غریب گھرانے کے بچے اُس مہذب، ترقی یافتہ اور علمی احول میں پرورش نہیں پا سکتے جو اُن کی فطری صلاحیتوں کو اُبھار سکے اور جو اُن کی ذہنی و جسمانی قوتوں کو بیدار کر سکے۔ مگر روس میں ہر شخص کو وہ مساوات ضرور حاصل ہے جو روبل سے خریدی جا سکتی ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے بچے کی تہذیب و تربیت ایسی ہو جس سے اُس کے فطری احساسات پر خوشگوار اثر پڑے؟ .... بالشویکی روس میں یہ چیز ممکن ہے وہاں ایسے سازگار ماحول میں پرورش ہر شخص کا حق سمجھا جاتا ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے۔ بنظر انصاف دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تربیت و ترقی کی یکساں سہولت ہی حقیقی مساوات ہے۔

مذہب اور اشتراکیت

یہ خیال کہ اشتراکیت بے دینی کی تعلیم دیتی ہے بالکل صحیح نہیں ہے لیکن اُس میں اتنی حقیقت ضرور ہے کہ اشتراکیت معاشی فارغ البالی کا ایک ایسا احول تیار کر دیتی ہے جو انسان کی زندگی میں سے تشکیک و بے اعتباری (Unsicherheit) جیسے جذبہ کو نکال دیتا ہے۔ اور اُس میں خود اعتمادی اور مستقبل کے متعلق ایک ایسا احساس پیدا کر دیتا ہے جو اُسے صرف مادی اور محسوس قوتوں کی حقیقت کا قائل کرتا ہے۔ تاہم یہ سچ ہے کہ اشتراکیت کسی مذہب کے پیش کردہ معاشری پروگرام کو پسند نہیں کرتی۔ وہ اس صنعتی دور میں ازمنۂ وسطیٰ کے مذاہب کے سکھائے ہوئے معاشی اصولوں کو (اگر واقعی اُن کے کوئی معاشی اصول ہیں) اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ موجودہ مصائب کو دور کر سکیں۔

اشتراکی صرف معاشی قوت کی مساوی تقسیم چاہتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی جمہوری حکومت کے طالب ہیں جو افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کر سکے۔ لیکن کسی شخص کے "ایمان" سے اُسے کوئی واسطہ نہیں، یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ اِس ضمن میں یہ معلوم کرنا شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ روسی ترکستان اور کاکیشیا وغیرہ میں مذہبی آزادی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ روس میں جو چھوٹی چھوٹی قومیں آباد ہیں اُن کو لسانی اور مذہبی آزادی پوری طرح نصیب ہے۔ چنانچہ روس میں قومیت کے نام سے ہنس کان (Hans Kohn) نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ نیز اِس سلسلہ میں سردار اقبال علی شاہ کے سفرنامہ کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جس میں اُنھوں نے روس میں مذہبی آزادی کے متعلق کافی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور غالباً روسی ترکستان کی کسی مسجد کی تصویر بھی دی ہے جس میں با جماعت نماز ادا کی جا رہی ہے

تاہم اگر ایمان کی یہ ذاتی اور بے ضرر حقیقت کسی وقت اجتماعی خطرہ کی صورت اختیار کر لے تو اشتراکی حکومت کو سماجی مفاد کے پیش نظر اس خطرہ کو کچلنے میں یقیناً کوئی تامل نہ ہوگا۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فسطائیت، مذہب کو پہلے جیسا ممتاز و بلند درجہ دیتی ہے۔ لیکن یہ خیال اتنا ہی غلط ہے جتنا اشتراکیت کے متعلق یہ گمان کہ اشتراکیت میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہیں —— اٹلی نے جب ابی سینیا فتح کیا تو مسولینی کے اشارہ پر پوپ نے فاتحین کو مبارکباد دے کر اُسے مذہبی جہاد کی تقدیس بخش دی تھی، حالانکہ ابی سینیا کے باشندے بھی مذہباً عیسائی تھے۔ اسی طرح جرمنی میں مذہب کو سیاست کے ماتحت کرنے کے لئے جو کشمکش جاری ہے وہ اخبار بین طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔ دراصل فسطائیوں نے مذہب کو اپنے پروپاگنڈے کے لئے اتنا اہم بنا رکھا ہے ورنہ وہ بھی ہمیشہ تیار ہیں (جیسا کہ اُن کے اعمال سے ظاہر ہے) کہ جس وقت مذہب اُن کی سیاسی اغراض میں سدِ راہ ہو تو وہ اُسے کچل دیں۔

اسلام کا معاشی نظام

اشتراکیت و سرمایہ داری کی موجودہ اصطلاحات کی روشنی میں

(از مولانا ابو الاقبال محمد جمیل الرحمن صاحب، سیوہاروی)

مشین کی ایجاد نے دنیا کو ناگفتہ بہ معاشی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ محنت و سرمایہ کے سوال نے آج کل جو اہمیت اختیار کر لی ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اشتراکیت و سرمایہ داری کے دو جدا جدا نظریے قائم ہو گئے ہیں۔ ایک کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں بلکہ قوم کی ملک ہے، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں آج تک ذاتی ملکیت کا جو رواج چلا آیا ہے وہی صحیح ہے لیکن چونکہ دنیا میں محنت کش مزدور اور کسان زیادہ ہیں اس لئے اشتراکیت ہی کے اصول زیادہ عام ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی چونکہ غربت و افلاس عام ہے اس لئے یہاں بھی اشتراکیت پسند پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اشتراکیت پسند نوجوان لینن اور مارکس کے اشتراکی نظریوں میں اتنے غرق ہیں کہ وہ مسئلہ کی اصل نوعیت پر بے نیاز ہو کر بہت کم غور کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے سوال یہ نہ ہونا چاہئے کہ چونکہ روس میں ایسا ہو رہا ہے، چونکہ کارل مارکس یا لینن نے ایسا کہا ہے اس لئے ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے، بلکہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ مشکلات کو حل کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ آیا موجودہ معاشی مرض کا علاج ہمارے دامن میں ہے یا نہیں، اگر ہے تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم لینن اور اسٹالن کے سامنے بھیک کا دامن پھیلائیں۔ خصوصاً اُن اشتراکی نوجوانوں کو تو اس چیز کی طرف غور کرنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے جن کو قدرت نے مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کے نوجوان صرف روس ہی کی طرف نہ دیکھا کریں بلکہ کبھی کبھی یثرب و بطحا کی جانب بھی نظر ڈال لیا کریں کہ نور ہدایت کا جو طوفان ان کو یہاں دکھائی دے گا اُس کا عشر عشیر بھی روس کی خاک میں نہ ملے گا۔

ذیل میں مولانا جمیل الرحمن صاحب نے اسی نقطۂ نظر کے ماتحت نہایت اختصار کے ساتھ اسلام کے معاشی نظام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے عیسائیت کے دلدادوں کی طرح سرمایہ کی پرورش کرنے کو جائز نہیں رکھا ہے اور اس لئے مذہب سے بے تعلق ہو کر ایک معاشی نظام بنانے کی جو ضرورت یورپ والوں کو پیش آئی اس کی ضرورت کم از کم مسلمانوں کو ہرگز نہیں ہے۔ ایڈیٹر)

اسلام نے جائداد منقولہ و غیر منقولہ میں شخصی حیثیت اور اس ملکیت میں مالکانہ تصرفات کا حق ایک محدود دائرہ میں تسلیم کیا ہے اور اسلام کے بیان کردہ ذرائع آمدنی مثلاً تجارت، وراثت، ہبہ، مزدوری، کاشتکاری وغیرہ وغیرہ ذرائع سے جو دولت بھی حاصل ہوتی ہے اُس پر شخصی ملکیت کا قانون نافذ ہو جاتا ہے اور پھر اسی شخصی ملکیت کے نتیجہ میں عُشر، زکوٰۃ، مہر و نفقات۔ خراج وغیرہ مختلف ٹیکس اشخاص پر عائد ہوتے ہیں۔ اور جس طرح جائداد منقولہ میں یہ شخصی تملک معتبر ہے۔ ٹھیک اس ہی طرح جائداد غیر منقولہ میں ہے اسلام کا قانون ملکیت نافذ ہے چنانچہ اسلام کے متفقہ اور مشہور قانون شفعہ کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ قرآن عظیم نے سورۃ الکہف میں جس باغ کا تذکرہ فرمایا ہے اُس کی ملکیت باغ کے زمینداروں کی جانب فرمائی ہے اور اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کو آئینی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کتاب و سنت اور ائمہ کے اجماعی مذہب کے پیش نظر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہر موقعہ پر دو اصول ملحوظ رکھے ہیں۔

اوّل یہ کہ دولت کی پیداوار کے ذرائع کسی ایک ہی طبقہ میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔

دوسرے یہ کہ شخصی اور ذاتی سرمایہ میں بھی عوام کا مستقل اور معقول حصّہ آئینی حیثیت سے موجود رہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے کیلا تکونُ دولۃً بین الاغنیاء منکم (تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں سمٹ کر نہ رہ جائے) اور فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (تمہاری دولت میں غریب اور فقیر کا بھی حق ہے) نیز پیغمبر اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمان ہے توخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم (دولتمندوں سے لیکر غریبوں میں بانٹ دیا جائے)

ایک اور مقام پر قرآن عظیم نے فرمایا ہے الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم (سورہ توبہ) جو لوگ سونے اور چاندی کو سرمایہ بنا کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کے بتلائے ہوئے راستہ میں قوم کے ضرورتمند طبقہ پر، خرچ نہیں کرتے ہیں اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دیجو اس ارشاد ربانی کی بنا پر اسلام کے ایک مشہور صحابی ابو ذر غفاریؓ کا عقیدہ یہ تھا کہ معمولی ضروریات زندگی کے علاوہ اسلام میں قطعاً سرمایہ داری جائز نہیں ہے۔ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ اس مسئلہ میں حضرت ابو ذر کے تقریباً ہمنوا تھے۔ فرق صرف یہ تھا وہ معمولی ضروریات کو چار ہزار درہم

یعنی مروجہ سکہ سے تخمیناً ایک ہزار روپیہ سالانہ میں محدود سمجھتے تھے۔ اس سے زائد سرمایہ اُن کے نزدیک بھی جائز نہ تھا بلکہ اُس کو قوم کے ضرورتمند طبقہ پر صرف کردینا ضروری تھا۔ اسلام کی مشہور شخصیت امام ضحاکؒ ان "معمولی ضروریات" کا تخمینہ اس سے کچھ زیادہ یعنی ڈھائی ہزار روپیہ فرماتے ہیں۔ (اتحاف السادۃ للزبیدی شرح احیاء العلوم جلد ۴ ص۸)

لیکن یہ واضح رہے کہ ان حضرات کا یہ اختلاف اصولی نہ تھا بلکہ اپنے اپنے تجربہ کے مطابق ضروریات زندگی کو دیکھتے ہوئے ایک تخمینہ تھا جسے ہر شخص ہر زمانہ میں جس طرح چاہے کرسکتا ہے۔

جمہور علماء اسلام کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن عظیم نے اُس سرمایہ کی شدید مذمت کی ہے جسمیں سے قوم کے ضرورتمند افراد کے لئے زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی معقول مقدار نہ نکالی جائے۔

جائداد غیر منقولہ کے بارے میں مالکانہ تصرفات کے لحاظ سے ائمہ اسلام کے حسب ذیل اقوال مذکور ہیں۔

امام حسنؒ۔ طاؤسؒ۔ اور ابن حزمؒ کے نزدیک جائداد صحرائی میں کسی ایک شخص کو صرف اتنی زمین ہی پر کاشت کرنے کا حق ہے جتنی زمین میں وہ بذات خود کاشت کرسکے۔ اس سے فاضل آراضی کو بدون معاوضہ دوسروں کو دیدینا ضروری ہے۔

(طحاوی جلد ۲ وحواشی الموطا للامام محمد وغیرہ)

امام جعفر صادق علیہ السلام کے خیال میں خود کاشت کی اس زمین کا تعین حکومت کی تجویز پر منحصر ہے۔ (مبسوط سرخسی جلد ۲۳ صفحہ ۲۳)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ ایک مقررہ لگان کے بعد زمینداری کو جائز سمجھتے ہیں (طحاوی وغیرہ)

دیگر علماء کے نزدیک لگان اور بٹائی کی دونوں صورتیں جائز ہیں (عالمگیریہ وعام کتب)۔

لیکن ان تمام حضرات کے نزدیک کاشتکار زبردست مراعات کا ہر وقت مستحق ہے مثلاً آفات سماوی وارضی کی بنا پر بقدر نقصان لگان خودبخود کم یا معاف ہوتا رہے گا۔ ایک ہی سال کا لگان رہتے ہوئے بعض حادثات کی بنا پر مدت کاشت معاہدہ سے زائد ہوسکے گی وغیرہ وغیرہ

(عالمگیریہ قاضیخان)

جائداد غیر منقولہ میں ملکیت کے لحاظ سے ذیل کی قسم کی آراضی ذاتی ملکیت کے ماتحت نہیں آسکتی:۔

(۱) وہ چراگاہ جو آبادی کے متصل ہو
(۲) وہ زمین جس کے درختوں کی لکڑی جلانے کے کام میں آئے۔
(۳) نمک کی کان
(۴) دریا

(فتاوی عالمگیریہ وکتاب احیاء الموات)

مستقل طور پر اسلام نے چار چیزوں میں ہر انسان کا اشتراکی حق تجویز کیا ہے (۱) قدرتی پانی (۲) خودرو گھاس (۳) کان کا نمک (۴) جلانے کی لکڑیاں جو خودرو درختوں سے لی جائیں اور آگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الناس شرکاء فی ثلث فی الماء والکلاء والنار تمام انسان ان تین چیزوں میں باہم شریک ہیں پانی میں۔ گھاس میں۔ آگ میں (ہدایہ) ابوداؤد کی روایت میں اس سوال کے جواب میں کہ ماالشئی الذی لایحل منعہ یعنی وہ کیا چیز ہے جس کا روکنا جائز نہیں آپ نے فرمایا کہ الملح یعنی نمک۔ صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ آگ سے مراد وہ خودرو درخت ہیں جن کی لکڑی جلانے کے کام میں آئے۔

اسلام نے سونے چاندی کے زیور اور نقد اور سامان تجارت میں زکوٰۃ یعنی سرمایہ کا چالیسواں حصہ عوام اور قوم کے حاجتمند طبقہ کے لئے سالانہ ٹیکس کی حیثیت سے مسلمانوں کے ذمہ تجویز کیا ہے۔ زکوٰۃ کا فلسفہ یا اس تجویز کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام دولت کو محفوظ سرمایہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص (مسلمان) اپنی ابتدائی عمر میں چالیس لاکھ یا چالیس کروڑ یا کسی بڑے سے بڑے سرمایہ کا مالک بنتا ہے تو اسلام کے قانون زکوٰۃ کے ماتحت از روئے حساب سالانہ چالیسواں حصہ نکالتے رہنے کے اعتبار سے یہ تمام کا تمام سرمایہ تقریباً پچاس سال کے اندر اندر اس کے ہاتھ سے نکل کر عوام تک پہنچ جائے گا۔ معلوم ہے کہ انسان کی عمر طبعی ساٹھ یا پینسٹھ سال ہوتی ہے اور پندرہ سال تک وہ ایک غیر مختار ہونے کی حیثیت سے دوسروں کی سرپرستی میں گذارتا ہے لہذا ہوش اور خودمختاری کے اس پورے دور میں پچاس سال تک اسلام ایک مسلمان کو یہ اجازت تو دیتا ہے کہ وہ حدود شرعیہ میں رہ کر قیام زندگی کے لئے اس سرمایہ سے فائدہ حاصل کرسکے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دولت کی کسی بھی مقدار کو محفوظ سرمایہ بنا کر چھوڑ دے۔ بلکہ فی اموالھم حق معلوم (اُن کے مال میں غریبوں کا حق ہے) کے قانون کی بنا پر ایک سرمایہ دار اپنی عمر طبعی سے پہلے ہی اس مال کو عوام تک پہنچا دینے پر مجبور رہے۔

واضح رہے کہ سرمایہ کی مثال میں یہ مقدار جمہور کے خیال کے پیش نظر ہے ورنہ ابوذر غفاریؓ اور علی مرتضیٰؓ وغیرہ حضرات کے مسلک کے پیش نظر تو سرمایہ کی ایک محدود معین مقدار کے علاوہ باقی کل سرمایہ عوام کی ملکیت ہے

مسلمان کی پیداوار میں بارانی اور آبپاشی کے فرق سے دسواں اور بیسواں حصہ (عشر) عوام کا حق تجویز کیا گیا ہے۔

مویشیوں کی معتدبہ تعداد پر مختلف اصناف کے لحاظ سے مختلف حصہ (زکوٰۃ کے نام سے) عوام کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

تلقی اور احتکار یعنی تجارت کے وہ طریقے جو عوام پر اثر انداز ہوں اور جن میں سامان ضرورت کو ضرورت کے باوجود گرانی کے انتظار میں روک لیا جاتا ہے اور اسی طرح کسی تجارتی جماعت کا نرخ پر اس طرح قابو پالینا جس سے عوام متاثر ہوتے ہوں تجارت کے یہ تمام پہلو اسلام میں قانوناً جرم ہیں اور حکومت کے ذمہ ان کی نگرانی تجویز کی گئی ہے

(ہدایہ وقاضیخان وعام کتب)

اگر عوام پر کوئی حادثہ آجائے یا وہ سخت مفلس ہوجائیں تو سرمایہ داروں کو بلاقیمت سامان زندگی مہیا کرنے پر مجبور کیا جائیگا۔

(الحسبہ فی الاسلام لابن قیمؒ)

اسی طرح کسی معاشی حادثہ کو روکنے یا عوام کو پریشانی سے محفوظ رکھنے کے لئے سرمایہ داروں کی دولت کو جبراً صرف کرنا ضروری ہوگا۔

(فتاوی عالمگیریہ بیان کری الانہار کتاب الشرب)

اسلام کے مذکورہ بالا نظریات کی روشنی میں جو اجمالی طور پر پیش کئے گئے ہیں حسب ذیل نتیجہ برآمد ہے۔

"اسلام نے شخصی ملکیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہر موقعہ پر سرمایہ میں عوام کا معقول حصہ تجویز کیا ہے حتیٰ کہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں عوام کی ضروریات کا بہت بڑی حد تک سرمایہ داروں کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔"

لہذا ان تمام امور کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اسلام کے نظام معیشت کو اگرچہ موجودہ عہد کی غیر فطری اور ناکام اشتراکیت یا انسانیت سوز سرمایہ داری کی اصطلاح سے معنون کرنا درست نہیں ہے تاہم اس نے کافی حد تک اعتدال کے ساتھ اشتراکی ضروریات کو پورا کردیا ہے۔"

ہمارے حوصلے ہمیں کہاں لیجانا چاہتے ہیں؟

(از جناب محمد مختار احمد۔ بی۔ ایس۔ سی۔ بیدر۔ حیدرآباد)

یہ ایک بہت اہم سوال ہے کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ دنیا میں ہر شخص کو کھانے اور پہننے کے لئے ضروری چیزیں مہیا ہوجائیں تو کیا پھر دنیا کو حقیقی سکون میسر ہوسکے گا؟ یا انسانی حوصلوں اور امنگوں کی آخری آماجگاہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟ ذیل میں فاضل مقالہ نگار نے اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ سوشلزم کے نظام معیشت کی بحثوں کو پڑھنے کے بعد اس مقالہ کا مطالعہ خاص طور سے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (ایڈیٹر)

کائنات کی جملہ مخلوقات کی سوانح حیات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی پیدائش علم اور ارادہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور یہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت اپنی زندگی گذارتی ہیں پس کائنات اور انسان کی پیدائش کی بھی کوئی نہ کوئی غرض وغایت ہونا چاہئے۔ ورنہ یہ بات علم وارادہ والی ذات کے بالکل منافی ہوگی کہ وہ کسی مخلوق کو یونہی فضول پیدا کرکے چھوڑ دے۔ ارشاد باری ہے کہ "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ" (کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے؟) دوسری جگہ خود انسان کی زبان سے کہلایا گیا ہے۔ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ فضول اور بیکار نہیں بنایا)

بنابریں ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کائنات اور انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان، کائنات کی تمام چیزوں کا محتاج نظر آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز انسانی احتیاج کو پورا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اگر ہم زبان قال سے اس کا انکار بھی کریں تب بھی زبان حال سے ضرور اس بات کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ قرآن میں جابجا یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے کائنات کی تمام چیزیں انسان کے زیر اثر کردی ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان کی فطری حاجتیں کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ ان کی تکمیل کے لئے کائنات کی تمام چیزوں کو زیر اثر کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو علم کی طلب اور نئی نئی باتوں کو جاننے کی دیوانہ وار ہوس حضرت انسان کو نہ ہوتی۔

جانوروں کو اگر پیٹ بھر کر اُن کی مرغوب غذا مل جائے، آرام کرنے کے لئے ان کو اچھا سا مسکن حاصل ہو جائے اور اُن کے ساتھ ان کا جوڑا بھی تندرست و صحیح سلامت ہو تو پھر اُن کو کائنات کی کسی چیز کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ مزے سے کھاتے ہیں، اطمینان سے پڑ کر سوتے ہیں اور جب کیف و سرمستی میں آتے ہیں تو افزائش نسل کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

آپ جس جانور کی زندگی پر نظر ڈالیں گے آپ کو یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آئے گی۔ وہ جنگل کا شیر ہو یا بن کی چڑیا، دونوں کو اگر کھانے پینے اور رہنے سہنے اور اپنا جوڑا ڈھونڈھنے کے کام سے فراغت حاصل ہو تو پھر دنیا میں اُن کی طلب کچھ نہیں ہوتی وہ چین کی بنسی بجاتے ہیں، چین سے سوتے ہیں اور چین سے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں۔

لیکن حضرت انسان کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے یعنی اگر آپ انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کھانے پینے، اوڑھنے بچھانے اور رہنے سہنے کی تمام آسائشیں دیدیں، تب بھی ایسے مرد و عورت دنیا میں مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اب وہ کچھ اور چاہیں گے۔ وہ ستاروں کو دیکھیں گے تو ان کا کھوج لگانے کے لئے سرگرداں ہو جائیں گے، ہوا کی سرسراہٹ سنیں گے تو ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کے لئے پریشان ہو جائیں گے۔ حضرت انسان کی یہی فکر و جستجو تو ہے جس کی بنا پر ہر سال سینکڑوں آدمی ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ پر چڑھنے کے لئے اپنی جانیں خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس آج سینکڑوں پروفیسر، ڈاکٹر اور عالم جو اپنی تجربہ گاہوں، لائبریریوں اور کتب خانوں میں بیٹھے علمی ریسرچ (اکتشافات) کیا کرتے ہیں ایسے ہیں جن کو کھانے پینے کے لئے مطلق کسی چیز کی حاجت نہیں۔ ان کے گھر خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ ان میں سے کچھ زمیندار ہیں اور کچھ کارخانہ دار، اور اس لئے ان کو محض زندگی کی آسائشوں کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانے یا محنت مشقت کرنے کی مطلق احتیاج نہیں۔ مگر پھر بھی آپ اُن کے کمروں میں اگر جھانک کر دیکھیں تو انہیں بے انتہا مصروف و منہمک پائیں گے۔ وہ اپنے کام میں ڈوبے ہوئے ملیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بھوکا شیر جی چھوڑ کر اپنے شکار کا پیچھا کرتا ہے، یہ لوگ اپنے کام کا پیچھا کرتے نظر آئیں گے۔ ان کو نہ سر کا ہوش ہے نہ پاؤں کی فکر، نہ کھانے کا خیال ہے نہ پینے کی فرصت۔

ایڈیسن کا قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ نوکر کمرے میں کھانا رکھ گیا لیکن آپ جر ثقیل اور فلکیات کے مسائل میں اتنے غرق تھے کہ کچھ خبر نہ ہوئی۔ نوکر آیا اور چلا گیا، مگر آپ کا دماغ آسمانی اجرام کی باہمی کشش کو دریافت کرنے میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ گیا کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے شکار کی تلاش میں کھویا جائیگا۔ نوکر کے جانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ایڈیسن کے ایک بہت گہرے دوست کمرے میں وارد ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایڈیسن صاحب کسی بڑی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک طرف میز پر کھانا رکھا ہے۔ ان کی طرف سے ایڈیسن کی پیٹھ تھی۔ وہ دبے پاؤں کھانے کی میز کی طرف گئے، سرپوش اٹھا کر دیکھا تو کھانا رکھا تھا۔ ان کو مذاق سوجھا۔ چپکے چپکے سارا کھانا کھا گئے۔ جب کھا چکے تو آہستہ آہستہ ہاتھ دھوئے اور پھر ایڈیسن کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کر "آداب عرض" کہا۔ ایڈیسن ایکدم اس طرح چونک پڑے جیسے کسی نے سوتے سے جگا دیا ہو۔ گھبرا کر بولے "آیئے، بیٹھئے۔ آپ تو کئی روز سے آئے ہی نہیں، رہتے کہاں ہیں؟"

دوست نے یہ سنکر سوکھا سا منہ بنا کر کہا "آجکل بڑا مصروف رہتا ہوں۔" اس کے بعد ایڈیسن نے گھڑی میں دیکھا تو کھانے کا وقت گذر چکا تھا۔ فوراً یہ کہتے ہوئے اُٹھے "ارے توبہ! آج مجھے کتنی دیر ہوگئی۔ اب تک کھانا نہیں کھایا۔"

دوست نے یہ سنا تو ہنسی ضبط کئے خاموش بیٹھے رہے۔ ایڈیسن صاحب کھانے کی میز کے قریب گئے، کھانے کا سرپوش اتار کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ معاً بولے "ارے، میں سمجھا تھا کہ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، میں تو کھا چکا ہوں"

اور یہ کہہ کر پھر اپنی کرسی پر بڑے اطمینان سے آکر بیٹھ گئے۔ سگار سلگایا اور اسے پینے لگے۔

دوست نے یہ حالت دیکھی تو قہقہہ لگا کر بولا

"ایڈیسن، خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ اگر تمہارے استغراق کا یہی عالم رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی دن کوئی چور تمہیں چرا کر نہ لے جائے۔ کھانا تو تمہارا میں نے کھایا ہے اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم کھا چکے ہو۔"

ایڈیسن نے جب سارا قصہ سنا تو کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

غرض اس بات کو ثابت کرنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں کہ انسان کی طلب و جستجو کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ کھانے پینے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوا کرتا تو پیٹ بھرے لوگوں میں آپ عالم فاضل اور مفکر و ڈاکٹر ہرگز نہ پاتے۔ ایک شخص کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ انسان کی ہوس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اگر اُسے روئے زمین کی بادشاہت بھی ملجائے تب بھی وہ مطمئن نہ ہوگا بلکہ یہ چاہے گا کہ آسمان کے ستارے چاند سورج اور سیارے بھی اس کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔

بہرحال اگر آپ انسان کے اس ذوق جستجو اور ہوس و طلب پر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اگر انسان کو کھانے پینے کی ضروری چیزیں مہیا کر دی جائیں اور خوش قسمت جانوروں کی طرح اُسے پیٹ بھر کر کھانے کو ملے، بسیرا کرنے کے لئے اُس کے پاس عمدہ سا مسکن ہو اور ایک صحیح و تندرست "جوڑا" بھی اُس کی رفاقت کا دم بھرے تب بھی اس کے حوصلوں اور امنگوں کی دنیا ختم نہیں ہو سکتی، تب بھی وہ مطمئن نہیں ہو سکتا، تب بھی وہ قانع نہیں ہو سکتا، تب بھی وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا، تب بھی اُسے سکون نصیب نہیں ہو سکتا، تب بھی وہ جنگل کے جانوروں اور بن کی چڑیوں کی طرح خوش و خرم نہیں رہ سکتا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان کے حوصلوں اور امنگوں کی آخری آماجگاہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی آسانیاں حاصل کرنا ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے حوصلوں کی آخری آماجگاہ وہ چیز ہے جسے قرآن کی زبان میں —— "خلافت اللہ علی الارض" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انسان صرف اُسی وقت مطمئن ہو سکتا ہے جب وہ یہ محسوس کرے کہ خدا کی جانشینی کا صحیح منصب اس کو مل گیا ہے، جب وہ یہ دیکھے کہ اب کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے حلقۂ اثر میں آچکا ہے۔ اسی چیز کو ہندو فلسفہ کی زبان میں نروان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اسی کو عیسائیت نے سالویشن (یعنی نجات) کہا ہے۔ اور اسی مفہوم کو اسلام کے سادہ فلسفہ کی زبان میں "خلافت اللہ علی الارض" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہر چیز پر درجہ بدرجہ غور کریں۔ دیکھئے انسان کی سب سے پہلی اور ابتدائی ضرورت یہ ہے کہ اسے کھانے کو ملے، پہننے کو اتنا نصیب ہو کہ جاڑے گرمی کی شدت اسے نہ ستائے، جنسی جذبات کی تسکین کے لئے اس کا ایک "جوڑا" ہو یعنی اگر وہ مرد ہے تو اس کی رفاقت کے لئے عورت ہو اور اگر وہ عورت ہو تو اس کی رفاقت کے لئے مرد موجود ہو۔ انسان کی سب سے پہلی اور ابتدائی ضرورت یہی ہے جب تک یہ چیز اسے حاصل نہ ہو گی اس کی نظر کسی اور چیز کی طرف نہیں پڑ سکتی۔ اگر پیٹ خالی ہو تو پھر آسمان کے ثوابت و سیارے کچھ نظر نہیں آتے۔ لیکن جیسے ہی یہ ضرورت پوری ہوئی کہ انسان کے سامنے ایک دوسرا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور وہ دروازہ اس کی روح یا دماغ کا دروازہ ہوتا ہے۔ اور یہی دروازہ ہے جس میں سے ہو کر وہ "خلافت اللہ علی الارض" کے منصب تک پہنچ سکتا ہے اور اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کی پہلی احتیاج یقیناً روٹی کپڑے کی احتیاج ہے اور اس لئے اس احتیاج کو پورا کرنا ضروری ہے۔ مگر اس کو پورا کر دینے کے بعد یہ سمجھ لینا کہ اب زندگی کی تمام احتیاجیں ختم ہو گئیں سب سے بڑی حماقت ہے۔

سوشلزم (اشتراکیت) کے نام سے آج دنیا میں جس معاشی نظام کی دھوم مچی ہوئی ہے اس پر بحث کرنے کا یہ وقت نہیں۔ البتہ اتنا جان لیجئے کہ یہ نظام صرف ہماری پہلی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ اور اس لئے اگر فرض کر لیجئے کہ آج ساری دنیا میں سوشلزم کا معاشی نظام تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ انسانی سکون و اطمینان کی آخری منزل حاصل ہو گئی۔ انسانی سکون و اطمینان کی آخری منزل تو صرف روح کے سکون میں ہے، خدا تک پہنچ جانے اور ہمہ اوست ہو جانے میں ہے۔ اور یہی وہ منزل ہے جس کی طرف دنیا کے تمام مذہبوں نے رہنمائی کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج دنیا کی نظریں سائنس کے چند اکتشافات کو دیکھ کر ایسی پتھرا گئی ہیں کہ انھوں نے انسانی روح کے اصل مقصد کو پس پشت ڈال دینا چاہا ہے۔ یورپ میں عیسائی پادریوں نے جو تباہیاں مچائیں اس نے عوام کو مذہب ہی سے بیزار بنا دیا۔ اور چونکہ دنیا طاقتور کا ساتھ دیتی ہے اس لئے آج یورپ کے سحر سے مغلوب ہو کر ہندوستان کی بہت سے پڑھے لکھے مسلم نوجوان اسلام کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو دنیا کی نجات کا صحیح راستہ سوشلزم ہرگز نہیں بلکہ صرف اسلام ہے جس نے انسان کی جسمانی پرورش کے لئے اسے ایک صحیح معاشی نظام بھی دیا ہے —— ایک ایسا معاشی نظام جس میں ایک آدمی دوسرے آدمی کی محنت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔ (انگریزی اصطلاح میں (EXPLOIT) نہیں کر سکتا) نیز اس کی روحانی تربیت کے لئے ایک بہترین روحانی تعلیم بھی عطا کی ہے۔ اور اس لئے میں سوشلزم کے سحر سامری کے ستائے ہوئے تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ دنیا کی نجات کا راستہ کارل مارکس کے "کیپٹل" (CAPITAL) کی تین جلدوں میں نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی صرف ایک جلد میں مضمر ہے۔

عقل کا دیوانہ پن

اللہ کے بھیدوں کو گنا کرتی ہے
غور اس کی مشیت پہ کیا کرتی ہے
دیوانہ پن اس عقل کا دیکھا اخگر
سیپی میں سمندر کو بھرا کرتی ہے

(اخگر۔ مرادآبادی)

جہالت کی تاریکی!

اسے کیسے دور کیا جاسکتا ہے؟

(از عالیجناب آنریبل قاضی عطاء اللہ خاں۔ وزیر تعلیم و مالیات صوبہ سرحد)

محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کے موقر جریدہ نے اپنی عمر کے پچیس سال قوم وملت کی خدمت میں شاندار طور پر پورے کئے۔ میری دعا ہے کہ آپ کا اخبار بہت عرصہ تک وطن کی خدمت اسی سرگرمی کے ساتھ کرتا رہے جو اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

میں بہت ہی عدیم الفرصت ہوں، اس لئے اس وقت کسی موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال نہیں کرسکتا لیکن چونکہ مجھے تعلیم سے خاص شغف ہے اور میں دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح اپنے ملک کے ہر فرد بشر کو بھی تعلیم یافتہ دیکھنے کا بیحد آرزومند ہوں اس لئے اس سلسلہ میں آپ کے اخبار کے توسط سے تعلیم کے متعلق صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے پڑھے لکھے آدمیوں کی کمی نہیں اگر ان میں سے ہر ایک پڑھا لکھا مرد اور ہر ایک پڑھی لکھی عورت یہ عزم کرلے کہ وہ ایک سال کے اندر اندر ایک مرد اور ایک عورت کو خواندہ بنادے گا تو ہمارے ملک سے جہالت کی تاریکی انشاء اللہ جلد دور ہو جائیگی۔ اس وقت ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد آٹھ دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہے لیکن اگر ہم میں کا ہر تعلیم یافتہ مرد اور عورت اپنے قومی فریضہ کو محسوس کرلے تو یہ المناک حالت بہت جلد رفع ہوسکتی ہے۔

اس بارے میں آپ کے صوبہ کی حکومت کا اقدام نہایت پسندیدہ ہے۔ ہم بھی اپنی بضاعت کے مطابق اپنے صوبہ میں اس بارے میں امکانی کوشش کررہے ہیں لیکن ہماری بے مایگی ہمارے راستہ میں حائل ہے جن اصحاب اور خواتین کو ملک کے سرمایہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے اُن کے ذمہ یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک سے ناخواندگی اور جہالت کی تاریکی کو دور کریں، اور اس بارے میں جتنی کوشش اُن سے ہوسکتی ہے اُس سے دریغ نہ کریں۔ میں اُس دن کی آمد کا بیحد متمنی ہوں جب ہر ایک ہندوستانی فخر کے ساتھ یہ کہہ سکے گا کہ ہمارے وسیع براعظم ہند میں آج ایک متنفس بھی ناخواندہ نہیں رہا۔ خدا کرے کہ اس مبارک دن کی صبح مراد جلدی طلوع ہو۔

ہم کیا بولیں؟

(از جناب ڈاکٹر محمد حامد فاروقی ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ بار ایٹ لا۔ الہ آباد)

جب میں ہندی اُردو کے موجودہ قضیہ پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار یہ شعر ورد زبان ہوجاتا ہے:۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، سہیل از روم
ز خاک مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبیست

اُردو نے یوپی میں جنم لیا، دہلی، لکھنؤ، آگرہ اور الہ آباد کی آب وہوا میں پروان چڑھی، میر، انیس، ذوق وغالب نے اسی صوبہ میں اسے چار چاند لگائے، پریم چند، چکبست اور رتن ناتھ سرشار نے گنگا جمنا کی ان ہی لہروں کے کنارے بیٹھ کر اس کی آبیاری کی، لیکن زمانہ کی نیرنگیاں دیکھئے کہ آج اسی آب وہوا، اسی صوبہ اور اسی خاک سے اس کا بیج ناپید کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ آنکھیں تو یہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں کہ جب ہندوستان کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھوں سے نکلکر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آئیگی اور ہمارے صوبہ کی اسمبلی کے ممبر بولنے کھڑے ہوں گے تو سننے والے ان کی زبان کو سن کر پکار اٹھیں گے، پریم چند، دیا شنکر نسیم اور مومن وآزاد کی بھولی ہوئی زبان پھر رنگ وبار لائیگی اور اسمبلی ہال ہمارے قومی اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے گی لیکن افسوس کہ زمانہ کا انقلاب ان امیدوں پر پانی پھیرتا نظر آرہا ہے۔ اور آج ہم اس فکر میں مبتلا ہیں کہ اُردو کو اس کی جنم بھوم میں مٹنے سے کیسے بچائیں۔

چند روز ہوئے ہندی ساہتیہ سمیلن کا سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ اس میں ہمارے صوبہ کے صدر مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن اور ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند اور مسٹر سکسینہ جیسے ممتاز قوم پرست (؟) افراد شامل تھے اس میں جو چیز ٹیپ کے بند کے طور پر بار بار دُہرائی جاتی تھی وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ ——— اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، اس صوبہ کے رہنے والوں کی مادری زبان صرف ہندی ہے۔ عدالتوں میں آج کل جو زبان رائج ہے وہ عوام کی زبان نہیں ہے۔ اسے بدلنا چاہئے۔ ملک بھر میں ذریعۂ تعلیم صرف ہندی ہو۔ وغیرہ وغیرہ

اس سمیلن کے اجلاس میں ہندی کی حمایت اور اُردو کی مخالفت میں جو جارحانہ اور جنگجویانہ تجویزیں پاس کی گئیں اُن کو یہاں نقل کرکے میں خواہ مخواہ قارئین کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اپنے صوبہ کے صدر اعظم مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی تقریر کے اُس حصہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کئے دیتا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے قبل ہمیں چاہئے کہ اس کے لئے راستہ صاف کریں، میدان تیار کریں اور فضا ہموار کریں تاکہ آہستہ آہستہ وہ دن بھی جلد آجائے جب ہم دفتری، عدالتی اور سرکاری تمام کاروبار صرف ہندی میں کرسکیں۔

اُردو ہندی کے تصفیہ میں عجیب عجیب لفظی بازیگریوں اور منطقی مغالطات سے کام لیا جاتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک ہندوستانی کی جدید اصطلاح

بھی ہے۔ ہندی کے حامی حسب ضرورت موقع محل کی مناسبت سے کبھی ہندی اور اُردو کو ایک ہی زبان کے دو نام قرار دیتے ہیں، کبھی اُردو کو ہندی کی شاخ بتلاتے ہیں، کبھی ہندی اُردو دونوں کو ہندستانی میں ضم کردیتے ہیں، لیکن چالاک بازیگر کی طرح جب ان تمام بحثوں سے باہر آتے ہیں تو اُن کی زبان پر وہی ہندی ہوتی ہے جسے ہندی کے بجائے سنسکرت کہنا زیادہ موزوں ہے۔

میں پرشوتم داس ٹنڈن اور بعض دیگر حضرات کا کافی احترام کرتا ہوں، اور اُن کی ذات کے ساتھ مجھے جو پُر خلوص دوستانہ وابستگی ہے اُسے محو کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود میں اُن کے اُس عمل کی کسی طرح تائید نہیں کرسکتا جو اُردو ہندی کے موجودہ جھگڑے کے سلسلہ میں انھوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم زبان کے مسئلہ کو ایمانداری کے ساتھ سوچنے کے بجائے فرقہ وارانہ لائنوں پر سوچتے ہیں۔ زبان ایک لطیف چیز ہے لیکن افسوس کہ ہم نے اسے سیاست کی کانٹوں بھری وادی میں کھینچکر اس کا حلیہ بگاڑنا شروع کردیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس وقت یہ مسئلہ اتنا اہم اور نازک ہرگز نہ بنتا۔

آج ہندی کی حمایت میں جو لوگ آواز بلند کررہے ہیں وہ اپنے رویہ میں اتنے شدید ہیں کہ کسی طرف سے، ذرا سی لچک بھی اُن میں نہیں پائی جاتی۔ انھیں اصرار ہے کہ زبان کا نام بھی ہندی ہو، رسم خط بھی دیوناگری ہو، الفاظ بھی دیوبانی ہوں اور انداز بیان بھی وہی ہو جس سے آجتک کان آشنا نہیں۔

آج امیر خسرو، ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خاں وغیرہ کے حوالے دے دے کر ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح وہ ہندوستان کی زبان کو ہندی کہتے تھے اسی طرح تم بھی اُردو کے بجائے اُسے ہندی کہو، نیز جس قسم کی وہ زبان لکھتے تھے ویسی ہی تم بھی لکھو۔ گویا ہمیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ایسی زبان لکھیں اور بولیں:۔

چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ دیں، نہ بھیجیں بتیاں

(خسرو)

ہم سے کہا جاتا ہے کہ "اگلے زمانہ کی طرف لوٹو" کیسی حیرت انگیز نصیحت ہے! سوال یہ ہے کہ اگر اس نصیحت کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر زبان ہی پر کیا منحصر ہے ہمیں ہر چیز میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹنا چاہئے میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم کوئی ایک ایسے انگریز کا نام بتلا سکتے ہو جو یہ کہے کہ ہمیں موجودہ انگریزی کو چھوڑ کر اسپنسر، چاسر، یا بین جانسن اور ملٹن کی زبان اختیار کرنی چاہئے؟ کیا کوئی ایک ایرانی ایسا مل سکتا ہے جو آج کل کی ایرانی زبان کے بجائے عہد قدیم کی پہلوی کو ترجیح دیتا ہو؟ کیا کوئی ایک اٹالین ایسا دکھا سکتے ہو جو پرانی لیٹن کو اٹلی کی موجودہ زبان کی جگہ رائج کرانا چاہتا ہو؟ پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہندوستان میں ہم سے یہ کہا جارہا ہے کہ ہماری زبان نے صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں اُنہیں بھول جاؤ، صدیوں کی مدت میں اس میں جو کاٹ چھانٹ ہوئی ہے اُس کو فراموش کردو اور صدیوں کی کوششوں سے زمانہ کی ضروریات کی بنا پر اُس نے جو رنگ اختیار کیا ہے اُسے دماغ سے محو کردو اور اب پھر نئے سرے سے صدیوں پہلے کی بھولی ہوئی اور مٹی ہوئی زبان کو لکھنا اور بولنا شروع کرو۔ بچہ بڑھ کر جوان ہوگیا مگر اب اصرار ہے کہ تو پھر پہلے کی طرح بچہ بن جا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کیا ہے؟ بلکہ یہ دیکھو کہ کیا تھا؟ ——— حیرت!

بہرحال سیاسی بداعتمادی ومنافرت کی موجودہ تاریک فضا کے باوجود میں اب بھی مایوس نہیں ہوں۔ اسی تاریک فضا میں مجھے کچھ یہی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن سے اُمید کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ یہی ہستیاں ہیں جنہیں موجودہ غبار آلود مطلع میں اُمید کے چمکتے ہوئے تارے سمجھنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ شاید یہ فضا زیادہ دیر تک باقی نہ رہے گی، ہم چیزوں کو صحیح طور سے دیکھیں گے اور غلط باتوں پر اصرار کرنا چھوڑ دیں گے۔ خدا نہ کرے کہ یہ توقع غلط ثابت ہو!!

وقت کا سب سے بڑا فریضہ

ہماری نجات کا راستہ کیا ہو سکتا ہے؟

(از حضرت العلامہ مولانا اسلم جیراجپوری۔ استاذ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

ہندوستان کے مسلمانوں کی آجکل جو حالت ہو رہی ہے اس کو اسلام کے آخری عظیم الشان مفکر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس ایک شعر میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کر دیا ہے۔

گنہگار یست بیش از مرگ در قبر
نکیرش از کلیسا منکر از دیر

وہ تہی دست بھی ہے اور بے سرپرست بھی۔ محکوم بھی ہے اور ملک کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں غیر منظم اور کم علم بھی۔ اور یہ سب کچھ خود اسی کے اعمال وافعال کا نتیجہ ہے۔ اس وقت جو ماحول اس کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ اس میں اس کے لئے ایسی راہِ عمل متعین کرنا جس میں اس کی نجات و فلاح یقینی ہو ازبس دشوار ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو عارضی سیاسیات کو اُمت اسلامیہ کی نجات کا راستہ سمجھتے ہوں۔ بلکہ میں کامل یقین رکھتا ہوں کہ ہماری کامیابی ان امور اور مہمات اسلامی ہی میں مضمر ہے جو جاودانی حقیقت رکھتے ہیں۔

قرآن کریم نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں ان سب کو ایک مختصر لفظ میں اس آیت میں ظاہر کیا ہے۔

وماخلقت الجن والانس الالیعبدون۔ میں نے جن وانس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے بندے بنیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے ۲۳ سالہ عہد میں ایک پورے ملک کے باشندوں کے سر جو شرک کے نیندائی اور اس کے حق کی بندگی سے گریزاں تھے اللہ کے سامنے جھکا دئے اور سارے عرب کو جو توحید سے باغی اور سرکش تھا اس کا حامی اور یاور بنا دیا۔ حضور اکرم کے بعد یہ فریضہ اُمت کے ذمہ عاید ہوا جس نے کچھ ادا بھی کیا اور کچھ کوتاہیاں بھی کیں۔ ہندوستانی مسلمان (جو ہر قسم کی جدوجہد سے جو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے لابدی ہے محروم ہے) اُس وقت اس کا فریضہ یہ ہے کہ اپنے ملک کے ان باشندوں کو جو حق سے ناآشنا اور توحید سے ناواقف ہیں قرآن کا پیغام پہنچائے۔ اور ہر مسلم اپنے ذمہ یہ لازم کرلے کہ مرنے سے پہلے کم سے کم ایک گم کردہ راہ کو سیدھے رستہ پر لگا دے۔ تاکہ اس کے سر کے بدلہ میں اپنے سر اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے بدلے میں اپنے ہاتھوں اور پاؤں اور اس کے جسم کے بدلے میں اپنے جسم کو جہنم سے آزاد کرالے۔

ہندوستان کی اچھوت قومیں مدت ہائے دراز سے مظلوم ومقہور ہیں اور کوئی اُن کی پرسش کرنے والا نہیں۔ آج جن لوگوں نے اُن کی طرف نگاہ مرحمت بھی پھیری ہے وہ بھی سیاسی غرض پر مبنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اگر خالصۃً للّٰہ یہ فریضہ ادا کرنے کو تیار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ اس کی بدولت اُن کی سابقہ کوتاہیوں کی تلافی کر دے۔

میرے نزدیک یہ تبلیغ حق نہ صرف مسلمانوں کے لئے مفید ہے بلکہ ہندوستان کی بہبودی بلکہ آزادی کا بھی ایک راستہ ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اپنے اس فریضہ کی ادائگی میں تہاون اور سستی سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ اپنے دستور کے مطابق ان ہی اچھوتوں کے ہاتھوں سے اُن کو سزا نہ دلوا دے۔

مسلمانان ہند میں نہ اجتماعی زندگی ہے نہ اُن کا کوئی امام ہے نہ کوئی مرکز ہے ایسی صورت میں انفرادی لحاظ سے اگر کوئی اجتماعی فائدہ کا کام کیا جا سکتا ہے تو تبلیغ ہی ہے ہر مسلمان دینی حیثیت سے اسلام کا وارث قرآن کا حامل اور خاتم النبیین کا قائم مقام ہے۔ اس لئے اس فریضہ سے ان میں سے کوئی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

تبلیغ کے ہزار طریق ہیں لیکن اس کا اصل راز خلوص اور ہمدردی پر مضمر ہے۔ اگر ہر مسلمان دل سے اس بات پر یقین رکھے کہ کسی مشرک کو توحید کی طرف لانا ایسا عمل ہے جس سے اس کی خود نجات ہوگی تو اس کو اپنا کام سمجھکر کرے گا۔ اور کسی مشکل کو جو اس راستہ میں پیش آئے گی وہ مشکل نہ سمجھیگا۔

اُردو ہندی

سچ ہے کہ ہے اُردو کی سہیلی ہندی
ساتھ اس کے ہمیشہ سے ہے کھیلی ہندی
کس طرح نہ ہو اس سے زیادہ میٹھی
اُردو ہے شکر گُڑ کی ہے بھیلی ہندی

(اخگر مرادآبادی)

فریاد

بحضور شہنشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

(از بسمل سعیدی ہاشمی)

فریاد ہے اے عدل ومساوات کے بانی
اے عدل ومساوات کے مفہوم ومعانی
گذری ہوئی پھر حد سے ہے پاشاہِ تہامی
آقاؤں کی آقائی، غلاموں کی غلامی
ہو گا کبھی نافذ ترا قانون مساوات
پانی کی طرح بہتا ہے اب خون مساوات
آقائی الگ سب کی جو تسلیم ہوئی ہے
ٹکڑوں میں خدائی ہے کہ تقسیم ہوئی ہے
ہیں جبر خدائی لئے احکام پھر اُس کے
دُنیا کے خداوند ہیں اصنام پھر اس کے
پھر اُس کے ستم تیری دہائی سے الگ ہیں
پھر اُس کی حدیں حدِ خدائی سے الگ ہیں!
موجود ہے پھر اس میں ہر ایک چیز کی لعنت
تفریق کی لعنت کہیں تمیز کی لعنت
آمر کی نہ مامور کی پھر حق پہ نظر ہے
پھر کوئی عمرؓ ہے نہ کوئی ابن عمرؓ ہے
قرآن نہیں یا ترے فرمان نہیں ہیں
یا آج زمانے میں مسلمان نہیں ہیں؟
کیا قابلِ تسلیم تری بات نہیں ہے
کیوں اب تری اُمت میں مساوات نہیں ہے؟!
مذہب کو یہ مدت سے مگر چھوڑ چکی ہے
اُمت تری "تہذیب کا بت" پوج رہی ہے
والی کوئی دنیا میں غریبوں کا نہیں اب
وارث کوئی برگشتہ نصیبوں کا نہیں اب
ہر بیکس ومسکین کی جو تسکین ہے تری ذات
پھر منتظر بیکس ومسکیں ہے تری ذات

افسانہ

شیخ و برہمن

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

ذیل کا افسانہ ڈاکٹر اعظم کریوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک کہنہ مشق افسانہ نویس ہیں اور چونکہ ہندی ادب شاعری پر بہت گہری دسترس رکھتے ہیں اس لئے ڈاکٹر ٹیگور کی طرح ان کے افسانوں میں ہندوستان کا مقامی رنگ بہت نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہے اس لئے کہ اس میں ہندوستان کے موجودہ ہندو مسلم فساد کے مسئلہ کو ایک نہایت حکیمانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کی دوستی صرف اُن کے گاؤں کچھنا ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک مشہور تھی۔ شیخ جی کے پاؤں میں کانٹا چُبھتا تو پنڈت جی کے دل پر چوٹ لگتی۔ اور اگر پنڈت جی کو کوئی تکلیف ہوتی تو شیخ جی بے چین ہو جاتے۔ جب تک دونوں آپس میں مشورہ نہ کر لیتے کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتے۔ پنڈت جی کے ہاں جب ست نارائن کی کتھا ہوتی تو شیخ منیر کے ہاتھ میں سارا انتظام رہتا۔ اور شیخ منیر کے ہاں میلاد شریف کی مجلس ہوتی تو پنڈت جی انتظام کرتے۔ گھر بھی دونوں کا ملا ہوا تھا۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے چبوترہ پر دونوں کی نشست رہا کرتی۔ رات کو گاؤں کے اور دو چار کسان وہاں آجاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ صبح کے وقت گاؤں کے اکھاڑے میں پہنچ جاتے۔ دونوں اکھاڑے کے خلیفہ تھے۔ جوانی میں بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا۔ شاگردوں کو کشتیاں لڑاتے اور داؤں پیچ بتاتے تھے کبھی دل میں آجاتا تو زور بھی کرا دیتے۔ جب کہیں دنگل ہوتا تو شاگردوں کے ساتھ ضرور جاتے۔ ان کے دم قدم کی برکت سے کچھنا کے پہلوان جس دنگل میں گئے فتحمند واپس آئے۔

شیخ جی اور پنڈت جی کا شمار گاؤں کے بڑے کاشتکاروں میں تھا دونوں کے پاس اتنی موروثی کاشتکاری تھی کہ بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ مختلف مذہب کے پیرو ہوتے ہوئے بھی ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ پریم کے پجاری تھے۔ محبت نے اُن کے دلوں سے شیخ و برہمن کی تفریق دور کر دی تھی۔ ظاہر میں وہ دو، لیکن باطن میں ایک تھے۔ اسے اتفاق سمجھئے یا خدا کی قدرت کہ دونوں کی صرف ایک ایک ہی اولاد ہوئی۔ شیخ جمن اور جٹا شنکر بھی اپنے والدین کی طرح آپس میں لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی اٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے۔ شیخ جمن کی شادی میں پنڈت دیا شنکر اور جٹا شنکر کے بیاہ میں شیخ منیر "اگوا" بنے تھے۔ غرضکہ جب تک پنڈت جی اور شیخ جی زندہ رہے، ایک جان اور دو قالب بنے رہے۔ اور مرے بھی تو اتفاق سے ایک ہی ماہ میں۔ پہلے پنڈت جی سُرگباش ہوئے، ان کے پیچھے شیخ جی بھی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

—— (۲) ——

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کے مرنے کے بعد ایک سال تک دونوں گھروں کے تعلقات بدستور رہے۔ لیکن جب پنڈت دیا شنکر کی برسی ہوئی اور جٹا شنکر نے خلاف معمول شیخ جمن سے کوئی مشورہ نہ لیا تو اسکو بہت ناگوار گذرا۔ برسی میں جو ست نارائن کی کتھا ہوئی اُس میں بھی جٹا شنکر نے شہر سے کسی نئے پرچارک کو بلایا۔ پرچارک جی بزعم خود جوشیلے اور قوم پرست واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے کتھا کے بعد بات چیت میں سنگٹھن پر خاص طور سے زور دیا اور دانستہ یا نادانستہ کچھ مسلمانوں کے خلاف بھی کہہ ڈالا شیخ جمن کتھا میں موجود تھے۔ اُن کے لئے یہ نئی بات تھی بچپن ہی سے اُن کے تعلقات ہندوؤں سے خصوصاً جٹا شنکر سے برادرانہ تھے۔ اگر سنگٹھن کے علاوہ پرچارک جی مسلمانوں کے خلاف کچھ نہ کہتے تو کوئی اعتراض کا موقعہ نہ تھا۔ جمن پڑھا نہ لکھا اُجڈ گنوار تھا۔ اس نے سمجھا کہ یہ سب جٹا شنکر ہی کے اشارہ سے ہوا ہے۔ ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب ست نارائن کی کتھا ختم ہو جاتی تو جمن بھی پرشاد لے کر اپنے گھر جایا کرتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ کتھا ختم ہوتے ہی پرشاد لئے بغیر ہی شیخ جمن منہ لٹکائے گھر واپس ہوئے۔ اُن کو واپس جاتے دیکھ کر جٹا شنکر کی ماں نے کہا "بیٹا! ایسی جلدی کیا ہے۔ ابھی بیٹھو، پرشاد لیکر جانا"۔

"موسی! مجھے آج گھر پر بہت ضروری کام ہے۔ پرشاد میں لے چکا"۔ یہ کہتے ہوئے شیخ جمن نکل گئے۔ اگر جٹا شنکر اُن کو روکتے تو ممکن تھا کہ شیخ جمن ٹھہر جاتے، لیکن اس کا موقعہ ہی نہیں ملا، کیونکہ جٹا شنکر کسی کام میں مشغول تھے اور انھوں نے شیخ جمن کو جاتے نہیں دیکھا۔

—— (۳) ——

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ دو تین دن ہوئے پہلی بارش پڑ چکا تھا۔ جتائی شروع ہو چکی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ شیخ جمن اپنے کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیلوں کو ہانکتے اپنے کھیت سے گھر واپس آ رہے تھے۔ راہ میں اُن کی ملاقات اپنے ایک دوست گھسیٹے خاں سے ہوئی۔

گھسیٹے خاں نے کہا۔ "کہو شیخ جی، کل تو تم نے ہندوؤں سے مسلمانوں کو خوب گالیاں دلوائیں"۔

"میں اور مسلمانوں کو گالیاں دلواؤنگا، جھوٹ بالکل جھوٹ۔ ہاں کل جٹا شنکر کے یہاں کتھا تھی، میں وہاں گیا ضرور تھا، وہاں جو کچھ بات چیت ہوئی اس میں میری کیا خطا تھی؟"

"تمام گاؤں کے مسلمان اس کا الزام تم ہی پر رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے مسلمانوں کو گالیاں دی گئیں، اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔ خدا کی قسم میں اگر وہاں موجود ہوتا تو خون کی ندی بہا دیتا۔ لیکن میں ایسی جگہ جانے ہی کیوں لگا۔ ہندوؤں کی کتھا اور اُن کی دوستی تم ہی کو مبارک رہے۔ ابھی کیا ہوا ہے۔ اگر جٹا شنکر تمہارا دیوالہ نہ نکالدے تو کوئی بات ہی نہیں"۔

شیخ جمن خود تو جٹا شنکر سے ناراض تھے لیکن اس وقت تک اتنی عقل رکھتے تھے کہ گھسیٹے خاں کی اس بات میں اُنہیں شرارت کی بو آئی۔ جلکر بولے۔ "میں خود جٹا شنکر سے سمجھ لونگا۔ کسی غیر کو میرے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہیں"۔

گھسیٹے خاں نے دیکھا کہ شکار قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ کہنے لگے۔ "ہاں بھئی! جٹا شنکر تمہارا سب کچھ ہے۔ میں تو غیر ٹھیرا۔ میں نے بھر پایا۔ اب تم سے کبھی کچھ نہ کہونگا"۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ راہ میں مُلا کمال مل گئے۔ مُلاجی نے پوچھا "کہو یارو، کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" گھسیٹے خاں کو سہارا مل گیا۔ کہنے لگے "کل جٹا شنکر کے یہاں مسلمانوں کو خوب گالیاں دی گئیں۔ شیخ جی وہاں موجود تھے لیکن چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اس پر جو میں نے اِن سے کہا تو اُلٹے مجھ ہی پر خفا ہونے لگے"۔

مُلاجی بولے۔ "اس میں بگڑنے کی کون بات تھی، جمن کو خدا جانے جٹا شنکر نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ یہ اسی کی غلامی میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ وہ جٹا شنکر سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیوں! گھسیٹے میں سچ کہتا ہوں؟"

شیخ جمن کے جواب سے گھسیٹے خاں کچھ مایوس ہو چکے تھے۔ مگر مُلاجی کے ساتھ دینے سے ان کا دل بڑھ گیا، بولے "اجی ان کے سامنے جٹا شنکر کوئی چیز نہیں۔ یہ ہر بات میں اس سے بڑھ کر ہیں۔ مگر ان کو سمجھائے کون؟ جب گاؤں کا کوئی مسلمان کتھا میں شریک نہیں تھا تو ان کے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ جو مسلمان ہندوؤں کی کتھا سنتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیوں ملاجی یہ سچ ہے نا؟"

ملاجی کی دوڑ گاؤں کی مسجد ہی تک تھی۔ اُردو کی پہلی کتاب بھی ختم نہیں کی تھی کہ ملاجی بن گئے۔ کلام پاک کی دو چار آیتیں طوطے کی طرح رٹ رکھی تھیں جس سے وہ خود کو زبردست عالم سمجھنے لگے تھے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ گھسیٹے خاں نے ان سے فتویٰ مانگا تو دل میں خوش ہو کر فرمانے لگے۔ "ہاں حدیث کی بڑی بڑی کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ جو کافروں سے میل جول رکھتا ہے وہ بھی کافر ہو جاتا ہے"۔

شیخ جی کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ "آہ! مجھے یہ پہلے سے کیوں نہ معلوم تھا۔ میں نے دھوکا کھایا"۔ اُنھوں نے بڑی حسرت سے ملاجی سے پوچھا "کیوں ملاجی، جو مسلمان پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، وہ بھی کیا ہندوؤں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے کافر ہو جائینگے"۔

ملاجی نے منہ بنا کر کہا "شرعی معاملات میں دلیل و حجت کی ضرورت نہیں، جو کچھ حدیث میں لکھا ہے میں نے بتا دیا۔ آگے تم جانو تمہارا کام"۔

اب سب شیخ جمن کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔ شیخ جی نے ہل کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ گھسیٹے خاں اور ملاجی کے لئے چارپائی بچھا دی گھسیٹے خاں نے شیخ جمن سے ہمدردی کرتے ہوئے ملاجی سے پوچھا۔ "بچارے شیخ جی کو کیا معلوم تھا کہ کتھا سننے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ جس سے یہ پھر پکے مسلمان ہو جائیں"۔

مُلاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ہاں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے کیوں جمن تم اپنے باپ کی برسی کب کرو گے؟"

"آج کے آٹھویں دن برسی ہو گی"۔

"برسی میں میلاد شریف کی محفل بڑی شان سے کرانا چاہئے۔ وعظ کے لئے شہر سے کوئی مولوی بلاؤ۔ کہنے کو تو میں بھی وعظ کہہ سکتا ہوں۔ لیکن بھائی گاؤں کا معاملہ ہے۔ میں اس میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ شہر سے جو مولوی صاحب بلائے جائیں وہ بھی اپنے وعظ میں ہندوؤں کی خوب خبر لیں۔ اس طرح سے تم جٹا شنکر سے بدلہ لے لوگے۔ پندرہ بیس روپیہ کا خرچ ہے۔ لیکن تمہارے لئے یہ معمولی بات ہے"۔

شیخ جمن نے کہا "خیر روپیہ کی کوئی فکر نہیں۔ لیکن میں تو شہر کے کسی مولوی صاحب کو نہیں جانتا"۔

مُلاجی بولے "اس سے تم بے فکر رہو میں سب انتظام کر لوں گا"۔

شیخ جمن جال میں پھنس گئے۔ ملاجی نے انھیں کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ چنانچہ جب شیخ جمن کے یہاں محفل میلاد شریف منعقد ہوئی تو شہر سے ملاجی کسی "بڑے مولانا" کو بلا لائے۔ انھوں نے اپنے وعظ میں فتویٰ دیدیا کہ ہندوؤں سے ملنا جلنا یا اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنا کفر ہے۔ وعظ کہکر بڑے مولانا تو واپس تشریف لے گئے۔ مگر جو آگ پنڈت جی کے پرچار سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ اب مولانا کے وعظ سے یکبارگی بھڑک اُٹھی، اور گاؤں کا امن خطرہ میں پڑ گیا۔

(۴)

صبح کا وقت تھا۔ پنڈت جٹا شنکر اپنے چبوترہ پر بیٹھے لالہ بہاری لال پٹواری اور چھوٹے لال بنئے سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دور پر ننکو واچار زمین پر بیٹھا مونج کی رسّی بٹ رہا تھا۔ شیخ جمن اپنے گھر سے نکلے۔ اُن کو دیکھ کر جٹا شنکر نے کہا "کیوں شیخ جی، ہندوؤں کو گالیاں دلوا کر اب تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟"

شیخ جمن نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔ "جو جیسا کہیگا ویسا سنے گا۔ وہ دن بھول گئے جب تم نے مسلمانوں کو گالیاں دلائی تھیں سچ ہے میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو"

"لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا"۔

"دیکھا جائیگا" یہ کہتے ہوئے شیخ جمن آگے بڑھ گئے۔ چبوترہ پر بیٹھے نہیں۔

چھوٹے لال بنئے نے کہا۔ "شیخ جی تو بہت بگڑے ہوئے ہیں"

پٹواری۔ "رانی روٹھیں گی، اپنا سہاگ لیں گی"

چھوٹے لال۔ "شیخ جی کا کسی سے مقابلہ پڑے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا"

ننکو واچار نے دیکھا کہ وہی سب سے پیچھے رہا جاتا ہے۔ بول اُٹھا "چار بگیہ جمین (زمین) پر اتنا اکڑت (اکڑتے) ہیں۔ کہوں جمیندار ہوت تو ہم لوگن کا کچا کھائے جات (کہیں زمیندار ہوتے تو ہم لوگوں کو کچا کھا جاتے)"

اب جٹا شنکر کی باری تھی۔ کہنے لگا "پر تو یہاں پروا کس کو ہے۔ گاؤں میں گنتی کے تو مسلمان ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو مار کر بھگا دیں گے۔ وہ لو بھگوانداس مہاراج بھی آ گئے۔ اُن کی رائے بھی لے لو"

بھگوانداس مہاراج گاؤں کے پروہت تھے۔ انھوں نے جب سارا معاملہ سنا تو کہا "ان ملکشوں کا کبھی وشواش نہیں کرنا چاہئے۔ سب کو ان سے اسہوگ کرنا ہی اُتم ہے پرماتما کرے سب مسلمان گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں"

ننکو واچار اچھل پڑا "با مہاراج ——— تم نے بڑی ماکول (معقول) بات کہی۔ دھن ہے تمہری بدھی کو۔ کہو تمھو تمہار کا رائے ہو (تمہاری کیا رائے ہے)"

چھوٹے لال بنئے نے جواب دیا "مدا (لیکن) ہمارا نسکان (نقصان) ہو گا"

پٹواری نے سنبھالا "نہیں نہیں، تم اس کی فکر نہ کرو"

آخر کار مہاراج بھگوانداس کی رائے سب نے مان لی اور اسی دن سے گاؤں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جہاں کبھی ہندو مسلمان آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ وہاں اب نفاق کا بیج بو دیا گیا۔ شیخ و برہمن کی جنگ سے پریشان ہو کر امن امان کی دیوی گاؤں سے رخصت ہو گئی،

(۵)

ایک دن پنڈت جٹا شنکر کے بیلوں کی چر میں شیخ جمن کی مُرغی چلی گئی۔ جٹا شنکر نے ڈھیلا مارا۔ جمن نے دیکھ لیا۔ پہلے ڈھیلے، کا کیا ذکر، اگر جٹا شنکر مُرغی کو جان سے بھی مار ڈالتے تو شیخ جی کو کوئی صدمہ نہ ہوتا۔ لیکن اب تو لاگ ڈانٹ تھی۔ جمن نے سوچا کہ جٹا شنکر نے جان بوجھ کر اُن کی مرغی کو ڈھیلا مارا ہے۔

بگڑ کر بولے "تم نے میری مرغی کو ڈھیلا کیوں مارا ہے؟"

"ہمارا نقصان کریگی تو ہم ضرور مارینگے"

"آئے کہیں کے بڑے مارنے والے۔ اب مارو تو بتائیں"

"اچھا یہ بات ہے تو اپنی مرغی بھیجکر دیکھ لو"

"اب اس ضد پر تو میری مرغی ضرور جائیگی۔ میں بھی دیکھونگا کہ کون مائی کا لال میری مرغی کو مارتا ہے"

"شیخ جی! بس زیادہ نہ بڑھو۔ زبان سنبھال کر بات کرو نہیں تو اسکا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ تمہاری مرغیاں میرا نقصان کریں اور اگر میں کچھ کہوں تو بجائے شرمندہ ہونے کے اُلٹا مجھے آنکھیں دکھاتے ہو"

"تم کو کچھ کہنا تھا تو مجھ سے کہتے۔ میری مرغی کو مارنیوالے تم کون ہوتے ہو۔ میں تم سے دبنے والا آسامی نہیں ہوں۔ تم ایک کہوگے تو میں ہزار کہونگا۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں سمجھا۔ مجھ سے زیادہ بولوگے تو ساری شیخی خاک میں ملا دوں گا"

"آہا! چیونٹی چلی بہرا ئچ۔ تمہاری یہ مجال کہ مجھ سے آنکھ ملاؤ اچھا آؤ اب دیر کیا ہے۔ لاٹھی لیکر آ جاؤ۔ آج ہی ہمارا اور تمہارا فیصلہ ہو جانے" یہ کہہ کر شیخ جمن گھر سے لاٹھی لینے کے لئے دوڑے۔ ماں نے گھبرا کر پوچھا "کیا معاملہ ہے؟" لیکن جمن نے غصہ میں کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر بھی جب جٹا شنکر گھر سے لاٹھی لے کر باہر نکلنے لگے تو ان کی ماں نے ٹوکا۔ مگر وہ بھی بغیر کچھ کہے جلدی سے باہر آ گئے۔

اس اثنا میں گاؤں کے اور بھی ہند و مسلمان جمع ہو گئے تھے مسلمانوں نے شیخ جی کا ساتھ دیا اور کہا "شیخ جی گھبرانا نہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر آج تم دب گئے تو اتنا سمجھ لینا کہ پھر ہندو ہمارا گاؤں میں رہنا دشوار کر دیں گے"

دوسری جانب ہندوؤں نے جٹا شنکر کو اُبھارا "خبردار مسلمانوں سے دبنا نہیں۔ اکڑے رہو"

دونوں جانب کے گنوار مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اب یہ جٹا شنکر اور شیخ جمن کی لڑائی نہ تھی، بلکہ شیخ و برہمن کی جنگ تھی۔ گاؤں میں زمینداروں کا ظلم برداشت کیا جا سکتا ہے، لگان کی وصول یابی کے وقت کارندوں کی مار پیٹ کا بھی جا سکتی ہے، پیادوں کی گالیاں کھائی جا سکتی ہیں، حاکم پرگنہ کی بیگار میں کوئی عذر نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس وقت شیخ و برہمن کا سوال پیدا ہو گیا تو فاقہ کش ہند و مسلم کسان اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر اس جنگ میں نہ تو کتھا والے پرچارک شریک تھے اور نہ میلاد شریف والے مولانا۔ اس وقت بھُس میں چنگاری ڈال کر وہ دور سے تماشا دیکھنے والوں میں بھی نہیں تھے۔ فریقین جوش غضب میں پاگل ہو رہے تھے۔ انجام کی کسی کو کوئی خبر نہ تھی، ہندوؤں نے "جے۔ جے" اور مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ مارا۔ دونوں جانب کے سردار شیخ جمن اور پنڈت جٹا شنکر سب سے پہلے لاٹھی سنبھال کر آگے بڑھے۔ قریب تھا کہ دونوں جانب کی لاٹھیاں چل جائیں کہ ٹھیک اُسی وقت جٹا شنکر اور شیخ جمن کی مائیں دوڑتی ہوئی آئیں اور دونوں کے درمیان کھڑی ہو گئیں۔ جوش پر آیا ہوا یہ دریا تھم گیا۔ اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔ مہاراجن نے اپنے لڑکے جٹا شنکر کو مخاطب کر کے کہا۔

"تو میرے جیتے جی جمن پر لاٹھی نہیں چلا سکتا۔ تجھے مارنا ہی ہے تو پہلے اپنی ماں پر لاٹھی چلا۔ میں جمن کو تجھ سے کم نہیں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی میرا بچہ ہے جس کو تو آج مارنے چلا ہے۔ اسی کو تیرے پتا جی اپنی جان سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ آج تم دونوں بھائیوں کی لڑائی سے اُن کی آتما کو کتنا دکھ پہنچ رہا ہوگا۔ ہائے وہ میل ملاپ کے دن کیا ہوئے۔ تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ تو دوسروں کے بہکانے میں آ گیا ہے مسلمان برسوں سے اس گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اُن سے لڑائی مول لینا اچھا نہیں۔ آپس کی لڑائی سے سارا گاؤں تباہ ہو جائے گا۔ جنھیں تو اپنا دوست سمجھتا ہے وہ وقت پڑنے پر تیرا ساتھ نہ دیں گے۔ فوجداری سے جو ہتھیا ہوگی۔ اس کا پاپ کس پر پڑے گا؟"

ادھر مہاراجن جٹا شنکر کو سمجھا رہی تھیں، اور ادھر شیخ جمن کی ماں اپنے بیٹے کو لعنت ملامت کر رہی تھیں "میں جٹا شنکر پر ہرگز کوئی آنچ نہ آنے دونگی، وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میرا کیا میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی ہوں، آج نہ مری کل مری۔ مارنا ہے تو مجھے مار ڈال، میری خون سے تیرا غصہ ٹھنڈا ہو جاویگا۔ ایک مُرغی کے پیچھے تو جٹا شنکر کی جان لینے چلا ہے، توبہ۔ توبہ! جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم دونوں بھائیوں کو لڑا کر تماشا دیکھیں ان کی منشا میری زندگی میں پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک مہاراجن اور میں زندہ ہوں اس گھر میں پھوٹ نہیں پڑ سکتی"

اتنا کہہ کر وہ مہاراجن کی طرف بڑھیں۔ دونوں گلے ملکر رونے لگیں! بہت ہی پُر اثر اور حسرت ناک نظارہ تھا۔ دونوں کی محبت آمیز تقریر اور پاک آنسوؤں نے بغض و عناد کے خس و خاشاک کو بہا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل صاف ہو گئے۔ جٹا شنکر اور شیخ جمن آگے بڑھے اور دونوں گلے مل گئے۔ سب یکبارگی چلا اٹھے "ہندو مسلمان کی جے"

طلسم بے خبری

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ!
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ مے خانہ!
یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ
طلسم بے خبری کافری و دینداری
حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ
نصیب خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ!

(اقبال)

داستانِ دل

اُردو کی عشقیہ شاعری

(از جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ ایم اے۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی)

ذیل کا نہایت دلچسپ ادیبانہ مضمون اُردو ادب کی ایک ممتاز ہستی پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر موصوف اُردو شعر وادب کا نہایت ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور ہمارے ادیبوں کے اُس خوش نصیب گروہ میں شامل ہیں جنکو علم وادب کی دولت وراثت میں ملی ہے یعنی آپکے والد بزرگوار جناب گورکھ پرشاد صاحب عبرت بھی اُردو کے بہترین ادیب تھے۔ چنانچہ "حسن فطرت" کے نام سے ایک مثنوی آپ کی یادگار ہے۔

ذیل کے مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے ایک خاص زاویۂ نظر سے عشق و عاشقی کے موضوع پر نظر ڈالی ہے جس کا مطالعہ کافی دلچسپی کا سامان فراہم کرسکتا ہے۔ (ایڈیٹر)

اُردو کی عشقیہ شاعری پر برا بھلا بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ عشقیہ شاعری کو آپ جو کچھ سمجھیں بہت سے لوگ تو عشق ہی کو ایک روگ یا کم از کم بُری چیز بتاتے ہیں۔ اس کا فیصلہ آپ کریں کہ عشق کرنا ایک معقول آدمی' ایک بھلے چنگے آدمی کے لئے کہاں تک مناسب ہے۔ اگر سے کے پھیر سے ایک معقول آدمی عاشق ہو بھی گیا تو اُس کی کیا درگت بنتی ہے۔ غالب تو عشق کا رونا یوں روتے ہیں:۔

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اور جوش ملیح آبادی نکمّا ونکمّا نہیں مانتے بلکہ یہ دعوی کرتے ہیں:۔

عشق میں کہتے ہو حیران ہوئے جاتے ہیں
یہ نہیں کہتے کہ انسان ہوئے جاتے ہیں

بہر حال اگر دلوں کا چور نکل سکے تو بڑے بڑوں کی قلعی کھل جائے۔ ایک انگریزی مصنف شاید آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ پیری کی ٹریجیڈی یہی ہے کہ آدمی جوان رہتا ہے یعنی پیری میں بھی جوانی دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔ حالی بھی تو کچھ یونہی کہتے ہیں:۔

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

ہاں تو عشق آدمی کے ساتھ کیا کرتا ہے یہ آدمی آدمی یا عشق عشق پر منحصر ہے۔ اور اگر سماجی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو قوم قوم یا سماج سماج پر منحصر ہے۔ ایک طرف تو جوانی دیوانی مانتے ہوئے حالی نے جوانی کا ماتم کیا ہے دوسری طرف یہ رونا بھی حالی ہی روتے ہیں۔

اے عشق تونے اکثر قوموں کو کھاکے چھوڑا
جس گھر سے سر اُٹھایا اس کو بٹھاکے چھوڑا

حالی کی پیلی غزل دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا مقطع سنئے:۔

اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگاکے چھوڑا

ہندوستان میں رام' کرشن' ارجن' پرتھی راج' نل اور دمن' یورپ میں سکندر اعظم' سیزر۔ اینٹنی اور کلیوپیٹرا' نپولین' نلسن' پارنل اور پھر شیریں فرہاد' لیلیٰ مجنوں' غزنوی اور ایاز کی کتھائیں ہیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے لیکن عشق نے سب کو چھٹی کا دودھ یاد دلاکر بیوقوف بنایا یا عقلمند بنایا۔ ان کو بنایا یا بگاڑا اس کا فیصلہ آپ کریں۔ لیکن میں بھی کیوں نہ لگے ہاتھوں اپنی رائے ناقص اس معاملے میں ظاہر کردوں۔ عام طور پر تو عقلمند آدمی اُس وقت بھی لئے دیئے رہتا ہے جب عشق نے اس کے اندر ایک زلزلہ پیدا کردیا ہو اور اس کے کلیجے کا خون ہو رہا ہو اور بے اختیار آدمی عام طور پر عشق کے جھٹکوں سے اور بھی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ لیکن عقلمند کے معنی ذہین یا ذکی کے نہیں ہیں بلکہ ادراک اور احساس کی بجائے قوتِ ارادی اور قوتِ عمل کے مضبوط اور متوازن ہونے سے مراد ہے اگر قوتِ ارادی اور قوتِ عمل ڈانواں ڈول اور غیر متوازن ہے تو ادراک اور احساس ذہانت ذکاوت اور طباعی عشق ہونے پر جان کا جنجال ہو جاتی ہیں۔ عشق کی اصطلاح میں عالم اور عاقل بے عمل احمق بن جاتا ہے۔ غالباً یا یقیناً احمق محض یا محض بیوقوف آدمی تو عاشق ہو ہی نہیں سکتا۔ عاشق ہونے کے لئے عقلمند ہونا ضروری ہے لیکن عشق میں سنبھلے ہوئے رہنے کے لئے فولادی رگ وریشے کی ضرورت ہے۔ یہاں تقدیر کا فیصلہ حساسی اور عقلمندی پر نہیں ہے بلکہ مزاج پر ہے۔ یا کردار پر ہے یا مجموعی شخصیت پر تقدیر کا فیصلہ ہے۔

ہاں تو عشق ایک شدید ترین احساس کا نام ہے۔ بنیادی طور پر یا مرکزی طور پر تو اس کا مخزن یا تعلق جنسیات یا شہوانیات میں ملے گا۔ اور یہاں سے اُبھر کر جذبات اور نفسیات کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تمام قوائے انسانی اور تمام شخصیت میں یہ احساس یا یہ غیبی تحریک بھر جاتی ہے اور شش جہت سے انسان پر چھا جاتی ہے۔ بات تو صرف اتنی ہے جو حالی نے کہی ہے یعنی:۔

عشق کہتے ہیں جسے سب وہی ہو شاید
خود بخود دل میں ہو اک شخص سمایا جاتا

جب یہ حال ہے اور جب یہ بات ہے تو اس میں رزم اور بزم قصہ کہانی اور رنگا رنگ نوعیتوں کی جاسوسی افسانوں کی طرح نئے نئے واردات اور سانحات یا سیر وسیاحت کی طرح نئے نئے مناظر نئے نئے واقعات اور حیرت انگیز خبروں کی گنجایش عشق کے افسانوں میں کہاں۔ تنوع سے لبریز خارجیت کا موقع عشق وحسن کے افسانوں میں کہاں۔ بات تو وہی ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور اسی ایک بات کی سو باتیں بن جاتی ہے۔ بقول حالی:۔

نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا ٭ بڑی وسعت ہے میری داستاں کی

جس طرح طلوع آفتاب میں اور تاروں کے اُگنے میں بھوک اور پیاس میں مناظر قدرت میں میٹھی نیند کے بعد اُٹھنے میں پرانا پن اور نیا پن' بوسیدگیت اور تازگی ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی اسی طرح عشق میں بھی رہی ہے اور رہے گی۔ عشق کی خوشیاں اور غم کی حالتیں' اُمیدیں اور ناامیدیاں' تلخیاں اور نرمیاں' راست گویاں اور دروغ گوئیاں' قربانیاں اور خود غرضیاں' اس کی ٹریجڈی اور اس کی کامیڈی اُمنگ اور بے دلی' تازگی اور افسردگی' گھبراہٹیں اور دلفریبیاں' حساسی اور بے حسی' رنگینیاں اور اُداسیاں' تذبذب اور یقین' خلوتیں اور جلوتیں سب کی سب اسی ایک غیبی جذب وکشش اور تحریک کے کرشمے ہیں کہ "خود بخود دل میں ہر ایک شخص سمایا جاتا" ورنہ جیسا میں نے اپنے اک شعر میں کہا ہے:۔

یہی ہوا کہ ترے بیدلوں پہ کچھ نہ ہوا
جو آئے لفظ وبیاں میں وہ واردات نہیں

یہ وہ افسانہ ہے جس میں سب کچھ ہوتا ہے اور پھر کچھ نہیں ہوتا شخصیت کے کرشمے واقعاتی چیزیں نہیں ہیں۔ یہاں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ:۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے ——— میر

یا:۔

وصل وہجراں ہیں کہ یہ دو منزلیں تھیں عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا ——— میر

کہا جاتا ہے کہ ایک جاہل افغانی ایک مشاعرے میں موجود تھا اور قریب قریب ہر شعر پر خوب جھوم رہا تھا اور دل کھول کر داد دے رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آغا کیا سمجھے؟ اس نے کہا ہم سب سمجھ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا اس شعر کا کیا مطلب ہے اس نے کہا "ہاں وہی بات ہے" اس غریب نے کیا غلط کہا مضمون آفرینی کئے جائیے۔ بات تو سب وہی ہے۔

یہ سب سہی لیکن پھر بھی عشق کی بدولت کیا کچھ نہیں ہوا۔ بقول مومن "کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے" یعنی قتل' خودکشی' مارپیٹ کبھی معمولی اور کبھی شدید۔ یہ قتل اور یہ مارپیٹ دوسرے فریقوں کے علاوہ عاشق ومعشوق کے درمیان بھی ہوئے ہیں۔ آتش زنی' لوٹ' دھوکہ' جعل سازی' چوری' غبن' مقروض ہوجانا' بک جانا' نشہ خوری' جوا۔ جھوٹ' عیاشی اور ہر طرح کی بربادی یہاں تک کہ دو قوموں کی لڑائی اور جتنے ممکن جرائم ہیں یہ سب بھی اسی عشق کے کارن ہوئے جس کے لئے جوش نے کہا کہ "یہ نہیں کہتے کہ انسان ہوئے جاتے ہیں" اور غالب نے صرف اتنے ہی پر بات ختم کردینی چاہی تھی کہ "عشق نے غالب نکما کردیا" بہر حال عشق کے برباد اور آباد کرنے کے نتیجے اور اسکے تخریبی اور تعمیری اثرات بہت دور تک پہونچتے ہیں

اچھا اب ذرا ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ عشق سے متعلق کچھ سوالات پر غور کیجئے۔ (۱) کیا میاں کو صرف بی بی سے اور بی بی کو صرف میاں سے عشق ہونا چاہئے۔ یا ہوتا ہے (۲) کیا معشوق سے شادی ہوجانے کے بعد عشق قایم رہ سکتا ہے (۳) اگر نہیں تو ایک شادی شدہ یا غیر شادی شدہ مرد کو کتنی عورتوں سے اور ایک شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورت کو کتنے مردوں سے عشق ہوسکتا ہے (۴) اور کتنے کتنے عرصہ کے بعد عورت یا مرد اپنے اپنے معشوقوں کو بدل سکتے ہیں (۵) عشق مجازی میں اور ہوس میں داخلی اور خارجی طور پر یعنی جذباتی اور عملی طور پر کیا فرق ہے (۶) کیا عشق مجازی' شہوانی اور جنسی ترغیبوں اور خواہشوں کا نام ہے؟ کیا

ان خواہشوں کے برتنے سے سچا عشق نہیں رہتا اور اگر رہتا ہے تو عشق اور ہوس میں کس بنا پر امتیاز کیا جائے۔ (۷) کیا چند حالتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ شوہر یا بی بی کے ہوتے ہوئے یا نہ ہوتے ہوئے کسی اور سے بھی سچا اور مستقل اور شدید عشق ہو اور دو چار سے کبھی کبھار سے جنسی تعلقات بھی برت لئے جائیں۔ (۸) کیا یہ بھی ممکن ہے کہ عاشق و معشوق میں سچی اور مستقل محبت کے باوجود کبھی کبھی جذبۂ عشق ٹھنڈا پڑ جائے اور پھر تازہ ہو جائے۔ (۹) اور امرد پرستی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیونکہ خواہ آپ اسے غیر فطری کہیں خواہ مکروہ اور ذلیل خواہ آپ تعزیزات ہند کا سہارا لیں لیکن یہ یاد رہے کہ جو لوگ امرد پرستی کے مرتکب ہیں وہ نہ تو جرائم پیشہ ہوتے ہیں نہ رذیل نہ ذلیل نہ کمینے نہ عام طور سے خراب آدمی ہوتے ہیں بلکہ کئی امرد پرست تو اخلاق اور تمدن اور روحانیات کی تاریخ کے مشاہیر رہے ہیں جیسے سقراط، سیزر، مائکل انجلو، ترحد، شیکسپیر اور دنیا بھر میں لکھوکھا آدمی جو امرد پرست رہے ہیں وہ نہایت شریف انسان رہے ہیں۔ (۱۰) اسی طرح عورت کو عورت سے بھی جنسی یا شہوانی محبت رہی ہے اور یہ عورتیں بھی ذلیل نہیں ہوتی تھیں۔

اب عشق ایسے پیچیدہ مسئلہ پر سہل پسندی سے یا جلدی سے یا بے سوچے سمجھے یا روایتی رائے یا عام رائے یا مذہب کی اور بزرگوں کی رائے ظاہر کرنے یا دہرانے کا زمانہ گیا۔ یہ سائنس کا دور ہے اور تعصب حقیقت کے چہرے پر نقاب نہیں ڈال سکتی۔ بغیر نفسیات اور انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ کے اخلاقی مسائل پر رائے دی ہی نہیں جا سکتی اخلاقی لطافتوں کو خلا میں متعین نہیں کیا جا سکتا۔ بقول غالب:۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" یا بقول اصغر گونڈوی:۔ "لالہ و گل نہیں معراج ہے آب و گل کی" ہمارے معیار اور ہماری تخیئل کی انگلیاں ستاروں کو مس کرتی ہیں لیکن ان کے قدم اسی کیچڑ پانی والی مادی اور کثیف زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔ افلاطون نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ محبت میں جنسی یا شہوانی یا نفسانی خواہشات یا محرکات کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔ اسلامی فلسفہ پر بھی افلاطون کے اس نظریہ کا اثر پڑا اور ناکامی اور محرومی شاعری میں تبرک ہو کر رہ گئی۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں:۔

ذرد کے آنے کو اے یار بُرا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

میر کہتے ہیں:۔
دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

حالانکہ اصلی بات کچھ یوں ہے کہ:۔

جو یہاں آئے ہو وہ پاس ہی بیٹھے ہو ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

یا بقول جرأت:۔

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

بہرحال خواہش یا آرزو اور جستجو کو تکمیل خواہش پر ترجیح دینا نفسیات کا ایک مسئلہ ہے۔ مشہور جرمن شاعر اور مفکر شیلر کا قول ہے کہ اگر خدا یا حقیقت کی تلاش، اور خدا یا حقیقت کا پا لینا یہ دو ممکنات ہوں تو میں اپنے لئے پہلا امکان منتخب کروں گا۔ کیوں؟ اسے نہ پوچھئے۔ آدمی کبھی کبھی تکمیل۔ آرزو سے ڈرتا ہے۔ ہر عمل میں ردعمل بھی مضمر ہے۔ انسانی مزاج اور انسانی سرشت متناقص، متضاد اور متصادم عناصر سے مرکب ہیں یہی زندگی کی جدلیت ہے۔ آپ اجازت دیں تو اپنا ایک شعر پیش کروں:۔

ڈرتا ہوں کامیابی تدبیر دیکھ کر
یعنی ستم ظریفیٔ تقدیر دیکھ کر

اپنا ہی ایک اور شعر یاد آیا:۔

نصیب عشق جہاں سو رہے ہیں موت کی نیند
وہیں اس آنکھ کے جادو جگائے جاتے ہیں

کیوں نہیں وہاں جہاں عشق کے نصیب جاگ چکے ہوں؟

ہاں تو سوال یہ ہے کہ معشوق کے جور و کرم، تغافل اور توجہ، ہجر و وصل، سپردگی اور بیگانگی، کسی بھی حالت میں آج تک کوئی عاشق خوش ہو سکا ہے؟ یا رنج یا غم یا ناکامی اور حسرت کے احساس سے بچ سکا ہے؟ اور اگر ایسا ہوا ہے تو کس حد تک اور کب تک عشق کی حالتوں کے لئے کوئی آخر ماس زمان و مکان میں نہیں۔ عشق کی شدید اور تیز خوشی اس کی رنگیں آسودگی اور طمانیت سے کس کو انکار ہے لیکن اس عمل کا ردِ کب تک ملتوی رہ سکتا ہے۔

اک وصل و ہجر کیا کسی حالت میں کل نہیں
ہیں تیرے ولولے دلِ ناداں عجیب سے (نیرنگ)

میرا شعر ہے:

نگاہ ناز تیرے چھیڑنے کی اور بات ہے
ملول بھی کہاں ہوں میں اگرچہ شادماں نہیں

تو کیا عشقیہ شاعری عشق کے کامیاب لمحوں کی ترجمانی تک محدود رہے یا یہ بھی بتائے کہ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"۔ بہرحال یہ دیکھتے ہوئے کہ "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" خواہ خرابی کی یہ صورت عشق کے اولین لمحوں میں رونما ہو جب "دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے" یا عشق کے درمیانی لمحوں میں رونما ہو یا یہ ردعمل بعد کو شروع ہو، سوال یہ ہے کہ کیا ہو؟ نشاط محض ہو یا غم محض ہو یا غم آمیز نشاط یا نشاط آمیز غم یا سکو ہو یا اضطراب ہو، اطمینان ہو یا انتشار ہو سلجھی ہوئی حالت ہو یا الجھی ہوئی حالت ہو؟ ہر روپ بہروپ ہے ہر رنگ میں ساتوں رنگ کی جھلک چھپی ہوئی ہے۔ یہاں نیک و بد برا اور بھلا گناہ اور ثواب حلال اور حرام کی سہل تقسیمیں کام نہیں دیتیں۔ انسانی جذبات اور کیفیات اور خواہشات کو ایک ہی ڈنڈے سے ہنکانا نہیں چاہئے اس کی ایک مثال سنئے۔ گورکھپور میں طاعون آیا ہوا تھا۔ ہم لوگ شہر سے کچھ دور ایک باغ میں خیموں اور چھپّروں میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ موسم سرما تھا۔ تیسرے پہر کے بعد ہم لوگ کئی لڑکے ذرا سیر کو نکل گئے اور آتے وقت باغ کا راستہ بھول گئے۔ ہم لوگوں میں ایک منشی جی تھے۔ تھے تو وہ سن شعور کو پہونچے ہوئے لیکن کچھ عجیب سے آدمی تھے۔ ایک جوان لڑکی سرسوں کے کھیت میں کوئی ساگ چن رہی تھی منشی جی نے لہک کے پوچھا "متوا مہوئی کے باغ کا کون راستہ ہے"۔ متوا کا لفظ سننا تھا کہ اس نوخیز دوشیزہ نے وہ دھرلوں گالیاں اور کوسنے منشی جی کو دئے کہ طبیعت خوش ہو گئی آپ کہیں گے کہ متوا کی جگہ بیٹی یا بہن کہنا چاہئے تھا۔ لیکن میرا تو یہ گمان ہے کہ بیٹی یا بہن کا لفظ ایک اجنبی جوان سے سن کر وہ مست شباب لڑکی خواہ گالیاں نہ دیتی لیکن بہت خوش نہ ہوتی۔ اب ان اگلے وقتوں کے لوگوں کو کیا کہا جائے جو بھولے پن سے کہتے ہیں کہ پرائی عورت کو ماں بہن یا بیٹی سمجھو اور کہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یاد رہے کہ وہ لڑکی کوئی بازاری عورت نہیں تھی اور نہ کوئی بری بات یا بھدا مذاق یا کھلی کھلی بد مذاقی روا رکھ سکتی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ طرز خطاب اس کی اٹھتی جوانی کے شایان شان ہو کتنا نازک محذوش اور پیچیدہ جذبہ ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے والا ہنس تو شاید نایاب نہ ہو لیکن عشق کا عشق اور خواہش کی خواہش کو الگ کرنے والا ہنس کہاں سے ہاتھ آئے۔ مشہور امریکن مفکر امرسن لکھتا ہے کہ آغاز ہستی سے انسان ہمیشہ اس کاوش میں رہا ہے کہ ٹھیک اور مناسب چیز کو خوشگوار اور لذت آمیز چیز سے الگ رکھے اور ہمیشہ اس کوشش میں ناکامیاب رہا ہے۔ مرزا یگانہ نے کیا شعر کہا ہے:۔

حلال کو بھی بتایا حرام واویلا!!
نگاہ شوق سے کیا کیا گل و ثمر گذرے

غرض کہ عشق اس جنگ کا نام ہے جو خدا اور شیطان کے درمیان ازل سے انسان کے دل کے اندر ہو رہی ہے۔ عشق کا بھیس تو یہ ہے کہ "فردوس بہ داماں ہے دوزخ بہ گریباں ہے" کیسا عذاب کیسا ثواب آپ عشق میں اپنے اوپر جبر کرنا، ضبط کرنا لئے دئے رہنا، رکھ رکھاؤ قایم رکھنا اپنے آپ کو دبانا ہر طرح کی روک تھام کو کیا سمجھتے ہیں، زندگی اور شاعری دونوں میں ضبط کی تعریفیں کی گئی ہیں، اس کوشش کو سراہا گیا ہے لیکن آسکر وائلڈ کہتا ہے کہ (The best way to conquer temptation is to yield to it") یعنی کسی لالچ یا خواہش پر قابو پانے کا بہترین طریقہ ہے کہ اُسے پورا ہو جانے دو یعنی اپنی لالچ یا خواہش کو راہ دو۔ مشہور انگریزی مصنف برٹرنڈ رسل جو بہت سمجھ بوجھ کر باتیں کہتا ہے اس بارے میں لکھتا ہے کہ

(Of all forms of Caution
Caution in love is the worst.)

یعنی جتنی احتیاطیں دنیا میں ہیں ان میں وہ احتیاط بدترین ہے جو عشق میں اپنے اوپر عاید کی جائے۔ بے ساختہ جگر مرادآبادی کا یہ معرکۃ الآرا شعر یاد آ گیا:۔

ضبط کا جنبش دعوئ عشق میں رہا اکثر
حال ہم نے دیکھا ہے بیشتر خراب اُن کا

یا جیسا ذرا اُونچ کے اقبال نے کہا ہے:۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اور حسرت موہانی مومن کے اس قول "کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے" کی تردید یوں کرتے ہیں:۔

صبر مشکل ہے آرزو بیکار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

خیر یہ سب تو عشق پر لگے ہاتھوں جو باتیں خیال میں آگئیں روا روی میں ان کا ذکر کر دیا گیا۔

اب اُردو میں عشقیہ شاعری پر کچھ تبادلہ خیالات کریں۔ اُردو کی چھپی ہوئی کتابوں میں قریب قریب دو تین لاکھ غزلیں ہوں گی جن میں صرف حسن و عشق سے متعلق آٹھ دس لاکھ اشعار ہوں گے۔ بُرے بھلے کی بحث نہیں۔ لیکن غزلوں کے علاوہ اُردو کی مسلسل نظموں میں جو عشقیہ شاعری ہے کچھ اس کا ذکر کر لیں۔ میر سے پہلے دکن کے شعرا نے منظوم عشقیہ افسانے لکھے، پھر میر کی متعدد مثنویاں حسن و عشق کے متعلق ہیں خواجہ میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" قیامت کی عشقیہ مثنوی ہے۔

اس وقت تک مسلسل نظموں میں سلسلہ کے دو اور مشہور نام ہیں یعنی سوداؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی۔ سوداؔ کی نظموں میں رومانیت کا لب ولہجہ اور حسن و عشق کے واردات خارجی یا تشبیہ و استعارے تو ضرور آگئے ہیں لیکن سوداؔ کی نظمیں عشقیہ نہیں ہیں۔ البتہ نظیرؔ اکبرآبادی کی کئی نظموں میں حسن و عشق کی چاشنی اور رنگینی آگئی ہے مومنؔ کی کوئی مثنوی یا ان کا کوئی قصیدہ عشقیہ نہیں اور نہ ذوقؔ کے قصائد عشقیہ کہے جاسکتے ہیں۔ ہاں میر حسنؔ کی مثنوی بدر منیر عشقیہ ہے اور اپنے حدود کے اندر بڑی حد تک کامیاب ہے اس کے بعد انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثئے کہے اور اردو کی غیر عشقیہ شاعری کو دنیا کی غیر عشقیہ اور غیر رومانی شاعری کے دوش بدوش کردیا۔ گلزار نسیم بھی اپنے تکلفات و تصنعات کے باوجود عشقیہ مثنوی ہے اور اس میں حسن و عشق کی لطافتیں عجب انداز سے آگئی ہیں۔ واجد علی شاہ کی مثنوی حزن اختر کا نام بھی عشقیہ شاعری کے سلسلہ میں لیا جائے گا۔ اور مرزا شوقؔ کی مثنوی زہر عشق تو اپنے خلوص اور بے اختیار سادگی اور امڈے ہوئے جذبات کی بنا پر دنیا کی مشہور عشقیہ نظموں میں شامل ہے۔ مرزا شوقؔ کی اور مثنویاں جیسے لذت عشق بھی فحش اور عریاں ہوتے ہوئے بلکہ فحش اور عریاں ہونے کی وجہ ہی سے مباشرت کی کیفیتوں لذتوں حرکات و سکنات کی نیز مصوری اور محاکاتی صفات کی اس طرح حامل ہیں کہ اپنے رنگ کا انھیں معرکہ آرا کارنامہ ماننا پڑتا ہے۔ قدیم رنگ کی کچھ رسمی کچھ واقعیت لئے ہوئے قسم کی مثنویوں میں قلقؔ کی مثنوی، داغؔ کی مثنوی، تسلیمؔ کی مثنوی کا بھی ذکر کیا جانا چاہئے۔ بہرحال انیسویں صدی کے اخیر تک اردو کی مسلسل نظموں میں دس پندرہ فی صدی غیر عشقیہ نظمیں ہیں بقیہ عشقیہ ہیں برعکس یورپ کی شاعری کے جہاں قریب پچھتر فی صدی کے غیر عشقیہ شاعری تھی اور ہے اور پچیس فی صدی عشقیہ نظمیں۔ انیسویں صدی کے آخری سال حالیؔ اور آزادؔ کی نظموں کے ساتھ جدید اردو شاعری کے جنم کے دن ہیں۔ شبلیؔ کی نظم ڈاکٹر نذیر احمد کی نظم اور اسمٰعیل میرٹھی اور بیانؔ میرٹھی کی شاعری کے بھی یہی دن ہیں اور یہ سب کا سب مجموعہ حسن و عشق سے کوسوں دور ہے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حالیؔ کی مناجات بیوہ کو حسن و عشق و جوانی کے ماتم کی وجہ سے آپ کسی معنی میں عشقیہ نظم سمجھیں گے یا نہیں۔ اسی زمانہ کی ایک نظم میرے والد مرحوم منشی گورکھ پرشاد صاحب عبرتؔ کی مثنوی حسن فطرت ہے جو اب تک اردو کی تنہا تمثیلی نظم (Allegory) ہے اور بہت لطیف عشقیہ نظم ہے۔ وہ شائع ہوچکی ہے اور ملک کے رسائل اور جرائد میں اس کا ریویو نکل چکا ہے۔

عہد جدید کے دوسرے دور میں اکبر الٰہ آبادی۔ اقبالؔ۔ شوقؔ قدوائی۔ چکبستؔ۔ سرور جہان آبادی۔ نادر کاکوروی۔ عظمت مرحوم میرٹھی۔ اور والد مرحوم حضرت عبرتؔ گورکھپوری بھی آتے ہیں۔ اکبرؔ کی برق کلیسا اور اکثر ان کے قطعات ایک خاص نظریہ سے عشقیہ شاعری کی مثالیں پیش کرتے ہیں یعنی عشقیہ شاعری کی کامیڈی یا کبھی کبھی ٹریجڈی۔ کامیڈی یا یوں کہئے کہ رومانیت کی حماقتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اقبالؔ نے حسن و محبت کے فلسفہ کو مختلف تمثیلوں (Symbols) کے پردوں میں اجاگر کیا اور ان کی کئی غیر عشقیہ نظموں میں عشقیہ جذبات یا غزلیت کی اور ان کیفیتوں کی چاشنی ہے۔ شوقؔ قدوائی نے میاں بی بی والا عشق یعنی انگریزی شاعر پیٹمور کی طرح ازدواجی عشق (Married Love) کی ترجمانی عالم خیال میں منظوم خطوط کے ذریعہ سے کی۔ میاں بی بی کی محبت میں عام طور پر تیز رومانیت غالباً نہیں ہوتی جو آزاد محبت میں ہوتی ہے۔ لیکن اردو میں ابھی اس محبت کے تمام امکانات اور اس کی تمام شکلوں کی مصوری اور ترجمانی نہیں کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ رامائن اور شکنتلا اور اتھیلو اور دنیا کی بہت سی نظمیں ازدواجی محبت کی زبردست اور گہری ترجمانیاں ہیں۔ چکبستؔ اور سرورؔ عشقیہ شاعری کے باب میں خاموش ہیں ہاں عشقیہ جذبات کی چھینٹیں ان کی بھی چند نظموں پر پڑگئی ہیں۔ نادر کاکوروی نے ٹامس مور کی انگریزی نظم لالہ رخ کو اردو نظم کا جامہ پہنایا اور مور ہی کی مختصر عشقیہ انگریزی نظموں کا نہایت نرم اور مترنم لطیف ترجمہ اردو نظموں میں کیا۔ عظمت میرٹھی کی نظمیں تھوڑی ہی سی ہیں لیکن معصوم اور شدید عشقیہ جذبات ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دیئے گئے ہیں۔ اردو شاعری نے ان نظموں میں ہندی کی عشقیہ شاعری کی ترجمانی کا حق پورا پورا ادا کردیا ہے۔ والد مرحوم حضرت عبرتؔ کی شاعری عہد جدید کے اول اور دوم دور دونوں میں آتی ہے ان کی مثنوی حسن فطرت کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ خیال یار اور کچھ اور نظمیں بھی ان کی ہیں جو یا تو سراسر عشقیہ ہیں یا پھر محبت آمیز ہیں اس کے بعد عزیزؔ لکھنوی کی ایک نظم شادی کے عنوان سے مجھے یاد آتی ہے اور ازدواجی زندگی کے رومان کی پہلی جھلک کی نہایت لطیف اور رنگین مثال ہے۔ اب تو ہم دور حاضر کے بالکل قریب آگئے۔ جوشؔ ملیح آبادی کی بیسوں بلکہ پچاسوں ایسی نظمیں خیال میں گونجنے لگتی ہیں جن میں رومانیت چھتیسوں سنگار کے ساتھ اپنی چھب دکھاتی ہوئی سامنے آتی ہے۔ اختر شیرانی کا تو نام ہی رومانی شاعری کا مترادف ہوگیا ہے اور تیز اور رنگین احساس کے جو تیر اور نشتر ان کی متعدد نظموں میں ہیں وہ ہزار ہا دلوں میں کھٹک چکے ہیں۔ اختر انصاری کے یہاں بھی عشقیہ جذبات سے تھرتھراتے ہوئے وہ قطعات ہیں جو ہمارے دکھتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کردیتے ہیں اور ہماری سانس اور آواز رک سی جاتی ہے۔ ان کا چٹیلا پن محتاج بیان نہیں۔ مغربی شاعری کا بھی لب ولہجہ ان میں حلاوت کئے ہوئے ہے۔ روشؔ صدیقی کی عشقیہ نظمیں بھی ایک متلاطم ترنم رکھتی ہیں اور امڈے ہوئے جذبات کے دریا بہا دیتی ہیں جو نہایت رنگین وادیوں اور گھاٹیوں سے گذرتے ہوئے اور چاند تاروں اور فضاؤں کو منعکس کرتے ہوئے اور زندگی اور فطرت کے رنگا رنگ اور سیکڑوں نکہتوں سے معطر منازل کو خیر مقدم اور خیرباد کہتے ہوئے عالم غیب میں جاکر نگاہوں سے محو ہوجاتے ہیں نوجوان شعرا میں فطرتؔ دہلوی نے اپنے مجموعہ حدیث حسن میں اور بعد کی نظموں میں ایک نہایت دلکش اور دلفریب اور سامع نواز مگر سطحی رومانیت کا نمونہ پیش کیا۔ ان کے لہجے میں کچھ اور خوشیاں سموئی ہوئی ہوتیں کوئی تہ دار بات ہوتی اور ان کے تصور اور تخیل میں حیرت اور انفعال کا عنصر نمایاں ہوتا تو مرکزیت اور وزن کلام میں زیادہ آجاتا۔ احسانؔ دانش اس عصر کے نوجوان شاعروں میں ہیں لیکن دو برس کے اندر ان کی شاعری کو جو فروغ ہوا ہے اور جس خاص انداز اور خاص تعمیری صلاحیت کا ثبوت انھوں نے دیا ہے اس کی بجا طور پر ان کا مرتبہ بہت بلند ہوچلا ہے اور ان کے کارناموں سے ہم کو بہت امیدیں ہوچلی ہیں۔ یہ بہت نیک شگون ہے کہ رومانیت زدہ اور غزلیت زدہ اردو شاعری سے بچ کر انھوں نے اپنی الگ راہ نکالی وہ راہ جسے شاہ راہ فطرت کہہ سکتے ہیں۔ عشقیہ شاعری احسانؔ کے یہاں نہیں ہے اور جہاں ضمنی طور پر ہے وہاں رومانیت عام زندگی کے غیر رومانی مگر پر جذبات رجحانات کا ایک دائمی عنصر ہے۔ مجازؔ شاعر انقلاب ہیں اور معنوی اور اصولی تہیں جو علم اور سماجی فلسفہ کا عطر ان کے کلام میں ہے ان تک آسانی سے ان لوگوں کی نظریں نہیں پہونچ سکتیں جو فلسفہ سماج فلسفہ تاریخ اور فلسفہ ارتقا و انقلاب سے بخوبی واقف نہیں مجازؔ کی چند نظمیں عورت کے عنوان پر یا عشقیہ عنوانوں پر ہیں لیکن جذبات یا انفرادی عشق کی بجائے یہ نظمیں غیر شخصی اصولوں کی نہایت واقف کارانہ ترجمانی کررہی ہیں اور کچھ لطیف تبدیلیوں کے ساتھ یہی رنگ مجازؔ کے دوست سردارؔ کی کچھ نظموں کا ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملاؔ بھی نرے عشقیہ شاعر نہیں ان کی نظمیں وسیع تر جولانگاہ کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن جیوا کے عنوان سے ان کی مشہور نظم عشق و حسن پر نہ سہی لیکن عشق و حسن کی ایک سماجی ٹریجیڈی پر روشنی ضرور ڈالتی ہے۔ میں یہ مضمون رواروی اور عین علالت میں لکھ رہا ہوں اس لئے ان سیکڑوں نظموں کا جائزہ لینا کچھ اپنی مجبوریوں کے کچھ وقت اور جگہ کی قلت سے ناممکن ہے جو بہت سے اور شاعروں سے ہم کو ملی ہیں جن میں کچھ نہایت لطیف نظمیں عورتوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن ان سب کا نام نہ لیتے ہوئے بھی پروفیسر فیض احمد کی نظم جس کا عنوان ہے "رقیب سے" اور جو ہمایوں کے فروری ۱۹۳۸ء کے نمبر میں نکل چکی ہے اس کا ذکر ضرور کروں گا۔ میں بہت کم اشعار غزلوں یا نظموں کے متعلق یہ احساس کرتا ہوں کہ میرے دل و دماغ کا چور نکلا لیکن یہ نظم ایسی ہی نظم تھی اردو کی عشقیہ شاعری میں اب تک اتنی پاکیزہ اتنی چٹیلی اور اتنی دور رس اور مفکرانہ نظم وجود میں نہیں آئی۔ نظم نہیں ہے بلکہ جنت اور دوزخ کی وحدت کا راگ ہے۔ شیکسپیر، گوئٹے، کالی داس اور سعدی بھی اس سے زیادہ کیا کہتے۔ عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم ربط کو سمجھنا ہو تو یہ نظم دیکھئے۔ یہ ملکی مذاق کی بدنصیبی ہے کہ اس نظم کی غالباً وہ قدرشناسی نہ ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ عشقیہ نظموں کا کوئی گلدستہ اس نظم کے بغیر بے جان اور بے رنگ و بو رہے گا۔ کچھ دنوں سے اردو نظم میں ایک اور اضافہ ہوا ہے یعنی ہندی کوِتا کے طرز پر سیکڑوں گیت لکھے گئے ہیں لیکن ہندی کی چیزوں کی طرح سادگی اور معصومی کیساتھ ساتھ شدت احساس اور معنویت ابھی ان میں نہیں آسکی ہے لیکن یہ گیت کبھی کبھی ہمارے کانوں کو بھلے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ حفیظؔ جالندھری اور ساغرؔ نظامی اور پنڈت اندجیت شرما اور کئی اور لوگوں نے اس قسم کی چیزیں لکھی ہیں۔ مغربی زبانوں اور دوسری زبانوں کی غیر عشقیہ نظموں کے ساتھ کافی تعداد میں عشقیہ نظموں کے بھی ترجمے ہوتے رہے ہیں شریمتی سروجنی نائیڈو کی غالباً پچاس نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ الگ شائع ہوچکا ہے۔ ابھی یونانی، چینی، جاپانی اور دوسری اور تمام زبانوں سے سیکڑوں ہزاروں چھوٹی بڑی عشقیہ نظموں کا اردو نظم میں ترجمہ بھی ہوسکتا ہے اور خود ساختہ اردو نظمیں لکھنے میں بھی ان سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال اردو زبان اور شاعری کے جنم دن سے اب تک جو مجموعے رسالے اور جریدے مل سکتے ہیں ان سے اگر عشقیہ نظموں کا ایک سلسلہ مرتب کیا جائے تو وہ سلسلہ پانچ پانچ سو صفحات کی بیس جلدوں سے کم میں پورا نہ ہوسکے گا۔ یعنی کم و بیش دس ہزار صفحوں کا سرمایہ صرف مسلسل اور مربوط اردو کی عشقیہ نظموں کا ہے۔ اور اگر چوکس انتخاب کیا جائے تو بھی ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک نہایت بھاری بھرکم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج تک کی اردو کی عشقیہ نظموں پر بحیثیت مجموعی کیا حکم آپ لگاتے ہیں۔ اگرچہ دل کی ایک معمولی سی گدگدی، معمولی کسک یا بدن

پھُریری سے لے کر استخواں سوز اور جاں گداز حالت تک سبھی کو عشق کہہ دیتے ہیں لیکن جس نظم میں صرف للچا للچا کر محض سطحی طور پر حسن و جوانی کی چند اداؤں کا ذکر آ جائے اور ان میں زبان، ترنم یا زور بیان یا حُسن بیان کا کتنا ہی لطف ہو وہ صحیح معنوں میں عشقیہ نظمیں نہیں ہیں ہاں ان میں حُسن و عشق کی چاشنی ضرور ہے جیسے شکر کے قوام میں انار، نارنگی انگور وغیرہ کا ست چند بوند ڈال دیا جائے اور اُسے شربت انار، شربت نارنگی اور شربت انگور کا نام دے دیا جائے عشقیہ شاعری کے حساس نوٗئی کا تو یہ قول ہے:-

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
ہائے وہ بادہ جو افشردہ انگور نہیں
غالب

عشقیہ شاعری میں تو خواہش اور ماورائے خواہش کی شدید ترین تشکیل کا وہ امتزاج ہوتا ہے جو محض طباعی اور قادر الکلامی کے بس کی چیز نہیں۔ اس کسوٹی پر تو ہماری اُردو کی عشقیہ نظموں میں نوے فی صدی چیزیں زرکم عیار ثابت ہوں گی۔ یہ نظمیں برائے نام عشقیہ نظمیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو کی عشقیہ نظموں میں سب سکّے کھوٹے ہیں۔ ہندوستان کی زندگی کا ابھی بہت کچھ مشاہدہ ہمارے شعرا کو کرنا ہے اور دنیا کے ادب کا گہرا مطالعہ بھی کرنا ہے۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی ہماری عشقیہ شاعری کو بہت کچھ ہو جانا اور کرنا دھرنا ہے۔ ابھی ہماری اُردو میں کسی سیتا۔ رادھا۔ شکنتلا۔ ڈیزڈیمونا۔ مونالیزا۔ مریم مگدلین۔ مرنیڈا کی تخلیق نہیں ہوئی بلکہ شیریں فرہاد پر بھی کوئی نظم ایسی نہیں جس میں کردار نگاری اپنی پوری درخشانیت کا جلوہ دکھا سکے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دنیا کی عشقیہ نظموں ناٹکوں، رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں اور نظموں، ناولوں اور افسانوں اور تاریخی واقعات کا ترجمہ اُردو نثر میں ہو جائے تو ہمارے شعرا کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُکسانے میں اور اُردو شاعری میں ایک نئی بیداری پیدا کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔ اب دنیا کا کلچر اتنا وسیع اور زرخیز ہو چکا ہے کہ تقسیم اور تنظیم (Classification and Planning) کی سخت ضرورت ہے۔ موضوع کے لحاظ سے کتابوں کے سلسلوں کی اشاعت ہونی چاہئے تاکہ حسن و عشق کے لٹریچر پر اگر ہمارے شعرا یا غیر شعرا نظر ڈالنا چاہیں تو کتابوں کی مکمل اور منظم فہرست (Bibliography) میں ایک ہی جگہ پر اس موضوع کے تمام لٹریچر پر نظر پڑ جائے۔ بغیر اس کے ہماری ادبی زندگی میں تزلزل رہے گا۔

اب اُردو شاعری کے اس بدنام حصہ پر آئیے جسے غزل کہتے ہیں غزل پر کسی مفصل بحث کی تو کیا صفحہ دو صفحہ کی بحث کی بھی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ یہی نظم اور غزل کی بحث سو میں تو یہی کہتا ہوں کہ بدترین سے لے کر بہترین نظمیں بھی موجود ہیں اور خدا کے فضل سے بدترین غزلیں بھی ہیں اور بہترین غزلیں بھی ہیں۔ ہمارے منطقی اور مسلسل خیالات کے لئے نظموں کے اصناف ہیں اور شدید ترین مرکزیت اور داخلیت، ماورائیت اور جامعیت کے لئے غزل ہے۔ نہ کام بغیر تفصیل کے چلتا ہے نہ بغیر اجمال کے۔ دیکھئے اسی مضمون میں اب تک بحث نظموں کی تھی اور شروع میں عشقیہ شاعری نہیں بلکہ عشق کے نفسیات اور لوازمات کی بحث تھی لیکن ان دونوں سلسلوں میں جب چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ جانے کی ضرورت ہوئی تو غزل کے اشعار آڑے آئے۔ انسان حیوان ناطق ضرور ہے لیکن اس میں دیوتاؤں کی وہ صفت بھی موجود ہے جسے کلّیت کہہ سکتے ہیں یعنی اختصار اور اتمام کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جانے کی صفت۔ انسانی شعور اکثر تدریجیت کو پھاند جاتا ہے۔ دنیا صرف اُگتی اور بڑھتی یا گھٹتی اور مٹتی نہیں ہے بلکہ کایا پلٹ کے مناظر بھی دکھاتی ہے۔ اس حقیقت پر غالبًا دو اشعار سے روشنی پڑے۔

منازلِ ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہو
کسی کو جس کی خبر نہیں ہو وہ انقلاب ایک بار ہوگا

دوسرا شعر یوں ہے:-

ہستی و موت حشر و ازل پر نہ کھُل سکا
کس طرح اک نظر سے بدلتی ہیں ہستیاں

سوال شعور انسانی یا نبضِ انسانی کی دھڑکنوں کے انداز اور ان کی رفتار یا توتج (Rhythm) کا ہے۔ اسی توتج میں اسی رفتار یا تھرتھری میں زمان و مکان وحدت و کثرت اجمال اور تفصیل کے بھید چھپے ہوئے ہیں۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ جس طرح جسم میں حرکت ہوتی ہے اسی طرح روح یا شعور میں بھی حرکت ہوتی ہے جسمانی حرکت ماورائی لرزشوں کا نام ہے جو زمان و مکان کو اپنے شدید مرکزی جذب و کشش میں سمو لیا کرتی ہے۔ اور شعور کی یہ حرکت حیرت انگیز حد تک تیز ہو سکتی ہے یہاں تک کہ اس میں ہمہ گیری آ جائے جیسے سوت کے ایک ٹکڑے میں سرے پر آگ لگا کر تیزی سے اُسے گھمانے سے ایک آتشیں ہالہ بن جاتا ہے اگرچہ ایک وقت میں آتشیں نقطہ ایک ہی جگہ پر ہے یا جیسے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کئی گھنٹے کئی دن کئی ہفتے یا کئی برس گذر گئے حالانکہ خواب صرف دو تین منٹ کا تھا اسی طرح شعر اور نغمہ کے زیر اثر شعور انسانی کی تھرتھراہٹ اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اس کا ایک پل دوام کا حکم رکھتا ہے۔ کیا آپ کو کبھی کبھی ایسا احساس ہوا ہے کہ زمانہ حال میں جو کچھ آپ دیکھ سُن رہے ہیں یا کر رہے ہیں بجنسہٖ یہی چیزیں کبھی پہلے دیکھی سنی یا کی تھیں نفسیات میں اس معمہ کا یہ حل بتایا گیا ہے کہ بغیر آپ کے جانے ہوئے پہلے کبھی آپ کے شعور کی رفتار اتنی تیز ہو گئی تھی کہ آئندہ ہونے والی بات تک شعور پہونچ گیا تھا۔ یہ عالم غیر شعوری ہوتا ہے جب حال اور مستقبل کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور "اب" یا "اس لمحہ" کے معنی میں امروز و فردا کا میل ہو جاتا ہے۔ جب یہ غیر شعوری حالت شعوری حالت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو پیشین گوئی ممکن ہوتی ہے۔ پیشین گو وہ ہے جس کے لئے مستقبل حال بن جائے۔ یا یوں سمجھئے کہ حال کی تیلیوں یا چاک سے مستقبل جھانکتا ہے (Eternity peeps through time) اور اسی سے کہا گیا ہے کہ "شاعری جزو یست از پیغمبری"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نوح ناروی سے سنہ ۱۹۵۰ء کا حال آپ پوچھیں بلکہ یہ کہ جو توتج شعور انسانی میں شعری وجدان پیدا کر دیتا ہے وہ اس حالت کی پرچھائیں ہے جو پیغمبری کی حالت ہوتی ہے۔

ہومر، ملٹن، والمیک، کالیداس، فردوسی، انیس اور دنیا کے بڑے بڑے ناول نگار اور دیگر طویل کتابوں کے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ آفاقی لٹریچر ہے لیکن یاد رہے کہ وید اور قرآن کی غیر مسلسل غیر مربوط اور بکھری ہوئی آیتیں بھی آفاقی لٹریچر ہیں جہاں چند لفظوں کی ایک آیت میں زمان و مکاں ہستی و عدم زندگی اور موت کی پوری تاریخ سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک مختصر سی بات کتنی دور رس ہو سکتی ہے اور اس میں کتنی تہیں یا گہرائیاں ہو سکتی ہیں وہ کتنی اتھاہ ہو سکتی ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ غزل کے ہر شعر کا اختصار ایسا ہی اختصار ہے۔ اس اختصار میں وہ جامعیت اور کلّیت ہوتی ہے کہ بظاہر ایک عالم، ایک کیفیت، ایک تاثر یا ایک انفعال کا ذکر ہوتا ہے اور وہ بھی ہمیشہ نہیں مگر اکثر ساقی، شراب پیمانہ، گلستان و صحرا، بہار و خزاں، زلف و رُخ، وصل و ہجر کے پردے میں ہوتا ہے۔ لیکن جو بات کہی جاتی ہے وہ تمام کائنات اور حیات و ممات پر حاوی ہوتی ہے۔

غزل میں سب سے زیادہ امکان اس وسعت ہمہ گیری اور جامعیت کا ہوتا ہے جو ہمارے وجدانی شعور میں محض چند الفاظ سے یا ایک شعر سے پیدا کر دی جائے۔ غزل کے علاوہ جو اصناف سخن ہیں ان میں جزیت اور تفصیل ہوتی ہے۔ غزل میں اجمال ہوتا ہے۔ اس لئے غزل جتنی سُکڑی ہوئی اور سمٹی ہوئی چیز ہے اتنی ہی وسیع ہمہ گیر اور جامع چیز بھی ہے۔ غزل کی شاعری کل شناس اور ہمہ داں (Gnomic) ہوتی ہے۔ اسکا ایک مصرع ایک آئینہ ہے پوری کائنات کا:-

شیشہ بادِ صبح میں وحشیٔ بیقرار کے
زخمِ جگر چھلک گئے ہوش اُڑے بہار کے

ہاں تو غزل میں کیا ہوتا ہے اور کیا کچھ نہیں ہوتا جس طرح اور اصناف سخن میں تفصیل یا جزیت کامیابی کی شرط ہے اسی طرح غزل میں اجمال اور کلیت کامیابی کی شرط ہے روایتی طور پر غزل کے موضوع کو تین حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ معرفت و تصوف، حیات و کائنات اور اخلاقیات پر انفعالی یا فلسفیانہ طور پر حکم لگانا اور عشق مجازی لیکن اول دو اقسام میں بھی عشقیہ لب و لہجہ کی چاشنی ضروری ہے یعنی حسن و عشق کے مانوس زبان و رنگ کے علاوہ حقیقت اور مجاز کو حسن و عشق کی شکل میں دیکھنا۔ افلاطون نے وجود کی حقیقی شکل کو کہا تھا اصلیت، نیکی اور حسن (The true, the good, the beautiful) غالب نے یوں کہا تھا:-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بادہ و ساغر کہے بغیر کا مطلب ایک تو وہ تمام تمثیلات ہیں جیسے گل و بلبل، ساقی و میخانہ، ہوش و بیخودی، جنون و چاک گریباں، وطن و غربت، زندان و بیاباں وغیرہ وغیرہ جو اردو شاعری کی زندہ یا تاریخی روایتیں ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بادہ و ساغر سے جو کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں شعر کے لب و لہجہ سے وہی کیفیتیں پیدا ہو جائیں غرض کہ غزل کے بکھرے ہوئے مشاہدات میں عشق کی رنگینی اور مستی کسک اور چنچلاپن یا عشق کی حساسی ہو اور حُسن کے جلوے ہوں یا حسن کے اثرات کی طرف کنایہ ہو یعنی یہ ضروری نہیں کہ حسن و عشق کا براہ راست ذکر ہو مثال کے طور پر ذیل کے شعر لیجئے جو مجھے قلم برداشتہ یاد آئے:-

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے (میر)

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (〃)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا (〃)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوق)

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے (〃)

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز — دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے (غالبؔ)

دریاء معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا (〃)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے (آتش) ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں (〃) لگاکے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں (اقبالؔ)

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں (〃)

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر (〃)

ان اشعار کو (اور اردو غزل میں ایسے ہزارہا اشعار ملیں گے) عشقیہ شاعری تو نہیں کہہ سکتے لیکن عشقیہ شاعری کی چاشنی ان میں آگئی ہے۔ جیسا میں کہہ چکا ہوں عشق جنسی اور شہوانی محرکات سے شروع ہو کر انسانی وجود کو سراسر بدل دیتا ہے اور اپنے ابتدائی مظاہروں کی حدوں کو توڑتا ہوا تمام عالم ہستی پر چھا جاتا ہے بلکہ:۔

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل تیری تو کیا کائنات ہے؟

یا:۔
حجابِ صورت معنی اٹھیں۔ تری نظریں
نہ کچھ سہی مگر اتنا تو کر گئی ہوں گی

اس لئے غزل کی عشقیہ شاعری کی غرض و غایت ایک تو کھلی کھلی عشقیہ شاعری کرنا ہے دوسرے عارفانہ یا فلسفیانہ یا محض انسانی یا انفرادی حسیات اور تاثرات کو حسن اور عشق کا آئینہ مہیا کرنا ہے تاکہ اس آئینہ میں وجود اپنا نکھار دیکھ سکے۔ یا یوں کہئے کہ وجود کے ہمہ گیر تصادم اور جدلیت (Universal dialectics) میں جو ہم آہنگی (harmony) چھپی ہوئی ہے سارہستی کو چھیڑ کر اس ہم آہنگی کے احساس کو اکسانا غزل کی عشقیہ شاعری کی غرض و غایت ہے یعنی انسانی وجدان کی ارتقا میں مدد دینا عشقیہ شاعری کا نصب العین یا معیار ہے۔ اس آئینہ داری، اس احساس ہم آہنگی اس ارتقا میں دل کا خون کرنیوالی دوزخ و جنت کی جو منزلیں پڑتی ہیں اور ابدالآباد تک پڑتی جائیں گی انہیں کون بیان کرسکتا ہے۔ اپنے کچھ شعر حاضر کرتا ہوں:۔

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

آج بھی عشق لٹاتا دل و جاں ہے کہ جو تھا
آج بھی حسن وہی جنس گراں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

برقِ فنا بھی کھائے جہاں ٹھوکریں فراقؔ
راہِ وفا میں آتے ہیں ایسے مقام بھی

ہر گام بر طریقِ محبت ہیں موت تھی
اس راہ میں کھلے در رحمت کہاں کہاں

خبر کچھ انکی بھی رکھتو ہو رنگ و بو والو (فراقؔ) جو کانٹے چلے جاتے تھے راہ صحرا کو

یہ اجل بھی کیا یہ عدم بھی کیا کبھی دیکھ آکے فراقؔ کو
اسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے (فراقؔ)

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے (〃)

انہیں حسیات کو اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں میں نے یوں ظاہر کیا تھا:۔ جان لیوا لے جنوں گو ہیں یہ سرگردانیاں
کیوں بھٹک جاتے ہیں لیکن خود رہ منزل ہیں ہم (فراقؔ)

یہ سفر یہ گمراہیاں اور یہ رسائیاں کوئی مادی یا جسمانی حرکت نہیں ہیں۔ بلکہ وجدان کی وہ تھرتھراہٹ ہے جس کا ذکر میں کر چکا ہوں یعنی ایک غیر زمانی اور غیر مکانی حرکت۔ میرؔ کے یہ اشعار سنئے:۔

دنیا کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی
قسمت سے مجھکو آج یہ بد دست پا ملا

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

غرضکہ وجود کائنات اور انسانی حیات کی مرکزی غرض و غایت کو "دیکھنا" اور "چلنا" ان دو لفظوں میں اردو غزل میں ادا کیا گیا ہے اور یہی تشبیہ اور استعارہ آپ مذہب، فلسفہ، عقلیت (Rationalism) درس عمل اور دنیا بھر کی شاعری میں پائیں گے۔

ہاں تو زندگی اور کائنات، معرفت اور تصوف یا روحانیت اور جنسی یا مجازی عشق غزل کے موضوع ہیں۔ ان میں سے تیسرا موضوع یعنی عشق مجازی اردو غزل میں بسا اوقات یوں ادا کیا گیا ہے کہ ایک طرف اس پر معرفت اور روحانیت کی چھوٹ پڑتی ہے اور دوسری طرف فلسفۂ حیات و کائنات کی سنجیدگی اور گہرائی یعنی متفکرانہ اور حکیمانہ انداز بھی اس میں آگیا ہے۔ ایسے اشعار میں غزل کے تینوں موضوع ملکر ایک ہو گئے ہیں بلکہ فلسفہ، روحانیت اور عشق تینوں سے گذر کر وجود محض کے ٹھیٹھ احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے:۔

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی (اصغرؔ گونڈوی)

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں (میرؔ)

وہی ہے اک شعلۂ تجلی رہا جو ایمن میں سنگ ہو کر
جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر (داغؔ)

بت کو بت اور خدا کو جو خدا کہتے ہیں
ہم بھی دیکھیں کہ تجھے دیکھ کے کیا کہتے ہیں (〃)

عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جاؤ
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے (آسیؔ غازیپوری)

میری آنکھیں اور دیدار آپ کا
یا قیامت آگئی یا خواب ہے (〃)

تمہیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہ کن کیوں ہو (〃)

پوچھا جو اُن سے عنبر کو چاہوں تو کیا کرو
بولے کہ جاؤ چاہو کوئی دوسرا بھی ہے! (حکیم کاشف مرحوم)

ایک ادا تھی جسے ہستی مرے دل نے جانا
اک نظر تھی جسے انسان رگ جاں سمجھا (عزیزؔ لکھنوی)

خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہہ کر لکھا
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے (〃)

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دل دوست میں سما نہ گیا (یاسؔ یگانہ)

سمجھنے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا (〃)

فریب نفس کا جب احتمال ہوتا ہے
تو فرق عشق و ہوس بھی محال ہوتا ہے (〃)

بقدر حوصلہ ملتی ہے داد عشق و ہوس
مزاج حسن میں کیسا اعتدال ہوتا ہے (〃)

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا (غالبؔ)

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے (〃)

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے (〃)

وہ آئینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے (〃)

اک جلوۂ حق نما کو دیکھا
تم کو دیکھا خدا کو دیکھا (راقم الحروف)

بہار جلوۂ صبح ازل کو دل نہیں بھولا
پڑی جب جب نظر تیری نگاہ اولیں نکلی (〃)

کوئی مزاج داں نہ تھا گردش روزگار کا
حسن تھا شادماں تو کیا عشق اُداس تھا تو کیا (〃)

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے (〃)

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی (〃)

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم (〃)

ہجر کی شب ترس گئی یوں تو ترے پیام کو
آج مگر فسانۂ دار و رسن سنا دیا (〃)

ان اشعار میں محدود مجازی حسن و عشق نہیں ہے بلکہ جس طرح فلسفۂ زندگی اور تصوف میں حسن و عشق کی چاشنی کی مثال دی جا چکی ہے اسی طرح مندرجہ بالا اشعار حسن و عشق میں فلسفۂ زندگی اور تصوف کی چاشنی کی مثال پیش کرتے ہیں یعنی احساس حسن و عشق میں متفکرانہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مثالیں تو تھوڑی سی دی گئی ہیں لیکن تصوف اور فلسفہ کے موضوع پر جو بیک وقت رنگین چٹیلی اور فلسفیانہ شاعری اردو غزل میں ملتی ہے اگر اس کا سلیقے سے مکمل انتخاب کیا جائے تو ہزارہا شعر کا گلدستہ تیار ہو سکتا ہے جس پر ذمہ دارانہ طور پر ہم بلندی اور عظمت کا حکم لگا سکتے ہیں اور جو کسی زبان اور ادب کی بلند ترین حسن و عشق کی شاعری سے کسی لحاظ سے کم نہ ٹھیرے گی۔ اسی سلسلے میں اردو غزل میں اس لطیف عشقیہ شاعری کا ذکر بھی کر دینا مناسب ہے جو حسن و عشق کی مابعد الطبیعات (Metaphysics of love + beauty) کے بجائے حسن و عشق کی نفسیات (Psychology of love + beauty) سے متعلق ہے جسے نمایاں طور پر مومنؔ اور مومنؔ اسکول کے شعرا میں ہم پاتے ہیں۔ دونوں حسن و عشق کی فلسفیانہ شاعری ہے لیکن اول الذکر میں نتائج اور کلیئے خلاقانہ طور پر بیان ہوتے ہیں اور آخر الذکر میں عموماً صرف لطیف اور نازک مشاہدات اور داخلی قسم کی معاملہ بندی کی ترجمانی ہوتی ہے پہلی قسم کی شاعری ماورائی ہوتی ہے دوسری داخلی یا نفسیاتی معنوں میں واقعاتی۔ ایسے چند اشعار سنئے:۔

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے (جرأتؔ)

دوسرے مصرع میں خارجی عمل "کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں" کے ساتھ داخلی کیفیت "گھبرائے ہوئے" پر غور کیجئے۔

پاس سے اس کے جو ہم ہو کے بتنگ آتے ہیں
اپنے ہی آپ سے کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں (میر حسنؔ)

دوسرے مصرع کی نفسیاتی سچائی پر غور کیجئے۔

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا (میرتقی)
خُوئے تری افسردہ کیا حسرت دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے غالب
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبیٔ عنوان کئے ہوئے (〃)
پھر دل طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے (〃)
میں جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا (〃)
ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں (〃)
کیا کیا ہیں دل میں دیکھئے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے حالی
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں (〃)
نیا ہے لیجئے جب نام اس کا
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں (〃)
جب سے چھوڑی ہے محبت نظر آتے ہیں یہ خواب
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی داغ
ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی مومن
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے ایک جواب میں (〃)
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ذوق
مرے اصرار پیہم سے عیاں ہے میری بیتابی
ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے (حسرت موہانی)
کوئی تم کو کیا جانے اور ہاں بظاہر تم
ناروا نہیں کہتے ناسزا نہیں کرتے (محوی لکھنوی)

ایسے اشعار ہیں اور اول الذکر قسم کے اشعار میں بعض وقت امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً میرا ہی شعر "اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے" جو میں اول الذکر قسم کے اشعار کے ساتھ پیش کر چکا ہوں آخر الذکر قسم کے اشعار میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور میرا یہ شعر:-

لطف و ستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب و بعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

یا جگر مراد آبادی کا یہ شعر:-

تاثیر محبت کی اللہ ری مجبوری ہر بعد میں اک قربت ہر قرب میں اک دوری

یا فانی کا یہ شعر:-

دل اُنکے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

یا پھر میرے ہی یہ اشعار:-

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے تری دم بھر کو آ جاؤ کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں
کھوئی ہوئی سی عشق کی ہستی قبول کر پلٹے نہ ہوش ہے نہ گرہ میں ہیں مستیاں
پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی رُکی کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہے آج پھر
نیرنگ حسن یار تری بس میں کیا نہیں لطف و کرم تو مانع جور و جفا نہیں

سلوک عشق سے کیا کیا نہ حسن یار کرے کسے یقین ہو کون اسکا اعتبار کرے
تمام جوش جنوں ہے تمام صحرا ہے کسے وہ جبر کرے کس کو اختیار کرے
وہ سوز و درد مٹے وہ زندگی بدل گئی سوال عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا

اُف یہ کہنا جا رہے ہیں اب نہ آئیں گے کبھی
روٹھنے میں بھی ادائے عہد و پیماں دیکھئے
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

فلسفیانہ یا نفسیاتی کس تحت میں رکھیں گے۔ بات یہ ہے کہ نفسیاتی محاکات اور مشاہدہ تحلیل اور تجزیہ میں کئی تہیں پڑ جاتی ہیں کبھی نفسیاتی کیفیت محض خواہش یا عمل کی کیفیت ہوتی ہے اور کبھی ادراک کی کیفیت ہوتی ہے اور کبھی ادراک کی مانوس اور معمولی سرحدوں سے گذر کر حقائق و معارف کی یا ما بعد الطبیعاتی حدود میں جا پڑتی ہے۔

حسن و عشق کا نفسیاتی مشاہدہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک کو داخلی محاکات کہہ سکتے ہیں اور ایک کو خارجی محاکات۔ داخلی محاکات کی مثالیں اور کچھ تفسیر ہمیں مل چکی۔ خارجی محاکات جسے عام طور پر معاملہ بندی کہتے ہیں نفسیات (Psychology) کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حرکات و سکنات (Behaviourism) کہتے ہیں۔ معاملہ بندی میں داخلیت یا غایر داخلیت تو نہیں ہوتی لیکن لطیف مصوری اور رنگینی کا اس میں نہایت دلکش عنصر ہوتا ہے۔ سنئے:-

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے (غالب) پسینا پونچھئے اپنی جبیں سے
جسکو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے حالی آج دل لیگا اگر کل نہ لیا یاد رہے
چھپتا ہے کب چھپائے سے چہرہ عتاب کا
ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا (آصف نظام دکن)
غرض غم نہ کرائے دل دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ "اُنھ" کر کے سُن لیا جواب ان کا (جگر)
کبھی کچھ رات گئے اور کبھی کچھ رات رہے
ہم نے ان شوخ حسینوں کو نکلتے دیکھا (داغ)
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ (وفا رامپوری)
اُف یہ کہنا جا رہے ہیں اب نہ آئیں گے کبھی
روٹھنے میں بھی ادائے عہد و پیماں دیکھئے (راقم الحروف)
کسی کا پوچھنا کیا کام ہم کو گھر بلانے سے
کوئی ہم سے نہ پوچھے اب ہم اس کو کیا سمجھتے ہیں (〃)

بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے (ذوق) ہاتھ چپکے سے مگر میرا دبا کر چھوڑا
حسرت تری نگاہ محبت کو کیا کہوں (〃) محفل میں بات اُنسے شرارت نہ ہو سکی
اے عشق کی حیا کی کیا تو ڈی کہاں سے (〃) جب پڑا انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

یہ دونوں قسم کی نفسیاتی عشقیہ شاعری یعنی داخلی اور خارجی، غزل میں کردار نگاری کی داغ بیل ڈالتی ہیں اور غزل کی شاعری کو ڈرامائی بنا دیتی ہیں۔ خاصکر شوخ اور چنچل مزاج کے شعرا مثلاً انشا اور جرأت اس میدان میں بہت کھل کھیلے۔ لیکن معاملہ بندی والی شاعری کیلئے یہ لازمی نہیں کہ وہ سوقیانہ ہو یا سطحی ہو۔ احتیاط اور رکھ رکھاؤ سے کام لیا جائے تو معاملہ بندی کے اشعار میں بھی پاکیزگی کا امکان ہے شرط یہ ہے کہ خارجیت کو نکھارا بھی جائے اور اسے کچھ دبا یا بھی جائے۔ اس میں داخلیت کا امتزاج ہو اور لب و لہجہ میں وضاحت اور کنایہ شوخی اور سنجیدگی کا میل ہو۔

معاملہ بندی کے ساتھ اردو غزل کی عشقیہ شاعری اپنی ہمہ گیر وسعتوں سے ذرا ہٹ آئی۔ اب حقائق اور معارف سے کچھ اُتر کر مخصوص طور پر مجازی عشق اور مجازی حسن کے تاثرات کا اظہار شروع ہوتا ہے۔ لیکن معنویت اور جامعیت کی کمی حسن و عشق کی دلفریب رنگینیوں اور کیفیتوں سے پوری ہو جاتی ہے۔ داخلیت اور خارجیت اضافی صفات ہیں۔ اسی طرح محدود اور غیر محدود۔ جزو اور کل۔ ظاہر اور باطن کی آنکھ مچولی بھی شاعری میں کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ بغیر فلسفہ اور حکمت اور تصوف کے بھی محدود تاثرات کے اظہار میں عظمت اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے عشقیہ شاعری کو بلند ہونے کے لئے اس میں حکمت اور روحانیت کی ضرورت نہیں ہے۔ وجدان میں فی نفسہٖ لامحدود وسعتیں ہیں حقیقی شاعری کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو فلسفیانہ اور روحانی حقائق کو بھی اپنے احساسات میں جذب کر لے اور چاہے تو اپنے محدود اور مخصوص اور جزئی احساسات ہی کو ابد اور لامکاں کا حریف بنا دے۔ سنئے:-

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں (غالب)

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے (غالب) بے نیازی تری عادت ہی سہی
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں (〃) پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو (〃) کاش کے تم مرے لئے ہوتے
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب (〃) وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو (〃) وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے (〃) آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی (〃) تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے (غالب)

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم (حالی) ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

رہیں عشق میں نہ وہ گرمیاں ہیں حسن میں نہ وہ شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں (اقبال)
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا (جلیل)
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں (〃)
کون سُنے گا اس کا درد شورش کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں (جوش ملیح آبادی)

کیا سے کیا کر دیا محبت نے اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں
(خواجہ میر اثر دہلوی)

آ کے تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں! (جگر مراد آبادی)
تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں (جگر بریلوی)

ان اشعار میں . . . . عارفانہ، فلسفیانہ یا نفسیاتی محاسبہ یا ماورائی یا معیاری اور تخیلی (ideal) انداز بیان یا مبالغہ یا اخلاقیات سب سے کترا کر عشقیہ شاعری کی گئی ہے لیکن اسے غیر عظمت عشقیہ شاعری نہ ماننا بے انصافی ہو گی۔ ان اشعار کی وجدانی کیفیات کا یہ کرشمہ ہے کہ ہر شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ ہے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

اردو شاعری کو شعرا اور شاعر تو نصیب ہوتے رہے ہیں لیکن سلیقہ سے انتخاب کرنے والے اور ایک معیار کے مطابق ترتیب دینے والے اڈیٹر نایاب رہے۔ ملک کا مذاق سنوارنے اور رچانے میں شاعروں سے کم حصہ نقادوں اور اڈیٹروں کا نہیں ہے۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں نشاط اور غم، قنوطیت اور رجائیت کے بارے میں کیا کہنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ شروع ہی سے دونوں مزاج اور دونوں نظریے غزل کی عشقیہ شاعری میں ملیں گے۔ ایک سلسلہ تو میر، مظہر جان جاناں، میر سوز، میر درد، میر اثر، قائم چاندپوری، یقین، وغیرہ کا ہے اس سلسلہ کے شعراء غم سے زیادہ مانوس ہیں اور ان کا رجحان قنوطیت کی طرف ہے۔

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد دل لاکھوں کئے جمع تو دیوان ہوا

بادی النظر میں ان تمام شعراء کا غم آمیز لہجہ میں وہی معلوم ہوتا ہے جو میر صاحب کا ہے۔ لیکن میر کی آواز میں وہ تہیں ہیں وہ خاموش گہرائیاں اس میں سموئی ہوئی ہیں اس میں وہ ہمہ گیری وہ درد رسی وہ وزن ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔ وہ بھرپور بات دوسروں کو کہاں نصیب۔ دوسرا سلسلہ حاتم۔ سودا۔ نظیر اکبر آبادی جن کی چھ سو غیر مطبوعہ غزلیں حال میں دستیاب ہوئی ہیں۔ مصحفی۔ آتش۔ جرأت انشا کا ہے۔ ان کی آواز نشاط آمیز ہے۔ سانحات، واردات، احساسات اور مضامین فی نفسہ تو ایک ہی طرح کے دونوں کے یہاں ہیں لیکن میر اور ان کے ہمنواؤں کے یہاں سوز بن گئے ہیں اور سودا اور ان کے ہمنواؤں کے یہاں ساز بن گئے ہیں۔ میر اور سودا کو سوتے سے نہ جگانے کے بارے میں دونوں کے الگ الگ شعر مشہور ہیں لیکن ایک غم آمیز اور دوسرا نشاط آمیز۔

میر کا یہ شعر لیجئے :-

ہوگا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اکبر الہ ابادی کا یہ شعر لیجئے :-

ہجر ہو یا وصال ہو اکبر
جاگنا رات بھر قیامت ہے

اب آتش کے یہ دو مطلعے دیکھئے :-

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا
خاک پر سنگ در یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

غالب کہتے ہیں :-

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

آتش کہتا ہے :-

موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

دیکھئے کہ بات ایک ہی ہے اور مضمون ایک ہی ہے لیکن وجدان کی کیمیا نے اسے کتنا بدل دیا ہے۔ اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قنوطیت کے علمبردار شعرا کی زندگی اور شاعری میں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ہجر ہی ہجر تھا اور جور و ستم ہی تھا اور رجائیت کے علمبردار شعرا کے یہاں وصل ہی وصل تھا اور لطف و کرم ہی تھا۔ شعر کے مجموعی صوتی اثرات اور اس کی وجدانی فضا شعر کے لغوی اور منطقی معنوں کو بدل دیتے ہیں۔

سودا کے یہ شعر :-

لطف لے اشک کہ پل مارتے ڈھل جاؤں گا
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا

اس خرابی سے نہ تو مجھکو نکال اب گھر
تو کہے آج ہی جا میں کہوں کل جاؤں گا

نشاط آمیز اور نشاط انگیز ہیں۔ ان اشعار میں جوانی کی چنچل آواز ہے لیکن میر کے یہ شعر :-

متصل رونے سے شاید کہ بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا دیتے ہیں
جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھکر

غم آمیز اور غم انگیز ہیں۔

خیر اس بحث کو یہیں چھوڑئے اب آپ قنوطیت اور رجائیت کے لحاظ سے (کسی اور لحاظ سے نہیں) میر حسن، مومن، ذوق، غالب، ظفر، حالی، داغ، امیر، حسرت موہانی، اور گذشتہ دوروں کے صف دویم کے شعرا اور دور حاضر کے غزل گو شعرا کو دو صفوں میں یا ان کے بین بین تقسیم کرنے کی کوشش کیجئے۔ کیا اردو غزل اور اس کی عشقیہ شاعری محض ٹریجیڈی یا المیہ ہے یا اس میں کامیڈی یا طربیہ کی اسپرٹ بھی کار فرما نظر آتی ہے۔ یوں تو زندگی اور حسن و عشق اور بلند ترین شاعری بھی ٹریجیڈی اور کامیڈی غم اور خوشی دونوں سے بالاتر ہے۔ میر اور ان کے ہمنوا شعرا اگر خون جگر کھا رہے ہیں اور اگر ان کے یہاں دل شکستگی ہے تو یاد رہے کہ وہ نشاط اور عشرتوں کا بھی شدید ترین تجربہ کر چکے ہونگے۔ جو خوشی سے نہیں تڑپا وہ غم سے کیا تڑپے گا۔

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

اردو غزل کی عشقیہ شاعری پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں فحاشی اور ہوس پرستی بھری ہوئی ہے۔ سوقیانہ، بازاری اور چھچھورے اشعار کی کثرت سے ہم انکار نہیں کرنا چاہتے لیکن اگر اردو غزل کے سرمایہ میں ولی دکنی اور سراج دکنی کے وقت سے اب تک پچیس ہزار اشعار بھی ایسے مل جائیں جو شریفانہ جذبات سے لبریز ہوں اور شدت احساس سے تھرتھرا رہے ہوں تو ہوس پرستانہ اشعار کے وجود سے ہمیں اتنا ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فن کے پرستار کو ذرا نڈر ہونا چاہئے۔ ہم تو چرکین، جان صاحب، رنگین، اور انشا کے کلام کو بھی دیکھ لیا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے متقی پرہیزگار، سادھو مہاتما رشی منی مخصوص صحبتوں میں اس طرح کھل کھیلتے ہیں کہ فحاشی خود پناہ مانگے۔ اگلے وقتوں میں سعدی اور ان کے ہم رتبہ شعرا کے کلام کے اخیر میں بے تکلف مخاشیات کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ خود ڈاکٹر اقبال نے سینکڑوں فحش اشعار کہے لیکن زمانہ کا رنگ دیکھکر انہیں اپنے ہی تک اور اپنے دوستوں تک رکھا۔ اردو میں فحش یا ہوس پرستانہ عشقیہ اشعار کے ہونے کا سوال ہی غلط ہے سوال یہ ہونا چاہئے کہ پاکیزہ اور بلند اور شرافت سے لبریز اشعار اور غزلوں کی کافی تعداد اردو میں ہے یا نہیں۔ مسخرا پن بیکار چیز نہیں ہے بشرطیکہ ہمارا کلچر محض مسخرا پن ہو کر نہ رہ جائے۔ اور سلیقے سے مسخرا پن کرنا بھی سب کے بس کی بات نہیں۔ عیب کردن راہنر باید۔ ہر شخص انشا۔ جرأت۔ داغ جان صاحب اور چرکین بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں ملک کے مذاق کو وقف مسخر ہو کر رہ جانا البتہ مہلک چیز ہے ورنہ زہر بھی بیکار چیز نہیں ہے۔ اور یہی بات ہے اردو غزل کے اس حصہ کے متعلق کہونگا جس میں تکلف تصنع اور محض میکانیکی فنی پیچیدگیاں یا بنوٹ یا آورد کے کرشمے دکھائے گئے ہیں۔ آخر ناسخ، شاہ نصیر اور ان کی تقلید کرنے والوں کا فن بھی ایک چیز ہے۔ اسی فن پر قدرت حاصل کر کے مصحفی نے سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیا ہے۔ جگر مراد آبادی کا شعر ہے :-

اپنی حدود سے نہ بڑھے عشق میں کوئی
جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

اور نقاد کو بھی اپنی حدود سے نہیں بڑھنا چاہئے۔ ہاں پُر تصنع شاعری کو بلند ترین شاعری یا شاعری کا معیار سمجھ لینا سب کچھ الفاظ اور الفاظ کی نوک کو سمجھ لینا البتہ مذاق کی گمراہی ہے۔ یہیں سے دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ نے اردو کی جو خدمت کی اس سے انکار نقادانہ کفر ہے لیکن آرٹ کی جدلیت (Dialectics) کو حضرات لکھنؤ نے نظرانداز کر دیا غالباً جس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری ہی کے عروج کے زمانے میں وہاں منطق اور "مولویت" یا "علمیت" کا بھی عروج تھا اور وہ بھی عربی علوم کا۔ تکمیل بیان، زور بیان، اور ایسے ہی سیکڑوں خارجی محاسن کے وہ ایسے گرویدہ ہوئے کہ شاعری کی خاموش گہرائیوں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ اس رو میں انیس اور آتش اور عزیز لکھنوی بھی اپنے کلام کا بہترین حصہ مرتب کرتے وقت آگئے اور جہاں تک کہنے کا تعلق ہے بڑی بڑی باتیں کہیں، امڈے ہوئے جذبات اور بلند خیالات سب کچھ لائے مگر وجدانی کیفیت پیدا نہ ہو سکی بات یہ ہے کہ فن لطیف میں فن کی ہر ظاہری خصوصیت جیسے شعر میں وضاحت، کنایہ، ترنم، ندرت خیال، بلند خیالی، اظہار جذبات، طرز ادا، زور بیان، معصومانہ انداز، طنز، تشبیہ اور استعارہ سب کی نفی اور رد کا بھی احساس ہونا چاہئے۔ تاکہ شعر کے ماورائی صفات، اس کا غیبی جمال، اس کے تحت الشعرا امکانات اس کے وجدانی اثرات ہمارے شعور کو مس کر سکیں لیکن جب بیان معنی پر یا معنی کے معنی پر چھایا ہوا رہے گا تو ایسا نہ ہو سکے گا۔ شاعری قدرت کلام اور عجز بیان کے امتزاج کا نام ہے لیکن اردو غزل میں عشقیہ شاعری کا کوئی انتخاب مکمل نہیں کیا جا سکتا جو لکھنؤ کے کمالات کو نظرانداز کر دے۔ ہم کو فحش اور بازاری قسم کی عشقیہ شاعری، پُر تصنع عشقیہ شاعری اور حقیقی عشقیہ شاعری سب کو تنظیم اور ترتیب دیکر ملک کے سامنے پیش کرنا ہے۔

امرد پرستی اور غیر فطری جذبات اور واردات کے اظہار کا الزام بھی سنگین الزام سمجھکر اردو کی عشقیہ شاعری پر لگایا گیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم اور کچھ نہیں کہتے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ میرے اس شعر میں :-

جا بھی چکا کب کا وہ بھول چکا کب کا
دل ہے کہ فراق ابتک دامن کو چھڑائے ہے

یا عزیز لکھنوی کے اس شعر میں :-

او ناشناس جنس وفا ہیں ترے نثار
کیا سوچتا ہے خوں بھری شمشیر دیکھکر

جا بھی چکی، بھول چکی، کیا سوچتی ہے۔ بنانے کے لئے میں تیار نہیں۔

دو اور اعتراضوں کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اردو شاعری تمام تر فارسی شاعری کی نقالی یا بگڑی ہوئی آواز ہے یا بگڑی ہوئی تصویر ہے۔ اردو کی نظموں میں مثنوی اور رباعی۔ قصاید اور کچھ اور اصناف کو چھوڑ کر جہاں تک مرثیہ۔ مسدس اور دور جدید کی نظموں کا تعلق ہے ان کا تو پتہ بھی فارسی شاعری میں نہیں۔ مثنوی میں بھی گلزار نسیم، زہر عشق اور میر کی مثنویوں یا حالی کی نیچریہ اور دیگر مثنویوں کو بھی محض فارسی کی نقل

سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غزل میں فارسی شاعری نے بہت کچھ اُردو غزل کو دیا لیکن میرؔ۔ غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ، جراتؔ، داغؔ۔ امیرؔ کے بہترین اشعار محض فارسی شاعری کے بگڑے ہوئے نقش کہہ کر نہیں ٹالے جاسکتے۔ میرؔ کے دل ودماغ کا آدمی اور شاعر تو ایران نے پیدا ہی نہیں کیا اور نہ آتشؔ کی اکڑ اور بانکپن فقر اور مستی کسی ایران کے شاعر میں ملتی ہے نہ جراتؔ کی بات کہیں ہے اور نہ داغؔ کی۔ رہی فارسی غزل کی سنجیدگی پختگی اور معنویت اور اس کی مجموعی عظمت تو اس کے لئے وقت کی ضرورت تھی اور بہت حد تک یاسؔ دیگانہ۔ ڈاکٹر اقبالؔ، حسرتؔ موہانی۔ فانیؔ، جگرؔ مرادآبادی، شادؔ عظیم آبادی اور اصغرؔ گونڈوی زمانہ حال کے غزل گو شعرا نے فارسی کے رچے ہوئے لہجے اور اسکی معنویت کو بھی اردو غزل میں سمو دیا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اردو غزل کی عشقیہ شاعری میں ہزار ہا شعر فارسی غزل کی تمام خوبیوں کا حامل ہوتے ہوئے نئے احساسات اور انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں اور یوں تو سعدیؔ اور حافظؔ آئے دن کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرا اعتراض فرسودگی اور پامال یا رسمی طرز بیان کا ہے۔ مختصراً اس باب میں بھی یہی کہوں گا کہ محض نقالی اور محض رسمی طرز ادا یا رسمی اور روایتی خیالات سے قطع نظر کرکے بھی اگر دیکھا جائے تو احساسات، خیالات۔ معنی اور طرز بیان کی تازگی کی ہزارہا مثالیں اردو کی عشقیہ شاعری میں ملیں گی۔ جو لوگ اردو بہت کم جانتے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھی اردو غزل کی عشقیہ شاعری میں واقعیت اور نفسیات کا جو جائزہ لیا جاتا ہے جو داخلی اور خارجی محاکاتی باتیں ہوتی ہیں اسے دیکھ کر عش عش کر جاتے ہیں "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" یوں تو حسن حسن ہے اور عشق عشق ہے اور بقول اس سرحدی آغا کے "سب وہی بات ہے" لیکن حسن اور عشق کی جاسوسی میں فطرت انسانی کے جو ہزار ہا سراغ ہزار ہا پتے ہزار ہا نشانیاں اردو کی عشقیہ شاعری میں ملتی ہیں۔ ایسی تفتیش ایسا انکشاف راز ایسی صراحت اور ایسے کنائے کسی بھی ادب کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں۔ "ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاکست" اسی مضمون میں پچاسوں اشعار کا حوالہ ہر دور کے غزل گو شعرا کے کلام سے میں دے چکا ہوں۔ ان میں سے کتنے ایسے شعر ہیں جن سے جھوٹے ہونے یا باسی ہونے یا فرسودہ ہونے یا محض رسمی ہونے کی بو آتی ہے۔ یہ کہدینا تو آسان ہے کہ وہی قفس اور آشیاں اور گل وبلبل اب تک لائے جا رہے ہیں لیکن میں اپنا ایک شعر حاضر کرتا ہوں میں اس مضمون میں اپنے شعر درج کرکے بہت خوش نہیں ہوں لیکن خود اپنے شعر سے کچھ اثر لینے کا مجھے بھی حق دیجئے۔ ہاں وہ شعر یہ ہے:-

چھٹا قفس تو وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

کیسے نقالی ہے؟ دوسرا شعر اقبالؔ کا ہے اور غالباً یوں ہے:-

ہزاروں سال نرگس اپنی بے بصری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اسے آپ محض نرگس، بے بصری اور چمن کے الفاظ آجانے سے کیا فرسودہ بتائیں گے؟ دیکھئے کتنا خلاقانہ استعمال ان الفاظ کا ہوا ہے۔ شعر تمثیلوں، الفاظ، اور منطقی مفہوم کی بنا پر فرسودہ درسودہ نہیں ہوتا ان کے علاوہ بھی شعر کے داخلی اجزا ہوتے ہیں، شعر کا مجموعی صوتی اثر ہوتا ہے۔ اس کا تال وسم ہوتا ہے، اسکی فضا ہوتی ہے اسکی ایک دنیا ماورائے لفظ وبیان ہوتی ہے۔ اس کا احساس اگر ہو تو سرقہ اور توارد کے بارے میں ہمارے خیالات میں انقلاب ہوجائے۔

بہرحال اب سوال یہ ہے کہ کیا قدیم غزل گو سب کچھ کہہ گئے اور دور حاضر کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امیرؔ اور داغؔ کی موت تک اردو غزل کو تین سو برس سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ حالیؔ، شادؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، یاسؔ ویگانہ، فانیؔ، عزیزؔ لکھنوی، جگرؔ مرادآبادی، اور اقبالؔ نے صرف یہی نہیں کہ اپنے یہاں کچھ بدل کر بات کہی بلکہ ان کے احساسات اور لب ولہجہ میں اب دور حاضر اور جدید کلچر کی ترجمانی نہیں ملتی تو یہ سراسر غلط ہوگا۔ میں یہ البتہ تسلیم کرتا ہوں کہ دور حاضر کے چند غزل گو کے یہاں کافی اشعار میں اور سب کے یہاں کچھ نہ کچھ اشعار میں قدامت اور رسمیت کی چاشنی آگئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کا کلام قدما کے کلام کا گراموفون ریکرڈ نہیں ہے۔ اس کی اور بات ہے کہ ساون کے اندھے کو سب ہرا دکھائی دے اور یرقان کے مریض کو سب زرد دکھائی دے اور بلی کو صرف چھیچھڑے نظر آئیں۔ اس اعتراض سے ہمارے غزل گو شعرا اور بھی احتیاط برتنے لگیں تو یہ بیجا اعتراض بھی کارآمد ہی ثابت ہوگا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ غزل کی شاعری میں نئے اور پرانے، فرسودگی اور تازگی کی بحث کے لئے تنہا معیار لہجہ ہے۔ ایک ہی سین کو دو مصور دو چیزیں بنا دیتے ہیں۔ ایک ہی نغمہ کو دو گانے والے دو چیز بنا دیتے ہیں۔ اردو کے عام مذاق نے بھی زندہ جاوید انہیں شعرا کو مانا اور جانا ہے جو صاحب طرز تھے جنکی صداؤں میں انفرادیت تھی۔

اردو غزل میں عشقیہ شاعری پر میں بہت کچھ کہہ چکا۔ یہ عشقیہ شاعری محض لفظ پرستی اور فنی رسمیت سے شروع ہوکر، کبھی جھوٹی کبھی سچی ہوتی ہوئی فحاشی اور ہوا پرستی کی زہریلی مگر کبھی کبھی دلفریب فضاؤں سے گذرتی ہوئی شریفانہ معصوم اور اڈے ہوئے یا شدید جذبات اور حیات کی ترجمانی کرتی ہوئی عشق کی نفسیات حرکات وسکنات کا جائزہ لیتی ہوئی فلسفۂ حسن وعشق اور پھر حقیقت کا انکشاف کبھی سہل ممتنع سے کبھی دوسرے طریقوں سے کرتی ہوئی وہاں جاکر ختم ہوتی ہے جب مجازی حسن وعشق یا عارفانہ احساس حسن وعشق حسن وعشق کی صوری یا معنوی حدود کو توڑ دیتے ہیں اور غیر عشقیہ اشعار میں بھی اس مزاج اور اس احساس کا پتہ دیتے ہیں جو حسن وعشق کے تجربوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی مزاج کی خلقت عشقیہ شاعری کی آخری غرض وغایت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ابتک صف اوّل اور صف دوئم میں تین سو برس کے اندر قریب قریب سو غزل گو شعرا آچکے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ میرؔ اور شاید دوچار کو چھوڑ کر کسی نے حسن وعشق اور زندگی کے احساسات سے اپنی کائنات بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس کو میں فرسودگی اور نقالی یا پامالی تو نہیں کہوں گا بلکہ ان کی خلاقانہ طاقتوں کی نارسائی کہونگا۔ عاشق ہونا تو شاید آسان ہے، حقیقی عشقیہ شاعری کرنا ذرا مشکل کام ہے لیکن عشقیہ شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسی کائنات تعمیر کرسکنا جو پہچانی بھی جاسکے اور لامحدود بھی ہو جو زماں ومکاں سے ماورائی وسعتیں اور نئی بلندیاں، اور گہرائیاں، نئی شش جہت رکھتی ہو جس کے عناصر حیات اپنے ہوں جس کی افسردگی اور تازگی اپنی الگ بوباس رکھتی ہو بہت مشکل کام ہے، صاحب طرز ہونے کے مقابلے میں جمالیات اور وجدانیات کی نئی کائنات تعمیر کرنا زیادہ مشکل ہے اور یہ توفیق اردو کیا دنیا کے شاعروں میں بہت کم کو نصیب ہوئی۔ محض جدت پسندی اور مشکل پسندی کے بل پر بھی یہ کام نہیں ہوا کرتا۔ اُردو شاعری کی طاقت بڑی حد تک فن کی فروعی قوتوں اور دلکشیوں کیلئے وقف رہی ہے۔ حیات، کائنات اور وجدان کی تہوں تک پہونچنے ان کی گہرائیوں کی تھاہ لینے کا موقع ابھی ہمارے شعرا کو ہم یہ تو نہ کہیں گے کہ نہیں ملا لیکن کم ملا۔ ہماری عشقیہ اور غیر عشقیہ شاعری میں جو کلچر کا عنصر ہے اس کے اور پختہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اور نئے عناصر کے بھی جذب کرنے کی ضرورت ہے۔ سنسکرت کلچر، جاپانی اور چینی کلچر، یونانی کلچر، لاطینی کلچر، جدید مغربی ادب، سائنس اور فلسفہ کا کلچر ہندوستان کی دیگر زبانوں اور لٹریچروں کا کلچر ان سب کے عناصر کو جذب کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اردو میں فارسی کلچر کا ہی رونا رو رہے تھے۔ بیسویں صدی کا کوئی ادب مقامی اور ملکی خصوصیات تک بند نہیں رہ سکتا۔

ہماری عشقیہ شاعری کے متعلق ایک اور شکایت کی جاتی ہے اور یہ اعتراض ذرا اہم اور وزنی ہے۔ ابھی ہم اپنی عشقیہ شاعری میں غم اور نشاط قنوطیت اور رجائیت دونوں کا ذکر کرچکے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ناکامی اور محرومی، دل برداشتگی اور بیزاری کا اثر بہت تیز ہے۔ اس اعتراض کا ایک جواب تو نشاطیہ اور طربیہ شعرا کے کلام سے دیا جاسکتا ہے۔ سوز وگداز کی آپ جو کچھ قدر وقیمت سمجھیں لیکن حقیقی اور وجدانی سوز وگداز میرؔ کے یہاں بھی پانچ سات فی صدی شعر سے زیادہ میں نہیں ملیں گے۔ جب یہ حال ہے تو پھر اس اعتراض کے کیا معنی۔ لیکن وجدانیت کی کیمیا اگرچہ بہت تھوڑے اشعار میں سوز وگداز پیدا کرسکی ہے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے طربیہ اور نشاطیہ اشعار میں بھی یہ کیمیا بہت کم کو اصلی سونا بنا سکی ہے۔ اردو کے زیادہ تر اشعار میرؔ کے رنگ میں ہوں یا سوداؔ کی تقلید میں ہوں یا ناکامی یا محرومی کا ہی رونا روتے ہیں یا کھسیانی ہنسی ہنستے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اردو پر اسلامی کلچر کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کلچر کو اور مغرب کے غیر اسلامی کلچر کو بھی اتنا اور ایسا زمانہ نہیں ملا جتنا اور جیسا زمانہ ہندو کلچر کو مل چکا ہے۔ اور بغیر اس کے وجود اور احساس وجود، حسن وعشق اور احساس حسن وعشق میں اس ہم آہنگی اس شانتی کا احساس نہیں پیدا ہوسکتا، ہمہ دانی اور معصومی کا وہ میل نہیں پیدا ہوسکتا۔ خیر وبرکت اور سلامتی کا وہ مانوس انداز اور وہ رس جسے ہم آبحیات یا امرت کہیں پیدا نہیں ہوسکتا جو ہندو ادب اور ہندو کلچر کو نصیب ہے۔ ہندو ادب حیات نما اور حیات آور دونوں ہے۔ اسی سے جو غزلیت رامؔ اور کرشنؔ، سیتاؔ اور رادھاؔ اور شکنتلا میں موجود ہے وہ غزلیت نہ قیسؔ میں ہے نہ فرہادؔ میں نہ لیلیٰ میں نہ شیریںؔ میں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ رامؔ۔ کرشنؔ سیتاؔ رادھاؔ شکنتلا ساوتری اور پاروتیؔ کی زندگی میں جانگداز اور استخواں سوز آزمائشیں نہیں تھیں۔ لیکن ہندو وجدان نے غم کے ان عناصر کو کیا بنا دیا۔ دور حاضر کی غزل گوئی سے کبھی کبھی وہ کرن پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے جو خون میں بھی ڈوبی ہوئی ہے اور امرت میں بھی اور یہ ایک نیک شگون ہے۔ اسلئے شانتی کی کمی کا اعتراض اردو کی عشقیہ شاعری پر بجا اعتراض ہے۔ لیکن دنیا کے ادب میں امرت کی صرف چند بوندیں ملتی ہیں سنسکرت ادب میں زہر اور امرت دونوں کی کچھ زیادہ بوندیں ملتی ہیں۔ ورنہ زندگی اور ادب دونوں میں

تمام تشنہ لبی ہے تمام شبنم ہے

اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ اردو غزل تمامتر عشقیہ شاعری ہونے کے لئے بدنام ہے لیکن اس کا قریب قریب نوے فی صدی حصہ محض حسن نما اور عشق نما ہے، حسن وعشق نہیں ہے لیکن دس فیصدی بھی بہت ہوتا ہے۔ اس ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ عاشقوں کا قحط اور شاعروں کی بھرمار رہی ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری کو اس لحاظ سے دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے ایک وہ جو فنی کارنامہ ہونے کے لحاظ سے

دلچسپ یا قابل لحاظ ہے (کیونکہ نقلی اور مصنوعی پھول بھی آرائش میں کام آتے ہیں) اور دوسرا وہ جو شاعری بھی ہے اور اصلیت بھی ہے۔ آخرالذکر اشعار کی تعداد بھی کئی ہزار ہوگی۔

آخری بات مجھے یہ کہنی ہے یا پوچھنی ہے کہ ہماری عشقیہ شاعری میں عوام کی زندگی عوام کے دلوں کی دھڑکن اور عوام کی آواز یا ان کا لب ولہجہ کہاں تک ہے۔ اردو شاعری ہمارے نوے فیصدی ہموطنوں کی زندگی اور جذبات سے کتنی قریب ہے۔ دنیا میں جو دور آرہا ہے وہ محض سیاسی یا معیشی جمہوریت کا دور نہیں ہے بلکہ تمدن اور تہذیب یعنی کلچر کی جمہوریت کا بھی دور ہے۔ جو شاعری یا ادب محض دو چار فیصدی تک محدود رہے۔ اس کا مٹنا لازمی ہے خواہ وہ کتنی ہی بلند یا لطیف ہو۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو اردو زبان اور اُردو شاعری میں ہندی کی چندی کی گئی۔ ٹکسال اور روزمرہ محاورہ اور بولی ٹھولی سے اُسے سجایا گیا اور دوسری طرف اردو شاعری محض ایک طبقہ کی چیز ہو کر رہ گئی۔ لیکن یہ بھی نہ بھولئے کہ جن ہندو مسلمانوں کی زبان ہندوستانی ہے ان میں پانچ فیصدی ہی خواندہ ہیں اور ہندو سماج میں جو خواندہ ہیں ان میں سے اسی فیصدی کے قریب اب فارسی رسم الخط سے بیگانہ ہو چلے ہیں۔ لیکن اگر اردو نثر اور نظم کو ناگری حروف میں بھی چھاپ دیا جائے اور کچھ مشکل ٹکڑوں کی شرح دیدی جائے تو گاؤں گاؤں اور گھر گھر میں اردو پھیل جائے اور اردو ادب سے لطف اور فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں کروروں کا اضافہ ہو جائے۔ اردو کے پرچار ہندو ماس اور کلاس کانٹیکٹ (Hindu mass + Class Contact) کا یہ تنہا ذریعہ ہے۔ یہ سب مانتے ہوئے بھی اس سے انکار کیونکر کیا جائے کہ دنیا کا ادب اور خاصکر اردو ادب ایک طبقے کی چیز رہی ہے۔ ہماری شاعری کی لغت، طرز بیان، انداز احساس، اس کا لب ولہجہ اسکی فضا اس کی دنیا بہت حد تک عوام کی زندگی سے دور رہی ہے۔ کچھ تو عوام کو بھی اوپر اور آگے بڑھنا ہے اور کچھ ہمارے ادب اور شاعری کو بھی عوام کے قریب آنا ہے۔ ہماری تہذیب اور ہمارا کلچر ہمارا ادب صرف اسی طریقہ سے نیا جنم لے سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ معنوی حیثیت سے جو مدارج اور مقامات ہمارا ادب طے کر چکا ہے انہیں ترک کر دیا جائے۔ ذہنیت اور معنویت ایک ہی چیز کا نام نہیں ہے۔ ہمیں اپنی ذہنیت بدلنی ہے۔ ہماری شاعری کو عوام کی زندگی سے جو چیز الگ کئے ہوئے ہے وہ محض زبان اور خیال کی دقتیں نہیں ہیں وہ ذہنیت اور طرز وجدان اور مزاج کا فرق ہے۔ کچھ تو ضرور ہمارا طرز وجدان عوام کا طرز وجدان ہو سکے گا اگرچہ بہت کچھ ردو بدل کے بعد لیکن ہمارے طرز وجدان میں بھی عوام کی زندگی کی دھڑکنیں ہونی چاہئیں۔ حال میں میں نے نظیر اکبرآبادی کی ان غزلوں کا انتخاب دیکھا جو حال ہی میں دستیاب ہوئی ہیں تو ان غزلوں میں البتہ عوام اور خواص کی زندگی کا امتزاج اور امتزاج کے امکانات نظر آئے۔ آرزو کی خالص اردو تو غیر خالص اردو سے بھی زیادہ پُرتکلف ہے فارسی الفاظ نکال دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہاں نظیر کی شاعری۔ بہت حد تک حالی کی شاعری خاصکر مناجات بیوہ۔ میر اور داغ اور کچھ حصہ اقبال کے کلام کا عوام کی زندگی کا جزو بن سکتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے بس کی یہ بات نہیں۔ انیس تک کو ہم اس تمدن اور تہذیب کا شاعر نہیں مان سکتے جو سولہویں صدی عیسوی کا تمدن اور تہذیب ہے۔ دہلی اسکول ہی کی طرف نظر اٹھتی ہے جب عوام کی زندگی اور عوام کے دلوں کی دھڑکن کو اردو شاعری سمو لیگی تو اس میں ایک نئی کسک ایک نئی ٹیس نیا نکھار نئی سادگی نیا خلوص نئی ہمہ دانی اور نئی معصومیت نئی وسعتیں اور ایک مردانہ وار ادا نئی بے نیازی اور نئی لگاوٹ نئی نرمی اور نئی سختی۔ ہاں ایک نئی انسانیت کی تخلیق اور تعمیر نشو و نما اور ارتقا کے امکان پیدا ہو جائیں گے۔ اردو غزل اور اردو کی عشقیہ شاعری اس لحاظ سے ذرا بیمار چیز رہی ہے اور اسے تندرست ہونے کے لئے عوام سے حیات مستعار لینا ہے۔ ابھی تک اردو شاعری کا یہ قول رہا ہے کہ

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے (غالب)

لیکن اب آنکھوں سے لہو ٹپکانے سے زیادہ اہم ضرورت اس شاعری کی رگوں میں خون صالح کے دوڑتے پھرنے کی ضرورت ہے۔ اسی بات میں اردو شاعری کے درخشاں مستقبل کا راز چھپا ہوا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اسی درخشاں مستقبل کا پیغمبر تھا۔

برادر وطن سے

(از سید شمیم عسکری خیرآبادی)

یہی اُردو کی شان ہے پیارے — میری تیری زبان ہے پیارے
آبیاری میں اس کی کب سے شریک — سارا ہندوستان ہے پیارے
جس میں ہے غوطہ زن ہر اہل وطن — یہ وہ گنگا نہان ہے پیارے
چشم انصاف سے تو دیکھ اس کو — کتنی پیاری زبان ہے پیارے
صرف ملکی زبان ہی یہ نہیں — بلکہ قومی نشان ہے پیارے
اس کی شیریں بیانیوں کا قائل آج — ہم نہیں۔ اک جہان ہے پیارے
اس کا ہر لفظ اپنے معنی میں — گویا اک داستان ہے پیارے
ایسی وسعت پر ایسی رعنائی — دیکھ کیا دھان پان ہے پیارے
نام ہندی سے ضد نہیں ہم کو — تو عبث بدگمان ہے پیارے
ہندی و سنسکرت و اُردو کا — ایک ہی خاندان ہے پیارے
لاگ اس کو کسی زباں سے نہیں — سب کی یہ میزبان ہے پیارے
ساتھ اس کے ترا عمل کچھ ہے — اور ترا کچھ بیان ہے پیارے
کر تو "نافذ" کا ترجمہ "لاگو" — کیونکہ تو حکمران ہے پیارے
لیکن انصاف سے ذرا یہ بتا — یہی تیری زبان ہے پیارے؟
یوں چلے تیغ جانِ اُردو پر — کیسا تو پاسبان ہے پیارے؟
دیکھ بھی لینے دے شباب اس کا — یہ ابھی نوجوان ہے پیارے
یہ مٹے گی ترے مٹانے سے؟ — وہم ہے اک گمان ہے پیارے
تو سمجھتا نہیں سمجھکر بھی — کیسی یہ تیری آن ہے پیارے
یوں جسے تو اُجاڑتا ہے آج — تیرے گھر کی دُکان ہے پیارے
غلط الزام ہے بدیشی کا — یہ سودیشی زبان ہے پیارے

آ۔ میں تیری بلائیں لے لوں شمیم
تو مرا ہمزبان ہے پیارے

ابنِ یمین

بادۂ شیراز کا ایک جام رنگین

(از جناب زکریا فیاضی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ) بجنور)

ذیل کا عالمانہ مقالہ ایک ایسے فاضل دوست کی غور و فکر کا نتیجہ ہے جن کے مطالعہ کی وسعت اور علم و ادب کا اچھوتا مذاق قابل رشک ہے۔ آپ فارسی اور انگریزی کے علاوہ اُردو اور ہندی ادب پر بھی خاصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ذیل کے مقالہ میں آپ نے فارسی کے ایک مشہور فلسفی اور صوفی شاعر کی زندگی کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ یہ حالات عام تذکروں میں نہیں ملتے اس لئے خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں۔ (ایڈیٹر)

بغداد کی تباہی و بربادی کا خونچکاں واقعہ جو ۶۵۶ھ میں وقوع پذیر ہوا، اس نے نہ صرف خلافت عباسیہ کے آخری چشم و چراغ معتصم باللہ کی حکومت کا دفتر الٹ دیا بلکہ مسلمانوں کے چھ صدی کے سرمایۂ علم و ادب اور مخزنِ تہذیب و تمدن کا بھی صفایا کر دیا۔ یہ ناگہاں آفت ایسی دلدوز اور تباہ کن تھی کہ شاعر ایران (سعدی) کا دل لرز اُٹھا اور حسرت و یاسی کے عالم میں بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

خلافت عباسیہ کے ٹمٹاتے چراغ کی جگہ اب تاتاریوں کا آفتاب عروج سرزمین ایران پر چمکا اور ہلاکو خاں اور اس کے جانشین جو تاریخ ایران میں ایلخانیوں کے نام سے مشہور ہیں داد حکومت دینے لگے۔ بتعجب ہے کہ رہزنوں اور بادیہ نشینوں کا یہ گروہ جو قتل و غارتگری اور خون آشامی کا دلدادہ تھا، ایران کی تہذیب پرور فضا کے اثر سے اپنی خصلت کو بالکل بھول گیا۔ خاکستر عجم سے ادب و انشائے ایران کے پیکر بیجان میں روح تازہ کے سامان نظر آنے لگے۔ اور اس خونریز قوم کی حکومت میں آئین و فنون جنگ کی آئینہ بندی کے ساتھ ساتھ علم ہیئت و ہندسہ، منطق و فلسفہ اور کلام و تاریخ پر بے نظیر کتابیں عالم ظہور میں آئیں۔ اہل قلم کو اطمینان نصیب ہوا تو عربی اور فارسی میں تفسیر، تصوف اور اخلاقیات پر بیشمار کتابیں لکھ ڈالیں اور عشق حقیقی و مجازی کی واردات کے بیان میں وہ گل کاریاں کیں اور سوز و گداز سے پُر نظمیں لکھیں جو ادب ایران کے لئے طرۂ امتیاز ہیں۔

تفسیر بیضاوی، فصوص الحکم (ابن عربی) اور طبقات الاطبار، کامل (ابن اثیر) وغیرہ عربی میں اور تاریخ جہاں کشا (عطا ملک جوینی) اخلاق ناصری (محقق طوسی) گلستان سعدی، تاریخ وصاف۔ جامع التواریخ (رشید الدین فضل اللہ) تاریخ گزیدہ (حمد اللہ مستوفی) تاریخ بناکتی (فخر الدین بناکتی) درۃ التاج (قطب الدین شیرازی) مشہور تصانیف ہیں۔ شاعری میں غزل۔ اخلاق و تصوف میں رباعی لکھی گئیں۔ رزمیہ کا بھی زور رہا مگر صرف ظفر نامہ مشہور ہے۔ مشہور شعراء میں فرید الدین عطار، کمال اسمٰعیل، مولانا روم، سعدی شیرازی۔ پور بہائی جامی۔ امامی ہروی، مجد ہمگر، عراقی، اوحد الدین کرمانی، محمود شبستری اور ہمام تبریزی مشہور ہیں۔

اس خاندان کا آخری حکمراں سلطان ابو سعید تھا جو ۷۳۶ھ میں لاولد فوت ہو گیا۔ اس کی وفات سے فترت تیمور تک جو ۳۵ سال کا زمانہ ہوتا ہے ایران میں مرکزی حکومت تباہ ہو کر چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستیں قائم ہو گئیں۔ جو آپس میں برسر پیکار رہتی تھیں۔ ان حکومتوں میں زیادہ مشہور آل مظفر فارس و عراق میں داد حکومت دیتے رہے۔ اس خاندان کا بانی مبارز الدین محمد تھا۔ تیمور نے اس کا خاتمہ کیا۔ حافظ شیراز اس خاندان کے مشہور شاعر ہوئے۔ دوسرا خاندان جلائر تھا جو بغداد اور آذربائیجان پر قابض ہو گیا اس کا بانی حسن جلائر تھا۔ سلمان ساوجی اس خاندان کا مداح رہا۔ تیسرا خاندان سربداراں (سربدالان) تھا جو پچاس سال تک سبزوار میں حکمراں رہا۔ اس کا آخری فرماں روا خواجہ علی مؤید تھا۔ اس خاندان کا مشہور شاعر ابن یمین تھا۔ چوتھی حکومت ہرات میں کرت خاندان کی تھی جس کا بانی شمس الدین کرت تھا۔ معز الدین کرت نے سربداروں کو ختم کر دیا۔ اور آخر میں باقی تمام ریاستوں کو تیمور نے تباہ کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

ابن یمین سربداران کے متوسلین میں سے تھے۔ اس کے ہمعصر شعراء میں خواجو کرمانی۔ کمال خجند۔ مغربی۔ حافظ شیرازی اور سلمان ساوجی بہت مشہور ہیں۔ جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں داد کمال دی۔ کوئی غزل گوئی میں مشہور ہوا تو کسی نے قصیدہ نگاری کو اوج کمال تک پہنچایا۔ لیکن یمین نے سب کے برخلاف قطعہ نگاری کو کمال فن ٹھیرایا۔ قطعہ گوئی کے لحاظ سے ابن یمین کا پایہ فارسی ادب میں بہت بلند ہے۔

زندگی

افسوس ہے کہ اس صاحب کمال کے حالات زندگی شرح و بسط کے ساتھ کسی تذکرہ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کے نام اور تاریخ پیدائش و وفات میں بھی تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے۔ اس کا اصل نام امیر فخر الدین محمود ابن یمین تھا۔ گو دولت شاہ نے امیر محمود ابن یمین الدین لکھا ہے لیکن تاریخ میں وہ ابن یمین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا باپ امیر یمین الدین (یمین الدولہ) ترکستان کا باشندہ تھا اور ایک صاحب فضل اور معقول پسند شاعر تھا۔ وہ ترکستان سے سلطان محمد خدا بندہ کے عہد میں خراسان آیا اور فریومد (فرومد) میں مقیم ہو گیا۔ اور اپنے گذارے کے لئے جائداد خرید لی۔ ابن یمین ۶۸۵ھ ۱۲۸۶ء میں یہیں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت میں باپ کی شاگردی کی اور اسی سے فن شعر حاصل کیا ؎

چنیں بود پدرے، کش چناں بود پسرے
چنیں بود عرضے، کش چنیں بود جوہر

باپ نے بچہ کا دل بڑھانے اور قابلیت کا اندازہ لگانے کی غرض سے اپنی غزلوں پر غزلیں لکھوائیں۔ ابن یمین کی ایک جوابیہ رباعی بہت مشہور ہے ؎

دارم جفائے فلکِ آئینہ گوں ۔ پر آہ دلی کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہزار غم بہ شب می آرم ۔ تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

باپ کی رباعی ملاحظہ ہو:-

دارم ز عتابِ فلکِ بوقلموں ۔ وز گردشِ روزگارِ خس پرور دوں
چشمی چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک ۔ جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

خواجہ علاؤ الدین وزیر سلطان ابو سعید، امیر یمین الدین کا مربی تھا۔ اس لئے ابن یمین کو بعد تکمیل فن بہت آسانی سے شاہی دربار میں رسائی کا موقع مل گیا۔ اُس نے اپنے باپ کی حیات ہی میں شاعری میں کمال حاصل کر لیا تھا اور عربی فارسی اور ترکی میں کافی استعداد بہم پہنچا لی تھی۔ چنانچہ ایک تذکرہ نویس لکھتا ہے:-

"از فضلائے عہد بودہ۔ اخلاق حمیدہ و سیرت پسندیدہ داشتہ۔ طبعے ظریف و سخنے دلپذیر دارد و از دہقنت مال حاصل کردے و فضلا و فقرا را زیارت کردے و اکابر او را حرمتے زیادہ از وصف می داشتہ اند"

اس کے باپ کا انتقال ۷۲۲ھ ۱۳۲۲ء میں ہوا۔ ابن یمین کی عمر اسوقت ۳۷ سال تھی۔ اس نے علاؤ الدین کی تعریف میں ایک شاندار قصیدہ بھی کہہ کر گذرانا، اور اس میں ممدوح کے تعمیر کردہ شفاخانہ کی خوبیاں بیان کیں اور ان حسین و جمیل خواتین کے محامد بیان کئے جو بیماروں کی تیمارداری کے لئے ملازم رکھی گئی تھیں۔

ابن یمین کی زندگی میں ۷۳۶ھ۔ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سال سلطان ابو سعید کا انتقال ہوا اور ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی، اور اسی سال تیمور پیدا ہوا۔ یہ ابن یمین کا دور شباب تھا۔ اس کا دل روزمرہ کی خونریزیوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے سرد ہو گیا۔ اس نے دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ لیکن ۷۴۳ھ ۱۳۴۲ء میں جب امیر مسعود سربدار نے ہرات پر فوج کشی کی تو ابن یمین بھی جنگ میں شریک ہوا مگر فوج کو شکست ہو گئی اور اس کا تمام ساز و سامان لٹ گیا۔ اسی ہنگامہ میں اس کا دیوان بھی ضائع ہو گیا اور اس طرح اس کی نصف عمر کی کمائی غارت ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد ابن یمین نے درباروں سے تعلقات منقطع کر لئے اور فقر و قناعت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی۔ اسی میں کاشت کر کے خورد و نوش کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ اس کا انتقال ۸ جمادی الثانی ۷۶۹ھ ۱۳۶۷ء کو ہوا۔ مرنے سے قبل جانماز پر لیٹے لیٹے حسب ذیل رباعی لکھی ؎

منگر کہ دل ابن یمیں پُر خوں شد ۔ بنگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
(یہ نہ دیکھ کہ ابن یمین کا دل خون آلود ہے۔ یہ دیکھ کہ وہ اس جہاں سے کیسے رخصت ہوا)
مصحف بکف و چشم بہ رو بدوست ۔ با پیکِ اجل غمزہ زناں بیروں شد
(وہ اس طرح رخصت ہوا کہ اسکے ہاتھ میں قرآن تھا، آنکھیں جمال یار کی منتظر تھیں اور موت کے فرشتہ سے اشارے کنائے کر رہا تھا۔)

کلام

جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے اس کا دیوان ہنگامۂ جنگ میں ضائع ہو چکا تھا۔ موجودہ کلام دس سال بعد جمع کرنا شروع کیا۔ کچھ حافظہ سے جمع کیا اور کچھ دوست احباب کی بیاضوں سے نقل کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں اس نے اس میں اور نظموں کا بھی اضافہ کیا۔ اس کی شاعری کے دو دور ہیں پہلا دور ساتویں صدی ہجری کے اختتام ۷۴۳ھ ۱۳۴۲ء تک جو عالم جوانی کا دور ہے۔ اس میں غزلیات و قصائد کا زور رہا دوسرا دور اس کے بعد سے شروع ہوتا ہے جسے دور پیری کہنا چاہیئے۔ اب شاعر کا دل کشمکش حیات سے عاجز آ چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اخلاقی نظمیں اور بالخصوص قطعات عالم وجود میں آئے دور اوّل کی شاعری کے نمونے بہت کم موجود ہیں اور اسلئے

عہدِ شباب کی رنگینوں کا پورے طور پر علم نہیں ہو سکتا۔ لیکن بعض اشعار سے جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی غزلیں کم مایہ نہیں تھیں۔ مثلاً

سر مدہ اے دیدہ ہر دم اشک غمّاز مرا — تا نسازد فاش پیشِ مردماں راز مرا

اے آنکھ ہر دم آنسو نہ بہا کہ اس سے لوگوں کے سامنے میرا راز فاش ہو جائیگا

ز خود بیگانہ بودن در رہِ عشق — باں معشوق طرحِ آشنائی ست

ہر وقت کھویا ہوا سا رہنا بھی اس معشوق سے راہ و رسم بڑھانیکا طریقہ ہے۔

لیکن اس کا خاص رنگ اخلاقی شاعری ہے۔ اور اس میں بھی قناعت اور خودداری کے مضمون کو مختلف پیرایۂ بیان اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے جو بالکلیہ اس کا حصہ ہے۔ اور اس سے بہتر آج تک دوسرا ادا نہیں کر سکا۔ اس کا کلام کیفیاتِ قلبی کا صحیح صحیح فوٹو پیش کرتا ہے۔ جو کیفیت دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے وہی لفظی جامہ پہنکر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا قال حال کی تصویر ہے اس لئے ایک خاص اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور دل پر نشتر کا کام کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی نظمیں فارسی ادب میں نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ عربی اور ترکی ادب سے کماحقہٗ واقف تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی اور وہ اپنے گرد و پیش کا نظر غائر سے مطالعہ کرتا تھا۔ اس نے نہایت سلیس اور شستہ زبان میں حیرت و استعجاب میں ڈالدینے والے فارسی ادب کے مرقع پیش کئے ہیں۔ اس نے حیاتِ انسانی کے عارضی و چند روزہ قیام کے پہلوؤں کو مختلف انداز میں پیش کیا اور حیاتِ فردا کے خوش آیند خواب اور اس کے امید افزا تصورات کے خیالات کو حماقتِ محض اور تضیعِ اوقات سمجھا۔ وہ عقل و دلائل کا قائل اور فہمِ عامہ کی پُرزور قوت کا مبلغ تھا۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں اس نے اپنی فلسفیانہ خیالات کی ترویج کی۔ اس کے اشعار میں مزاحیہ رنگ بھی موجود ہے۔ اور ہجو گویانہ تلخی بھی نمایاں ہے۔ وہ مجلسِ عیش و نشاط، صحبتِ احباب اور لذتِ شراب و کباب کا دلدادہ تھا۔ مرنجاں مرنج زندگی کو پسند کرتا اور گوشۂ سکون و عافیت میں بسر کرنا گوارا کرتا تھا۔ وہ ہمیں صاف و صریح الفاظ میں بتاتا ہے کہ دنیا میں خوشی و خرمی اور ہوشیاری سے زندگی گذارنی چاہیئے۔ کبھی کبھی فلسفہ کے عمیق رموز اور نکاتِ تصوف بھی رقم کر دیئے ہیں۔ لیکن صفائی زبان اور قوتِ استدلال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے اور دقیق مطالب کو آسان کر دیا ہے۔ قطعات سے جو اس کی شاعری کی جان ہیں اس کی قوتِ مشاہدہ اور زندگی کے تجربات کی وسعت کا علم ہوتا ہے۔ تمثیلات میں اس کی قوتِ تخیل نہایت قوی اور بلند پرواز ہے زبان سلیس اور شستہ ہے جاہ طلبی کی مذمت کا پیرایہ بیان ملاحظہ ہو:-

دو قرص نان اگر از گندم است یا از جو — دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو

دو روٹیاں چاہے گیہوں کی ہوں یا جو کی۔ دو جوڑے کپڑے چاہے نئے ہوں یا پرانے

بہ چار گوشۂ دیوار خود بخاطرِ جمع — کہ کس نگوید ازیں جا بخیز و آنجا رو

اپنے گھر کی چہار دیواری کا سکون۔ جہاں کوئی کہہ سکے کہ یہاں سے اٹھ اور وہاں جا

ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابنِ یمین — ز فرِّ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

ابن یمین کے نزدیک کیقباد و کیخسرو کی سلطنت سے ہزار بار بہتر ہے۔

ز دیوانہ کرد روزی سوال — سلیمانِ مرسل علیہ السّلام

سلیمان علیہ السلام نے ایک روز ایک دیوانہ سے پوچھا

کہ چوں بینی ایں سلطنت کز پدر — مرا ماند با ایں ہمہ احتشام

کہ یہ سلطنت میرے باپ سے مجھ تک کیسے باقی رہی

چہ خوش گفت دیوانہ او را جواب — کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام

یہ سنکر دیوانہ نے اُسے کیا اچھا جواب دیا۔ بولا کہ جب دنیا کی حکومت کو ثبات نہیں ہے

پدر مدتی آہن سرد کوفت — تو در باد پیمودنی صبح و شام

تو تیری حکومت کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ تیرا باپ ایک زمانہ تک ٹھنڈا لوہا پیٹتا رہا اور تو صبح شام ہوا ناپتا پھرتا ہے۔

حضرت داؤدؑ زرہ بنایا کرتے تھے اور حضرت سلیمانؑ کی نسبت مشہور ہے کہ ان کا تخت ہوا پر چلتا تھا۔ فارسی میں آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن کے معنی بیکار کام کرنے کے ہیں۔ دیوانہ نے حضرت داؤد کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمانؑ کے تخت کے ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن سے تعبیر کیا ہے۔

زر پرست اور طمّاع شعراء کی شان میں ارشاد ہے ؎

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں — رسدت نان و نیز ترہ و دوغ

شاعری کوئی پیشہ نہیں جس سے تجھے روٹی، ساگ یا دہی مل سکے

راستی، سخت زشت و بے معنی ست — اُجرتی خواستن برائے دروغ

جھوٹ بول کر اس کا معاوضہ مانگنا بڑی بری بات ہے

زاں بود کارِ شاعراں بے نور — کہ ندارد چراغِ کذب فروغ

اسی وجہ سے شاعروں کی بات بگڑی ہوئی ہے کہ جھوٹ کا چراغ کبھی نہیں جلتا

وہ اُن معمولی واقعات سے جو انسان کو اپنی زندگی میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں نہایت مفید حیرت انگیز اور عبرت زا نتائج پیدا کرتا ہے۔ آپ اُن تجربات اور نتائج کی صداقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں یہ دوسری بات ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں شاعر نے اپنی قوتِ مدرکہ کی جلوہ نمائیاں بہت حد تک کی ہیں۔ اس کے چمنستانِ شاعری میں باغبانِ فطرت کی گلکاریوں کے جاذبِ نظر گلدستے بھی نظر آتے ہیں۔ جو ابن یمین کو یورپ کے فطرت پرست شعراء کے ہمنوا و ہم پلہ کر دیتے ہیں وہ نیرنگیِ فطرت کا پرستار ہے اور محنت و مشقت سے روزی حاصل کرنے کو اچھا سمجھتا ہے۔ دورِ جدید میں بھی جبکہ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ جاری ہے اور محنت و مشقت کو ذریعہ عزت قرار دیا جاتا ہے ان خیالات کا پرتو نہیں ملتا۔ وہ اپنی تھوڑی سی زمین پر قانع ہے اور اس میں کاشت کر کے پیٹ پالنے کو بھیتی اور مداحی سے زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔ ہنگامہ و فساد کے اُس دور میں وہ بہت زیادہ نا امیدیوں اور مایوسیوں کا شکار بنا رہا۔ تاہم عوام کے دلوں میں اس کی بہت قدر و منزلت تھی۔ اس کی شاعری میں عمر خیام کی شاعری کا پرتو نمایاں ہے۔ اس نے گردشِ افلاک کی تباہ کاریوں کا بہ مقابلہ ہمعصر شعراء کے زیادہ وضاحت کے ساتھ مرثیہ گایا لیکن راست گوئی اور صداقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سبزوار، نیشاپور اور گرگان میں گذارا اور شاہانہ دربار، میدانِ جنگ اور ہنگامہ ہائے خورد و نوش کو اپنے لئے دار المطالعہ بنایا، اور ان سے سبق حاصل کیا۔

کلام

۱- طریقِ تسلیم و رضا ہی میں امن و سلامتی ہے:-

خواہی کہ خدا کارِ نکو با تو کند — ارواح و ملائک ہمہ رو با تو کند

اگر تو چاہتا ہے کہ خدا تیرے سب کام بناتا رہے اور عالمِ بالا تجھ پر مہربان رہے

یا ہر چہ رضائے اوست در آں ہست بکن — یا راضی شو ہر آنچہ او با تو کند

تو یا تو اپنا ہر کام خدا کے حکم کے مطابق کر اور یا خدا کے ہر کام پر سرِ اطاعت خم کر

۲- محبت زبردست طاقت ہے۔ آفتابِ عالمتاب کی طرح اس کا اثر عالمگیر ہے:-

مہر دو مہرِ دلبر چوں تاباں شود — چہ باک ار بود خصم با کین و تاب

معشوق کا چاند سورج جب چمکنے لگے تو پھر دشمن کی دشمنی سے ڈرنے کی کوئی حاجت نہیں

چوں رخشاں کند رخ ز شرق آفتاب — زحل خواہ گو تاب و خواہی متاب

جب مشرق سے چمکتا ہوا آفتاب نکل آئے تو زحل (منحوس ستارہ) چمکے یا نہ چمکے، سب برابر ہے۔

۳- فکرِ فردا یا غمِ ماضی عقلمندوں کا شیوہ نہیں ہے:-

غمِ نا آمدہ خوردن نبود شیوۂ عقل — وانچہ بگذشت ازاں ہم نکند عاقل یاد

جو بات ابھی نہیں ہوئی اسپر غم کھانا عقل کا شیوہ نہیں۔ اور جو کچھ گذر چکا اسے یاد کرنا بھی عقلمندوں کا کام نہیں۔

وقت را داں کہ در آں ای و غنیمت شمرش — زانکہ از پیش تو آنہم گذران است چو باد

زمانہ تو بس حال ہے، اس کو غنیمت جان اسلئے کہ وہ بھی تیرے سامنے سے ہوا کی طرح گذر رہا ہے

گر بدیں نکتہ کہ گفت ابن یمیں کار کنی — نگذرد بر تو زمانی کہ نباشی دل شاد

اگر تو ابن یمین کے اس نکتہ پر عمل کرے۔ تو تجھ پر کبھی ایسا وقت نہ آئے جب تجھے غم کرنا پڑے

۴- دنیا گذشتنی و گذاشتنی ہے یہاں دل نہ لگاؤ لیکن وقت کی قدر کرو۔

باخبر باش کہ دنیا گذران است ای دل — خیز کایں خوابگہِ بیخبراں است ای دل

ہشیار رہ کہ دنیا آنی جانی ہے۔ اُٹھ کہ یہ دنیا غافلوں کی خوابگاہ ہے۔

ہر یک از برگِ بنفشہ کہ دمد از دلِ خاک — خالِ مشکینِ رخِ سیمبراں است ای دل

بنفشہ کا جو پتہ مٹی سے اُگتا ہے وہ کسی حسین کے چہرہ کا حسین تل ہے (جو مرنے کے بعد مٹی میں مل کر مٹی ہو چکا ہے)

شاخِ سنبل کہ سر از جیبِ زمیں بر دارد — جعدِ عنبر شکنِ خوش نظراں است ای دل

سنبل کی ڈالیاں جو زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ خوبصورتوں کی خوشبودار زلفیں ہونگی

وقت دریاب کہ بس کاسۂ سرہائے ملوک — تعبیہ در کارگہِ کوزہ گراں است ای دل

وقت کو غنیمت جان کہ سینکڑوں بادشاہوں کی کھوپڑیاں کمہاروں کی بھٹی میں جھونکی جا چکی ہیں۔

۵- تعلیم و تربیت بد اصل کی خصلت نہیں بدل سکتی:-

ہر کہ در اصل بد نہاد افتاد — ہیچ نیکی ازو مدار امید

جس کی اصل خراب ہو، اس سے کسی بھلائی کی آس نہ باندھ

زانکہ ہرگز بہ جہد نتواں ساخت — از کلاغ سیاہ، بازِ سفید۔

اس لئے کہ کتنی ہی کوشش کیجائے، کالے کوّے کو سفید باز نہیں بنایا جا سکتا

دوں نوازی مکن کہ می نشود — در ضیا ہیچ ذرہ چوں خورشید

کمینوں کو نوازنا چھوڑ دے کہ سورج کی روشنی سے ذرہ سورج نہیں بن سکتا

ہر کرا دورِ چرخ جامی داد — با بصارت نگشت چوں جمشید

جس کسی کو جام ہاتھ لگ جائے وہ جمشید نہیں بن جاتا۔

بید را گر بہ پرورند چو عود — بر نیاید نسیمِ عود از بید

بید کے درخت کی اگر عود کی طرح دیکھ بھال کریں تب بھی اس میں سے عود کی سی خوشبو نہ آئے گی۔

۶- انقلاباتِ عالم سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ امارت و غربت، عزت و ذلت سب خدا کے حکم سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے حکم پر شاکر رہو:-

ایدل اگر زمانہ بصد غم نشاندہ است — بنشین و صبر کن، کہ صبوری دوائے است

اگر تجھے زمانہ نے سینکڑوں غم پہنچائے ہیں، تب بھی صبر سے کام لے کہ اس کا علاج صرف صبر ہے۔

با جورِ روزگار نشاید ستیزہ کرد — آں کس کرد ایں مثلی خوش برائی است

زمانہ کے ساتھ لڑنا نہ چاہیئے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو تیری مثال یہ ہے۔

بابیل زندہ پشہ چو پہلو ہمی زند		گرجاں بباد بردہ بحق ترا اوست
کہ زندگی کے ساتھ اگر مچھر لڑنے لگے تو یقیناً اسکو جان سے ہاتھ دھونا پڑے
گر کار عاقلے نرود بر رہِ صواب		از وے مبیں کہ آں نہ ز نکر و خطائے اوست
اگر کسی عقلمند کا کام نہ بنے تو یہ نہ سمجھ کہ یہ بات اسکی بیوقوفی یا نالائقی کی وجہ سے ہے
در جاہلے بمنصب جاہے رسد مگوئی		کاں مال و منصب از مدد عقل و رائے اوست
یا اگر کوئی جاہل بلند مرتبہ پر پہنچ جائے تو یہ خیال نہ کر کہ اس میں اس کی عقلمندی کو کچھ دخل ہے۔

چوں کارہا بہ جہد میسر نمی شود		آں زیبد از کسی کہ خردہ نمائے اوست
جب کوشش سے کچھ نہیں ہوتا تو بہتر یہی ہے کہ عقل سے کام لو۔
کز کار نیک و بد نشود شاد و مضطرب		داند کہ ہرچہ ہست بحکم خدائے اوست
نیک بد سے پریشان نہ ہو۔ یہ سمجھ کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔

۷۔ دستِ تمنا کو دراز نہ کرنے میں عزت ہے:۔
بر ہر کہ عطا پاشی باشی تو امیر او		وز ہر کہ عطا جستی گشتی تو اسیر او
تو جس کسی پر احسان کرے گا اس کا سردار بن جائیگا اور اگر کسی کا احسان لیگا تو اس کا اسیر ہو جائے گا۔
وانکس کہ نیاز خود بردی نکنی عرضہ		گر شاہِ جہاں باشد باشی تو نظیر او
اگر تو اپنی حاجت کسی کے آگے پیش نہ کرے تو پھر تو روئے زمین کے بادشاہ کے برابر ہے۔

۸۔ عالی ہمتی انسان کو سرخرو بناتی ہے:۔
ہر چند روزگار کند پست مرد را		از ہمتِ بلند نشاید بکاستن
تجھے زمانہ کتنا ہی گرا دے لیکن ہمت بلند کو ہاتھ سے نہ دے۔
رزقت چو از خزانۂ خالق مقدر ہست		دوں ہمتی بود زدرِ خلق خواستن
جب تیرا رزق خدا کے خزانہ سے مقرر ہے تو پھر اسکے لئے در در پھرنا پست ہمتی ہے
بنشیں بعزت از پئے کارے و صبر کن		تا پیشِ کس نبایدت از پائے خاستن
عزت سے ایک جگہ بیٹھ اور صبر سے کام لے تاکہ تجھے کسی کے سامنے کھڑا نہ ہونا پڑے۔

۹۔ خودداری سے کام لو۔ لیکن خواہ مخواہ دوسروں سے نہ لڑو:۔
مرد باید کہ ہر کجا باشد		عزتِ خویشتن نگہ دارد
آدمی کو چاہیئے کہ جہاں کہیں ہو، اپنی عزت کا خیال رکھے
خودپسندی و ابلہی نکند		ہرچہ کبر و نیست بگذارد
بیوقوفی اور خودستائی کی تمام حرکتیں چھوڑ دے
بطریقے رود کہ مردم را		سرِ موئی ز خود نیازارد
ایسی چال چلے کہ جس سے کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہ پہنچے
ہمہ کس را ز خویش بہ داند		ہیچ کس را حقیر نشمارد
ہر ایک کو اپنے سے اچھا جانے کسی کو اپنے سے حقیر نہ سمجھے
سر و زر در طلب نہد آنگہ		تا مگر دوستے بدست آرد
ہر وقت جان و مال کی قربانی کے لئے تیار رہے شاید اس طرح کوئی سچا دوست اسے مل جائے۔

۱۰۔ صبر و قناعت سے زندگی بسر کرو۔ اور حرص و آز کا دامن سکیڑ لو:۔
ہرگز نہ لایق است ز بہر دو روزہ عمر		مغرورِ جاہ و نعمتِ دنیا شود کسی
دو دن کی زندگی کے لئے دنیا کی نعمتوں پر اکڑنا ٹھیک نہیں
یا از برائے یک شکم نانِ نیم سیر		گردد رہینِ منت، انعام ہر خسی
نہ ہی یہ مناسب ہے کہ دو روٹیوں کی خاطر کسی بیوقوف کا احسان مول لیا جائے
آزاد باش و فارغ و قانع ز بہر آنکہ		دل در خدائی بند و مجو آرزو بسی
آزاد و قانع بن کر زندگی گذار اور خدا کے سوا کسی سے دل نہ لگا۔

۱۱۔ روپیہ جمع کرنے کا صحیح مقصد کیا ہے؟:۔
از برائے دو چیز جوید و بس		مرد عاقل جہانِ پُر فن را
انسان دو باتوں کے لئے روپیہ جمع کرتا ہے
یا از و سر بلند گردد دوست		یا کند پایمال دشمن را
یا تو اس لئے کہ دوستوں کو نوازے یا اس لئے کہ دشمنوں کو گرائے
وآنکہ می جوید و نمی داند		کہ غرض چیست مال جُستن را
لیکن جو روپیہ تو جمع کرے لیکن یہ نہ جانے کہ اس کا ہوگا کیا
چیدہ باشد بسکنت خوشہ		دادہ زاں پس بباد خرمن را
وہ بیوقوف ذلت کے ساتھ خوشے چنتا ہے اور پھر خرمن کو بربادی کیلئے چھوڑ جاتا ہے

۱۲۔ زندگی کی حقیقی لذت یہ ہے کہ انسان آزاد رہے اور کھیتی کرے:۔
گر ترا گنج سیم و زر باید		من بگویم کہ چیست تدبیرش
اگر تو سونے چاندی کا خزانہ چاہتا ہے تو آمیں تجھے بتا دوں
دہقنت پیشہ گیر و قانع شو		تا بہ بینی کہ چیست تاثیرش
کھیتی باڑی کر اور خدا پر قانع رہ۔ پھر دیکھ اس کی برکتیں

۱۳۔ امیروں اور مالداروں کی خدمت میں ہاتھ باندھے کھڑے رہنے سے کاشتکاری کر کے آزادی سے زندگی بسر کرنا بدرجہا بہتر ہے:۔
ز قطع راہ دراز امل غنی نہ شوی		بر آستانِ قناعت مگر مقام کنی
امید و آرزو کی لمبی دنیا میں بسنے سے تو غنی نہیں ہو سکتا۔ اسکا طریقہ صرف قناعت ہے۔
یکی دو گاؤ بدست آوری و مزرعہ		یکی امیر و دگر را وزیر نام کنی
دو بیل پال لے۔ ایک کا نام امیر رکھ اور دوسرے کا وزیر۔
و گر کفاف معیشت بنا شدت زاں نیز		روی و نانِ جوی از جہود وام کنی
اور اگر تیرا گذارہ اس سے بھی نہ چلے تو جا اور کسی یہودی سے جو کی روٹی قرض لے
ہزار بار ازاں بہ کہ بامداد پگاہ		کمر بہ بندی و بر چوں خودی سلام کنی
یہ سب کام اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں کہ صبح شام کمر باندھ کر اپنے جیسے کسی آدمی کو سلام کرے۔

۱۴۔ کاشتکاری سے انسان کو عزت و آزادی حاصل ہوتی ہے:۔
پادشاہی نزدِ اہل معرفت آزادگی ست		ہر کہ بند آرزو بکشاد از دل پادشاست
جاننے والوں کے نزدیک آزادی ہی بادشاہی ہے۔ جس کسی نے آیندہ کا غم چھوڑ دیا بس وہی بادشاہ ہے۔
رہ بمعنی بر کہ در صورت بہم مانند و نے		از یکی ریزد شکر واں یک بہر بوریاست
حقیقت کو پانے کی کوشش کر ورنہ یوں دیکھنے میں تو بانس اور گنے دونوں کی شکلیں ایک سی ہیں لیکن ایک سے شکر نکلتی ہے اور دوسرے سے صرف چٹائی بنی جاتی ہے۔
کنج عزلت گیر و دہقانی کن ای ابن یمین		تا بدانی کانچہ میکاریش رشد و نماست
ابن یمین! سب سے قطع تعلق کر کے کھیتی کا کام شروع کر تاکہ تجھے معلوم ہو کہ تیرا بویا ہوا کیا رنگ لاتا ہے۔

۱۵۔ دست سوال دراز کرنے والے کی عزت نہیں ہوتی، چاہے وہ کتنا ہی عالم فاضل ہو:۔
مردِ آزادہ درمیان گروہ		گرچہ خوشخو و عاقل و داناست
کوئی آدمی چاہے کتنا ہی خوش اخلاق اور عقلمند ہو۔
محترم آنگہی تواند بود		کہ از ایشاں بپالش استغناست
باعزت اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔
وانکہ محتاجِ خلق شد خوار است		گرچہ در علم بو علی سیناست
اور جس نے خلق کے آگے ہاتھ پھیلا دیا، وہ ذلیل ہے۔ خواہ علم و فضل میں بو علی سینا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۶۔ سادہ زندگی بسر کرنے میں بڑا لطف ہے:۔
کنجے و ہمدمے و کتابے و خوردۂ		از بہرِ ذوقِ نفس ز تاج و سریر بہ
ایک چھوٹا سا جھونپڑا، ایک رفیق زندگی، ایک کتاب اور معمولی وجہ معاش۔ یہ باتیں تاج و تخت سے بہتر ہیں۔
از بہرِ ستر عورت جامے و خرقۂ		از اطلسِ مُذہب و شعر حریر بہ
ضرورت کے مطابق تھوڑا سا کپڑا ریشم و زربفت سے بہتر ہے
از بہرِ دفع تشنگی از پارۂ سفال		آب مباحِ سرد ز جام عصیر بہ
پانی پینے کے لئے مٹی کا ایک پیالہ جس میں ٹھنڈا پانی پیا جائے چھلکتے ہوئے جام شراب سے بہتر ہے۔
حلوا و مرغ و تُرّہ اگر نیست گو مباش		صحت چو ہست از بہ نانِ فطیر بہ
اگر حلوے اور مرغن کھانے نہیں ہیں تو نہ سہی۔ اگر صحت ہو تو نان سب سے خمیری روٹی اچھی۔
وجہ کفاف اگر بکف آید ز دہقنت		نزد خرد ز خدمت شاہ و وزیر بہ
اگر تجھے کاشتکاری سے روٹی مل سکے تو عقل کی رو سے یہ بات شاہ و وزیر کی خدمت سے بہتر ہے۔

۱۷۔ شاعر کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی پورا پورا احساس ہے چنانچہ وہ خدائے ارحم الرحمین سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے:۔
ایزدا مستحقِ عفو توام		زانکہ من بندہ را گنا بسی است
اے خدا میں تیرے رحم کا مستحق ہوں کیونکہ میرے گناہ بیشمار ہیں
چو تو خود را عفو ہمے خوانی		پس بریں قول بلی خلاف بایست
چونکہ تو خود کو معاف کرنیوالا کہتا ہے اسلئے میرے گناہ بخشدے
عفو کردن پس از گناہ بود		بے گنہ را بہ عفو حاجت نیست
معاف کرنا تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی گناہ کرے۔ ورنہ بیگناہوں کو معافی کی کیا حاجت؟

"بات گئی"

از ابوالاعجاز سیف اکبرآبادی

اُن سے اُمید التفات گئی
وہ توقع گئی وہ بات گئی
دامن اس طرح اُن کا چھوٹ گیا
ہاتھ سے جیسے کائنات گئی
دلِ بیتاب اب تو سونے دے
دیکھ کمبخت کتنی رات گئی
جذبِ جلوہ میں ہو گیا اے سیفؔ
اب وہ فکرِ تخلیات گئی

"لینن"

عملی سوشلزم کا پہلا پیغمبر

(از جناب شیخ حبیب اللہ صاحب۔ اڑیسہ)

آج سے بیس سال قبل، اکتوبر کے مہینہ میں دنیا کے تمام انقلابوں کا سرتاج انقلاب، روس میں رونما ہوا۔ زار کا خاتمہ ہوا اور "سفید" روس "سرخ" ہوگیا۔ بھدی ٹوپی والے پست قد لینن نے غیر ممکن کو ممکن کر دکھایا۔ مارکس نے جن خیالات کو خیالی دنیا میں محدود رکھا تھا لینن نے انھیں میدان عمل کی جیتی جاگتی شکلیں بنا کر رکھدیا۔

لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا۔ یہ پیدائش مارکس اور بسمارک کی موت کے تقریباً نصف صدی بعد وقوع پذیر ہوئی۔ لینن غریب آدمی کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ اسکول کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ لینن ابھی بچہ ہی تھا کہ زار الیگزنڈر ثانی قتل کردیا گیا۔

نوخیز لینن بچپن ہی سے آزاد خیالی کا دلدادہ تھا۔ اس کا بڑا بھائی اس کا استاد بلکہ اس کے لئے نمونۂ زندگی تھا۔ اس کا بھائی پیدائشی انقلابی تھا اور وہی پہلا شخص ہے جس نے ہیگل اور مارکس کی تصنیفوں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس طرح لینن نے عہد طفلی ہی میں ان مصنفوں کی کتابوں سے تعارف بہم پہنچا لیا تھا۔ الگزنڈر ثانی کے قتل کے چھ سال بعد لینن کے بھائی نے نئے زار کے قتل کے لئے سازش کی بنا ڈالی۔ لیکن ٹھیک اس دن جب سازش مکمل ہونے والی تھی وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرفتار ہوا اور پھر اُسے قتل کردیا گیا۔

لینن کی عمر اب سترہ برس تھی۔ بھائی کی موت نے اُسے نقش حرماں بنا دیا۔ لیکن اس نے اس حادثہ سے ایک زبردست سبق حاصل کیا۔ لینن نے مارکس کی تصنیفوں میں وہ ذہانت وذکاوت کی قوت محسوس کی جس سے فتحیابی ایسی یقینی ہوجاتی ہے جو بم کے گولوں سے بھی ناممکن ہے۔ اس کے بھائی کا ایک ہی دشمن تھا اور اس کا نام تھا حکومت۔ مگر لینن کے لئے حکومت کے ماسوا ایک اور دشمن بھی پیدا ہوچکا تھا اور وہ برگونسی جماعت تھی جس کی شاہ پسند پالیسی اس کے لئے سوہان روح ہورہی تھی۔

یونیورسٹی کازان میں لینن قانون کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس کے خیالات کی کافی شہرت ہوچکی تھی اور اس کی ہمدردیوں سے دنیا واقف ہوگئی تھی۔ اس کی یہ باتیں یونیورسٹی کازان سے اُس کے اخراج کا باعث ہوئیں۔ اُسے شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور اس کی نقل و حرکت کی نگرانی ہونے لگی۔ پولیس اب اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

جرمنی میں سوشلسٹوں کی سرگرمی اور پھر وہاں مزدور یونین کا قیام یہ باتیں لینن اور اُس کے ہمراہیوں کے لئے بڑی ہمت افزا ثابت ہوئیں اور وہ لوگ بھی روس میں وہی تحریکیں شروع کرنے کی سعی کرنے لگے۔ کارخانوں میں اسٹرائک کی تیاری کی گئی مگر اسے بزور دبا دیا گیا اور لینن کو تین برس کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کردیا گیا۔

مگر روکھا پھیکا سائبیریا بھی لینن کی تحریک کے لئے ایک پرفضا میدان عمل ثابت ہوا۔ اتفاق سے یہاں اُسے ایسے آدمی ملے جو وہی باتیں سوچا کرتے تھے جنھیں وہ عملی جامہ پہنا رہا تھا خصوصاً مارٹوف تو اُسکا بالکل ہم خیال تھا چنانچہ اُسکی صحبت میں وہ مستقبل کے لئے نظام تیار کرنے لگا۔ سائبیریا ہی میں اُس نے اپنے تجویز کردہ مسائل کا حل دریافت کیا اور اپنی پہلی کتاب "نوبلن" کو طبع کرایا۔

جب وہ جلاوطنی سے واپس آیا تو اس کے خیالات پہلے سے زیادہ بلند وپاکیزہ تھے اور وہ اپنے کاموں میں بہت محتاط تھا۔ لینن اپنے قید کے زمانے کے ہمنواؤں کی صحبت سے محروم ہوچکا تھا مگر اُسے اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔

سوویٹ کاؤنسل کی تشکیل

اکتوبر ۱۹۰۵ء کی اسٹرائک انقلاب پذیر ثابت ہوئی۔ اس کے فوراً بعد سوویٹ کاؤنسل کی بنا ڈالی گئی لیکن لینن کو پھر فرار ہونا پڑا اور یہ تیسری فراری تھی۔ وہ فن لینڈ کی طرف بھاگا مگر پکڑ لیا گیا لیکن وہ پھر کسی طرح نکل بھاگا۔ پیرس پہنچا اور آخر کار کراکو میں جاکر دم لیا۔

جنگ عظیم نے عجیب عجیب باتیں پیدا کردیں۔ لال جھنڈے کو لوگ بھولنے لگے اور قومی جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ سوشلسٹ تحریک ماند پڑنے لگی اور اشتراکی لیڈر بد دل ہونے لگے۔ مگر لینن اپنے چند ہمراہیوں کی معیت میں ہمت وعزم کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا اور ناامیدی کو پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اس نے حب الوطنی کی تحریک کی دھجیاں اڑادیں اور جرمن مخالفت کی بجد مذمت کی اور دسمبر ۱۹۱۴ء میں "پیغام عمل" کے نام سے ایک پروگرام پیش کیا۔

تیرہ مہینے تک وہ زوریچ میں ان خیالات پر خاموشی سے غور کرتا رہا۔ اس کے پاس روپیہ کی قلت تھی اور اثر ورسوخ بھی اتنا نہ تھا کہ لوگ اس کی باتوں پر آمنّا وصدقنا کہتے۔ بایں ہمہ وہ تیاری کررہا تھا اور رضاکارانہ طور پر ایڈوانس گارڈ جمع کررہا تھا حتیٰ کہ فروری کی ۱۷ تاریخ کو اسے یہ امید افزا خبر ملی کہ زار کا خاتمہ ہوگیا۔

روس کو واپسی

فینلینس اسٹیشن پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ واپس ہونے والے جلاوطن کا خیر مقدم ایک نجات دہندہ کی طرح کیا گیا۔ اسٹیشن پر زار کے استقبالی کمرے میں لینن کے مخالف نے اس کا خیر مقدم ان الفاظ میں کیا: "لینن انقلاب تم کو مبارکباد پیش کرتا ہے"

لینن کا موٹر آہستہ آہستہ بھیڑ کے اندر سے گذر رہا تھا۔ لینن لوگوں کو نہایت معمولی جملوں سے مخاطب کرتا تھا۔ لیکن یہ پہلا دن تھا کہ لوگوں نے اُسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ غور وفکر کے بادل اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ تدبر، انجام بینی اور پُرمغز خاموشی کے ساتھ وہ کامیابی اور سُرخروئی کا خواب دیکھ رہا تھا۔

آتے ہی اس نے "پراودا" میں اپنے پروگرام کو نشر کردیا۔ سپاہیوں سے محبت، تمام فتوحات کی مذمت، سوویٹ کے کام کرنے والوں اور کسانوں کو پوری قوت کا عطیہ، اس حکومت کی مخالفت جو جنگ کو جاری رکھنا چاہتی تھی۔ تمام جائداد کو اشتراکی نظام میں مدغم کرنا ساہوکارہ یعنی بینک کا استحکام، خورد ونوش کی تمام اشیاء پر قبضہ حاصل کرنا اور پھر ایک نئی قوم اور نئے نظام کی تشکیل —— یہ تھا اسکے پروگرام کا خلاصہ!

حکومت قصر سلطانی میں ناک بھوں چڑھا رہی تھی کہ دشمن سینہ پر سوار ہورہا ہے۔ مزدوروں کی کانگریس میں ۸۰۰ ڈیلیگیٹ (نمایندے) "کرینسکی" جواب پر خاموش تھے۔ اُس نے لینن سے کہا "تم اگر چاہتے ہو کہ میں آمر مطلق (ڈکٹیٹر) ہوجاؤں تو یہ غلط خیال ہے" لینن بیٹھا یہ غور کررہا تھا کہ کون آمر (ڈکٹیٹر) ہوگا۔

اس کانگریس کے بعد جس میں وہ اقلیت کے ساتھ رہ چکا تھا اُسے ماہ جولائی میں پھر روپوش ہونا پڑا۔ وہ پھر بارہ سال پہلے کی طرح فن لینڈ کو بھاگ گیا اور یہ بات پیٹروگراڈ میں آنے کے تین ماہ بعد وقوع پذیر ہوئی۔ لیکن موسم بہار میں وہ مصنوعی پاس لے کر پھر نمودار ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ہم عصر ٹراٹسکی اوج کمال پر ہے۔ پارٹی مضبوط تھی اور کسان آسودگی وامن کے متمنی کیونکہ کرنسکی حملہ کی تیاری کررہا تھا۔

یہ حال دیکھ کر اس نے بھیس بدلدیا۔ ڈاڑھی صاف کردی اور سر پر مصنوعی بال پہن لئے تاکہ پہچانا نہ جاسکے۔ اس حالت میں وہ اندرونی معاملات میں حصہ لینے لگا اور اس نے اپنے ہمراہیوں کو خوب اکسایا اور ۲۴ر اکتوبر کے تاریخی انقلاب کے لئے محاذ تیار کرنے میں منہمک ہوگیا۔

اس زمانہ میں جبکہ لینن کا بول بالا تھا وہ قریب قریب آمر مطلق بن چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک زبردست سیاست داں بھی ثابت ہوا۔ لیکن اس کے ہمعصروں کی اکثریت اس کی پالیسی کے بالکل خلاف تھی۔ مگر وہ سب طرف سے آنکھ بند کرکے اپنے کام میں مصروف تھا۔

لینن ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ ثابت کردیا کہ ایک مدبّر اپنے مخالفوں کی چال بازیوں پر غلبہ پاکر انھیں سرنگوں کرسکتا ہے۔ ملک کی بہتری کے لئے اس نے جرمن اور فرانسیسی ماہروں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ بچپن ہی سے یہ سوچتا تھا کہ سارے روس کو ترقی یافتہ کردیا جائے اور وہ اس کی طرف دل وجان سے لگ گیا۔

سامراجی حکومت کا تو وہ سخت دشمن تھا ہی اس لئے اس نے امارت پسندی کے اصولوں کو زور شور سے توڑنا شروع کیا تاکہ عام لوگ غربت وافلاس کی زندگی سے نجات پاجائیں۔

ایک روز یعنی آمریت کے تین سال بعد جبکہ وہ سڑک پر جارہا تھا تو ایک عورت نے اُسے گولی ماردی۔ وہ کریملین میں موت کا انتظار کررہا تھا، اُٹھنے بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔ اُس کے دوستوں نے اعلان کردیا کہ لینن اب بیکار ہوچکا ہے۔

وہ شخص جو مجسم بجلی، حرکت اور جدوجہد تھا اب بستر مرگ پر مفلوج پڑا تھا۔ سترہ سال کی عمر سے پینتالیس تک، تیس سال کی آوارہ گردی جلاوطنی، فراری، اندرونی وبیرونی جنگ کے بعد یکایک سرخرو اور کامیاب ہوتا ہے پھر تین سال تک ملک وقوم کی شاندار خدمات انجام دیتا ہے اور متحدہ مخالف قوتوں کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ پچاس سال کی عمر میں گولی کا نشانہ بنتا ہے اور اپنی قوت، زندگی اور تگ ودو سے محروم ہوجاتا ہے!

مگر لینن اپنے مشن کو پورا کرچکا تھا۔ اس نے پہلے غلامی کی زنجیروں کو کاٹا اور پھر سرمایہ پرستی کی کشتی کو ڈبویا۔ یہ کیا کم بات ہے کہ ایک ہستی تن تنہا اپنے ذوق یقین کے جوش میں انقلاب برپا کردیتی ہے اور پھر نوع انسانی کو لعنت وخباثت سے نکالکر خوش وخرم کردیتی ہے۔

مگر یہ بات کب پیدا ہوتی ہے؟ اُسی وقت جب آدمی میں اپنے

مقصد کی پاکیزگی کا پل یقین اور پکا ایمان ہو:۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

لینن کی خفیہ زندگی

لینن بھیس تبدیل کرنے میں بڑا ماہر تھا۔ کوئی بھی بھیس یا شکل ایسی نہ ہوگی جو اس نے اختیار نہ کی ہو۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ جس ملک میں اور جن لوگوں میں رہنا ہو انہیں جیسی زندگی بسر کی جادے۔ پولیس کی نظروں سے بچا رہنا بھی بھیس تبدیل کرنے کا مقصد تھا۔ کامریڈ لینن جیسے قوی ہیکل، بہادر، اور خوبصورت نوجوان کو ہر ملک کی پولیس تنگ کرسکتی تھی۔ مگر اس نے ایسے ایسے بھیس بدلے ہیں اور ایسی ایسی شکلیں تبدیل کی ہیں کہ پولیس بھی حیران رہ گئی۔

کبھی روسی، کبھی جرمنی، کبھی فرانسیسی اور کبھی انگریزی لبادے میں ملبوس ہوکر انہیں جیسی شکل بنا لیتا تھا۔ آج واڑھی لمبی ہے تو کل کرزن فیشن۔ کبھی داڑھی مونچھیں سب صاف۔ کارخانوں کا دورہ کرتے وقت مزدور ہے، دیہات میں کسان ہے اور شہر میں سوداگر بنجاتا ہے۔ ان تمام شکلوں اور پوشاک کی تبدیلیوں کے باوجود بھی وہ ایک مصمم انقلابی تھا۔ اس بہادر انقلاب پسند نوجوان نے اپنا نام بھی ہزارہا مرتبہ تبدیل کیا۔ انقلابیوں کو اپنی جماعت میں بھی جھوٹے نام بتلانے ہوتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کون پولیس کا آدمی ہے؟

لینن کی خفیہ زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً پچیس سال تک اس کے گہرے رفیقوں کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کا نام "بلیڈ میر ایلچ اولینو" تھا۔ جب وہ فروری ۱۹۱۷ء میں روس میں پہنچا تو اسوقت بھی اکے رفیقوں کو اسکے اصلی نام کا پتہ نہ تھا۔ مگر اسی سال کے اکتوبر کے مہینے میں جب بالشویک انقلاب ہوا تب اس کے اصلی نام کا پتہ چلا۔

لینن اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جب طلبا میں کام کرتا تھا تب بھی اس نے کئی دفعہ نام تبدیل کئے۔ بہت سے لوگ اسے نکولاس پٹروویچ کے نام سے جانتے تھے، اور بہت سے اصحاب اسٹاری کارپوپ کے نام سے۔ اس کے دیگر نام ٹولن۔ سنیلوف وغیرہ ہیں۔

جب کبھی اسے مجبوریوں کے باعث غیر ممالک میں جانا ہوتا تھا تو بناوٹی پاسپورٹ سے کام لیتا تھا۔ مگر ہر دفعہ اپنا نام اور حلیہ بالکل تبدیل کرلیتا تھا۔ ان تمام ہوشیاریوں اور چالاکیوں کے باوجود بھی اسکو دو مرتبہ گرفتار ہونا پڑا۔

کامریڈ کریشوف اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ:۔

۱۸۹۷ء میں میری دادی انتقال کرگئی۔ میں نے اپنے دوستوں سے صلاح کی کہ کسی طرح جلد از جلد گھر واپس جانا چاہیئے تاکہ اپنی دولت پر قبضہ کرسکوں۔ دولت پر قبضہ کرنے کا سوال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ میری دادی ساری دولت مرتے وقت میرے نام کرگئی تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ وطن کس طرح جانا چاہیئے۔ میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں دی۔ آئیؔ اولینو وکیل سے صلاح لینے جاؤں۔ دوستوں نے تاکید کی کہ اس کا پتہ زبانی یاد رکھا جائے، لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تلاش کرتا ہوا کزاق سڑک پر پہنچا، اور نمبر ۱۳ مکان کی گھنٹی بجائی۔ گھر کی مالکہ نے دروازہ کھولکر کہا کہ "اولینو ابھی واپس نہیں آیا۔ آپ ذرا دیر صبر کیجیئے، وہ آنے والے ہی ہیں"۔ یہ کہکر وہ مجھے اندر لے گئی اور گفتگو شروع کی۔ کمرہ چھوٹا سا تھا صرف دو دروازے اور دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک طرف لوہے کی ایک چھوٹی سی چارپائی پڑی تھی۔ ایک طرف پرانی میز اور تین ٹوٹی پھوٹی کرسیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر میں نے پوچھا کہ اس طرح کا غریب یہ کونسا وکیل ہے؟ کیا اسکو کوئی آمدنی نہیں ہوتی؟ اتنے میں گھنٹی کی آواز آئی دروازہ کھولا گیا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا ایک نوجوان اندر آیا۔ سر پر کالا ٹوپ اور گلے میں لمبا کوٹ۔ درمیانہ قد، رنگ گورا، مسکراتا ہوا چہرہ، پیشانی چوڑی، آنکھیں موٹی، بھرا ہوا سڈول بدن اور چال مستانی۔ وہ کمرے میں آتے ہی بولا

"اُف آپ تو بہت دیر سے میرے انتظار میں ہونگے"

میں نے جواب دیا "جی ہاں"

اتنے میں لمبا کوٹ اتار کر اپنی پوشاک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

"براہ کرم ایک منٹ ٹھیریئے میں کپڑے بدل کر حاضر ہوتا ہوں"

میں نے اس کی ہوشیاری دیکھ کر اندازہ کیا کہ یہ تو نکولاس پٹروویچ ہے۔ میں نے بلا تکلف پوچھا "بھائی! آپ تو نکولاس پٹروویچ ہیں۔ مجھے میرے دوستوں نے اولینو نامی وکیل کے پاس مشورہ کے لئے بھیجا ہے"

میرا یہ سوال سنکر وہ حیران ہوگیا اور گرج کر بولا۔

"چپ رہو۔ تم بڑے تاڑنے والے ہو۔ میرا ہی نام اولینو ہے۔ باہر جاکر کسی کو نہ بتانا کہ میں نکولاس پٹروویچ سے ملا ہوں"

لیکن اس کے باوجود اسی دن سے اس نے اپنی جائے قیام تبدیل کرلی۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بہادر لینن نے اپنی خفیہ زندگی کس طرح بسر کی۔

لینن کی بیوی کرولپکایا نے اپنی ڈائری میں جو حالات درج کئے ہیں وہ بھی لینن کی خفیہ زندگی پر واضح روشنی ڈالتے ہیں، اور حیران کردیتے ہیں۔ اس وقت وہ میونخ میں قیام پذیر تھا۔ وہاں سے اوکرانا نامی اخبار شائع کرتا تھا۔ یہ عورت لکھتی ہے:۔

میں لینن سے کئی ضروری کاموں کی وجہ سے ملاقات کرنا چاہتی تھی مگر بہت کھوج کرنے سے بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ شہر تک بھی معلوم نہ ہوسکا۔ میں ناامید ہوکر شکوک سے بھری ہوئی پراگ پہنچی۔ تب سراغ ملا کہ وہ یہاں مودرالتیک نام سے رہتے ہیں۔ تلاش کرتے ہوئے میں ایک چار منزلہ مکان پر پہنچی۔ آواز دینے پر ایک سفید پوشاک والی چیک عورت نے دروازہ کھولا۔ اس سے میں نے درخواست کی کہ میں ہر مودرالتیک سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ اندر سے ایک مزدور میری طرف آیا۔ اور نرم آواز سے بولا:۔

"ہر مودرالتیک میں ہی ہوں۔ تبلایئے کیا کام ہے؟"

میرے ہوش باختہ ہوگئے میں نے سہم کر کہا "نہیں! نہیں! آپ کو نہیں میں تو اپنے خاوند کی تلاش میں آئی ہوں"

"اف شاید آپ ہر رٹماٹر کی بیوی ہیں جواب میونخ میں رہتے ہیں انہیں دنوں میں وہ آپ کو میری معرفت کتابیں اور اخبار بھیجینگے۔ پھر ملنا"

میں دن بھر وہیں رہی۔ میں نے اس کو روسی جمہوری پارٹی کی بابت بہت سی باتیں بتائیں اور اس نے مجھے آسٹریلیا کی شورش کا حال سنایا۔ شام کو میونخ کی طرف چلی گئی۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ سب لوگ ٹھنڈی پوشاک پہنے ہوئے ہیں، اور میں گرم کپڑوں میں ملبوس تھی۔ خیر! میں نے اپنا نام سامان اسٹیشن ماسٹر کے سپرد کردیا اور ہر رٹماٹر کی تلاش میں ٹریم گاڑی پر سوار ہوئی۔ جو مکان ملا وہ شراب خانہ تھا۔ میں نے مالک مکان کے پاس جاکر ہر رٹماٹر کا پتہ دریافت کیا۔ اس وقت مجھے اول تو ہر رٹماٹر (لینن) سے ہی ملنے کی کوئی امید نہ رہی تھی، دوسرے مالک مکان نے الٹا مجھ ہی سے یہ سوال کردیا۔

"کیا کام ہے؟ میں ہی ہر رٹماٹر ہوں" میں حیران پریشان رہ گئی۔ جواب دیا "نہیں جناب میں تو اپنے خاوند کی تلاش میں ہوں"

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف تاکنے لگے۔ ہم دونوں کے منہ سے کوئی کلمہ نہ نکلا۔ اسی آفت میں مبتلا تھے کہ ہر رٹماٹر کی عورت آگئی اور اس نے میری طرف بغور دیکھ کر کہا

"اوہو! ٹھیک! یہ تو ہر رٹماٹر کی بیوی ہے جو روس سے آنیوالی تھی۔ وہ بھی کئی روز سے اس کا انتظار کررہا ہے"

یہ سنکر مجھے کچھ امید ہوئی کہ شاید میں اب لینن سے مل سکوں۔ پھر سوچتی تھی کہ شاید یہ حضرت ہر رٹماٹر بھی کوئی اور ہی ہوں اور فضول پریشان ہونا پڑے۔ میں ابھی اسی کشمکش میں تھی کہ وہ عورت بولی:۔

"اچھا آؤ میں آپ کو پہنچا دوں"

میں خاموش ہوکر فراؤ رٹماٹر کے پیچھے چل پڑی۔ آخر وہ مجھے ایک عالیشان محل میں لے گئی۔ یہ مکان سارا خالی معلوم ہوتا تھا، مگر جس دروازہ کے سامنے ہم جاکر کھڑے ہوئے اس نے اسکی گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک عورت آئی جس کو میں پہچاننے کی کوشش کررہی تھی اور ایک مرد جس کو میں بالکل نہ پہچان سکی، میرے پاس آئے۔ اور حال پوچھا۔ مگر میں تصویر کی طرح چپ چاپ کھڑی رہی۔ تب وہ آدمی بولا۔

"کیا آپ اب تک مجھے نہیں پہچان سکیں؟"

میں پھر بت کی طرح اپنی غلطی اور بیوقوفی پر افسوس کرنے لگی کہ میں نے کیوں انجان آدمی سے ملکر فضول وقت برباد کیا۔ مجھے اس طرح متفکر دیکھ کر پھر بولا

"میں بلیڈ میر ایلچ ہوں، اور یہ میری بہن ہے۔ اب تو فرمایئے"

یہ سنکر میں غصہ میں اپنے رہبر کا شکریہ ادا کرنا تو بھول گئی اور اس (لینن) پر غصہ ہو پڑی

"کمبخت! تمہارا ستیاناس ہو! شرم کرو۔ مجھے اپنے ٹھکانے کے دو حروف خط پر لکھ کر بھیج دیتے تو کیا آفت آجاتی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے تمہیں تلاش کرنے میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں"

یہ سنکر اس نے قہقہہ لگایا اور خاموشی سے بولا۔

"گھبراتی کیوں ہو؟ تمہیں اس سے بھی بلند کام دینے ہیں"

اب ہم کرولپکایا کی ڈائری میں سے کچھ اور باتیں پیش کرتے ہیں وہ لکھتی ہے:۔

۱۹۰۵ء میں جب کامریڈ لینن روس میں آیا تو وہ ہتھیار بند انقلاب کی تیاریوں میں سرگرم ہوگیا۔ کسی نہ کسی طرح حکومت کو بھی یہ راز معلوم ہوگیا کہ لینن ماسکو شہر میں آیا ہے۔ وہاں کی پولیس نے لینن کی قیام گاہ کا پتہ کسی طرح لگالیا۔ اچھی طرح یہ سمجھ کر کہ وہ لینن اب مکان کے اندر ہے مسلح پولیس اور فوج نے مکان گھیر لیا۔ مگر ہشیار لینن ایک بوڑھے یہودی کا بھیس بنا کر ایکدم پٹروگریڈ (موجودہ لینن گراڈ) میں جا پہنچا۔ جب میں اس سے ملنے گئی تو وہ مکان بھی جس میں وہ رہتا تھا پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ لینن کو پولیس کے محاصرہ کی بابت کوئی علم نہ تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ پولیس نے مکان کا گھیراڈال رکھا ہے

تو وہ آہستہ سے بولا کہ "مجھے پکڑنے آئے ہوں گے؟ اچھا فکر نہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی ایک اچھی سی پوشاک پہنی، اور ہری عینک لگائی۔ اس کے بعد میں اور وہ بازو میں بازو ڈالکر اس طرح گاڑی پر سوار ہوئے گویا کوئی بڑا سوداگر سیر و تفریح کے لئے باہر جا رہا ہے۔ ہم جلد ہی روما نیو کے مکان پر جا پہنچے۔ دو ہفتہ تک لینن مکان سے باہر نہ گیا تاکہ پولیس کی سرگرمی کم ہو جائے۔ ایک زریں لباس والی نوجوان لڑکی کے ذریعہ ہم نے اپنا سارا سامان بھی منگوا لیا۔ اس لڑکی نے پولیس کو اپنے سب سامان کی فہرست بتلا دی۔ پولیس سرسری نگاہ سے دیکھ کر خالی ہاتھ چلی گئی۔ ایسا کرنے سے سامان بھی بچ گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ کامریڈ لینن کو خود اسٹالن بھی نہ پہچان سکا حالانکہ وہ اس کا پکا ساتھی اور ہر وقت ساتھ رہنے والا دوست تھا۔ فقط

(ترجمہ)

راسپوٹین

سرزمین روس کا ایک زاہد مکار

(از جناب شیخ حبیب اللہ صاحب۔ اڈیسہ)

گری گوری ناوک عرف راسپوٹین سے دنیا واقف ہو چکی ہے۔ شیطان تھا مگر روس میں ولی بنا ہوا تھا اور صاحب اقتدار بھی تھا۔ لوگوں پر اس کی گرفت زار سے بھی زیادہ تھی۔ وہ روس کا محافظ اور روحی رہبر مانا جاتا تھا۔ روس کے جاہل باشندے اُسے فقیر تصور کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس میں یزدانی قوت پنہاں تھی اور اُن کے لئے محیر العقول باتیں پیش کرنے کی طاقت تھی۔ لوگوں کی جہالت سے وہ خوب فائدہ اٹھاتا تھا اور اپنے متعلق عجیب و غریب باتیں پیش کیا کرتا تھا اور اس طرح وہ بہت جلد سارے روس کا بے تاج کا بادشاہ ہو گیا۔

فقیری اختیار کرتے وقت وہ عالم شباب میں تھا۔ اور جب وہ نام و نمود کے اعلیٰ ترین زینہ پر گامزن ہوا تو اس کی عمر صرف ۳۰ برس تھی۔ وہ بیحد غلیظ و کثیف رہتا تھا اور اسی لئے اس کی حالت بڑی طرفہ تھی۔ اپنی شکل و شباہت کی اُسے کوئی پرواہ نہ تھی اور اسی لئے وہ اپنے بالوں کو خوب بڑھنے دیا کرتا تھا۔ اس کا رنگ زردئی مائل تھا، گال دبے ہوئے اور آنکھیں بہت دھنسی ہوئیں۔ وہ کپڑے بہت کم تبدیل کرتا تھا اور یہ بات تو مشتبہ ہے کہ آیا اُس نے اپنی زندگی میں کبھی غسل بھی کیا تھا؟

با ایں ہمہ یہ بدصورت شخص تمام روس کو اپنے قبضہ میں رکھتا تھا۔ اعلیٰ طبقوں میں اس کی رسائی تھی حتیٰ کہ قصر سلطانی کے دروازے بھی اس کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی اس شخص نے اپنے ملک کے ساتھ غداری کی اور اُسے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کر دیا۔

راسپوٹین سائبیریا کا جاہل کسان تھا لیکن اُس میں عورتوں کو موہ لینے کی ایک زبردست کشش تھی، دربار شاہی کی عورتیں بھی اُس پر گرویدہ ہو جاتی تھیں۔ عورتوں ہی نے اس کی رفاقت کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ جہاں جاتا وہیں ہر دلعزیز اور بارسوخ ہو جاتا۔ بدچلنی اور گھوڑا چوری کرنے کے جرم میں اُسے جیل خانے کی ہوا بھی کھانی پڑی تاہم اس کی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتا اپنے رنگین کشف و کرامات کے قصوں سے لوگوں کو مسحور کر دیتا اور لوگ اس کے زیر فرمان ہو جاتے۔ اس کی بدچلنی کے ثبوت کے باوجود لوگ اس کے غلام بنے رہتے تھے۔

نیا مذہب

راسپوٹین نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا اور اُس کی ہفتہ وار مجالس میں پیٹروگراڈ وغیرہ دور دراز مقامات سے قابل و دانا اور متمول عورتیں جوق جوق آیا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ "یہ گھوڑا چور" مرد پیغمبر سمجھا جانے لگا جسے روس کا محافظ ہو کر مبعوث کیا گیا ہو۔ وہ اتنا ہر دلعزیز و مشہور ہو گیا کہ اس کا تعارف دربار شاہی میں کرایا گیا اور اس کی ہاتھ کی صفائیاں یا نظر بندیاں معجزات سمجھی جانے لگیں۔ واقعی اس کی شخصیت ایسی ہو گئی کہ وہ جہاں جاتا عورتیں اس پر پروانہ وار گرتیں۔ سڑکوں پر انبوہ در انبوہ ٹوٹی پڑتیں کہ اس کے ہاتھوں کا بوسہ لیں اور اس کی دعاؤں سے مستفیض ہوں۔ اور یہ ناشائستہ، جاہل اور غلیظ کسان ان پر یزدانی دعائیں برسانے لگتا۔

راسپوٹین نے ملکہ زار کو بھی اپنی جھوٹی کرامت کے زور سے اپنا معتقد بنا لیا اور اس کرامت کی قلعی اس وقت کھلی جبکہ اس کی ہڈیاں خاک میں مل چکی تھیں۔ قصہ یہ ہوا کہ جب راسپوٹین کو بلایا گیا اس وقت ملکہ کا لڑکا اور ولیعہد بیمار تھا جس دن راسپوٹین آیا اُس دن بچہ کچھ اچھا تھا۔ لیکن راسپوٹین نے پیشین گوئی کی کہ لڑکے کی حالت نازک ترین ہو جائے گی اور واقعی ہوا بھی ایسا ہی۔ راسپوٹین کو پھر بلایا گیا اور اس نے اس مرتبہ یہ کہا کہ بچہ فوراً اچھا ہو جائے گا، یہ بھی سچ ہوا۔ راسپوٹین بچہ پر بہت کچھ پڑھ کر دم کیا کرتا تھا اور بہت کچھ بڑبڑاتا بھی تھا اور اسی لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ راسپوٹین ہی کا اثر ہے کہ بچہ رو بہ صحت ہو گیا۔ بہر کیف راسپوٹین کی موت کے بعد یہ راز فاش ہوا کہ حرم شاہی میں راسپوٹین کی طرفدار ایک عورت تھی جو راسپوٹین کے حکم کے مطابق بچہ کو بیہوشی کی دوا کھلا دیا کرتی تھی اور پھر اسی کے حکم کے بموجب ہوش کی دوا بھی کھلا دیا کرتی تھی اس شخص کی ہر بات دھوکا اور فریب پر مبنی تھی، تاہم جب تک وہ زندہ رہا اس کا طوطی بولتا رہا۔

راسپوٹین اپنے ہمراہیوں کی مدد سے اسی قسم کے بہت سے معجزے دکھایا کرتا تھا۔

جب اُسے کسی مریض کو دکھانے کے لئے بلایا جاتا تو وہ ایک نرس اپنی طرف سے مقرر کر دیتا جو ناداننگی کے عالم میں اس کے حسب منشا دوا کھلایا کرتی۔ اس کی کرامت کے آماجگاہ اکثر و بیشتر غربا ہوا کرتے جنھیں روپیہ پیسہ کا لالچ دلا کر روس کے دور دراز مقامات میں روانہ کر دیا جاتا، جہاں اس مجنوں فقیر کے کشف و کرامت کے متعلق کوئی زبان نہیں ہلا سکتا۔ راسپوٹین کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ وہ دربار شاہی میں لوگوں کو ملازم تک رکھا دیا کرتا اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے اُس کی سفارش کے لوگ متلاشی ہوا کرتے تھے۔

غداری

فقیری کے پردے میں یہ شیطان جرمنی سے ساز باز رکھتا تھا اور روس کو برباد کرنے کے صلہ میں اسے گرانقدر رقم ملتی تھی۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی کثیر دولت کا کیا حشر ہوا اور نہ اس کی پاس بک میں نو کروروں روپیوں کا حساب تھا۔ مگر نہ معلوم اس نے روپیہ لے کر کیا کیا۔ لیکن یہ بات قطعی طور سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ جرمنی کا جاسوس تھا کیونکہ اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں سے جرمنی کے بے شمار خفیہ خطوط دستیاب ہوئے۔ متعدد خطوط میں جرمنی نے اُسے تہنیت پیش کی تھی کہ اس نے روس کے متعلق ایسی گرانقدر معلومات فراہم کیں۔ سیاہ و سفید کا مالک یہ "مقدس باپ" (اسی نام سے وہ روس میں یاد کیا جاتا تھا) زبردست غدار ثابت ہوا۔ اس کی موت کے چند روز پہلے حکام کو اس کی طرف سے شک و شبہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اسکا بھانڈا پھوڑنے کی خلش میں آتش زیر پا ہو رہے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے اقدام عمل کی ہمت اس کے نام و نمود کی چمک کے آگے ماند پڑ جاتی تھی۔

بہر کیف ایک روز ایم، گوچ کاف نے جو معزز اور مشہور شخص تھا اس کی مخالفت کی اور اُسے جھٹلانے لگا۔ اس امر نے ایک سنسنی پھیلا دی اور راسپوٹین لرزہ براندام ہو کر اپنی دیہاتی خانقاہ پوکروسکی کو بھاگ گیا۔ چند دن بعد وہ پیٹروگراڈ آیا تو اس کے ایک دوست نے اسے متنبہ کر دیا کہ اسے جان کا خطرہ ہے کیونکہ اس کے قتل کی سازش ہو رہی ہے۔ مگر اس نے اس خبر پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی عزت، ناموس اور اثر و رسوخ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں کہ اس کا خاتمہ اب ہوا ہی چاہتا ہے۔

خاتمہ

یہ سب کو معلوم تھا کہ راسپوٹین خوبصورت عورتوں کا بڑا دلدادہ تھا۔ ایک روز پرنس یوسوپوف نے اُسے ایک رنگین محفل میں شامل ہونیکی دعوت دی۔ اسے یہ یقین دلایا گیا کہ اس دعوت میں شہزادہ ایک نہایت ہی خوبرو، حسین اور باوقار خاتون کے ہمراہ ہوگا۔ راسپوٹین نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کر لی۔ اُسے یقین تھا کہ اس دعوت میں اُسے حسین ترین مرید حاصل ہوں گے۔

دعوت میں دو بوتلیں تھیں، ایک میں زہر ملا ہوا تھا۔ راسپوٹین نے بوتل چڑھا لی اور شہزادہ کے چھ سپاہی چھپکر راسپوٹین کی موت کا انتظار کرنے لگے کیونکہ وہ زہر جو شراب میں ملایا گیا تھا چھ آدمیوں کی جان لینے کیلئے کافی تھا۔ مگر شہزادہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس شیطان نے ایک بسکٹ کو سفوف بنا کر کھا لیا جس سے زہر کا اثر جاتا رہا۔ اب تو شہزادہ کو بے انتہا خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ جب راسپوٹین ٹھہرا اور اسکی پیٹھ شہزادہ کی طرف ہوئی تو شہزادہ نے اُسے پستول کا نشانہ بنا دیا جس کے بعد یہ شیطان خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ راسپوٹین دروازہ کی طرف پیٹ کے بل رینگ رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ گولی نے اس پر پوری طرح اثر نہ کیا تھا۔ البتہ خوف کی وجہ سے اس نے خود کو مردہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ شہزادہ اسے دوسری گولی نہ مارے۔ وہ زمین پر رینگ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو ڈرے۔ انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ ابھی کوئی غیبی قوت تھی ——— سازش کرنیوالے نقش حیرت بنے خاموش کھڑے تھے۔ مگر ایک شخص نے اسکے دماغ پر متواتر پستول کے فائر کئے جس سے وہ بالکل سرد ہو گیا۔

موٹر کار میں چھپا کر اسکی لاش کو دریا میں بہا دیا گیا اس طرح اس بناوٹی پیر کا جو درحقیقت شیطان تھا خاتمہ ہوا۔ ——— کاش ہندوستان کے بہروپ

جنگ!

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

(مقام:- واشنگٹن۔ ایک وسیع ہال میں دنیا کی تمام چھوٹی بڑی حکومتوں کے نمایندے جنگ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جمع ہوئے ہیں۔ کانفرنس کا صدر مسٹر روزویلٹ (صدر جمہوریہ امریکہ ہے)

(روزویلٹ افتتاحی تقریر کر رہا ہے)

"سمندر پار سے طوفان کی علامات نظر آ رہی ہیں۔ دنیا کی بربادی کے سامان!! اب یہ واضح ہو گیا ہے۔ دنیا میں امن یقینی نہیں۔ مذہب، جمہوریت اور بین الاقوامی خوش اعتمادی خطرہ میں ہیں۔ تمام ممالک فوجی واقتصادی جنگ کا اعلان کر رہے ہیں۔ انسانیت کے عقیدے اور اصولِ مذہب، صداقت اور تہذیب قایم رکھنے کے لئے صورتِ حال اور وقت کی نزاکت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ امن وصلح کی پوری کوشش کریں"

(آواز:- "ہیر، ہیر")

"معاملہ کو اچھی طرح سے سمجھ لینے کے لئے انسانی سرشت، ماہیت جاننے کی ضرورت ہے، انسان بہت خود غرض واقع ہوا ہے، اُسکی ذہنیت میں یہ زہر یلا مادہ سرایت کئے ہوئے ہے، اُس کے تمام افعال وحرکات کا یہی جذبہ سرچشمہ ہے۔ ہوا وہوس کا پابند انسان جو کچھ کرتا ہے خود غرضی کی بنا پر۔ اسی جذبہ کے تحت میں، اُس کی خود غرضی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، جذبات وتاثرات سے اس کا بہت گہرا لگاؤ ہے۔ یہ ہے انسانی تصویر کا ایک پہلو۔ اسی خیال کو وسعت دے کر انسانی دماغ، اُس کے اطوار وچلن کا مشاہدہ کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک آدمی کے ذاتی اغراض ومفاد، دوسرے آدمی کی خود بینی یا خود غرضی سے ٹکراتے ہیں۔ اسی طرح اور آگے بڑھ کر یہی تصادم وٹکر آپ دو ملکوں یا قوموں کے درمیان پائیں گے۔ تصادم وٹکر سے حرارت پیدا ہوتی ہے جوش بڑھتا ہے۔ رنجش، کشیدگی واختلافات رُونما ہوتے ہیں۔ برتری وفوقیت کے لئے آپس میں مقابلہ شروع ہوتا ہے، غرضیکہ دُنیا طاقت آزمائی کا ایک دنگل بنجاتی ہے۔ ناسمجھ انسان کی اُمنگوں اور حوصلوں کی آماجگاہ یہی طاقت آزمائی کے منظر پیش کرتی ہے"

(آواز:- "ہیر، ہیر")

"لڑائی میں ایک کی جیت ہوتی ہے تو دوسرے کی ہار، امن وصلح میں جیت ہی جیت ہے ہار کا نام نہیں۔ امن وچین کے زمانہ میں علوم وفنون کو فروغ حاصل ہوتا ہے صنعت وحرفت میں ترقی۔ تجارت بڑھکر خوشحالی لاتی ہے، کساد بازاری دور ہو جاتی ہے، تہذیب، تمدن ومعاشرت کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس کے برخلاف لڑائی کے خوفناک نتایج ہمارے قیاس میں بھی نہیں آسکتے۔ لڑائی کی آگ انسانیت کی ایک چتا تیار کر دیتی ہے جسمیں وہ سب کچھ جل جاتا ہے جو ہم کو پیارا ہے ___ حضرات! کیا امن وصلح کی اعلیٰ برکتیں لڑائی کی شاندار فتح سے افضل نہیں؟"

(سب ہم آواز ہو کر۔ ہم لڑائی نہیں چاہتے، امن چاہتے ہیں، صلح چاہتے ہیں)

"آپ کے جواب ہی سے پریشانی واضطراب کا پتہ چلتا ہے۔ لڑائی کا خیال ہمارے دلوں میں سما گیا ہے اور اس کا خوف بھی کچھ کم نہیں۔ جب ہم لڑنا نہیں چاہتے، تہذیب اور انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں تو پھر یہ پریشانی کیسی؟ ہر طرف جنگ کی پکار کیوں ہے؟ ہماری اسلحہ بندی کے کیا معنے؟"

(سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

"آپ کہیں گے یہ سب امن وصلح قایم رکھنے اور اپنی مدافعت اور حفاظت کے لئے ہے۔ میں پوچھتا ہوں امن وصلح اس طرح قایم رہ سکے گا؟ کیا ہمارے اختلافات، کشیدگی وعدم اعتمادی ہم کو لڑائی کی طرف نہیں لے جا رہے؟

ہم ذرا سوچیں، اور انصاف سے کام لیں تو کسی اچھے نتیجہ پر پہونچ ہی جائنگے دُنیا سے لڑائی ختم کر دینا انسانی طاقت سے باہر تو نہیں لیکن یہ کام آسان بھی نہیں۔ ہمارے درمیان اختلافات کی ایک خلیج حائل ہے پہلے اسے پار کرنا ہوگا پھر ساحل پر پہونچ کر زندگی کی لڑائی میں انسانیت، نیک نیتی، صفائی وخوش اعتمادی کو اپنا راہبر بنانا ہے۔ بات کو گہری نظر سے دیکھئے اور بتلائیے کیا ہم ان سب باتوں کیلئے تیار ہیں؟" (خاموشی!) "میں پھر پوچھتا ہوں کیا ہم تیار ہیں؟"

(جواب ندارد۔)

"ہماری خاموشی ہی اپنا جواب ہے۔ اب میں عرض کروں گا، امن وصلح کے مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دینے کے لئے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ ممبران ہمارے بنیادی واساسی اختلافات بتلائیں اور مشکلات کا حل تلاش کریں"

(تقریر ختم۔ تالیاں بجتی ہیں)

دوسرا منظر

مسٹر چیمبرلین تقریر کرتے ہیں

"جناب صدر ومعزز حاضرین

دُنیا کی تاریخ کا ورق اُلٹنے والا ہے، حالات واقعات بہت تیزی سے گذر رہے ہیں۔ بہت نازک ہے ہمارا یہ دور، اسی پر انحصار ہے دُنیا کے بننے اور بگڑ جانے کا، تہذیب وتمدن کی فنا اور بقا کا۔ امن وصلح کا مسئلہ دُنیا میں نیا نہیں اور نہ ہی داستانِ پارینہ ہو جانے سے اِس کی اہمیت کم ہوئی ہے۔ آئے دن یہ مسئلہ خوفناک صورت اختیار کر رہا ہے اور کسی نہ کسی اختلافی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، آئندہ لائحہ عمل کی ترتیب اور اِس کے فوری حل کی ضرورت ہے ورنہ ڈر ہے چنگاری کے بھڑک جانے اور تمام عالم کو جَلا دینے کا"

(آواز:- "ہیر، ہیر")

"دُنیا کی قومیں بیدار ہو چکی ہیں، ہر طرف قومی جذبہ کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ انتہا ہیں اس جذبہ کے سمندر کی گہرائیاں، اور انہیں سرشاری بدمستی ہی دُنیا کے امن کی مخالف بن گئی ہے۔ قومیت بذات خود کوئی بُری چیز نہیں، لیکن حد سے بڑھ جانے والی بات خطرناک پہلو اختیار کر لیتی ہے کسی چیز کی زیادتی وفراوانی بھی مضر ثابت ہونے لگتی ہے"

(آواز:- "ہیر، ہیر")

"قومیت کے تصور وتخیل کی ابتدا اٹھارویں صدی میں تحریکِ انقلاب (Renaissance) اور تحریک اصلاح (Reformation) کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بعد انقلاب فرانس نے دُنیا کا رنگ بدلا۔

انقلاب فرانس حامی تھا انسانی حریت، آزادی، مساوات اور اخوت کا۔

قومیت کے جذبہ نے اِسی کے سایہ میں پرورش پائی، مگر وہ پودا پھلا پھولا اور بڑھ کر خود انقلابی رنگ اختیار کر گیا۔ شخصی راج یا غیر آئینی حکومت کو مٹا دینا اور جمہوریت قایم کرنا قومیت کے پیشِ نظر تھا۔ اِس جذبہ کے تحت میں افراد متفق ومتحد ہو کر جمود وذلت سے نکل جاتے ہیں، اپنی اہلیت، خودداری، قومی عزت کا پاس ہو جاتا ہے اور یہی احساس خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔ ذاتی اغراض پر قومی مفاد، اُس کی بہبودی وبرتری کا خیال دل میں گھر کر لیتا ہے، قوم کا مستقبل شاندار نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ہے اِس تصویر کا روشن پہلو۔

اس کا دوسرا رُخ قوم پرستی سے نفرت پیدا کر دیتا ہے۔ قوم افراد سے بنتی ہے اور پورے طور پر منظم ومہذب جماعت نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہ ایک ایسا گروہ ہے جسکی چال بھیڑ چال ہے، جس طرف چاہے رُخ کر دو۔ قومی جوش وجذبہ ہی اس گروہ کے اتحاد کی بنا ہے، جذبات وتاثرات کی اُمنگوں سے کھیلنا ہی اس کا کام ہے، ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش آدمی قومی جذبہ کو اکسا کر عوام کو غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں، عوام میں یہ جذبہ مجنونانہ حرکات کا باعث ہوتا ہے، پردیسی یا غیر ملکی آدمیوں کی طرف سے اُن کے دلوں میں بدگمانی ونفرت آجاتی ہے۔ قومیت کے جنون کو سامراجی نشہ سمجھو۔ جب ایک قوم اپنی تنظیم، طاقت واسلحہ بندی پر نازاں ہو جاتی ہے، اُس کے حوصلے، اُمنگیں اور ارادے جارحانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں، چھوٹی غیر ترقی یافتہ قومیں ہیچ سمجھی جانے لگتی ہیں۔ اُن کی دلشکنی یا اُن پر زیادتی کرنا بُرائی خیال نہیں کیا جاتا۔ ترقی یافتہ قوموں کا یہ پیدائشی حق سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ دُنیا کی غیر منظم وغیر مہذب قوموں کو تہذیب وشائستگی کا سبق پڑھائیں۔ کمزور اور بے بس قوموں پر چڑھائی، اُن کے علاقوں پر تسلط، سب کچھ تہذیب ہی کے نام پر کیا جاتا ہے۔ ایسے بہت سے عذرات اسی بے پناہ جذبہ کو تسکین دینے کے لئے تلاش کرتے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے اِس کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔ فسطائیت اور نازیت نے بیشک اپنی قوموں میں نئی روح پھونکدی، دورِ جدید کا آغاز ہے، نوجوانانِ وطن قومی جوش کے نشہ میں سرشار ہیں۔ لیکن اس نظریہ نے کیا جنگ کے خطرہ کو قریب تر نہیں کر دیا؟ قوم پرستی نام ہے ایک دھوکہ وفریب کا جس کے پردے میں عوام کو اُبھار کر مطلب براری کی جاتی ہے"

(تحسین ومرحبا کی آواز۔ تالیاں بجتی ہیں)

تیسرا منظر

ہرا مونا تقریر کر رہا ہے

اب سے سو سال پہلے دُنیا کو چند حصوں میں تقسیم کرنا اور ہر حصہ کی ایک

جداگانہ ہستی باوجود قرار دینا کوئی مشکل بات نہ تھی، زمانہ نے کروٹ بدلی، اب یہی تقسیم فضول اور ناکارہ بھی جانے لگی۔ تمام عالم اور اُس کے کل خطے میل وملاپ کے رشتہ میں پڑکر منسلک و متحد ہوگئے ہیں، قومیت یا وطنیت بڑھ کر بین الاقوامی مسئلہ بن گئی ہے، سب ملک ضرورتاً ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، میل جول کے اِسی رشتہ کی مناسبت سے اُن کی جداگانہ حیثیت دُنیا میں قایم ہے، تجارت کی ترقی اور کاروبار کا بڑھاؤ بین الاقوامی رشتہ اور اتحاد کا سبب بن گیا۔ اِس بڑھتے ہوئے ملاپ سے بہت سے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ کثیر التعداد ملکوں کے درمیان تعلقات میں پورے طور سے موافقت و مطابقت ہونا بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ دو ملکوں کے درمیان لڑائی اب محدود نہیں رہ سکتی، تمام دُنیا پر لڑائی کا کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ اس سے عالمگیر جنگ کے خطرات بڑھ گئے ہیں"

(آواز "ہیر، ہیر")

"حضرات! دورِ حاضرہ میں اقتصادی کشمکش ہی جنگ کی اصل بنا ہے۔ وہ ممالک جنہیں صنعت وحرفت ترقی پاچکی اپنی ضروریات سے بہت زیادہ مال تیار کررہے ہیں، اُن کی خوشحالی اِسی بات پر ہے کہ دُنیا کے بازار اور منڈیوں میں اُن کا مال فروخت ہو، سب کی یہی خواہش ہے اور یہ خواہش ادر مفادِ دُنیا کی قوموں میں مقابلہ کا سوال پیدا کردیتا ہے لڑائیاں بیشتر اسی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہیں، تجارت میں مقابلہ کا سوال آجانے پر جائز و ناجائز، مناسب وغیر مناسب . . . طریق کارعمل میں آتے ہیں۔ ہر قوم بازی لے جانے کی فکر کرتی ہے، دوسرے ملکوں کی تجارت کو نقصان پہونچانے کے لئے ہر ممکن صورت وطریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

(آواز "ہیر ہیر")

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ نوآبادیات کے سوال کی بنا اقتصادی ہی ہوتی ہے۔ نوآبادیات پر تسلط فاتح قوم کی راحت وآسایش کا سامان مہیا کرتا ہے، ان علاقوں کے قدرتی وسائل، خام پیداوار، معدنی اشیا اور تجارتی منڈیوں سے فائدہ اُٹھانا ہی حکمران قوموں کے پیش نظر رہا ہے۔ (ہیر ہیر) مختلف قوموں کی مختلف ضروریات ہیں، رُوس کو تجارت بڑھانے کے لئے مناسب بندرگاہ چاہیئے۔ بالٹک سی پر تسلط کارآمد ثابت نہ ہوسکا۔ بحرِ اسود و بحرِ روم میں اقتدار ہونا اُس کے لئے مفید ہوگا۔ پیٹر اعظم کے زمانے سے کر آج تک روس کی خارجہ پالیسی کا مطمح نظر یہی رہا ہے۔ اطالیہ کی روز افزوں آبادی کے لئے زرخیز علاقہ چاہیئے، صنعت کی ترقی کے لئے معدنی اشیاء۔ حبش سے لڑائی کی خاص وجہ یہی تھی اور یہ سوال اب ٹیونس، جزیرہ کورسیکا، جبوتی و نہر سویز کے مطالبات ومراعات کی صورت میں پیش ہے۔ جاپان کی اقتصادی حالت کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ بسنے کے لئے زمین، تجارت کے لئے بازار اور منڈیاں — آسٹریلیا اور امریکہ نے پردیسیوں کے سمانے کی راہ روک دی۔ وہاں پر مزدوروں کی اُجرت وروزی کا سوال ہے، زندگی کا اعلیٰ معیار قایم رکھنا ہے — جاپان کی سب اُمیدیں ایشیا سے وابستہ ہیں۔ اسی میں اُس کو اپنی مشکلات کا حل نظر آتا ہے۔ منچوریہ پر تسلط کے لئے روس سے اَن بَن ہوئی اب چین کی متحدہ قومیت بھی جاپانی مصلحت گوارا نہیں کرسکتی نتیجہ جنگ کی صورت میں آپکے سامنے ہے۔ ہم تنہا یورپ کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے ایشیا کی بیداری پر نظر ہے تاکہ متحدہ محاذ قایم ہوجائے، مشرق ومغرب کی کشمکش میں تجارت کی کنجی ہمارے ہاتھ آئے۔ میں پھر کہتا ہوں آج کل اقتصادی مسئلہ ہی جنگ کی سب سے بڑی وجہ بن رہا ہے"

(ہیر، ہیر" تالیاں بجتی ہیں)

چوتھا منظر

(اسٹیلن کھڑا ہوتا ہے، ہنسی کی آواز)

"حضرات!

تمام دُنیا انسانی مخلوق کی ایک برادری، اور تمام ملکوں کا فیڈریشن ہمارے بلند حوصلوں اور ارادوں کے لئے میدانِ عمل۔

خیال اچھا ہے لیکن نیت بخیر نہیں، نیت اور عمل درست ہوں تو جنگ کا خیال ہی فضول ہے۔ ہمارے بنیادی واساسی اختلافات کیا ہیں، سب ہی نے بیان کئے لیکن مشکلات کا حل کسی نے بھی نہ بتلایا۔ میری رائے میں دُنیا سے جنگ ختم کرنے کا واحد علاج صرف سوشلزم ہوسکتا ہے۔

(آواز "نہیں، نہیں")

"دُنیا والے اِس نظریہ کی طرف تیزی سے آرہے ہیں، اِس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی ہوگا، امن وچین کا ضامن اشتراکیت ہی کا عالمگیر نظریہ ہوسکتا ہے"

(آواز "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں")

"سچ بات مانئے یا نہ مانئے، سوشلزم دُنیا کے گوشہ گوشہ میں تیزی سے بڑھ رہا ہے، یہ تحریک ہر جگہ پہونچ چکی ہے اور یہ آواز دنیا پر چھا جانے والی ہے فطرت کی پکار زیادہ عرصہ تک دبائی نہیں جاسکتی"

(آواز "وعظ بند کرو۔ ہم سوشلزم نہیں چاہتے"

"بند کرو۔ بند کرو"

صدر میز کی گھنٹی بجاتے ہیں۔ خاموشی، تقریر جاری ہوتی ہے۔)

"سوشلزم نام ہے، دُنیا کی گری ہوئی حالت کو سنبھالنے کا اُس کی درستی واصلاح کا۔ اشتراکیت دنیا کے سامنے ایسا معاشی وسماجی نظام پیش کرتی ہے جس کی تہ میں امن وچین کا راز پوشیدہ ہے۔ اِسکا نقطۂ نظر ہے کہ بیکاری کو ختم کردیا جائے، سرمایہ داری کو مٹا دیا جائے۔ دنیا میں ہر شخص کو کھانے اور پہننے کی ضروریات میسر ہوں۔ یہی ہے فطرت کی پکار اور انسان کا پیدائشی حق۔ تہذیب وتمدن کی بنا اِسی اصول پر کرنی ہوگی۔"

(شور ہونے لگتا ہے، گھنٹی بار بار بجتی ہے صدر کھڑے ہوکر)

"تقریر کا حق ہر ایک ممبر کو حاصل ہے، ٹھنڈے دل سے سُن لیجئے، جوش کو کام میں نہ لائیے" (تقریر جاری ہوتی ہے)

"قوم پرستی خود غرضی کا دوسرا نام ہے، آمریت شخصی حکومت کے مترادف ہے جمہوریت صحیح معنوں میں آزادی کی حامی نہیں، اسمیں خامیاں ہیں جو ہماری تکالیف دور نہیں کرسکتی، ہمارے امن کی ضامن نہیں، آخری صورت اشتراکیت ہے، امن وچین اسی کے سایہ میں مل سکتا ہے۔ اور ...... اور ......"

(زیادہ شور ہونے لگتا ہے، گھنٹی بار بار بجتی ہے)

آواز "خاموش، خاموش" بحث وتکرار سرگرمی سے ہونے لگتی ہے۔

(ہال کی روشنی غائب ہوجاتی ہے۔ دفعتہً فضا میں دھیمی روشنی کا ایک ہالہ چکر لگاتا ہے، ایک ہلکی آواز سکوت توڑتی ہے!

پانچواں منظر

غیبی آواز یا ضمیر کی پکار

"احمق! قدرت تیری کوشش و ناکامی پر ہنستی ہے، صداقت وراستی سے دور بندے! سچی بات کا سننا بھی گوارا نہیں۔

تیری ہستی، تیرا وجود بہت بلند ہے اس کا مرتبہ، زمین وآسمان سے اونچا، ملائک سے ارفع واعلیٰ۔ یہ کائنات اور تیری ہستی ابھی دور ہے پایۂ تکمیل سے۔ معراج تک رسائی تیری طاقت سے باہر نہیں۔ اپنی ہستی پہچان اور انسانیت کا درجہ بلند کر، اتنا بلند، اتنا اونچا کہ ملائک سربسجود ہوں اور دُنیا پر حقیقی معنوں میں تیری حکومت ہو۔ سکون وراحت جس کا تو متلاشی ہے، امن وصلح جس کے لئے تو بیتاب ہے اِس راز کی کنجی تیری ہستی کی تکمیل اور بلندی ہی میں پنہاں ہے۔ قدرت نے تیری ہستی "احسن تقویمہٖ" بنائی، پر تونے وہ راہ اختیار کی جس نے تجھے "اَسْفَلْ" بنادیا پستی میں گر کر اُسی کو بلندی سمجھ بیٹھا، کیا ایمان وعمل کا سبق یاد نہیں؟

تیری ہستی میں مضمر ہے بننے اور بگڑ جانے کا راز۔ نیکی کی صلاحیت، بدی کا خیال، دونوں تیرے وجود میں ہیں۔ امارت وثروت کا نشہ، سرمایہ داری کا خیال، مادیت کا یہ سامراجی بُت توڑ دے۔ انسانیت و روحانیت کا عالم میں ڈنکا بجا۔ اسی میں ہے تیری بھلائی اور راہِ نجات،

امن وچین دُنیا میں، راحت وسکون عقبیٰ میں،

(فضا میں ہنسی کی آواز۔ ہالہ کا چکر۔ ہال پھر روشن ہوجاتا ہے حیرت وتعجب میں سب اوپر دیکھتے ہیں۔ پریشانی وسراسیمگی میں مجلس برخاست ہوتی ہے)

(س، ک۔ ایم، اے۔ ایل ایل بی)

محسوسات ماہر

(از جناب ماہر القادری)

تخیل ہے پریشاں ناکام ہے ارادہ
غم دلنواز نکلا، امید سے زیادہ

الفت کی زندگی کا اللہ ہے نگہباں
اُمید شوخ فطرت، دل کا مزاج سادہ

گلزار کی روش پر، تاروں کی روشنی میں
وہ چہرہ گلابی، اُس پر فروغِ بادہ

بجلی کی تابشیں ہوں یا موجِ مے کی مستی
اُن کی نظر سے دنیا کرتی ہے استفادہ

یہ کون حشر ساماں رُک رُک کے چل رہا ہے
غلطاں ہے گردِ منزل، لرزاں ہے نبضِ جادہ

ماہر تمہاری باتیں دنیا سے ہیں نرالی
جینے کی آرزو میں، مرنے کا ہے ارادہ

ایلورہ کے غار

چند دن اورنگ آباد میں

(از جناب مقبول احمد مہتمم حلقہ ہمدردان جامعہ)

اورنگ آباد دکن کی دلی ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر بزرگوں کے مزارات اور تاریخی یادگاریں ہیں۔ دلی بھی مغلوں کا پایۂ تخت رہا اور اورنگ آباد بھی۔ دلی میں بھی مغلوں کے عروج کی عبرت ناک داستانیں سننے میں آتی ہیں اور اورنگ آباد میں بھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴ برس یہاں گذارے ہیں۔ سترہ لاکھ کی آبادی تھی۔ امیروں کے محلات اور عہدہ داران شاہی کے سر بہ فلک دیوان نظر آتے تھے۔ ایرانی چمن بندی کی سرسبزی بہار دکھاتی تھی۔ مسلمانوں کے عروج کی تاریخی بستی دیکھنی ہو تو یہاں آکر دیکھو۔ والیان ریاست کی ڈیوڑھیاں ٹوٹی پڑی ہیں جس طرح نئی دلی میں انگریزوں کے باجگزاروں نے شاہی تقریبات کی شرکت کے لئے اپنا اپنا ٹھکانہ بنایا ہے۔ کبھی یہی سماں اورنگ آباد میں بھی تھا

اورنگ آباد سے ایلورہ کو سڑک جاتی ہے جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے راستہ میں دولت آباد کا قلعہ اور خلد آباد واقع ہیں۔ یہ وہی خلد آباد ہے جہاں شہنشاہ عالمگیر کی آرامگاہ ہے۔ ایلورہ کے غار دو منزلے سہ منزلے کھلے ہوئے دروازے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے سب سے مشہور کیلاش کا مندر ہے۔ اسی کو رنگ محل بھی کہتے ہیں۔ پہاڑوں کو کاٹ کر ایسے حیرت انگیز کام کئے ہیں کہ انسانی عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ڈیوڑھی کے سامنے پردہ کی دیوار میں کنول کا پھول بنا ہوا ہے۔ اس کے نیچے جینی حروف کا کتبہ ہے۔ جس کے حروف مٹ گئے ہیں۔ اور جو سٹر جیمس (غار ہائے ایلورہ کا محقق) کے خیال کے مطابق پندرھویں صدی عیسوی کا ہے غربی اور شرقی دیوار پر بڑی بڑی تصویریں ہیں۔ غار کا صدر دروازہ غرب رویہ اور دو منزل کا بنا ہوا ہے ڈیوڑھی خوب لمبی چوڑی ہے۔ جس کے اِدھر اُدھر دربانوں کے بیٹھنے کی مختصر عمارت ہے۔ سامنے پردے کی دیوار پر ایک بڑی تصویر اور دونوں طرف چھوٹے چھوٹے ہاتھی ہیں۔ ہاتھیوں کے دونوں طرف چوبدار ہیں۔ اندر جاکر دو اور بڑے بڑے ہاتھی ملتے ہیں جنہیں کورو پانڈو کی یادگار بتایا جاتا ہے۔ پہاڑ کے بیچ میں مندر ہے جس احاطہ میں مندر ہے اس کی لمبائی تخمیناً ۲۰۰ فٹ اور چوڑائی ۱۵۴ فٹ ہر اونچائی بھی سو فٹ سے زیادہ ہوگی۔ اسی احاطہ میں ۱۰۶ فٹ کی چٹان بطور سائبان آویزاں نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کام مافوق الفطرت طاقتوں نے انجام دیا ہے۔ اس غار میں کئی مرتبہ رنگ پھیرا گیا ہے۔ جو رنگ زیادہ خوشنما اور شاندار ہے وہی قدیم زمانہ کا ہے۔ بعد کا رنگ بدنما اور خراب ہے۔ مندر کی چھت میں بھی شاید یہی رنگ ہوگا لیکن اب تو پجاریوں نے تیل اور گھی جلا جلا کر بالکل سیاہ کردیا ہے۔ موجودہ خسرو دکن نے لاکھوں روپیہ خرچ کرکے صفائی اور مرمت کرائی ہے۔ اور مورتوں کو چھونا "کھرچنا" پجاریوں کو رگڑنا قانوناً ممنوع قرار دیدیا ہے مبصرین کا خیال ہے کہ ابتدائی رنگ آبدار جواہرات کو محلول کرکے بنایا گیا ہے۔ مندر کی عمارت سے علیحدہ دو لمبے لمبے ستون ہیں اُن کو شمع دان کہتے ہیں ہر ستون کی اونچائی ۴۹ فٹ ہے۔ جس دروازہ سے مندر میں جاتے ہیں اس کے شمالی ستون پر سنسکرتی زبان کا کتبہ ہے۔ اس کتبہ اور دروازہ کے بیچ میں ایک عورت کی تصویر ہے۔ اس کے نیچے بھی کچھ مٹے مٹے حروف دکھائی دیتے ہیں۔ مندر کے باہر شمالی اور جنوبی دیواروں پر کوروں پانڈوؤں کے معرکے اور مندر کے چاروں طرف شیر اور ہاتھیوں کی تصویریں ہیں شیر اور ہاتھی اس طرح بنائے گئے ہیں گویا مندر کو اُٹھائے ہوئے ہیں مندر کی چھت میں جگہ جگہ مصوری کا کمال نظر آتا ہے۔ بہت سی تصویریں ایسی بنائی ہیں کہ جس طرف کھڑے ہوکر دیکھا جائے تصویر کی نگاہ دیکھنے والے کی نگراں رہتی ہے۔ ایک جگہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ اس طرح بنایا ہے کہ مکھیاں اُڑنا چاہتی ہیں۔

ایلورہ کے غاروں کے متعلق طرح طرح کے فسانے مشہور ہیں مگر تحقیق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کوئی کہتا ہے کورو پانڈو نے بنایا ہے اور کسی کا خیال ہے کہ یہ تمام کارنامے عاد و ثمود کے ہیں جو پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر مکان بناتے تھے۔ بیچارے کورو پانڈوؤں کو تو مہابھارت کی جنگ کے بعد سر اُٹھانے کی مہلت ہی کہاں ملی تھی نہ مہابھارت میں جو کورو پانڈوؤں کے کارناموں کا مرقع ہے اس کا تذکرہ ہے۔ سٹر جیمس نے لکھا ہے کہ غاروں کی تعمیر تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی ہے۔ اور نقاشی چھٹی ساتویں صدی تک ہوتی رہی۔ پھر بھی جگہ جگہ کام ادھورا رہ گیا امیر حسن بیجاپوری نے مصباح التاریخ میں لکھا ہے کہ یہ تمام کارنامہ پرچند راؤ فرماں روائے تلنگانہ کا ہے پرچند راؤ دکن اور تلنگانہ کا راجہ تھا جس نے چودہ سال تک یہ نادرۂ روزگار عجائب خانہ ایک لاکھ سنگ تراشوں کی مدد سے تیار کرایا امیر حسن کے اس قول کی تائید نمبر ۱۵ کے غار سے بھی ہوتی ہے۔

غاروں کا سلسلہ آدھ کوس تک مسلسل چلا گیا ہے گنتی میں کل ۳۴ غار ہیں جن میں سے ایک سے بارہ تک تو وہ بدھ زمانہ کی یاد دلاتے ہیں۔ ۱۳ سے ۲۹ تک برہمنی مذہب کے بُت خانے ہیں اور پانچ غار جینی مذہب کے آثار ہیں۔ بدھ مذہب کے غاروں میں جگہ جگہ عبادت مراقبہ وعظ و پند کے مجسمے ہیں بخلاف برہمنی بُت خانوں کے جن میں یا تو قتل و خون جنگ و غارت گری دکھائی دیتی ہے یا فحش و بدکاریاں نمایاں ہیں۔

بدھوں کے غاروں کا نمونہ

غار نمبر ۲ اس میں ایک دروازہ اور دو بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں بیچ کا حصہ بارہ منقش ستونوں پر قائم ہے جنوبی حجرے میں مہاتما بدھ ایک ہاتھ کی انگلی دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور بیچ کی انگلی سے پکڑے تخت پر بیٹھے ہیں پیر لٹک رہے ہیں۔ سر کے گھونگر یالے بال کترے ہوئے ہیں پہلو میں دو چھوٹی چھوٹی شکلیں اور شرقی و غربی دیواروں پر مورچھل بردار کھڑے ہیں۔ حجرہ کے دروازہ کے دونوں طرف قدآور دربان ہیں۔ اور دربانوں کے دونوں طرف ایک ایک عورت کھڑی ہے اس کے سوا اور بھی چھوٹی بڑی تصویریں ہیں۔ مہاتما بدھ جس حجرہ میں بیٹھے ہیں اس کے دونوں طرف ایک ایک حجرہ اور ہے۔ داہنے حجرے میں گوتم جی کا مجسمہ کنول کے پھول پر بنا ہوا ہے۔ یہ پھول سانپ کے سر پر ہے کچھ مردانے اور زنانے مجسمے بھی ہیں لیکن سب کی شکل مہاتما بدھ جیسی ہے۔ یہ تمام مورتیاں جن میں زنانہ پن ہے مہاتما بدھ کی بتائی جاتی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ مہاتما بدھ کی بڑی تصویر کے پرتو اور قوت روحانی نے ان تمام شاگردوں کو مہاتما جیسا بنا دیا ہے اور یہ سارے چیلے اور مرید فنافی الشیخ کے مقام میں ہیں ان کو عورت کی شکل میں نمایاں کرنے میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ شیخ مرد کامل ہے۔ اور یہ سب مغلوب احوال ہیں۔

چوتھے نمبر کے غار میں جس کا بہت سا حصہ گر گیا ہے، ایک حجرہ میں مہاتما بدھ تخت پر بیٹھے ہیں۔ سر پر سایہ دار درخت ہے۔ شاگرد پیچھے کھڑے ہیں چھٹے غار میں بھی تعلیم ہی کا منظر ہے اور شاگرد کتاب کھولے تعلیم حاصل کر رہے ہیں آٹھویں غار میں بھی یہی سماں ہے۔ مندر کے اوپر مہاتما بدھ بیٹھے ہیں۔ شاگرد قدم بوسی کر رہے ہیں غار نمبر ۱۰ جسے ستار جھونپڑی کہتے ہیں، بدھوں کی یادگاروں میں بہترین نمونہ ہے اس کا دوسرا نام وسواکرما ہے یہاں ایک مندر ۲۸ ہشت پہل اور دو چوپہل ستونوں پر قائم ہے۔ مندر کے شرقی حصہ میں مغرب کی سمت منہ کئے مہاتما بدھ تخت پر بیٹھے ہیں گیارہ فٹ اونچا مجسمہ ہے۔ محرابوں میں چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں۔ بیچ میں سایہ دار درخت ہے۔ ان تصویروں میں بھی وہی سماں ہے کہ شیخ نے اپنی قوت روحانی اور فیض سے ہر ایک شاگرد کو اپنا جیسا بنا دیا ہے۔ اور دیکھنے والا مرید اور شیخ میں تمیز نہیں کر سکتا۔ شاگردوں کی تصویریں چھوٹی چھوٹی اور گوتم جی کی بڑی ہے۔ گوتم جی مقام صدر پر ہیں جس سے سنگتراش کی قابلیت نمایاں ہے۔ محراب کی پشت پر ٹھوس گنبد ترشا ہوا ہے۔ جس کا قطر ۱۵ فٹ اور بلندی ۲۷ فٹ ہے مندر کی چھت سنگ تراشی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ بالکل جھونپڑی جیسا انداز ہے۔ اور پتھروں کو اس طرح تراشا گیا ہے گویا لکڑیوں کو خم دے کر ڈاٹ لگا دی گئی ہے۔ شمال و مغرب کے گوشہ میں چھوٹا سا دالان ہے۔ جس کی شرقی دیوار کے نیچے پانی کا چشمہ ہے۔ چشمہ ۱۵ - ۱۵ فٹ طول و عرض میں اور ۱۰ فٹ گہرا بتایا جاتا ہے۔ پانی کا رنگ دیکھنے میں سبز لیکن بہت صاف شفاف اور میٹھا ہے۔

تاریخی لحاظ سے نمبر ۱۵ کا دو منزلہ غار بھی خوب ہے۔ اس کا نام دس اوتار ہے۔ نیچے کی منزل تین درجوں میں تقسیم ہے۔ جو ۲۸ ستونوں پر قائم ہے اس منزل کے شمالی گوشے سے دوسری منزل میں جاتے ہیں۔ زینہ میں روشن دان ہے۔ پرانی سیڑھیاں بعض جگہ شکستہ ہوگئی تھیں جنھیں تاجدار دکن کے محکمۂ آثار قدیمہ نے سیمنٹ سے بنوا دیا ہے دوسرے غاروں میں بھی جہاں جہاں شکست و ریخت ہے مرمت کردی گئی ہے۔ دوسری منزل میں ۳۸ ستون ہیں جس کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگلے حصہ کے سامنے برآمدہ ہے۔ جس کے شمال و جنوب میں چار ہاتھ کا ایک مجسمہ ہے۔ اگلے حصہ کی جنوبی محراب میں دو حریف مصروف جنگ ہیں۔ ایک کا منہ شیر کا ہے جس کے آٹھ ہاتھ ہیں۔ اس نے حریف کے بائیں ہاتھ کو بغل کے نیچے دبا کر اپنی بائیں ٹانگ حریف کی سیدھی ٹانگ میں اڑا دی ہے۔ اس کے باقی سات ہاتھوں میں قدیم زمانہ کے ہتیار ہیں حریف کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال ہے مگر بے بس ہوگیا ہے تیسری محراب میں بھی چھ ہاتھ کا مجسمہ ہے۔ اس کا منہ سور کا ہے پانچویں محراب میں ایک اور مجسمہ ہے جو اپنے کندھے پر چار ہاتھ والے پہلوان کو اٹھائے ہوئے ہے چھٹی محراب میں ایک بڑا لمبا مجسمہ ہے جو ناگ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور بھی متعدد شکلیں ہیں۔ انہیں میں ایک رتھ بھی ہے جس میں چار گھوڑے جُتے ہوئے ہیں۔ کوچبان باگوں کو تھامے رتھ کو دوڑا رہا ہے رتھ کے اندر سپہ سالار بیٹھا ہے جس کے آٹھ ہاتھ ہیں ایک میں ڈھال ایک میں کمان



مسجد حضرت عمرؓ کا اندرونی حصہ



الحمراء کا ایک منظر



مسجد قرطبہ کی محرابیں



مسجد قرطبہ کا اندرونی حصہ



نخلستانِ غزہ

اور باقی چھ ہاتھوں میں دوسرے ہتھیار ہیں۔ اسی طرح اور بھی خوش منظر اور بدہیئت مجسمے یہاں موجود ہیں۔ جنگ کے خوفناک واقعے۔ ہتھیاروں کا استعمال ہتھیار چلاتے وقت کے تیور، حملہ آور کی خونخواری۔ اس کا بانکپن اور مستعدی زخم خوردہ حریف کی بے بسی یہ سب چیزیں دکھائی گئی ہیں۔ اسی غار میں وہ طویل کتبہ بھی ہے۔ جس سے اس عمارت کے بنانے والوں کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے ۱۳۰۵ء میں حسن گنگوہی اپنے مصاحبوں کیساتھ یہاں آیا تھا۔ اور اس نے ایک ہفتہ تک ایلورا کے غاروں کی سیر کی تھی۔ سب سے پہلی مرتبہ اسی نے کتبہ کو پڑھا تھا۔ کتبہ کے نیچے پرچند راؤ کا نام ہے پرچند راؤ یا ہرچند راؤ کرناٹک اور تلنگانہ کا راجہ تھا۔ یہ کتبہ بارگاہ کا کتبہ کہلاتا ہے۔

کتبہ کی عبارت کا ترجمہ

”میں نے یہ عمارت نمونہ دربار شاہی مع تصاویر و لوازم دربار اس غرض سے تعمیر کرائی ہے۔ کہ ملک کے آیندہ وارث اس عمارت کو دیکھ کر ہمیں نیکی سے یاد کریں۔ اور جہاں ہماری شان و شوکت و اقبال و عروج کا تصور کریں وہاں زوال اور دنیا کی بے ثباتی کو بھی سوچیں۔ اور دنیا کی آسائش پر فریفتہ ہو کر عدل و انصاف کو نہ بھولیں اگر انھیں اس قسم کی عمارت بنانے کی اُمنگ ہو۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ بیس ہزار معماروں کو جو فن سنگ تراشی کے بہترین ماہر ہوں۔ اور تصویر کشی و مصوری میں کمال رکھتے ہوں۔ وہ ہزار سال تک برابر کام کرتے رہیں اور خزانہ کا دروازہ کھول دیں۔ اس وقت شاید ایسی عمارت بن سکے گی“

یوں تو اور بھی بہت سے غار ہیں۔ لیکن ہم صرف ایک غار کا بیان اور کریں گے۔ یہ جینی رسم و رواج و روایات کا تصویر خانہ ہے۔ اس کا نام اندر سبھا ہے۔ اس میں بھی صدہا قسم کی تصویریں ہیں۔ اکثر حصے ناتمام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی کاریگر بناتے بناتے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس غار کے کتبوں کو سٹر برجس نے نویں اور دسویں عیسوی کا بتایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر غار کی تعمیر الگ الگ زمانوں میں ہوئی ہے۔ اس غار کے وسط میں مندر ہے۔ گوشہ شرق و جنوب میں زینہ ہے جس سے بالائی منزل پر جاتے ہیں۔ اس میں ۳۰ ستون ہیں وسطی حصہ کی چھت میں کنول کا بہت بڑا پھول تراشا گیا ہے اس کے تمام ستون نقش ونگار سے آراستہ ہیں جن میں دو ستون زیر و بم کی آواز دیتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل حیرت میں آجاتی ہے۔ ایک ستون سے داہیں طبلہ جیسی آواز اور ایک سے بائیں طبلہ جیسی گمک نکلتی ہے۔ ایک محراب میں سایہ دار درخت کے نیچے سانپ بچھو اور ہرن ترشے ہوئے ہیں۔ گو یا موسیقی کے اثر سے مدہوش ہیں۔ غربی دیوار پر راجہ اندر ہاتھی پہ بیٹھے ہیں۔ سر پر برگد کے درخت کا سایہ ہے۔ یہ راجہ اندر کی محفل　یا اکھاڑہ ہے۔ برگد کے درخت پر چار ملائس بیٹھے راجہ اندر کو دیکھ رہے ہیں۔ سامنے راجہ اندر کی رانی ہیں ان کے سر پر آم کا درخت ہے جن میں چھوٹے بڑے آم لگے ہیں۔ بندر آم توڑ کر کھا رہے ہیں کہیں پریوں کا جھرمٹ ہے اٹکھیلیاں ہو رہی ہیں اور کہیں دیو دکھائی دیتے ہیں۔

ایلورہ کے غاروں کی خصوصیات

(۱) ہر عمارت کا جواب بنایا گیا ہے۔

(۲) ایک ہی پہاڑ میں تین تین منزلیں تراشی گئی ہیں۔

(۳) تمام عمارتوں میں عموماً دو طرفہ زینے تراشے گئے ہیں اور زینوں کی چوڑائی اتنی ہے۔ کہ چار پانچ آدمی ساتھ چل کر سیڑھیوں پر چڑھ سکتے ہیں

(۴) روشنی کا انتظام ایسا اچھا ہے۔ کہ آفتاب کی پہلی شعاع اندر کے بت پر پڑتی ہے۔

(۵) دالان کے تمام کمروں میں کافی روشنی رہتی ہے۔ اور صبح سے شام تک تمام عمارت کے اندرونی حصہ بھی تاریک نہیں ہوتے۔ صرف چند کمرے ایسے ہیں جن میں اندھیرا ہو جاتا ہے

(۶) بتوں کے اعضا کی بناوٹ اور تناسب کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۷) مہادیو۔ اور پاربتی کے مجسمے زیادہ ہیں۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہادیو جی سب سے پہلے انہیں پہاڑوں پر ظاہر ہوئے تھے۔ اور اپنی بیوی پاربتی جی کے ساتھ انہیں پہاڑوں پر رہتے تھے۔

چند مذہبی فرقے

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(از جناب زکریا فیاضی ایم اے۔ ایل ایل بی علیگ)

ذیل کے مضمون میں شیعہ، بوہرے اور خوجہ وغیرہ فرقوں پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالی گئی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی۔　　(ایڈیٹر)

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفٰے صلعم کی وفات یعنی ۶۳۲ء کے بعد مسلمانوں میں جانشین اور خلیفہ کے انتخاب کے مسئلہ پر سخت اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے نزاکت موقع اور اہمیت انتخاب کے پیش نظر بہ تعجیل تمام ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور حضرت ابوبکرؓ کو جو بلحاظ سن و تقوٰی بزرگترین تھے خلیفہ منتخب کر لیا۔ اس انتخاب میں عرب مہاجرین اور انصار کی ایک کثیر جماعت متفق تھی لیکن ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس انتخاب کو نہ صرف بہ نظر ناپسندیدگی دیکھتا تھا بلکہ اس کو ناجائز محض اور خلاف وصیت پیغمبر سمجھتا تھا۔ یہ گروہ خلافت یا امت کے عہدہ کو منصوص من اللہ یعنی خدا کی طرف سے سمجھتا تھا جس کے نزدیک اسکے اہل حضرت علیؓ اور آن کی اولاد کے سوا دوسرا شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ کے حقیقی جانشین حضرت علیؓ ہیں۔ لیکن اس طبقہ کی رائے کے خلاف حضرت علیؓ کے ہاتھ میں عنانِ خلافت بہت بعد میں پہنچی۔ مگر اس کے باوجود یہ طبقہ انکو برابر برسرحق اور امام المسلمین مانتا رہا یہیں سے مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف پیدا ہوا اور گو اس اختلاف کی خلیج ایک عرصہ تک محدود اور مسدود رہی لیکن بتدریج اختلافات وسیع ہوتے گئے، حتیٰ کہ ایک فریق اپنے تئیں شیعانِ علی اور محب اہل بیت کہلانے لگا اور دوسرا اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم ہوا۔

سنیوں کے نقطہ نظر سے خلافت کی ترتیب حسب ذیل طور پر عمل میں آئی

اول، حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ ہوئے جنہوں نے ۶۳۲ء سے ۶۳۴ء تک تقریباً ڈھائی سال تک فرائض خلافت انجام دیئے۔ دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق تھے جن کا دور خلافت ۶۳۴ء سے ۶۴۴ء تک یعنی دس سال رہا۔ ان کے زمانہ میں ایران فتح ہو کر حکومت اسلامیہ میں شامل ہو گیا اور سلطنت کی حدود بہت وسیع اور کشادہ ہو گئیں۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان تھے جو ۶۴۴ء سے ۶۵۶ء یعنی بارہ سال تک مسند خلافت پر متمکن رہے۔ ان کی شہادت پر حضرت علی خلیفہ منتخب ہوئے۔ ان کا زمانہ خلافت ۶۵۶ء سے ۶۶۱ء تک یعنی تقریباً پانچ سال رہا لیکن ابتدا ہی سے جنگ و جدل کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا انجام ان کی شہادت ہوئی۔ ان کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے لیکن انھوں نے خونریزی و جدال سے متاثر ہو کر حضرت معاویہ کے حق میں دستبرداری دیدی، اور اس طرح خلافت خاندان بنی امیہ میں منتقل ہو گئی۔ جنہوں نے اپنا پایۂ تخت مدینہ سے دمشق بنایا۔

بنی امیہ کی حکومت ۷۵۰ء تک قایم رہی۔ اموی خلفا عموماً اپنا زیادہ وقت انتظام امور سلطنت میں صرف کرتے تھے اور اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور مخالفوں اور حریفوں کے زیر کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ان کو مذہبی امور کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ جمعہ کو خطبہ پڑھنا اور نماز پڑھانا ضروری سمجھتے تھے۔ انکے زوال پر حکومت بنی عباس کے ہاتھوں میں پہونچ گئی جنہوں نے دجلہ کے مشہور شہر بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ ان کی حکومت ۵۰۰ برس یعنی ۱۲۵۶ء تک رہی۔ پہلا خلیفہ عبد العباس ابو جعفر منصور السفاح تھا۔ خلفائے عباسیہ کو زیادہ وقت حکومت کی تہذیب و اصلاح کی خاطر وقف کرنا پڑا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی امور آن علمائے دین کے ہاتھوں انجام پانے لگے جو خاص طور پر ان کے جاننے والے تھے۔ تباہی بغداد کے بعد دو سال تک کوئی خلیفہ نہ ہوا۔ پھر بنی عباس کے ایک فرد احمد ابوالقاسم نے قاہرہ میں خلافت قائم کی۔ سولھویں صدی عیسوی یعنی ۱۵۳۰ء میں سلطان سلیم عثمانی فاتح قسطنطنیہ نے بنو عباس کے آخری خلیفہ سے اپنے حق میں سند خلافت حاصل کر لی۔ اور خود خلیفہ بن گیا اسی کی خلافت کا سلسلہ تھا جسے ۱۹۲۱ء میں مصطفٰے کمال پاشا نے ختم کیا۔

حضرت عمرؓ نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی امور مذہبی کا انتظام اس طرح کیا کہ ہر شہر میں قاضی مقرر کئے جن کا لقب حاکم آنشرع تھا اور جن کا تقرر و تنزل براہ راست خلیفہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ عامل یا والی کے ماتحت نہ تھے۔ ان کا کام نماز پڑھانا اور عدل و انصاف کرنا تھا۔ ان کو خزانۂ عامرہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا حتی کہ ہارون الرشید کے زمانہ میں حنفی فقہ باقاعدہ سلطنت کا قانون بن گیا کیونکہ امام ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے۔ سنی فقہ کی ابتدا خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں ہوئی۔ اگرچہ اس کی ابتدا حضرت معاویہ ہی کے زمانہ میں پڑ چکی تھی یعنی آن کے زمانہ ہی میں احادیث کی صحیح طور پر ترتیب کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا تھا اور اس طرح فقہ اسلامی کی بنیاد قایم ہو چکی تھی۔ خلیفہ عمر ثانی کے دور میں ابو ابن شہاب الزہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے سب سے پہلے احادیث جمع کیں۔ اسی وقت عبد الملک ابن جریح نے بھی کچھ احادیث جمع کیں۔ ان کے بعد مالک ابن انس کی مؤطا۔ بلحاظ مضامین پہلی کتاب وجود میں آئی۔ ابو داؤد کی کتاب السنن بھی بہت مشہور ہے۔

عباسی عہد میں قانون فقہ کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ کوفہ اور مدینہ کے سب عالم بغداد میں جمع ہوگئے۔ اُنھوں نے قانون اسلامی کے اصول کو مدوّن و منضبط کیا۔ فقہ سنّی کے ماخذ قرآن۔ احادیث۔ اجماع اور قیاس ٹھہرے۔ ان کی ترتیب و تشکیل کے ذمہ دار (اول) امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ) تھے ان کے استاد حضرت امام جعفر صادق تھے۔ امام حنیفہ کے دو شاگرد مشہور ہیں (۱) امام ابو یوسف اور (۲) امام محمد ان کی فقہ **حنفی** کہلاتی ہے۔ اور اس فقہ کے ماننے والے حنفی ہیں جن کا زور شمالی ہندوستان، افغانستان۔ عرب۔ شام۔ ترکی اور مصر کے بعض حصوں میں ہے دوسرے امام مالک ابن انس (۹۵ھ تا ۱۷۹ھ) تھے۔ انکی فقہ کی پیروی کرنے والے **مالکی** کہلاتے۔ یہ بھی امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ ان کے پیرو زیادہ تر شمالی افریقہ، مراکش اور اسپین میں پائے جاتے ہیں، تیسرے امام ابو عبد اللہ محمدؐ بن ادریس الشافعی (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) تھے۔ ان کی فقہ اور مقلد **شافعی** کہلاتے ہیں۔ جن کی زیادہ تعداد جنوبی ہند اور قاہرہ میں ہے۔ چوتھے امام احمد بن حنبل ہیں ۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ تھے۔ ان کی فقہ اور مقلد **حنبلی** کہلاتے ہیں اور ان کا زور نجد میں ہے۔

سنّیوں میں مذہبی امور میں استفسار و تصفیہ کے لئے قاضی و مفتی کے فتووں کو کافی سمجھا گیا جو گذشتہ دور کے منفصلہ مقدمات سے نتائج اخذ کرتے اور حکم لگاتے ہیں۔ مذکورہ بالا اماموں کے علاوہ اور بھی اہلِ صاحبِ علم حضرات گذرے ہیں جنہوں نے مذہبی فقہ و خیالات کی تدوین میں بہت حصّہ لیا مثلاً ثوری (۹۷ھ تا ۱۶۱ھ) اور ابو عبداللہ ترمذی وغیرہ۔ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی نصف حصّہ میں واصل ابن عطا کے فلسفہ کا بھی بہت زور رہا۔ یہ بھی امام جعفر صادق کے شاگرد تھے اور بعد میں حضرت حسن بصری کے مواعظ میں بھی شریک ہوئے اور عقلیات کے قائل ہوگئے۔ اُنھوں نے مذہب اعتزال جاری کیا اور ان کے پیرو معتزلہ کہلاتے۔ لیکن اب مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ان کی کوئی آواز نہیں ہے۔

شیعہ من حیث الجماعت ابتدا ہی سے سنّیوں سے الگ ہوگئے۔ لیکن سنّیوں کی طرح ان کی جماعت میں بھی مختلف فرقے ہوگئے، جنھوں نے مختلف افراد کو اپنا امام مانا اور مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ فرقہ شیعہ قرآن کی تفہیم اور تفسیر اور مذہبی بنیادی اصولوں کی نوعیت کے لحاظ سے بھی سنّیوں سے اختلاف رکھتا ہے۔ یہ سوائے خاندان علی کے کسی اور کو مستحق امامت و خلافت نہیں سمجھتا اس کے اماموں نے شام و مصر اور شمالی افریقہ اور ایران میں حکومت کی ایران میں ۱۴۹۹ء میں صفوی خاندان کے برسر حکومت آجانے کے باعث شیعی مذہب پہلی مرتبہ حکومت کا مذہب قرار پا گیا۔ اسماعیل صفوی نے بالخصوص اپنے شیعی معتقدات کی ترویج و تبلیغ میں بہت زیادہ شدت سے کام لیا اور غیر شیعہ مسلمانوں پر بے انتہا مظالم توڑے اور حد سے زیادہ زیادتیاں کیں حتیٰ کہ اُن کو حدودِ مملکت سے باہر نکل جانے پر مجبور کیا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت حسن نے حضرت معاویہ کے حق میں دستبرداری دے دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن شیعہ حضرات ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسین کو اپنا امام مانتے رہے۔ حضرت حسین کی شہادت کربلا کے اندوہناک واقعہ میں ہوئی۔ ان کی اولاد میں حضرت زین العابدین سے سلسلۂ نسل جاری رہا۔ حضرت حسن کی اولاد عرب سے ترک سکونت کر کے افریقہ چلی گئی اور بربر اور مراکش کے علاقہ میں مقیم ہوگئی اور اُن کی نسل ایک شخص حضرت ادریس کے نام پر **ادریسی** کہلائی جس کا سلسلہ آجتک موجود ہے۔

حضرت زین العابدین کے دو صاحبزادے حضرت محمد باقر اور زید ہوئے۔ ایک گروہ حضرت زید کو اپنا امام ماننے لگا اور دوسرے نے محمد باقر کو امام ٹھہرایا۔ زید نے خلفائے بنی امیہ کے خلاف کوفہ میں بغاوت کی لیکن مارے گئے۔ بنی امیہ نے ان کی لاش کو جلا کر راکھ کو دریائے فرات میں بہا دیا۔ شیعوں میں پہلا اختلاف یہیں سے ہوا۔ امام زید کے پیروؤں نے جو زیدی کہلائے پہلے تین خلفاء کو بھی جائز خلیفہ اور جانشین رسول تسلیم کیا اس لئے بعض اہل کوفہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ وہ پہلے تین خلفاء یعنی ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کو صحیح وارث و جانشین نہیں مانتے تھے۔ یمن اور شمالی ایران میں زیدی فرقہ کے افراد اب تک موجود ہیں۔ محمد باقر کے بیٹے جعفر صادق کے کئی اولادیں ہوئیں جن میں اسمٰعیلؑ سب سے بڑے تھے اور موسیٰ کاظمؑ چوتھے بیٹے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنی زندگی ہی میں اسمٰعیلؑ کو وارث امامت بنا کر بصرہ بھیجدیا، کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں اسمٰعیلؑ بنی امیہ کے ہاتھوں قتل نہ ہو جائیں۔ بصرہ بھیجنے سے قبل امام صادق نے اسمٰعیلؑ کا ایک جنازہ بھی مدینہ میں نکالا تاکہ حکومت کے افسروں کو اُن کی وفات کا یقین ہو جائے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد اسمٰعیلؑ شام میں بمقام سلیمیہ مقیم ہوگئے اور تاجرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اور دس سال تک خفیہ خفیہ امامت کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن کسی پر یہ راز افشانہ ہونے دیا۔ ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مدینہ میں بہت سے دعویدار امامت پیدا ہوگئے۔ ان میں سے ایک موسیٰ کاظمؑ بھی تھے۔ ان کی اولاد کا سلسلہ امامت حسب ذیل ہے۔

(۱) موسیٰ کاظم (۲) علی الرضا (۳) محمد تقی (۴) علی نقی الہادی (۵) علی حسن العسکری (۶) محمد ابو القاسم المہدی

آخری امام مہدی تھے جو شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ۲۶۰ء اور ۲۶۶ء کے درمیان کسی تاریخ میں روپوش ہوگئے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ قیامت کے قریب ظہور کریں گے۔ اس سلسلہ کے اماموں کو ماننے والے شیعہ جس میں بارہ امام شامل ہیں **اثنا عشری شیعہ** کہلاتے ہیں ان کی بھی دو شاخیں ہیں۔ **اخباری اور اصولی**

حضرت اسمٰعیل کو امام ماننے والے اسمٰعیلی کہلائے۔ اس سلسلہ کے ایک امام نے شام سے بغاوت کر کے قیروان میں اپنی حکومت قایم کی اور معز الدین باللہ کے عہد میں مصر کو دارلحکومت بنایا اور ۹۶۲ء میں شہر قاہرہ کی بنیاد ڈالی۔ اور جامعہ ازہر قایم کیا۔ یہ فاطمی خلیفہ کہلائے۔ امام مستنصر تک اسماعیلی مقلدین میں کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا لیکن ان کی وفات پر ان کے تین بیٹے نزار، مستعلی، اور محمدؐ اور اس کے بعد ان کی اولاد خلیفہ ہوئی۔ اور یہیں سے اختلاف پیدا ہوا۔ ایک گروہ نے مستعلی اور اُن کی اولاد کو امام مانا اور **بوہرے** کہلائے دوسرے گروہ نے نزار کو امام مانا اور **اسماعیلی امامی** کہلائے۔ نزار کی اولاد آپس کے نزاع سے گھبرا کر المونت کے قلعہ میں متمکن ہوگئی اور مصر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا ابو القاسم الطیب مستعلوی بوہروں کے آخری امام ہیں جو اس فرقہ کے عقیدہ کے بموجب ۱۱۳۲ء کے قریب غائب ہوگئے۔ ان کے بعد اماموں کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن مذہبی تبلیغ و اشاعت کا کام داعظ کرنے لگے جو اب تک جاری ہے۔ اس وقت بوہروں کے سب سے بڑے مذہبی رہنما حضرت ملا سیدنا طاہر سیف الدین ہیں جو بمبئی میں رہتے ہیں

طیب کے بعد مصر کی حکومت ۵۶۶ھ کے قریب صلاح الدین ایوبی کے ہاتھ میں آگئی جس نے اسی سال۔۔۔ سنّی فقہ کی ترویج و اشاعت کی غرض سے مدرسہ شافعیہ اور مالکیہ جاری کئے۔ اس طرح اسماعیلی شیعہ دو حصوں میں منقسم ہوگئے (۱) مغربی اسماعیلی۔ جو یمن شام اور ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور **داؤدی اور سلیمانی بوہرے** کہلاتے ہیں۔

(۲) شرقی اسماعیلی۔ جو امام نزار کی اولاد کو امام مانتے ہیں یہ فرقہ شام فارس وسطی ایشیا اور ہندوستان میں موجود ہے۔ ہندوستان میں اس فرقہ کے افراد **خوجہ** کہلاتے ہیں جن کے "پیرخاں" سر آغا خاں ہیں۔

المونت میں اسمعیلیوں کی امامت کا سلسلہ ۴۸۳ھ سے شروع ہو کر ۶۵۴ھ تک جاری رہا۔ المونت کا مشہور قلعہ قزوین اور گیلان کے درمیان واقع ہے اسمٰعیلی تنظیم کے سات رکن تھے۔ (۱) شیخ (۲) داعی کبیر (۳) داعی (۴) رفیق (۵) فدائی (۶) لبسک (۷) عوام۔ اسی طرح روحانی عہدیداروں کے بھی سات طبقے تھے (۱) امام (۲) حجت (۳) مکاسر (۴) داعی (۵) ماذون (۶) مقلب (۷) اور مومن

المونت میں اسمٰعیلی فرقہ کی زندگی میں حسن بن صباح کی جدوجہد اور جاں نثاری نے روح تازہ پیدا کردی۔ اُس نے مذہب میں بے شمار اصلاحات کیں اور حسب ذیل امور کو مذہب کی بنیاد ٹھیرایا۔

(۱) امامت کے درجہ کا امام کی نسل کے یکے بعد دیگرے وارث ہونے پر ایمان و یقین رکھنا۔

(۲) قرآن مذہبی کتاب ضرور ہے مگر اس کے الفاظ مقصود بالذات نہیں ہیں ہر آیت میں ایک خاص معنی پوشیدہ ہوتے ہیں جن کی طرف الفاظ محض رہنمائی کرتے ہیں۔ آیت کے اس خاص معنی کو صرف جانشین امام ہی بتا سکتا ہے۔

(۳) مقررہ عبادات اور اُن کے اوقات کی پابندی کو ترک کیا اور بتایا کہ اصلی اور سچی عبادت دل ہی میں ہونی چاہئے۔ معبود حقیقی کی صرف دلی عبادت کرنی چاہئے۔

چھٹی صدی ہجری کے آخر میں چنگیز خاں نے ایران پر حملہ کیا۔ اس کے جانشین ہلاکو خاں کے عہد حکومت میں رکن الدین اسمٰعیلی امام تھے تاتاریوں کی فوج نے ۶۵۴ھ میں المونت کے قلعہ کو فتح کر لیا اور اس امام کو پکڑ کر دریا میں بہا دیا۔ اس کے بعد امامت ایران کے دوسرے حصہ آذربائیجان میں منتقل ہوگئی اور امام رکن الدین کے بیٹے شمس الدین محمد امام ہوئے۔ ان کی اولاد ۱۲۳۳ھ تک ایران میں حکومت کرتی رہی امام شمس الدین نے اپنے بڑے بیٹے پیر شمس کو ہندوستان میں اسمٰعیلی مذہب کی تبلیغ کے لئے مامور کیا ایک دوسرے داعی پیر صدر الدین نے جو اسلام شاہ کے حکم سے ہندوستان آئے ہندو مذہب کی کتابوں اور شاستروں سے معلومات حاصل کیں اور انہیں اسلامی فلسفہ میں شامل کر لیا اور ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ اور **خوجہ** لقب دیا جو اب عام طور پر خوجہ کے نام سے مشہور ہیں خوجہ دراصل خواجہ ہے جس کے معنی تاجر معزز اور صاحب خانہ کے ہیں۔ خوجہ قوم میں زیادہ تر لوہار اور بھاٹیہ قوم کے افراد شامل ہیں۔ اسلام شاہ کے بھیجے ہوئے داعیوں نے پنجاب کشمیر سندھ۔ گجرات کاٹھیاواڑ اور دکن میں اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ دکن میں پیر تاج الدین مشہور داعی ہوئے۔ امام ابو ذر علی نے طہماسپ شاہ ایران کی بیٹی صابرہ خاتون سے شادی کی۔ دربار سے امیر الامرا کا خطاب ملا اور اس طرح اسمٰعیلیوں اور اثنا عشریوں میں دوبارہ اتحاد قایم ہوا۔

ایک دوسرے امام ابوالحسن علی نادر شاہ کے ہمراہ ہندوستان بھی آئے تھے ۱۱۱۱ھ میں کریم خاں زند ایران کا مالک بن بیٹھا۔ اُس نے بھی اسمٰعیلیوں کے دوستی کے سلسلہ کو برقرار رکھا اور اپنے تئیں وکیل امام ظاہر کیا۔ فتح علی شاہ قاچار نے خلیل اللہ علی (متوفی ۱۲۳۳ھ) کے بیٹے حسن علی کو آغاخاں کا خطاب مرحمت کیا۔ اس کے بعد مرکز امامت ہندوستان منتقل ہو گیا جو آجتک قایم ہے۔

حسن علیشاہ آغاخاں اول کی شادی فتح علیشاہ قاچار کی بیٹی سے ہوئی۔ وہ جنگ سندھ کے وقت ہندوستان آئے۔ جنگ افغانستان کے موقعہ پر انگریزوں کی مدد کے صلہ میں انھیں ہز ہائی نس کا خطاب ملا اور تین ہزار روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر ہوا۔ انھوں نے کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ یہ اسمٰعیلیوں کے چھیالیسویں امام تھے۔ ان کے بعد انکے بیٹے علیشاہ آغاخاں ثانی امام ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا اسمٰعیلیوں کے موجودہ امام جو سلسلہ کے لحاظ سے اڑتالیسویں امام ہیں سلطان محمد آغاخاں ثالث ہیں۔ یہ بمقام کراچی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ نواب عالیہ شمس الملک مرزا علی محمد خاں نظام الدولہ بن عبداللہ خاں امین الدولہ ابن حاجی محمد حسن خاں اصفہانی وزیراعظم فتح علیشاہ کی بیٹی تھیں اور ایران کے مشہور ادیب اور شاعر عبدالوہاب نشاط اصفہانی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ آغاخاں کے القاب و آداب بکثرت ہیں ان کے پیرو ان کو امام زماں، حاضر امام، صاحب الامر، ہادی الہدیٰ، دھنی سلامت داتار، حاضر جو پیجو دھنی، امام العصر، امام مبین اور قائم المقام کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ اسلام مذہبی اعتبار سے دو بڑے فرقوں یعنی شیعہ اور سنی میں منقسم ہے۔ لیکن ان میں سے بھی ہر ایک کی شاخیں ہو گئیں اور جس طرح سنی چار فرقوں میں تقسیم ہو گئے اسی طرح شیعہ بھی چار حصوں میں بٹ گئے اور یہ سب فرقے آج تک موجود ہیں۔

ہندوستان میں سنیوں میں حنفی۔ شافعی اور شیعوں میں اسماعیلی خوجے بوہرے اور اثنا عشری موجود ہیں۔ اسماعیلیوں اور بوہروں کی مذہبی کتابیں ابھی تک پریس سے شائع نہیں ہوتی ہیں اس لئے اُن کے صحیح مذہبی معتقدات کا علم حاصل کرنا دشوار ہے۔ وہ اپنے اپنے مذہبی پیشوا اور رہنما کے اقوال کو سند مانتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ خوجوں کے مذہبی پیشوا آغاخاں کو حق کامل حاصل ہے کہ وہ جس شخص کو چاہیں اپنی جماعت میں داخل کریں یا خارج کردیں اور جو کچھ نذر و نیاز دی جاتی ہے وہ اُن کی ذاتی ملکیت ہو جاتی ہے کسی وقت یا مفاد امور عامہ کے لئے نہیں ہوتی۔ لیکن داؤدی بوہروں میں ملاجی خیرات اور نذر و نیاز کے صرف نگراں و محاسب ہیں، مالک نہیں دنیا میں شیعہ فرقہ کی تعداد سنی فرقہ سے بہت کم ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانان عالم میں شیعہ افراد کی کل تعداد چھ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں ان کی کل تعداد ۲۰ لاکھ کے قریب ہے گویا سنی فرقہ کے مقابلہ میں تقریباً ۷ فیصدی۔

نفسی نفسی!

زور آور دبائے جاتا ہے ناتواں کو ستائے جاتا ہے
نفسی نفسی پڑی ہے عالم میں ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

(حکیم بسمل فرخ آبادی)

گذشتہ صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام

علما کی تنظیمی قابلیت، سیاسی خدمات اور حکومت برطانیہ کا مقابلہ

(از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء)

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے نام سے ایک نہایت مفید اور اہم کتاب تصنیف فرما رہے ہیں ذیل کا مضمون اسی کتاب کے چوتھے باب کا ایک حصہ ہے جسے نوجوان مصنف نے جوبلی نمبر میں شائع ہونے کے لئے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ اس مضمون میں گذشتہ صدی کے جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی نہایت اہم کڑیاں ہیں۔ جو عام طور سے فراموش کردیگئی ہیں اور جن سے عوام تو در کنار خواص اور اہل علم میں سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس مضمون کے مطالعہ سے اس وسیع اور مستحکم نظام کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو گذشتہ صدی میں ہندوستان میں قائم تھا نیز اس سے علماء کے ان کارناموں اور قربانیوں کا ایک سرسری حال معلوم ہو سکتا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو منظم کرنے اور حکومت کا مقابلہ کرنے میں کی ہیں۔ امید ہے ناظرین شوق اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔ (ایڈیٹر)

مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیم

مولانا سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد جماعت کے باقیماندہ لوگ ستھانہ چلے گئے۔ جہاں انھوں نے اپنا مرکز قائم کرلیا۔ ہندوستان میں اس عظیم الشان تحریک جہاد، اصلاح و تنظیم کا مرکز عظیم آباد پٹنہ اور اس کا محلہ صادق پور تھا، سید صاحبؒ نے میدان جنگ سے دو بزرگوں مولانا سید محمد علی صاحب رامپوری اور مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کو تبلیغ و اصلاح کے لئے ہندوستان روانہ کیا تھا۔ مولانا ولایت علی صاحب ۱۲۴۶ھ میں حیدرآباد (دکن) میں تھے کہ بالاکوٹ کے حادثہ کی اطلاع ملی۔ سید صاحب کے خلفاء عظام میں اب صرف آپ کا اور مولانا محمد علی صاحب کا دم باقی تھا، مولانا محمد علی صاحب مدراس میں تھے اور سارا بار آپ پر تھا، آپ نے پٹنہ آکر کام اپنے ہاتھ میں لیا، اور اپنی مسیحا نفسی، روحانیت، تنظیمی قابلیت اور جدوجہد سے پژمردہ جسموں اور مردہ دلوں میں روح پھونک دی۔ لوگوں سے از سر نو بیعت لی بیت المال قائم کیا، مرکزی مساجد میں خطیب اور واعظ مقرر کئے، بنگال اور دوسرے صوبجات و اقطاع میں اپنے مبلغ بھیجے، قصبات و دیہات کی اصلاح و ہدایت کے لئے لوگ مقرر کئے مجمعوں اور میلوں میں وعظ شروع کیا، گاؤں گاؤں اور دیہات دیہات کا دورہ کیا، اکثر آپ کو اپنے مرکز اور مقام میں پہونچنے میں مہینوں اور برسوں لگ جاتے۔ درس و تزکیہ، اصلاح و تربیت کے مشاغل سفر و حضر میں جاری رہتے آپ کا مکان اور پورا محلہ ایک معمور درسگاہ، ایک آباد خانقاہ اور ایک منظم تربیت گاہ تھی اس تمام مدت میں اس مرکز کا تعلق سرحد کے مرکز سے قائم رہا۔ اور وقتاً فوقتاً آپ کے اعزہ و تلامذہ وہاں کے کاموں میں شریک ہوتے رہے۔ دو مرتبہ آپ خود تشریف لے گئے اور ۱۲۶۹ھ میں وہیں انتقال فرمایا، آپ کے بعد اور آپ کی زندگی میں آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے جانشین و اعزا مولانا فرحت حسین صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب اور مولانا یحییٰ علی صاحب نے پورے انہاک اور قابلیت سے یہ خدمات انجام دیں اور ایک منظم سلطنت کی طرح اس نظام کو چلایا یہ نظام اپنی وسعت و استحکام مبلغین کی سیرت و اخلاق اور جوش و ایثار میں ایک بے نظیر نظام تھا جس کی مثال مسلمانوں کے داخلہ سندھ سے لیکر اس وقت تک ہم کو ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا۔

اس جماعت و تحریک کا سب سے بڑا دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں لکھتا ہے،

"یہ لوگ مشنریوں کی طرح انتھک کام کرتے تھے، وہ بے لوث و بے نفس لوگ تھے، جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا، وہ روپیہ اور آدمی پہنچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے، ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا"

"میرے لئے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں، ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے، اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لئے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے"

"جہاں تک مجھکو تجربہ ہے یہ یقینی ہے کہ وہابی مبلغین سب سے بڑے روحانی، اور کم سے کم خود غرض نوع کے لوگ ہیں"

مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی کے متعلق لکھتا ہے:-

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے، وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغین سے خط و کتابت رکھتے تھے، اور انھوں نے ایک اصطلاحی زبان میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں جن کو وہ خود استعمال کرتے تھے، اور جن کے ذریعہ وہ اطمینان سے بڑی بڑی رقمیں سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ (ستھانہ) بھیجتے تھے، وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے، اور مذہبی دیوانوں کی فوج کو بندوقیں چانچکر بھیجتے طلبہ کو روحانی اور دینی درس و تعلیم دیتے، انھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ سے عربی کے علماء و مصنفین سی اعلیٰ واقفیت پیدا کرلی تھی۔

لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ یا بالفاظ خود چھوٹی خانقاہ سے سرحد پار باغیوں کے مرکز "بڑی خانقاہ" کو رنگروٹ بھیجنا تھا، بنگالی متبعین کو راستہ میں صدہا بے تکے اور پریشان کن سوالات کا جواب دینا پڑتا

تھا، اس کو پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع صوبوں میں سے ہوکر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا، جہاں ہر گاؤں میں اس کی جسمانی شکل اور زبان اسکو اجنبی ثابت کرتی تھی، اس خطرناک کام میں یحییٰ علی ہی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت کام کر رہی تھی، انھوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیر دستین کر دیئے تھے، جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے، یحییٰ علی کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب کئے ہوئے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھی پکڑے جانیکا خوف خطر، شناخت ہوجانا، انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف آمادہ نہ کر سکا۔"

اس تنظیم کی وسعت اور جماعت کی سیرت کے متعلق بنگال کے کمشنر پولیس کی یہ شہادت پڑھنی چاہیئے۔

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اتنی ہزار ہیں، جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے، جن میں ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں، اس کو کسی بات سے عذر نہیں ہوتا،[۵۱]

"مشرقی بنگال میں ہر ضلع بغاوت کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور پٹنہ سے سمندر تک گنگا کے تمام راستہ میں مسلمان کسان باغیوں کے مرکز کے لئے ہفتہ وار امداد دیتے تھے۔"

اس تحریک و تبلیغ سے عام مسلمانوں میں جہاد کا جو جذبہ اور ولولہ پیدا ہوگیا تھا، اس کی مثال کم سے کم ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ملتی۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لئے علٰحدہ کر کے رکھ لیتے تھے، جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لئے ستھانہ جاکر خدمت کرتے تھے، جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہکر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضہ جہاد کے ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔"

"کوئی وہابی باپ اپنے کسی غیر معمولی دیندار بیٹے کے متعلق نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس وقت (جہاد کے لئے) اسکے گھر سے غائب ہو جائے۔"

مسٹر جیمس او کینلی لکھتا ہے:۔

"کمزور و بزدل بنگالی مسلمان خونخواری اور جوش جہاد میں افغانوں سے کم نہ تھے۔"

جماعت کے نظام کا حال مندرجہ ذیل اقتباس سے معلوم ہوگا، ڈاکٹر ہنٹر اس جماعت کے ایک رکن کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس کا تحصیل عشر و زکوٰۃ کا طریقہ بہت سادہ اور مکمل تھا، اس نے مالگذاری کی حیثیت سے متعدد گاؤں مجموعوں میں تقسیم کر دیئے تھے، ہر مجموعہ پر ایک خاص محصل مقرر تھا یہ افسر اپنی جگہ پر ہر دیہات کے لئے ایک تحصیلدار مقرر کرتا تھا، آئی ہوئی رقموں کو وہ جانچتا، اور ضلع کے مرکز کو بھیجدیتا قانوناً ہر دیہات میں ایک محصل مقرر تھا، لیکن جن دیہاتوں میں آبادی زیادہ ہوتی تھی، وہاں اس کام کے لئے ایک عملہ رکھنا پڑتا تھا جن میں سے کچھ دین کے سردار ہوتے تھے جو نماز پڑھاتے تھے، اور چندہ وصول کرتے تھے، کچھ عام منتظم "دیہات کے سردار" ہوتے تھے، یہ جماعت کے دنیاوی امور کا انتظام کرتے تھے، اور ایک افسر جو خطرناک خطوط اور بغاوت کے پیغامات پہنچاتا تھا۔"

حکومت برطانیہ کی مخالفت

گذشتہ ابواب سے واضح ہو چکا ہے کہ سید صاحبؒ کی تحریک ایک مستقل جہاد و اصلاح کی تحریک تھی، ناگزیر حالات کی بنا پر اس کا رُخ ابتداء میں سکھوں کی طرف تھا، لیکن اس کے پورے پروگرام کا علم صرف جماعت کے مخصوص لوگوں کو تھا، جو اسلامی غیرت و فراست ایک صوبہ میں غیر اسلامی اقتدار گوارا نہ کر سکی، وہ اس کو پورے ملک میں کس طرح گوارا کر سکتی تھی۔ لیکن ہر صاحب بصیرت کیلئے گو واقعات و اقدامات کی یہی طبعی اور مناسب ترتیب تھی جو ظہور میں آئی۔

کپتان کننگھم (تاریخ سکھ) میں لکھتا ہے:۔

"سید احمد صاحب کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں سے ان کی مراد صرف سکھ تھے، لیکن ان کے صحیح مقاصد پورے طور پر نہیں سمجھے گئے، وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے، لیکن ایک وسیع اور آباد ملک پر ایک دور دراز کی قوم کا اقتدار ان کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا۔"

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو مجاہدین کا رُخ ان کی طرف پھر گیا مولانا ولایت علی صاحب اور ان کی جماعت نے حالات کے تغیر اور خطرہ کا احساس کیا، اور شروع سے اپنے دائرہ عمل کو وسیع رکھا،

ہنٹر لکھتا ہے:۔

"مجاہدین کی ضرب سکھوں کے دیہاتوں پر شدید تھی لیکن وہ انگریز کافروں پر ضرب لگانے کے ہر موقع کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے تھے، انھوں نے کابل کی جنگ میں ہمارے دشمنوں کی مدد کے لئے ایک بڑی قوت بھیجی، اور ان میں سے ہزار ایک ہمارے مقابلہ میں موت تک جمے رہے، صرف غزنی کے سقوط میں ان کے تین سو آدمیوں نے انگریزی سنگینوں سے شہادت کی خوشی حاصل کی"

"پنجاب کے الحاق کے بعد جو غصہ پہلے سکھوں پر اترتا تھا اب ان کے جانشینوں (انگریزوں) پر اترنے لگا۔"

ہندوستانی مجاہدین کے متعلق ہنٹر لکھتا ہے:۔

"ان کی تبلیغ تھی کہ غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت مسلمانوں کو زندگی گذارنے کی شرعاً اجازت نہیں، جہاں غیر مسلم کی حکومت ہو وہاں صرف دو صورتیں ہیں اگر قدرت ہو تو جہاد ورنہ ہجرت، اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔"

ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے کہ (جس سے اسکی ساری کتاب رنگی ہوئی ہے) اس جماعت کے مبلغین اور پٹنہ کے پیشوا حکومت ہند کے خلاف علانیہ تبلیغ جہاد کرتے تھے،

حکومت ہند کے انتظامات

ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:۔

"۱۸۴۷ء میں سر ہنری لارنس نے یہ کارروائی قلمبند کی کہ مولانا ولایت علی اور عنایت علی پنجاب میں "غازی دین" اور "مجاہد اسلام" کے لقب سے مشہور ہیں، ان کو اپنے مکانوں میں پٹنہ میں نظربند رکھا جائے، پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان کی ضمانت لی، اور جماعت کے دوسرے بہت سے دولتمند ارکان سے بھی "نیک چلنی" کے مچلکے لئے،

"لیکن ۱۸۵۰ء میں ان کو جنوبی بنگال کے ضلع راج شاہی میں بغاوت کی تبلیغ کرتے ہوئے پایا گیا۔ جہاں ان سے حفظ امن کے لئے ضمانتیں لی گئیں، اور دوبارہ تبلیغ کرنے کی وجہ سے ان کا دو مرتبہ ضلع سے اخراج ہوا ۱۸۵۱ء میں سید صاحب کے بھی خلفاء جو اپنے شہر میں نظربند تھے، سرحد پر بغاوت پھیلانے کی تبلیغ کرتے ہوئے پٹنہ میں پائے گئے،

۱۸۵۲ء میں ان کو اپنی تدبیر میں بہت کچھ کامیابی ہوئی آدمی اور روپیہ ستھانہ کیمپ کثرت سے بھیجے گئے، اور پنجاب کے حکام نے ہماری فوجوں سے ان کی ایک باغیانہ خط و کتابت پکڑی، ان کے پیشواؤں نے ہماری چوتھی فوج سے سازباز کرنے کی بڑی مشاقی سے کوشش کی، جو راولپنڈی میں باغیوں کے کیمپ سے بہت قریب ٹھیری ہوئی تھی اور اس رجمنٹ کا جزو تھی جو ہمارے صوبہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے انکے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی،

خطوط سے ثابت ہوتا تھا کہ بنگال سے باغیوں کے کیمپ کو آدمی اور اسلحہ بھیجنے کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہے، اسی زمانہ ۹ اگست ۱۸۵۲ء میں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ باغی جماعت اور باغیانہ خیالات ترقی پر ہیں، انگریزی صوبہ کے اس دارالسلطنت (پٹنہ) کے خاص باشندے علانیہ بغاوت کی تبلیغ کرتے ہیں، پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے اور ان کے ایک سردار (مولوی احمد اللہ صاحب) نے اپنے مکان میں سات سو آدمیوں کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے مزید خانہ تلاشی ہوئی تو وہ ہتھیاروں سے مقابلہ کریں گے، حکومت برطانیہ اب زیادہ دنوں تک اپنے علاقہ میں ایک باغیانہ ادارہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتی، ۱۸۵۲ء کی فصل خزاں میں لارڈ ڈلہوزی نے دو اہم کارروائیاں قلمبند کیں انھوں نے اندرونی ادارہ کی پوری نگرانی اور ان سرحدی قبائل کے خلاف مہم بھیجنے کی ہدایت کی جن کی کافروں کے ساتھ دینی نفرت کو ہندوستانی مجنونوں نے ہوا دے کر مشتعل کر دیا تھا، اسی سال انھوں نے ہمارے حلیف امب کے رئیس پر حملہ کیا، اور ہم کو ایک برطانوی فوج اس کی امداد کے لئے بھیجنی پڑی ۱۸۵۳ء میں ہمارے متعدد دیسی سپاہی باغیوں سے خط و کتابت کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوئے،

(اس کے بعد ۱۸۵۷ء و ۱۸۶۳ء کی سرحدی جنگوں کا ذکر اور ۱۸۶۴ء کے مشہور مقدمہ سازش (انبالہ) کی تفصیل ہے)

[۵۱] "مسلمانانِ ہند" ڈاکٹر ہنٹر خط نمبر ۱۰۰ مورخہ ۲۲ مئی ۱۸۴۳ء و نمبر ۵۰ ۱۸۴۷ء

موت کا استقبال

(از جناب بسمل سعیدی ہاشمی)

سُن اے خمخانۂ ہستی میں جامِ مرگ کے ساقی   جہانتک رہ سکے انسانیت انسان میں باقی
جہانتک جوہرِ غیرت کو قائم رکھ سکے انساں   جہانتک نفس کی عزت کو قائم رکھ سکے انساں
جہانتک عظمتِ انسانیت کو وہ نہ کھو بیٹھے   جہانتک اپنے انسانی شرف کو وہ نہ رو بیٹھے

اُسے حق ہے وہ جی سکتا ہے انسانوں کی بستی میں
مثالِ شمع رہ سکتا ہے وہ فانوسِ ہستی میں

زمانہ، آدمیت کا تحمل کر سکے جب تک   مئے الفت سے جامِ دل کو انساں بھر سکے جبتک
رہے ماحولِ انساں پاک جبتک بیوفائی سے   محبّت کر سکے دنیا میں جبتک بھائی، بھائی سے
جیے بے لوث جبتک خانۂ امروز و فردا میں   رہے محفوظ جبتک آبروِ انساں کی دُنیا میں

بصد عیش و طرب لیل و نہارِ زندگی دیکھے
ریاضِ دہر میں انساں بہارِ زندگی دیکھے

اگر افعال انسانی بہائم سے نہ شرمائیں   اگر انسان سے اوصافِ انسانی نہ چھن جائیں
اگر انساں کی خودداری نہو شرمندۂ ہستی   اگر اوجِ شرافت ہو نہ پامالِ غمِ پستی
بشر سے دُور گر احساس کا جوہر نہ ہو جائے   جہاں میں زندگی گر موت سے بدتر نہ ہو جائے

تو حقِ زندگی انسان کو حاصل ہے دنیا میں
اُسے حق ہے مرے بھی وہ تو جینے کی تمنا میں

مگر انسان سے انسانیت جب دور ہو جائے   مگر انسان جب حالات سے مجبور ہو جائے
مگر جب زندگی غیرت کا استیصال کر ڈالے   مگر جب زندگی اخلاق کو پامال کر ڈالے
مگر جب زندگی محتاجِ لطفِ مائے و تو کر دے   مگر جب زندگی انسان کو بے آبرو کر دے
مگر جب زندگی اکّالِ ایثار و مروت ہو   مگر جب آدمی دنیا میں ننگِ آدمیت ہو
مگر جب پاسِ ننگ و نام کی طاقت نہو دل میں   حمیت بھی اگر ہو دل میں تو حالت نہو دل میں
مگر جب زندگی ہو مہلکِ اوصافِ انسانی   مگر جب زندگی ہو اک ندامت اک پشیمانی

مگر جب تنگ ہو دنیا کی وسعت زندگانی پر
تو پھر اک بار کیا سو بار لعنت زندگانی پر

اگر لیں زندگی کا جائزہ ہندوستاں والے   خصوصاً جس جگہ دہری مصیبت ہے وہاں والے
بہیمیت پر انساں جس جگہ مجبور ہوتا ہے   مرتّب غیر انسانی جہاں دستور ہوتا ہے

جہاں مفقود ہوں اسباب ساری زندگانی کے   جہاں مسدود ہوں ابواب ساری زندگانی کے
جہاں اپنے اور اپنوں کے سوا سب جانور ٹھیریں   طلبگارِ حقوقِ زندگی دریوزہ گر ٹھیریں
زیادہ ہو جہاں ایمان سے قانون کی قیمت   جہاں پانی سے کم ہو آدمی کے خون کی قیمت
جہاں مستثنیاتِ خاص کے احکام جاری ہوں   اصولِ عدل اپنی غیر آئینی سے عاری ہوں
جہاں محنت زیادہ لیکے کم مزدوری ملتی ہو   جہاں اوروں کی عریانی سے پوشاک اپنی سلتی ہو
غلط جذبہ شرافت کا جہاں رہنِ غلامی ہو   نمکخواری کی لعنت داخلِ ذہنِ غلامی ہو
جہاں ہو فرض صرف امتیازِ ما و تو رہنا   مدارِ آبرو ہو جس جگہ بے آبرو رہنا
جہاں انساں نہ سمجھا جائے فاقے کرنیوالوں کو   غم و غصہ کھلایا جائے بھوکے مرنے والوں کو
جہاں مجبور کر کے جنکو خود ترغیب دی جائے   انہیں جرموں پہ کمبختوں کی دار و گیر کی جائے
جہاں تاثیر سے فریاد کی محروم ہو انساں   محبت سے جہاں اولاد کی محروم ہو انسان
نہ تعلیم اُن کی ممکن ہو نہ ممکن تربیت انکی   جہالت ہو سرشت انکی غلامی ذہنیت انکی
جہاں افلاس و بدحالی کے پردے تک حائل ہوں   کہ رشتوں کے برتنے کے مواقع بھی نہ حاصل ہوں
دعا مقبول اور مسموع نالہ ہی نہو کوئی   جہاں فریادیوں کی سننے والا ہی نہو کوئی
اگرچہ گریہ و زاریِ محزوں بے اثر نشود   مگر "در میکدہ" "ایں حادثہ اصلا خبر نشود"

معاذ اللہ، اِن حالات میں جب زندگی گذرے
کہ جن میں زندگی خود منفعل ہے جینے والوں سے

تو اے پیکِ اجل اے ساقیِ جامِ فنا آجا   پیامِ زندگیِ آبرو دیتا ہوا آجا
پلا دے وہ شرابِ تند جسکو موت کہتے ہیں   کسلمندانِ ہستی آرزو میں جس کی رہتے ہیں
چھپا دے خاک کے دامن میں انسانی معائب کو   سلا دے موت کی آغوشِ راحت میں مصائب کو
خدارا ختم کر دے زندگی کی لعنتیں آکر   سکونِ مرگ کی ہم کو عطا کر رحمتیں آکر
نہ رکھا زندگی نے آہ دنیا میں کسی قابل   نہیں سامان اپنی موت کے بھی گو ہیں حاصل
گوارا ہم کو بے گور و کفن لاشوں کا سڑنا ہے   مگر منظور دامن موت کا چہروں پہ پڑنا ہے

بصد جاں، تیرا استقبال ہم کرنے کو بیٹھے ہیں
ہمیں جینا نہیں ہے راس ہم مرنے کو بیٹھے ہیں

تعلیم اور اسلام

(از جناب اصغر صاحب محزوںؔ دار العلوم دیوبند)

ہمیر برگنسال (مشہور جرمن مستشرق) کا مقولہ ہے کہ "عربی لٹریچر کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے عرب میں آفتاب رسالت طلوع ہوا"۔ یہ مقولہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ مذہب اسلام نے عبادات و اعتقادات کے ساتھ تعلیم پر بھی بے انتہا زور دیا ہے۔ اگر ہم صرف قرآن مجید کی ورق گردانی کریں تو معلوم ہوگا کہ اس مختصر سی کتاب میں پانچسو سے زائد مقامات میں مسلمانوں کو تعلیم اسلام پر اکسایا گیا ہے اور ان کے دلوں میں علم کا شوق پیدا کرنے کے لئے عالم کے درجات کو آسمان کی رفعتوں سے بھی بلند و بالا دکھلایا گیا ہے۔ یہی حال احادیث رسول اللہ صلعم کا ہے آپ نے لوگوں کو متعدد ذرائع سے علوم و فنون سیکھنے کی ترغیب دلائی ہے اور اس بارے میں اس قدر شدت و اعتنا سے کام لیا ہے کہ اگرچہ محدثین کی تحقیق کے مطابق طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ کا مقولہ آنحضرت صلعم کا ارشاد گرامی نہیں ہے۔ لیکن اسلام کے بڑے بڑے علماء نے معنوی اعتبار سے اسے حدیث رسول کا درجہ دیا ہے۔ قرآن و حدیث کی اس تلقین و تشویق کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ممالک فتح کرنے سے زیادہ تعلیم کے حصول کی طرف توجہ کی اور انھوں نے اس میدان میں وہ ترقی حاصل کی کہ آج سارا عالم ان کا منت گذار ہے مسلمانوں کے دور عروج میں علوم و فنون کی جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کے اندازہ کے لئے حکما، و مورخین کے اقوال کی چھان بین کی ضرورت نہیں ہے اگر آپ صرف یورپ کے علمی خزانوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر اسلام کے علمی جواہرات سے معمور ہیں۔ آج یورپ جن علمی ترقیوں کو اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دے رہا ہے اور جن کو پیش کرکے وہ خود ہم سے خراج تحسین حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ہی بلاغ علم کے برگ و بار ہیں جس کو ہمارے آباؤ اجداد نے آج سے صدیوں پیشتر لگایا تھا اور جس کو ہم نے اپنی بدقسمتی سے غیروں کے حوالہ کردیا ہے۔ اسلام نے علم کی قدردانی اور قدر افزائی اس وقت شروع کی جب دنیا کے بتکدہ میں علم ایک بالکل بے مایہ چیز تھی۔ یورپ کے بڑے ممالک جو آج علوم فنون کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں، چند انسانی توہمات اور مذہبی خرافات کے پجاری تھے اور انہی کو وہ علم کی کل کائنات خیال کرتے تھے۔ ایشیا کے ممالک میں ہندوستان تہذیب اور علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لیکن یہاں بھی علم کروڑوں انسانوں میں سے صرف برہمنوں کے ایک مخصوص اور محدود طبقہ کی ملکیت سمجھا جاتا تھا اور ان کا مبلغ علم بھی مہابھارت اور رامائن وغیرہ خرافاتی کتابوں میں محدود تھا۔ جہالت ظلمت کی اس گھنگھور گھٹا میں جو تمام دنیا پر چھائی ہوئی تھی، جزیرۃ العرب کے ایک گوشہ سے علم کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور تھوڑے دنوں کے اندر تمام دنیا کو اپنی روشن اور چمکیلی کرنوں سے منور کردیتا ہے۔ اسلام کی ترقی کے ساتھ ساتھ علم کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور اسکا اس درجہ بول بالا ہوتا ہے کہ آج تمام دنیا اسکے زمزموں سے گونج رہی ہے۔

اسلامی خلفاء اور علم کی قدردانی

اسلام کے عروج و اقبال کے زمانہ میں علم کو جو رفعتیں نصیب ہوئیں ان کے بیان کے لئے دفتر درکار ہیں۔ اسلامی تعلیمات نے مسلمانوں کے اندر تحصیل علم اور اکتساب فن کا وہ شوق و ولولہ پیدا کردیا تھا کہ وہ اس کے لئے ہر قسم کی مشقتیں برضا و رغبت برداشت کرتے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ اس زمانہ کے جو خلفاء تھے وہ خود علم اور اہل علم کے بہت بڑے قدرداں ہوتے تھے۔ شہزادگان کے لئے اٹھارہ علوم کا جاننا ضروری تھا اور ان کے پڑھانے کے لئے ائمہ فن مقرر ہوتے تھے جو بوقت ضرورت شہزادوں کو مارتے پیٹتے بھی تھے اور شہزادے اپنے استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ہر خلیفہ کا ایک الگ کتب خانہ ہوتا تھا۔ ابوجعفر منصور نے روم سے فلسفے کی کتابیں منگائیں اور لاکھوں روپے کے خرچے سے ترجمہ کرایا۔ مامون نے جزیرہ قبرص پر محض چند فلسفے کی کتابوں کی وجہ سے چڑھائی کی اور ان کو حاصل کرنے کے بعد جزیرہ مذکور کو آزاد کردیا۔

مدارس اسلامیہ اور اس کے انتظامات

اسلامی عروج کے زمانہ میں ہر ہر شہر میں بکثرت مدارس کھلے ہوئے تھے صرف قرطبہ (اسپین) میں اُس کی تعداد اسی تھی۔ سسلرنو میں ایک کالج تھا۔ جس میں یورپ کے ہر خطے کے طلبہ آ آکر تحصیل علم طب کیا کرتے تھے۔ بغداد میں دار العلوم نظامیہ قائم تھا جس میں چھ ہزار طلبہ کے خورد نوش کا مکمل انتظام تھا۔ مصر میں جامع ازہر اپنی ضوفشانیاں کر رہا تھا جو آج تک موجود ہے اور دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کا عہد حکومت جو موجودہ حکومت اور اس کے ہوا خواہوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹکتا ہے اور جس کو بدنام کرنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے اس زمانہ میں بلکہ اس کے بعد تک بھی انتظام تعلیم اس درجہ مکمل اور علوم و فنون کی ارتقاء کا منظر اسقدر دلفریب تھا کہ یقیناً آج تک گورنمنٹ پیدا نہ کرسکی۔ پروفیسر اکس میلز سرکاری کاغذات کی بنا پر کہتا ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے یعنی آبادی کے لحاظ سے ہر چالیس آدمی کے لئے ایک مدرسہ تھا عالمگیرؒ کے بدنام دور حکومت کی تعلیمی حالت کے بارے میں کپتان الگزنڈر ہملٹن بھی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ ٹھٹھہ (سندھ) میں چارسو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے۔

کتب خانے

مدرسوں سے کہیں زیادہ کتب خانوں کی بہتات تھی تاریخ سے ثابت ہے کہ سرزمین ہسپانیہ میں ستر کتب خانے موجود تھے۔ ہلاکو خاں نے جب بغداد لوٹا ہے تو وہاں کے کتب خانے کو کچھ تو جلادیا اور باقی کو دریائے فرات میں ڈبو دیا جس سے مہینوں دریا کی روانی بند رہی۔ کتب خانہ اسکندریہ کو قیصر نے جلوادیا۔ کتب خانہ غرناطہ کی آٹھ ہزار کتابیں کردینال اکسیمنس نے جلادیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں کا علمی شغف کچھ مذہبی علوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ علم کے قدردان تھے خواہ اسکا تعلق مذہب سے ہو یا نہ ہو۔

مساحۃ۔ ہندسہ۔ علم ہوا۔ ۔ منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت۔ ریاضی۔ طب، زراعت، سحر، طلسمات۔ اسرار الحروف۔ سیمیا۔ کیمیا۔ نجوم۔ جغرافیہ حساب۔ جبر و مقابلہ۔ تاریخ۔ انجنیری۔ لسانیات وغیرہ وغیرہ وہ علم ہیں جن کا مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے بلکہ علم نجوم اور علم سحر کا برتنا اور ان پر یقین کرنا اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یا تو مسلمان خود ان علوم کے موجد ہیں یا . . . . . ان کو مسلمانوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ غرض وہ اہل علم کی قدردانی میں تعصب و امتیاز سے بالکل بالاتر رہ کر اہل علم کی ہمت افزائی اور قدردانی اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ خواہ اس کا مذہب سے تعلق کچھ بھی نہ ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک مسیحی طبیب ابن اثال کو اپنے دربار میں بلاکر طب یونانی کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا نیز عابد کو صنعاء سے طلب کرکے شاہان یمن کی تاریخ مدون کرنے پر مجبور کیا تھا رحمۃ للعالمین کے مصنف نے تیس ایسے فضلاء کے نام گنائے ہیں جو خلافت عباسیہ کے زیر سایہ پرورش پاتے تھے اور یہ سب کے سب غیر مسلم یعنی نصرانی، یہودی یا صابی تھے مصنف مذکور لکھتا ہے کہ ایسے فضلاء کے نام . . گنانے کیلئے ایک دفتر کی ضرورت ہے میں تعارف کے طور پر جبرئیل یوحنا بن بختیشوع بختیشوع۔ سہل بن سعد۔ حنین بن اسحاق۔ یوحنا بن ماسویہ کے نام پیش کرتا ہوں جو عیسائی تھے اور علم کی وجہ سے مقربان سلاطین میں شامل ہوگئے تھے۔ یوحنا بن ماسویہ ڈائرکٹر تعلیمات تھا۔ حنین بن اسحاق اور باقی سب لوگ طبیب شاہی تھے مگر حنین دار الترجمہ کا افسر اعلیٰ بھی تھا۔ جب یہ بذات خود کوئی ترجمہ کرتا تھا تو اسے اسی کتاب کے برابر خالص سونا دیا جاتا تھا اور تنخواہ و انعامات اس کے علاوہ تھے۔ نیز یعقوب کندی خصوصی طور پر یونانی کتابوں کے ترجمہ کے لئے رکھا گیا تھا۔ عمر بن عبد العزیز کے دور میں ابن ابجر یونان کا زبردست فلسفی حفظان صحت کے عہدۂ نظامت پر سرفراز تھا۔ القصہ اسلامی عروج و ارتقاء کا زمانہ علوم و فنون کے ارتقاء کا زمانہ تھا۔ اس دور میں ابو علی حسین ابن سینا۔ ابو نصر فارابی۔ محقق طوسی ابوبکر رازی۔ قاضی ابن رشد۔ محمد بن زکریا، ابن بطوطہ، ضیاء الدین بیطار وغیرہ جیسے علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔ جن پر آج بھی فخر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب تو مسلمانوں کی حالت یہ ہے۔ اگر تاریخی شہادتیں موجود نہ ہوں تو ان کے متعلق بمشکل باور کیا جاسکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد علوم و فنون میں دنیا کے استاد رہ چکے ہیں۔

محسوساتِ ماہر

(از جناب ماہرؔ القادری)

اضطرابِ اہل دل، جیسے کہ نامعلوم ہے
ان کا طرزِ بےنیازی کسقدر معصوم ہے

لذتِ ذوق وفا سے فطرتاً محروم ہے
حسن کہتے ہیں جسے، ظالم نہیں مظلوم ہے

کاش! پروانوں کی جرأت رنگ محفل دیکھتی
بزم میں اک ابتری ہے، شمع بھی مغموم ہے

مسکراہٹ ان کی دلکش ہے مگر کیا کیجئے!
اُن کی پیشانی پہ، اُن کا حالِ دل مرقوم ہے؟

آپ سُن بھی لیں، تو فرصت غور کرنے کی کہاں!
عشق کا افسانہ تو مفہوم در مفہوم ہے

کیا اسی کا نام ہے ماہرؔ محبت کا مآل
میں ہوں اور اب سوگواریٔ دل مرحوم ہے؟

اشتراکیت کی مختصر تاریخ

یہ علاج ہے یا مرض؟

(از جناب محمد ہاشم قدوائی دریابادی بی اے (آنرز) لکھنؤ یونیورسٹی)

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی میں بہت سے امراض و عوارض پھیلے ہوئے ہیں، ان کو دور کرنا ہر شخص و فرد کا فرض ہے۔ ان امراض کو دور کرنے کے لئے بے شمار نسخے پیش کئے گئے ہیں نت نئے علاج بھی کئے گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی علاج پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوا ہے۔ آجکل اشتراکیت کو یہ کہکر پیش کیا جا رہا ہے کہ انسانی سوسائٹی کے جملہ امراض کا استیصال کلی کرکے رکھ دیگی۔ یہ ہمارے ہر درد کا دارو ثابت ہوگی لیکن عجلت یا انتشار ذہنی کی حالت میں ہرگز کوئی ایسا علاج نہیں کرنا چاہئے جس کے متعلق ذرا بھی شبہ ہو کہ آیا فی الحقیقت وہ علاج ہے یا علاج کے پردہ میں مرض؟ اسی معیار پر ہمیں اشتراکیت کو بھی جانچنا چاہیئے۔

آج دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں نظام سرمایہ داری قائم ہے۔ اس نظام کے ماتحت جو حکومتیں قائم ہیں اُن کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ اُس کو اس کا پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مال کو جس طرح چاہے صرف کرے اور اُسے اس کا بھی حق ہے کہ دولت کے جتنے وسائل و ذرائع ہیں اُن کو اپنے استعمال میں لائے اور ان پر پورا قبضہ رکھے۔ اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ حاصل کئے بغیر ان کو صرف کرنے اور استعمال کرنے سے انکار کر دے۔ یہ نظریہ اس خود غرضی سے شروع ہوتا ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے اور اس کا اختتام اس انتہائی خود غرضی پر ہوتا ہے جو انسان کی تمام ان صفات کو دبا دیتی ہے جو انسانی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس نظریہ کا لازمی و لابدی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کی تقسیم غیر مناسب ہوتی ہے اور دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع مخصوص دولتمند طبقوں کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عملاً انسانی سوسائٹی دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک عیش کرنے والا اور دوسرا عیش فراہم کرنے والا۔ عیش کرنے والا یعنی دولتمند طبقہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دولت پیدا کرنے کے تمام وسائل کو اپنے قبضہ میں رکھنے اور اُن کو استعمال کرنیکی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہے۔ یہ طبقہ سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن عیش فراہم کرنے والے یعنی مفلس و نادار طبقے کو ذرائع دولت کے استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ عملاً سرمایہ دار طبقے کی خدمت کرے اور اس کی خوشامد درآمد کرکے اپنے پیٹ بھرنے کے لئے اس سے کچھ حاصل کرلے۔ اس طریقہ زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی میں ایک طرف تو زمیندار، مہاجن، ساہوکار، کارخانہ دار پیدا ہو گئے ہیں، اور دوسری طرف کسان قرضدار، اور مزدور، امداد باہمی کے جذبہ اور انسانی اخوت سے ہماری سوسائٹی بالکل خالی ہو گئی ہے۔ غریب اور محتاج کے لئے معیشت کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔ سوسائٹی کا ہر فرد اپنی زندگی کے تحفظ و بقا کے لئے دوسرے افراد کے مقابلہ میں معاندانہ و جارحانہ جدوجہد کرتا ہے۔ جو لوگ دولت کے وسائل پر سب سے زیادہ قابو پاتے ہیں اُن ہی کے ہاتھ میں تمام قوت اور طاقت جمع ہو جاتی ہے لیکن جو لوگ اس بات میں ناکام رہتے ہیں وہ بالکل محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کوئی اُن کی خبر نہیں لیتا۔ ایک ایک دانہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان کی دست گیری اور اعانت نہیں کرتا، وہ جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آجکل ہماری سوسائٹی میں یہ حالت چند افراد کی نہیں بلکہ کروروں بندگان خدا اس میں مبتلا ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سوسائٹی کا اخلاقی معیار پست سے پست تر اور بد سے بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پیٹ بھرنے کی خاطر جرائم اور بےحیائی کی ذلیل طریقوں پر عمل کرنا آج ہمارا آئے دن کا شیوہ ہو گیا ہے۔

اشتراکی نظام

اس نظام کے مخالف ایک دوسرا نظام ہے جس کو اشتراکی نظام یا اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع اور وسائل سوسائٹی کے درمیان مشترک ہیں اسلئے سوسائٹی کے افراد کو فرداً فرداً ان پر مالکانہ تصرف کرنے اور اپنے حسب منشا ان کو استعمال کرنے اور ان کے منافع سے تنہا متمتع ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ ہوگا جو سوسائٹی کے مشترک مفاد کے لئے وہ انجام دیں گے۔ سوسائٹی ان کے لئے تمام ضروریات زندگی مہیا کرے گی۔ اور وہ اس کے بدلے میں کام کریں گے۔ یہ نظام سرے سے شخصی ملکیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی شے کسی فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ ہوگی تو سب کی ہوگی اور سب کے لئے ہوگی۔

اشتراکی تحریک کوئی نئی تحریک نہیں ہے۔ یہ اتنی ہی پرانی ہے جتنا نظام جاگیرداری یا اشتراکیوں کے الفاظ میں یہ خود بھی قرون وسطیٰ کی یادگار ہے بلکہ اس سے بھی پہلے کی۔ اگر ہم اشتراکیت کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں اس کا پتہ چلے گا کہ سب سے پہلے اس نے منظم شکل میں یونان میں اور اس کے بعد مزدک کی رہنمائی میں چھٹی صدی عیسوی میں ایران میں جنم لیا۔ اس وقت اس نے اس کی بڑی شدومد کے ساتھ نشر و اشاعت کی کہ تمام عورتیں تمام مردوں کے لئے حلال ہیں۔ نیز اُس نے انسانوں میں اقتصادی مساوات کا بھی علم بلند کیا۔ یہ تحریک اپنے ساتھ فواحش کا سیلاب عظیم بھی لائی۔ بالآخر اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور صدیوں تک ایک گوشہ میں منہ چھپا کر بیٹھنا پڑا۔ تا آنکہ یورپ میں علم کی نئی زندگی (Renaissance) کے بعد اور صنعتی انقلاب کے دور میں یہ پھر اُبھری۔ اس وقت کارل مارکس، انگلیز وغیرہ نے اس کا علم اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور "دنیا کے تمام مزدورو! ایک ہو جاؤ" کا نعرہ بلند کیا۔

کارل مارکس آنجہانی کی کوششوں سے ۱۸۴۷ء میں لندن میں اشتراکیوں کی ایک سوسائٹی قائم ہوئی جس نے انگلیز اور کارل مارکس کے مشورہ سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی اس کانفرنس کے بعد ایک اشتراکی انجمن قائم کی گئی جس کا مقصد بورژوا یعنی متوسط طبقے کو نیست و نابود کرکے اس کے اثر کو زائل کر دینا تھا۔ پرانی سوسائٹی کا خاتمہ کرکے ایک نئی سوسائٹی کا قیام عمل میں لانا جس میں نہ تو امیر و غریب کے مختلف طبقات ہوں اور نہ شخصی ملکیت۔ ۱۸۴۸ء میں اشتراکیوں کا ایک منشور یا مینی فسٹو شائع کیا گیا جو . . . اس نئی تحریک کی بنیاد قرار پایا۔ اس منشور نے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ بورژوا (متوسط طبقہ) کے مقابلہ میں کاشتکار و مزدور یعنی طبقہ عوام کو لایا جائے۔ اس منشور کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں:-

۱- جائداد کا بہ شکل زمین یا جاگیر خاتمہ کرنا۔

۲- آمدنی پر مزید انکم ٹیکس۔

۳- وراثت کے تمام حقوق کو ختم کرنا۔

۴- لین دین کے معاملات کو پورے طور سے حکومت کے ہاتھ میں قومی بینک کے ذریعہ سے دیدینا۔

[illegible]- حکومت کے مملوکہ و مقبوضہ کارخانوں نیز دولت پیدا کرنے کے وسائل میں اضافہ و توسیع۔

۶- تمام افراد کو یکساں طور پر کام کرنے پر مجبور کرنا۔

۷- نقل و حمل کے وسائل و ذرائع کا حکومت کے قبضہ میں ہونا۔

۸- زراعت کا صنعتوں سے مدغم کر دینا۔

۹- تمام بچوں کو عام مدرسوں میں مفت تعلیم دلانا اور کارخانوں میں بچوں سے کام لینے کے طریقے کو ختم کرنا۔

اس کے بعد پہلی بین الاقوامی اشتراکی کانگریس لندن میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۷۳ء تک متعدد کانگریسیں منعقد ہوئیں جن میں مختلف یورپین ممالک کے مزدوروں کے نمائندے شریک ہوئے۔ ان کانگریسوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں میں بیداری کی لہر دوڑنے لگی۔ سرمایہ دار اور مزدور طبقات میں جذبۂ مخاصمت و طبقہ وارانہ منافرت کا نشو و نما ہونے لگا۔ اشتراکیت تمام یورپ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگی صنعتی انقلاب کا اثر یورپ پر یہ ہوا کہ بڑے بڑے کارخانے مشینوں کی مدد سے کھل گئے اور اہل دولت داہل زر اُن کے مالک بن بیٹھے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مزدور ان کارخانوں میں کام کرتے تھے اور محض پیٹ بھرنے کی اجرت پاتے تھے۔ ان کی حالت حد درجہ زبوں اور خراب تھی مشکل سے پیٹ بھر سکتے تھے۔ برخلاف اس کے کارخانہ دار اور مالکان مل لاکھوں روپیہ نفع میں کماتے تھے۔ اور عالی شان محلات میں رہتے تھے۔ اس کا اثر ہماری سوسائٹی پر یہ ہوا کہ وہ عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو گئی؛ ایک سرمایہ دار اور دوسرا مزدور یا کارکن طبقہ۔

مزدوروں کی حالت نہایت خراب تھی۔ ضرورت تھی کہ کوئی ان کی حالت کو سدھارتا۔ اشتراکیوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مزدوروں میں کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کے خلاف یہ کہہ کر منافرت پھیلانا شروع کی کہ محنت تو تم کرتے ہو لیکن تمہاری محنت سے فائدہ اٹھا کر عیش کرتے ہیں یہ کارخانہ دار! تم کو چاہئے کہ ان سے انتقام لو۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اس طرح سے طبقہ وارانہ منافرت پھیلنی شروع ہوئی۔ کارل مارکس نے ۱۸۶۷ء میں اپنی کتاب "کیپٹل" (سرمایہ) لکھی جس کو آج اشتراکی بہت بڑا درجہ دیتے ہیں اور جس سے ہم کو اشتراکی اصولوں اور نظریوں کا صحیح علم ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنا اصل اصول یہ بیان کیا کہ قانونی تعلقات، حکومت کی قسمیں۔ رسوم و عادات، مذہب اور فلسفہ ہمیشہ اُن مادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن میں انسانوں نے اپنے کو

گھڑا گیا ہے۔ اُس کے نزدیک انسانی ارتقا اور نشو و نما کی تاریخ کوئی چیز نہیں بلکہ یہ مختلف طبقات کے جنگ کی داستان ہے جس میں برسر اقتدار طبقہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر معاشرتی اور تمدنی اداروں کو بدلا ہے۔

اس کا دوسرا اصول طبقہ وارانہ جنگ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ اور صنعت کا نشو و نما مختلف منزلوں سے گذرا ہے۔ سب سے پہلے ہاتھ کی صنعت کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد معمولی اوزاروں کی مدد سے کام کرنے کا زمانہ آیا۔ یہ زمانہ ترقی کرتے کرتے اس زمانہ سے آملا جس کے بعد مشینیں پیدا ہوئیں۔ مشینوں کے پیدا ہونے کے بعد سرمایہ چند افراد کی کو ٹھیوں میں سمٹنا شروع ہوا جس کا نتیجہ عملاً یہ ہے کہ ہماری موجودہ سوسائٹی دو مختلف خیال اور مفاد رکھنے والی جماعتوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک گروہ قبضہ رکھنے والوں کا اور دوسرا قبضہ نہ رکھنے والوں کا پیدا ہو گیا ہے۔ ان میں سے آخر الذکر طبقہ تبدیلی اور انقلاب پیدا کرنے کے لئے قوت و اقتدار پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

"کیپٹل" میں اشتراکیت کا تیسرا اصول "قیمت کا محنتی نظریہ" ہے۔ اس نظریہ کا یہ مطلب ہے کہ محنت ہی دولت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور نیز یہ کہ سرمایہ دار کارکنوں اور مزدوروں کو اجرت ادا کرنے کے بعد منافع اور بچت کی رقم کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ رقم بدیہی طور پر ان کی پیدا کی ہوئی رقم نہیں کہی جا سکتی۔

الغرض کارل مارکس کے حسب ذیل تین بنیادی اصول ہیں جن پر موجودہ اشتراکیت کی بنیاد قائم ہے :-

۱- قانونی تعلقات، حکومت کی شکلیں، اور ہیئت ترکیبی، رسوم و عادات، مذہب اور فلسفہ محض ابتدائی مادی حالات کا نتیجہ ہیں انسانی ارتقا و نشو و نما مختلف طبقات کے جنگ کی داستان ہے۔ برسر اقتدار طبقہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر معاشرتی و تمدنی اداروں کو بدلا ہے۔

۲- طبقہ وارانہ جنگ انسانی سوسائٹی و انسانی ارتقا کے لئے ناگزیر ہے۔ موجودہ سوسائٹی میں سرمایہ کے ایک جگہ یا چند جگہ جمع کر دینے کے باعث دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک بورژوا یا سرمایہ دار اور دوسرا کارکن طبقہ۔ ان طبقوں کے مفاد کبھی ایک ہو ہی نہیں سکتے۔ نئی انسانی سوسائٹی اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک کہ آخر الذکر طبقہ، اول الذکر طبقہ پر غلبہ نہ پائے اور انقلاب نہ برپا ہو۔

۳- محنت ہی دولت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ منافع اور بچت کی رقم پر مزدوروں کا حق ہے۔ سرمایہ داروں کا اس پر کوئی حق نہیں۔

اشتراکی اصولوں کے عملی نتائج

ان تین اصولوں کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکیت کے نزدیک قانونی تعلقات، رسوم و عادات، مذہب و فلسفہ (جس میں اخلاق بھی شامل ہے) کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہر وہ چیز جائز ہے جو اشتراکی سوسائٹی کے قیام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

اخلاق کے متعلق اشتراکیت کے سب سے بڑے علمبردار لینن نے اپنے دوست "گارکی" کے اس سوال کے جواب ہیں کہ "کیا اس کے پاس کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے؟" کہا کہ "میرے دوست۔ تم سے یہ کس نے کہدیا کہ میں نے کبھی اخلاق پر اعتقاد رکھا یا کوئی اخلاقی اصول اپنے پیش نظر رکھا"

جب لینن کے خاص دوستوں اور دوش بدوش کام کرنیوالوں نے ناجائز رقم لینے کی مخالفت کی اور اُسے جرم ٹھیرایا تو اس نے کہا کہ "میں یہ روپیہ ضرور لوں گا۔ کیا تم بھی نیک چلنی اور دیانتداری کے بارے میں بورژوا طبقہ کے خیالات سے متاثر ہو؟ تم نے اس وقت میری تعریف کیوں کی جبکہ میں نے ٹیفلے کے ڈاکخانہ پر دھاوا کر کے چند ہزار روبل حاصل کئے تھے؟ تم اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ روپیہ صرف بورژوا طبقہ ہی کا نہ تھا۔ بلکہ غریب کسانوں اور تباہ حال مزدوروں کا بھی ہے مگر اس کے باوجود... تم نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے۔ رفیقو! اپنے تعصبات سے نجات حاصل کرو۔ جائز اور ناجائز صحیح اور غلط کی بابت سرگرداں اور پریشان نہ ہو"

لینن نے ایک دوسرے دوست کو یہ لکھنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا کہ "اخلاق اور اعزاز کے آئین کا ہمارے نزدیک کوئی وجود نہیں"

ایف وائی اُسن ڈاسکی اپنی کتاب موسوم بہ "لینن" میں لکھتا ہے کہ "لینن نے والسس سے روسی نوٹوں کو جعلی بنا دینے کو کہا۔ والسس نے اس کام کو انجام دیا اور دس دس روبل کے پانچ سو نوٹوں کو جعلی بنا دیا۔ لینن نے اس کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان روسی نوٹوں کو پائونڈوں میں تبدیل کر لیا۔ اس کے بعد وہ لندن گیا اور رچسٹر کا فرضی جرمن نام اختیار کر لیا۔ بعدازاں جب ٹراٹسکی نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ ہم (اشتراکی)، باغی گداگروں کے گروہ سے کچھ زیادہ نہیں تو لینن نے ان الفاظ میں اسے تسلی دی :- "کہ ہمارے پاس سرکاری مطبع ہے جو غیر ملکی نوٹوں کی کسی تعداد کو شائع کر سکتا ہے" یعنی جعلی نوٹ تیار کر سکتا ہے"

اقتباسات بالا سے (جو مشیر حسین قدوائی مرحوم کی قابلقدر تصنیف "پان اسلامزم اینڈ سوشلزم" سے لئے گئے ہیں) واضح ہو گیا ہو گا کہ اشتراکیت کے اس مشہور و معروف رہنما کے نزدیک اخلاق کے کوئی معنی نہ تھے۔ دغابازی۔ جعلسازی سب کچھ جائز تھا۔ جب اشتراکی علمبردار کا یہ حال ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے پیرو کتنی زیادہ بداخلاقی پھیلائیں گے۔

ہماری موجودہ سوسائٹی میں جس کے مٹانے اور تباہ کرنے کے لئے اشتراکی اس درجہ بے قرار و مضطرب ہیں سب سے بڑی خرابی اور برائی یہ ہے کہ اس میں روز بروز اخلاقی معیار پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جھوٹ اور جعلسازی کی عزت کی جاتی ہے۔ صداقت۔ دیانت اور راست بازی کی کوئی وقعت نہیں۔ شرافت، بات کا پاس، ایمانداری وفاشعاری، بزرگوں کا ادب، غریبوں اور مظلوموں کی ہمدردی اور بیکسوں کی دادرسی کی اب ہماری سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں۔ مکر و فریب، دغاباز و دجل کو اب حکمت عملی یا ڈپلومیسی کے خوشنما نام سے پکارا جاتا ہے غرور انانیت۔ رعونت اور خود بینی کو اب ہماری سوسائٹی میں خودداری کہا جاتا ہے۔ نفسانیت اور خود غرضی کا بازار گرم ہے مختصراً یہ کہدینا کافی ہو گا کہ عدل و رحم کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اس اخلاقی پستی کو دور کرنا از حد ضروری ہے۔ اس نظام کو جو ہماری سوسائٹی کے بدلنے کا مدعی ہو۔ موجودہ بداخلاقی کو بھی بدل کر رکھ دینا چاہیئے لیکن اس معیار کو مدنظر رکھ کر جب ہم اشتراکیت کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اس پر پوری نہیں اترتی۔ جس نظام کے علمبرداروں کے نزدیک جھوٹ اور مکاری کوئی بری بات نہ ہو، جو یہ کہیں کہ ہم نے کبھی نیک چلنی اور اچھے اخلاق پر اعتقاد نہیں رکھا وہ کیسے اور کس طرح ہمارے امراض کا علاج کر سکتے ہیں؟

برعکس اس کے وہ مکاری، جھوٹ، بدچلنی، حرام کاری، زناکاری جعلسازی اور دغا و فریب پھیلاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت کی وجہ سے حرام کاری اور زناکاری میں بہت ترقی ہو جاتی ہے۔

"اخلاقی دباؤ کی اسی کمی کا نتیجہ تھا کہ فتح کے بعد بالشویک پارٹی شہوانی بدمستی میں مبتلا ہو گئے" (پان اسلامزم اینڈ بالشوزم صفحہ ۲۲۲)

اشتراکی سوسائٹی میں یہ صورت حال عملاً پیدا ہو چکی ہے کہ مرد اور عورت کے تعلق کو نکاح سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ نکاح کی کوئی اہمیت نہیں اخلاق کے بارے میں جو جدید اشتراکی تخیلات ہیں وہ یہ ہیں کہ آزاد محبت، سستا نکاح اور اس سے بھی زیادہ سستی طلاق اور ایسے ہی بہت سے اصول۔ روس جہاں اس وقت اشتراکی سوسائٹی ہے اور جو اشتراکیوں کے نزدیک جنت ہے ان اصولوں کی بدولت جانوروں کی سرزمین بن گیا ہے۔ نامور روسی سائنس داں، اینٹن نیمی لوف جو اشتراکیت کے پرجوش حامی ہیں اپنی کتاب "بیالوجیکل ٹریجیڈی آف وین" میں قمطراز ہیں کہ "روسی مزدوروں میں جنسی ابتری عام ہو گئی ہے اور شہوانیت اور نفسانی خواہشات کا طوفان عظیم اشتراکی سوسائٹی کے تمام طبقوں میں چھایا ہوا ہے۔" (صفحہ ۲۰۲) وہ اس کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تنبیہہ کرتے ہیں کہ یہ صورت حال انجام کار اشتراکی سوسائٹی کو تباہ کر کے رہے گی۔ مسٹر ڈامینٹ جو روس میں بلجیم کے کونسل جنرل رہ چکے ہیں فرماتے ہیں "کہ جنسی ابتری کے باعث روس میں تقریباً ۵۰ لاکھ ایسے بچے ہیں جن کا کوئی والی و وارث نہیں۔ بکثرت بارہ بارہ برس کی لڑکیاں ایسی ہیں جو پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کے لئے اپنے کو روسی نوجوانوں کی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے چھوڑ دیتی ہیں اور اشتراکی روس کی حکومت اس کو پرائیویٹ تجارت شمار کرتی ہے اور اس کی اجازت دیکر اپنا مقرر حصہ وصول کرتی ہے"

ممتاز اشتراکی کارکن میڈم اسمیٹو ورچھ کہتی ہیں کہ "ایک روز فاؤنڈلنگ اسپتال میں سولہ سولہ سال کے دو لڑکے ایک بچہ کو لے کر آئے اور کہنے لگے کہ یہ ہم دونوں کا مشترک بچہ ہے"

طبقہ وارانہ جنگ

اشتراکیت کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ طبقہ وارانہ جنگ انسانی سوسائٹی کے فلاح و بہبود کے لئے ناگزیر ہے۔ ہم اس اصول کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک طبقہ وارانہ جنگ نہ ہو گی تب تک سوسائٹی کی بہتری یا بہبودی نہیں ہو سکتی۔ اشتراکی پروگرام کی کامیابی کا انحصار طبقہ وارانہ جنگ پر ہے لیکن طبقہ وارانہ جنگ سے کسی ملک کو فائدہ ہرگز نہیں ہوتا۔ سراسر نقصان ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ طبقہ وارانہ جنگ کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سرمایہ دار طبقہ بالکل مٹ جائے گا۔ بورژوا (متوسط) طبقہ کا نام و نشان نہ رہے گا۔ اس کی جمع شدہ دولت غریبوں اور حاجتمندوں کے کام آئے گی۔ ملک کی خوش حالی اور سرسبزی میں اضافہ ہو گا۔ روپیہ بجائے الماریوں اور تجوریوں میں مقفل رہنے کے غربا کی بھوک، مفلسی اور غریبی کو دور کرے گا۔ بظاہر تو یہ دلیل بہت وزنی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اسے بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بالکل ہی سطحی دلیل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرمایہ دار طبقہ ختم ہو جائے گا اور مقفل شدہ روپیہ غربا کے پیٹ بھرنے کے کام آئے گا لیکن اس طبقہ کی تباہی بغیر خونریزی اور قتل و خون کے ممکن ہی نہیں۔ لاکھوں انسانوں کا خون بہے گا تب جاکر کہیں غربا کو روپیہ، شکم پری اور شکم سیری کے لئے مل سکے گا۔ روس میں جہاں اس وقت اشتراکی حکومت ہے بے شمار انسانوں کا خون بہایا جا چکا ہے۔ جان دین ہرڈ جس نے اپنی زندگی کے تیس سال روس میں گذارے ہیں اشتراکی ظلم و ستم کی داستان ان اعداد و شمار میں بیان کرتا ہے"

"۱۹۳۲ء تک ۲۶ لاکھ، ہزار سات سو ۳، انسانوں کا خون روس

میں بہایا گیا ہے جس میں ایک لاکھ ۹۶ ہزار مزدور اور ۲ لاکھ ۹۰ ہزار کسان شامل ہیں "

(ڈیلی گزٹ کراچی مورخہ ۵ رو ۶ رجون ۱۹۳۴ء)

مزید برآں طبقہ وارانہ جنگ بغیر طبقہ وارانہ منافرت پھیلائے ہو بھی نہیں سکتی. لہذا اشتراکیت کے پروگرام کے ایک بڑے جزو کی تکمیل کے لئے انسانی دشمنی اور طبقہ وارانہ منافرت کا پھیلنا اور پھیلانا ضروری ہوا انسان سے نفرت رکھنے کو کوئی صاحب ہوش مستحسن نہیں ٹھیرا سکتا۔ انسانوں سے نفرت رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانیت کے حدود سے لوگ تجاوز کر جائیں گے۔ بربریت اور انسانیت کے مابین امتیاز اٹھ جائیگا اور انسان وہ کر گذرے گا جو درندے اور وحشی جانور کرتے ہیں۔ طبقہ وارانہ جنگ و منافرت پھیلانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اشتراکیت کے نزدیک انسان کے خون کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں لینن کے حسب ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں جو اس نے اپنے دوست "گارکی" سے کہے :-

"ہم ایک آہنی عہد میں رہتے ہیں اور ہمارا کام لوگوں کے سروں کو سہلانا یا تھپتھپانا نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ہاتھوں کو زور سے استعمال کرنا چاہئے۔ لوگوں کی کھوپڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہئے اور ان کی ہڈیوں سے بلا کسی پس و پیش کے گودہ نکال لینا چاہئے"

"جب بالشویکوں نے سرمائی محل پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے قتل عام شروع کیا جس میں نہ عمر کا اور نہ صنف کا لحاظ کیا گیا" (مین اسلامزم اینڈ بالشوازم صفحات ۴۱۹ و ۴۲۲)

اشتراکیت اور مذہب

انسان کو ایک چیز تمام دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ چیز کیا ہے؟ خدا پرستی اور خدا شناسی انسانیت کی ارتقا اور تکمیل کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ انسان خداوندی ضابطوں اور قاعدوں پر عمل کرے اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلے۔ اسی کا نام مذہب ہے۔ مذہب اس کا نام نہیں ہے کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے ایک کونہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی جائے۔ مذہب اس کا نام ہے کہ تمام دنیا میں خدا پرستی پھیلائی جائے خدا کے خلاف بغاوت، لادینی، ظلم، مکاری، جعل سازی، مکر و فریب، جھوٹ غرضکہ وہ تمام چیزیں جو انسانیت پر کلنگ کا ٹیکہ ہیں مٹا دی جائیں۔ اگر کوئی نظام زندگی خدا کی اس بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی تلقین نہیں کرتا تو وہ ہرگز انسانی سوسائٹی کی فلاح اور بہبود کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ اب ہم اشتراکیت پر اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں کہ وہ مذہب کی حامی اور مددگار ہے یا اس کی مخالف اور دشمن؟

اشتراکیت کے علمبردار کہتے ہیں کہ اشتراکیت کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مذہب کی جگہ لامذہبیت لے لے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اشتراکی ملحد بھی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اشتراکیت اور دہریت و لامذہبیت لازم و ملزوم ہیں۔ کارل مارکس۔ لینن اور اشتراکی دنیا کے موجودہ پیشوا اور سوویٹ روس کے مطلق العنان آمر جناب اسٹالن سب کے سب مذہب کے شدید مخالف ہیں۔ ایک روس ہی پر کیا بلکہ تقریباً ہر جگہ اشتراکیت کے علمبردار لامذہب ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں اشتراکیت کے پُرجوش مبلغ جناب جواہر لال نہرو صاحب اور جناب ایم۔ این رائے صاحب سب ہی مذہب کے مخالف ہیں۔ جواہر لال صاحب کے نزدیک تو مذہب ترقی کے راستہ میں حائل ہے اور وہ اس کو مٹا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ نہرو صاحب کی لامذہبی اور رضاء دشمنی کا ایک واقعہ بیان کر دینا کافی ہوگا۔ ممتاز مسلم کانگریسی رہنما جناب ڈاکٹر شیخ محمد عالم صاحب بار ایٹ لا۔ ایم۔ ایل۔ اے کے ایک مقدمہ میں جو انھوں نے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف توہین کا دائر کیا تھا، نہرو صاحب بھی شہادت دینے کے لئے طلب کئے گئے تھے۔ جب حلف اٹھانے کو کہا گیا تو نہرو صاحب نے ارشاد کیا کہ مجھے ایسا حلف دیا جائے جس میں خدا کا نام نہ ہو۔ اور بالآخر انہیں ایسا حلف دیا گیا جس میں خدا کا نام نہ تھا۔

اشتراکیت کی موجودہ تحریک کے بانی مبانی کارل مارکس آنجہانی کا قول تھا کہ "مذہب انسان کے لئے افیون ہے"

"بالشویکی نقطۂ نگاہ سے مذہب کے خلاف حسب ذیل تین خاص اعتراضات، ایموشن ایز دی بیسز آف سولزیشن (Emotion as the basis of Civilization) میں پیش کئے گئے ہیں :-

۱- مذہب موجودہ عمرانی نظام جو سرمایہ داری کا حامی ہے کے قیام میں مدد کرتا ہے۔

۲- یہ لوگوں کو شکوک اور اوہام میں مبتلا رکھتا ہے اور اس طرح سے سائنس کی ترقی کو روکتا ہے۔

۳- یہ لوگوں کو . . . . . اپنی ضرورتوں کو خود پورا کرنے کے بجائے دعا مانگنا سکھاتا ہے اور اس طرح سے ان کو مجہول۔ کاہل اور سست بنا دیتا ہے۔

مذہب کے متعلق اشتراکیوں کے یہ خیالات ہیں ان کے نزدیک مذہب ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ وہ شکوک اور اوہام کا ایک مجموعہ ہے اور اس کا مٹا دینا انسانی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ مذہب سرمایہ داری کے آغوش میں پلا ہے اور اسی کی امداد پر قایم ہے لہذا اسے مٹانا ہر اشتراکی کا فرض ہے۔ مذہب خدا کی بارگاہ سے دعا مانگنا سکھاتا ہے اس سے کاہلی اور سستی پیدا ہوتی ہے۔ اشتراکیت کو کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اس لئے وہ چیز جو کاہلی اور سستی سکھاتی ہے فوراً مٹ جانی چاہئے۔ لینن جو اشتراکیوں کا ایک بڑا زبردست رہنما ہے ایک جگہ کہتا ہے کہ "ہم اب وہ افیون نہیں چاہتے جو لوگوں کے عزم و ارادہ کو بالکل سلب کر لے۔ اگر کبھی تمہارے خدا کا وجود تھا تو وہ اب تم کو چھوڑ دے گا۔"

(مین اسلامزم اینڈ بالشوزم صفحہ ۴۱۶)

ان لوگوں کے الفاظ پر غور کیجئے ان کے نزدیک مذہب افیون ہے جو لوگوں کی قوت آزادی کو سلب کر لیتی ہے۔

"مئی ۱۹۲۹ء میں روس میں ایک اعلان شائع کیا گیا جس میں الحاد کی سلطنت کی طرف سے تائید کی گئی اور ملحدوں کو اس بات کا حق دیا گیا کہ وہ اپنے عقائد لوگوں میں پھیلائیں۔ سوویٹ حکومت نے تعلیمی کمپ کو اس بات کی ہدایت کی کہ وہ مذہب دشمنی کی نشر و اشاعت کرنے کے لئے جانچ پڑتال کرنے کا ایک جدید محکمہ (انسپکٹریٹ) قائم کریں جس کی شاخیں تمام اضلاع کے مراکز میں قائم کی جائیں۔"

مذہب کو جو درجہ اشتراکیت عطا کرتی ہے وہ اس بات سے بخوبی واضح ہو جائے گا کہ کارکنوں کے لئے صحیح اور اصلی آزادی ضمیر کے تحفظ اور اسے برقرار رکھنے کے لئے کلیسا (مذہب) کو حکومت سے اور مدرسوں کو کلیسا (مذہب) سے علحدہ کر دیا گیا ہے۔ آزادی مذہب اور مذہب کی مخالفت کا پروپیگنڈا کرنے کا یقین ہر شہری کو دلایا جا سکتا ہے۔"

(روسی اشتراکی وفاقی سوویٹ جمہوریہ کے دستور اساسی کے عام اصولوں کی دفعہ ۱۳)

اس دفعہ کو پڑھنے سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ مذہب کا کوئی تعلق کسی ملکی معاملہ سے نہیں رہے گا۔ مذہبی تعلیم مدرسوں میں نہیں دیجائیگی ظاہر ہے کہ جو طلبا اپنا وقت اسکولوں اور مدرسوں میں صرف کریں گے ان کو یہ فرصت کب ہوگی کہ وہ مذہبی تعلیم حاصل کریں۔ اس طرح اشتراکیت کے عمل دخل کے تھوڑی عرصہ کے بعد مذہب ختم ہو جائے گا۔ مذہب کی اہمیت اسی وقت قایم رہ سکتی ہے جبکہ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاسی اقتدار و قوت ہو۔

لامذہبیت کا پروپیگنڈا کرنے کی ہر شخص کو اجازت رہیگی یعنی ہر شخص بلا روک ٹوک مذہب دشمنی کی اشاعت کر سکے گا۔ جب حکومت کی طرف سے لامذہبیت پھیلانے میں تعرض نہیں کیا جائے گا تو لامذہبیت کا طوفان ابھرے گا اور اسی کا دور دورہ ہوگا۔

غرضکہ امور بالا سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اشتراکیت مذہب کی شدید ترین مخالف ہے وہ اسے ترقی کی راہ میں حائل سمجھتی ہے۔ بڑے سے بڑے رہنماؤں اور رہبروں کی یہی خواہش رہی ہے کہ مذہب کو ختم کر دیا جائے۔ روس میں مذہب کو ماننے کے جرم میں بہت سے بے گناہوں کو پھانسی دی جا چکی ہے۔ کلیساؤں کو مسمار کیا جا چکا ہے۔ روس کے دستور اساسی کی ایک دفعہ میں خاص طور سے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر شخص کو مذہب کی مخالفت میں پروپیگنڈا کرنے کا حق حاصل ہے۔

آج بجائے جمہوریت کے آمریت کا زمانہ ہے۔ ہر ہٹلر اور مسولینی جرمنی اور اٹلی میں مطلق العنان آمر ہیں۔ آمریت کے استبداد اور ظلم سے ہر کہ و مہ نالاں ہے۔ جہاں فرد واحد کی آمریت نہیں وہاں مخصوص طبقہ یا جماعت کی حکومت ہے مثلاً امریکہ اور انگلستان میں سرمایہ داروں کی۔ غرض یہ کہ عوام اور غریبوں کی حکومت میں کوئی آواز نہیں۔ عمومی یا جمہوری حکومت کا صحیح معنوں میں کہیں بھی وجود نہیں۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر حکومتیں چلائی جاتی ہے لیکن ان کے دکھ درد کا کوئی علاج نہیں کرتا۔ مخصوص مفاد والے طبقات کے ہاتھ میں عنان حکومت ہے۔ وہ اپنے مفاد کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار رہتے ہیں غریبوں اور مفلسوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اس مرض اور خرابی کو دور کرنا اس نظام زندگی کا پہلا فرض ہے جو ہماری سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کا مدعی ہو۔ ہم اشتراکیت کا اس نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں اور روس کی حالت پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ۱۹۱۷ء میں زار کی جابرانہ حکومت کے ختم ہونے پر کسانوں اور مزدوروں کی دستوری مجلس بنائی گئی۔ لینن کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۸ء میں یہ مجلس توڑ دی گئی اور اس کی جگہ آمریت نے لے لی جو آج تک چلی آتی ہے۔ آج اسٹیلن جمہوریہ روس کے سنگھاسن پر مطلق العنان آمر کی حیثیت سے براجمان ہیں۔ روس کی ڈکٹیٹر شپ کے بارہ میں پروفیسر ہیکر اپنی کتاب (Religion under the Soviet) میں لکھتے ہیں کہ "بالشوزم اپنی آمریت کے ساتھ بلا شبہ ایک استبداد ہے جس کی شدت قدیم استبداد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے"

اشتالی کانگریس کے اجلاس میں ایک کسان نمائندہ نے صاف صاف کہا کہ "رائے عامہ محض ایک ڈھکوسلا ہے اگر اشتراکی رہنما چاہیں تو گھوڑہ اور خچر ہماری نمائندگی کی حیثیت سے یہاں بیٹھے نظر آئیں"۔ اشتراکیت آمریت کو ختم کر کے عوامی یا جمہوری حکومت قائم کرنے کی بجائے ایک پورے طبقہ کی آمریت کو مسلط کر دیتی ہے۔ یہ صورت حال عملاً روس میں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ آمریت فرد واحد کی آمریت سے بھی زیادہ سخت اور مستبدانہ ہے۔

اس استبداد کو قائم رکھنے میں قوت و طاقت کو برابر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ بارہا "سرخ فوج" کی مدد سے بغاوتوں کو کچلا گیا ہے۔

موریس ہنڈس جس کو کسی طرح بھی بالشویکوں کا مخالف نہیں کہا جا سکتا (Red Bread) میں روسی انقلابیوں کی بیرحمی کے قصے لکھتا ہے۔ ایک جگہ وہ رقمطراز ہے کہ "لوگ معہ اپنی عورتوں اور بچوں کے سڑکوں پر چھوڑ دیئے گئے۔ ان کو کوئی جائے پناہ نہیں دی گئی۔ ان کے اوپر کسی قسم کا رحم نہیں کیا گیا" وہ اشتراکی جو اسٹالن کے پکے دوست ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ۱۹۲۹-۳۰ء کے موسم سرما میں متشدد طریقوں نے روس کو "جلتی ہوئی آگ" کے کناروں تک ڈھکیل دیا گیا۔ (دین اسلام ازم اینڈ بالشوزم صفحہ ۴۳۷)

کولک (جو روس کی سب سے زیادہ محنتی قوم ہے) کے ساتھ اشتراکی حکومت روس نے جو برتاؤ کیا اُسے ہنڈس ان الفاظ میں لکھتا ہے۔ "اسٹالن کے دباؤ اور اثر سے سیاسی محکمہ نے اپنا مشہور و معروف اعلان ۵ جنوری ۱۹۳۰ء کو تیار کیا۔ اس اعلان میں دو اہم اور ضروری فیصلے کئے۔

۱۔ کولکوں کا صفایا کرنا۔

۲۔ مقررہ میعاد کے اندر آراضیات میں مکمل کاشت کرنا۔

کولکوں کو اقتصادی طریقہ سے بالکل تباہ کر دیا گیا۔ انکی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ ان کو جلا وطن کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا"

"جب ایک شخص ماسکو کی گلیوں میں لوگوں کے ہجوم اور انبوہ کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ اُس وحشیانہ اور بہیمانہ اختلاف رائے کو گوارا نہ کرنے والی قوت کو محسوس کرنے لگتا ہے جس نے سینکڑوں مخلص اور ایماندار نکتہ چینوں کو جلا وطن کر کے دنیا کے دور دراز حصوں میں اپنی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا"

(دین اسلام ازم اینڈ بالشوزم صفحہ ۴۳۸)

اب یہ بات محتاج تشریح نہیں رہی کہ اشتراکیت۔ استبداد یا آمریت کے مرض کو اور زیادہ بڑھاتی ہے اور اس کو دور ہرگز نہیں کرتی۔

"اشتراکیت کا اصل مقصد دولت کی تقسیم میں توازن قائم کرنا ہے مگر اس کے حصول کے لئے جو ذریعہ اس نے اختیار کیا ہے وہ بالکل غلط ہے درحقیقت وہ فطرت انسانی سے جنگ کرتی ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے سوسائٹی کا بالکل غلام بنا دینا انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ یہ چیز نظام تمدن سے اس کی روح اور اسکی اصلی قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے وہ در اصل انسان کا ذاتی مفاد ہے۔

اگر ذاتی مفاد کا سوال نہ رہے اور فرد کو یہ بتایا جائے کہ فوائد و منافع کی مقدار معین کر دی گئی ہے اس سے زیادہ اسکو کچھ نہ مل سکے گا تو اسکی تمام قوتیں ناکارہ اور بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔ وہ محض ایک مزدور کی طرح کام کرے گا جس کو اپنے کام سے بقدر اجرت ہی دلچسپی ہوگی"

"اشتراکیت اشتراکی حکومت کو وجود میں لاتی ہے مگر اس کے باوجود بجائے سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کے ایک اور بڑی سرمایہ دار حکومت کو لے آتی ہے۔ یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی اس قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح افراد سے خدمت لیتا ہے اور ایک مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسباب حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس کے پاس نہ ہمدردی ہے اور نہ قدر و اعتراف۔ وہ انسانوں سے انسان کی طرح کام نہیں لیتا بلکہ مشین کے کل پرزوں کی طرح ۔۔۔ وہ ان سے فکر و رائے اور عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کی بنا پر نظام اشتراکی نہ تو قائم ہو سکتا ہے اور نہ کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے کیونکہ افراد کی فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے۔ اگر ان کو دائمی استبداد کے آہنی پنجہ میں جکڑ کر رکھا جائے تو وہ اشتراکی نظم کو دیکھتے ہی دیکھتے منتشر کر دیں"

جو نظامِ زندگی ایک طرف انسان کی قوت محرکہ اور عمل کی آزادی کو سلب کرے مذہب کو بنی نوع انسان کیلئے افیون اور ترقی کی راہ میں حائل سمجھے، اخلاقیات کو بے معنی، شرم و حیا کو لغو، رحم و ہمدردی کے انسانی جذبات کو لایعنی ٹھہرائے، اور شدید ترین استبداد کے ساتھ آمریت کو قائم کرے وہ بھلا کس طرح سے علاج ہو سکتا ہے۔ وہ تو مرض در مرض ہوا بلکہ مہلک ترین مرض۔

حکومت کو سلام

(از جناب میکش اکبرآبادی)

مل گئے کل راستے میں اک معزز شہر کے آرہے تھے کر کے اربابِ حکومت کو سلام
مجھ سے فرمایا کہ "گو تم ہو بہت قابل مگر جو نہ آئے کام ایسی قابلیت کو سلام
سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے یہ تمہارا آستاں آسماں کرتا ہے جھک کر جسکی رفعت کو سلام
شہر میں تم دیکھتے ہو آدمی کوئی نہیں کر لیا ہے کس لئے تم نے سیاست کو سلام
حاکمانِ شہر شاکی ہیں کہ تم ملتے نہیں کبر سے کرتے نہیں اربابِ دولت کو سلام
ہو کے عالم دین کے چلتے ہو راہِ عقل پر ہو کے صوفی حلقۂ اہل طریقت کو سلام
یہ تمہاری وضع و صورت یہ تمہارے رنگ ڈھنگ اک نہ اک دن تم کرو گے دین و ملت کو سلام"

سلسلہ اُن کی ہدایت کا جو پہنچا دین تک کی گذارش میں نے بھی کر کے متانت کو سلام
مشفقِ من! شہر میں جب آدمی کوئی نہیں آپ ہی کہئے نہ کر لوں کیوں سیاست کو سلام
جس میں حق سننے کی استعداد بھی باقی نہیں ایسی باطل قوم کی باطل قیادت کو سلام
حاکموں سے جھوٹ بولوں بیچ ڈالوں قوم کو آپ کا منشا یہ ہے کر لوں شرافت کو سلام
خود لڑاؤں جاہلوں کو خود کروں تبلیغ امن لوں حکومت سے خطاب، ایسی سیاست کو سلام
مجکو اپنے نفس کی ذلت بھی ہے دل سے عزیز غیر سے جو مانگئے ہر ایسی عزت کو سلام
جس کی پاپوشیں بنی ہوں مفلسوں کی کھال سے دور سے اُس وارثِ قاروں کی دولت کو سلام
جس کے ہاتھوں سے ٹپکتا ہو شہیدوں کا لہو سن رکھیں اہل حکومت اس حکومت کو سلام
رند ہی اچھا نہ دو ذوقِ ریاکاری مجھے قید جو حلقے میں ہو ایسی طریقت کو سلام
دین بھی فطری ہے میرا عقل بھی فطری مری ہو جو فطرت کے مخالف اس شریعت کو سلام

ناصحا! جس دین و ملت کے نمائندے ہیں آپ
میکشِ بے دین کا اس دین و ملت کو سلام

وسطی زمانے کا ہندوستان

(از جناب تارا شنکر ناشاد ایم۔اے۔ایل۔ٹی بستی)

آج جبکہ دنیا کا ہر ملک شاہراہ ترقی پر گامزن ہے، ہمارا ہندوستان معاشرتی نقطہ نظر سے قعر پستی میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ اس سے انکار تو کجا چشم پوشی بھی نہیں کی جا سکتی۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ یورپ میں جو مذہبی جھگڑے تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی میں ہوئے تھے وہ آج بیسوی صدی میں ہمارے بدنصیب ملک کے گلے کا ہار بن گئے ہیں۔ جو لوگ یورپ کی تاریخ سے واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ فرانس میں بارتھولومیو کا قتل آج سے تقریباً ۔۰۰ برس پہلے ہوا تھا لیکن ہماری نگاہیں حال ہی میں اس سے کہیں زیادہ مہیب اور خطرناک فرقہ وارانہ فساد کانپور میں دیکھ چکی ہیں۔

ہمارا ماضی کتنا شاندار اور قابل تعریف تھا اُسے دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور نہ ہمارے ذہن میں اس وقت یہ مفہوم ہے۔ بلکہ ہم اس مضمون میں صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں ہندوستان کی کیا حالت تھی؟ ہماری اقتصادی معاشرتی یا مذہبی زندگی اسوقت کیسی تھی؟ ہم نے زندگی کے ضروری شعبوں میں کوئی ترقی کی تھی یا اس اعتبار سے ہم زوال نصیب کہلائے جانے کے مستحق ہیں؟ ہم اس مضمون میں کوئی دعویٰ بغیر دلیل اور کوئی بیان بغیر شہادت پیش کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اُن معترضین سے بچنے کے لئے جو مسلمان مورخین کو ناقابل اعتبار قرار دیکر اُن کو اپنے مذہب کی تعریفیں کرنے والے اور حالات کو مختلف رنگ میں بیان کرنے والے سمجھتے ہیں انتہائی احتیاط سے کام لیں گے اور حتی الامکان یورپین مورخین کی شہادتیں پیش کریں گے۔

سب سے پہلا موضوع جو خواہ مخواہ زیر بحث آیا جا رہا ہے وہ ہماری اقتصادی زندگی۔ ملک کا موجودہ افلاس و غربت محتاج بیان نہیں ہے، کسی گاؤں میں چلے جایئے، کسان اور ان کے بچے انتہائی سقیم حالت میں نظر آئیں گے، نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ بھر کھانے کو اناج۔ شہروں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، خوشحالی نام کو نہیں ہے۔ مسئلہ بیکاری اگرچہ موجودہ دنیا کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے لیکن ہندوستان کے لئے تو یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہماری موجودہ سرکار کے لئے یہی مسئلہ ایک لاینحل مسئلہ ثابت ہو رہا ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اُس زمانہ کی کیا کیفیت تھی۔ جب بقول جناب آنجہانی یہاں "شخصی حکومت" تھی اور مسلمانوں کا "من مانا" راج تھا اور جب بعض مورخین کے قول کے مطابق ہندوؤں کو اپنے مسلمان بھائیوں کی بہ نسبت طرح طرح کے ٹیکس اور جرمانے ادا کرنے پڑتے تھے، جزیہ دینا بھی پڑتا تھا، اور جبکہ مسلمان اپنی آمدنی کا صرف دسواں حصّہ بطور لگان ادا کرتے تھے تو ہندوؤں کو (بالخصوص علاؤالدین کے عہد حکومت میں) اپنی آمدنی کا نصف بطور سرکاری لگان دیدینا ضروری تھا، ملک پر آئے دن چڑھائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ مسلمان بادشاہ اپنی تفریحات پر رعایا کا روپیہ پانی کی طرح بہا دیتے تھے۔ ان بیانات کے بعد آپ کو یہ سنکر یقیناً حیرت ہوگی کہ اس زمانہ میں رعایا اسوقت سے کہیں زیادہ خوشحال اور آرام سے تھی۔ لین پول صاحب اپنی تاریخ Medieval India میں صفحہ ۱۵۰ پر لکھتے ہیں کہ

"اگر ہم درباری مورخ کی بہت سی باتوں پر اعتبار نہ بھی کریں تو بھی ہمیں ماننا پڑے گا کہ فیروز شاہ کے عہد میں ہر شخص، چھوٹا بڑا، آزاد یا غلام خوشحال اور بےفکر تھا ملک میں ہر چیز کی فراوانی تھی، کوئی گاؤں برباد نہیں تھا، نہ کوئی زمین ادسر تھی"

چینی مورخ مہوآن جو سفیر چنگت ہو کے ساتھ ۱۴۰۶ء میں بنگال میں آیا تھا رقمطراز ہے کہ

"امیر اور دولتمند لوگوں کے پاس بڑے بڑے جہاز ہیں جن سے وہ دور دراز کے ملکوں سے تجارت کرتے ہیں، دوسرے لوگ مختلف پیشوں سے گذر اوقات کرتے ہیں، بعض کا ذریعہ معاش کاشتکاری ہے۔ ملک ہر طرح خوشحال ہے، یہاں سینکڑوں قسم کے غلّے پیدا ہوتے ہیں، پان کا رواج کثرت سے ہے۔ آپ کو ہر جگہ پان نوش کرنے کو ملیگا"

اس خوشحالی کا باعث کیا تھا؟ یہی کہ حکومت ملک میں بیکاری کو پیدا نہ ہونے دیتی تھی، سینکڑوں محکمے صرف اسی لئے قائم تھے کہ ان کے ذریعہ اہل علم و فن کی پرورش ہوتی رہے۔ آجکل تو سخت قحط اور سیلاب کے زمانے میں حکومت سڑکیں بنانے یا نہریں جاری کرنے کی اسکیمیں بنواتی ہے لیکن پہلے حکومت اس قسم کا کام ہمیشہ جاری رکھتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کی سینکڑوں خوبصورت اور عالیشان عمارتیں آج بھی زبان حال سے اپنی اگلی شان و شوکت کی داستانیں سنا رہی ہیں۔ آہ! کیا زمانہ تھا کہ دربار میں اہل کمال کا جمگھٹ رہتا تھا، افسوس کہ زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ فنون لطیفہ اس طرح ناپید ہو گئے کہ بات بات پر ہمیں یورپ یا امریکہ کا آئینہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ میں شمالی ہندوستان اکثر خطرناک بیماریوں کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر بیرونی حملہ آور آفت ناگہانی کی طرح آجایا کرتے تھے لیکن بقول جناب آنجہانی ہم جلد ہی تندرست اور بشاش ہو جاتے تھے۔ آجکل کی طرح دق کے مریض بن کر ہمیشہ چارپائی سے نہ لگے رہتے تھے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بظاہر ہم امن کی زندگی گذار رہے ہیں، نہ مغلوں کا سامنا کرنا ہے۔ نہ تاتاریوں سے مورچہ لینا ہے۔ اندرونی لوٹ مار سے بھی ملک پہلے سے زیادہ پاک اور صاف ہے لیکن اس امن نے ہماری ہمت و جرأت اور مشکلوں کو برداشت کرنے کی طاقت کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کا صحیح اندازہ ہمیں اسوقت ہوگا جب خدانخواستہ ہمارے ملک پر جاپانی یا ہٹلری طیارے گولے برسانا شروع کریں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم میں سے ۸۰ فیصدی لوگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ ہم تلوار چلانا جانتے تھے۔ بندوقوں اور توپوں کے استعمال سے واقف تھے۔ ہم میں سے تقریباً ہر شخص گھوڑے کی سواری جانتا تھا اور ہم میں سے ہر شخص کو سینہ تان کر مصیبت کا مقابلہ کرنا آتا تھا۔ لیکن آج ہماری کیا حالت ہے؟ ہم میں سے ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے اس لئے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

حکما کے خیال کے مطابق کسی قوم کی تہذیب کا بہترین عہد اس قوم میں صلح و امن کا زمانہ ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں علمی ترقیات اپنی معراج کو پہنچتی ہیں اور اسی وقت تہذیب کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے۔ انگریزوں کا دور حکومت ہندوستان میں زمانہ امن و سلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں علمی و فنی اعتبار سے ہم نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے، ہمارے مذہبی خیالات میں جو پختگی آئی ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں ہے، جس حد تک ہماری تہذیب نے ترقی کی ہے وہ بھی روشن ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ہمارے کھانے اور پہننے کا بھی کوئی اپنا طریقہ نہیں ہے۔ اور نہ ہم اپنی زبان میں ضروری باتیں کر سکتے ہیں علمی ترقی کا خیال آتے ہی ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے حد یہ ہے کہ جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو یا ہندی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا سوال اٹھتا ہے تو معترضین عام طور پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی میں اُن مضامین پر کتابیں نہیں ہیں جو کورس میں داخل ہیں گویا یہ ہماری ترقی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

ہماری زبانوں کی اس افسوسناک حالت کی وجہ ایسی وجہ نہیں ہے جس کو تلاش کرنا پڑے۔ حضرت مکالے نے انگریزی تعلیم کا رواج دیکر ہماری زبانوں کو ایک نامعلوم وقت تک کے لئے جلاوطن کر دیا۔ سنسکرت کا کوئی کتنا ہی بڑا پنڈت کیوں نہ ہو ہماری نگاہوں میں اس کی بالکل وقعت نہیں اسی طرح عربی کا کتنا ہی بڑا عالم یا منشی کیوں نہ ہو ہم اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ بدقسمتی سے ہمارے نزدیک وہی شخص قابل تعظیم ہے۔ جو انگریزی کا بڑا ادیب یا شاعر ہے، اخباری دنیا میں بھی انگریزی اخباروں کو جو پوزیشن حاصل ہے وہ اردو یا ہندی کے بہترین اخباروں کو بھی نصیب نہیں اور وہ شاید اس لئے کہ اردو یا ہندی غلاموں کی زبان ہے اور یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ غلاموں کی زبان کو وہ فصاحت و بلاغت یا روانی و جوش کہاں نصیب ہو سکتا ہے جو ایک آزاد قوم کی زبان کو حاصل ہوتا ہے۔ زبان کا تعلق جذبات سے ہے۔ جب ہمارے دلوں میں غلامی کا احساس موجود ہے، ہمارے دماغوں پر کمزوری چھائی ہوئی ہے تو ہماری زبان میں زور کہاں سے آئیگا؟ موجودہ زمانہ نے ہندوستان میں بین الاقوامی شہرت کے صرف دو شاعر اقبال اور ٹیگور پیدا کئے لیکن انگریزی تاریخوں کے صفحات وسطی زمانے کے ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے تفصیلی تذکرے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے تاہم اجمالی ذکر یہاں بھی بے موقع نہیں۔

وسطی زمانے کے سب سے بڑے شاعر اور علم موسیقی کے ماہر امیر خسرو تھے، انھیں ہندوستانی مورخین نے طوطی ہند لکھا ہے، خسرو نہ صرف فنون لطیفہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے بلکہ اس زمانہ کے مایۂ ناز ادیب بھی تھے اور حضرت ابوالفضل کی طرح قلم اور تلوار دونوں کے ماہر تھے، خزائنہ الفتح کی عبارت شاہد ہے کہ خسرو کی نثر بھی بڑے معرکہ کی ہوتی تھی، علم موسیقی میں اس زمانہ کے مشہور مغنی گوپال نایک کے ساتھ آپ کے مباحثے انتہائی دلچسپ ہیں۔ دوسرے قابل ذکر مصنف حضرت میر حسن دہلوی تھے۔ آپ نے شیخ نظام الدین قدس سرہٗ کی جامع سوانح عمری لکھی اور اس ڈھنگ سے لکھی کہ پڑھنے والے کو فسانہ کا لطف آتا ہے۔ شاعرانہ انداز میں نثر لکھنے والوں میں منہاج السراج، ضیاءالدین برنی، شمس السراج عین الملک ملتانی، غلام یحییٰ ابن احمد مصنف تاریخ فیروز شاہی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت معین الدین عمرانی۔ مولانا خواجہ احمد تھانیسری، ظہیر دہلوی، حسن نشقی، اور نورالحق کے نام قابل ذکر ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سنسکرت کتابوں کا ترجمہ اکبر کے وقت سے شروع ہوا اگر ہماری معلومات کے مطابق یہ کام بہت پہلے شروع

ہو چکا تھا۔ محمد بن موسیٰ پہلے شخص ہیں جنھوں نے الجبرا پر ایک جامع کتاب سنسکرت کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی البیرونی جو محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے مولانا خالد خاں نے سنسکرت کی فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد دلایل فیروز شاہی تصنیف کی مسلمانوں کے دور حکومت میں مسلم علما کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں کہی جا سکتی مگر اسی زمانہ میں ہندو شاعروں اور فلاسفروں کی بہتات یقیناً آپ کیلئے تعجب انگیز ہوگی اور شاید یہ بات سمجھ میں نہ آسکے کہ اسلامی حکومت کے "زمانہ جور و تشدد" میں یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ہندوؤں نے بڑی بڑی جامع اور مدلل کتابیں لکھ ڈالیں جن کیلئے بے انتہا فرصت اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ راماَنج نے برہم سوتروں کی تفسیر اسی زمانہ میں لکھی۔ ہم چندر جین فلاسفر نے اپنی مشہور گرامر اسی عہد میں سپرد قلم کی۔ بنگال کے مشہور شاعر جے دیو نے اپنی غیر فانی نظم "گیت گوبند" اسی دور میں تصنیف کی۔ متاکشرا ہندو قانون کی کتاب جو اب تک مستند مانی جاتی ہے اور جوت بابن اسی زمانہ کی کتابیں ہیں۔ ودیاپتی، داچسپتی مصر، ہندی کے ممتاز شاعر، کسب چند بردائی مصنف پرتھوی راج راسو، جگ نایک مصنف آل کھنڈ جو اب بھی شوق کے ساتھ پڑھی اور لطف کے ساتھ سنی جاتی ہے، سب اسی زمانہ کے تھے۔ ہندی نے، جیسے بعض ہندو حضرات سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زیر عتاب ہے، اُس زمانہ میں اتنی ترقی کی کہ حساب نہیں لگایا جا سکتا، خود مسلمانوں نے ہندی کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا۔ جناب امیر خسرو صرف فارسی ہی کے قابل رشک شاعر نہ تھے بلکہ ہندی میں بھی اُن کی شاعری اُن کے زمانے کے ہندو شعرا سے کہیں بڑھی چڑھی تھی۔ مولانا داؤد ہندی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اس زمانہ کے ہندو شعرا میں وِٹھل ناتھ، ودیاپتی ٹھاکر، نامدیو، رامانند، و کبیر کے اسمائے گرامی ہمیشہ تاریخی صفحات پر جلی حروف میں لکھے جائیں گے۔

مسلمان بادشاہوں اور انگریز حکمرانوں میں بیّن فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا تو اُسے اپنا وطن بنایا، وہ ہندوستان ہی کے لئے جئے اور ہندوستان ہی کی خاطر مرے، چنانچہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ ایک خاص اہمیت کا زمانہ ہے۔ اگرچہ انگریز مورخین نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ مسلمانوں پر ضرورت سے زیادہ ظلم کیا ہے اور صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان فرمانروا ہندوؤں کے حقیقی دشمن، ان کی دولت کے لئے خطرناک ڈاکو، اور انکی تہذیب کو تباہ و برباد کر دینے والے لٹیرے تھے۔ لیکن جب تاریخ ایمانداری کے ساتھ لکھی جائیگی اور واقعات حقیقت کی روشنی میں چمکینگے تو معلوم ہوگا کہ مسلمان بادشاہوں نے نہ صرف ہندوستان کی حکومت میں دلچسپی لی بلکہ اس ملک کو اپنا وطن سمجھ کر اُسے ہر ممکن طریقہ سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی انتہائی کوشش بھی کی۔ انگریزوں کو ہندوستان میں حکومت کرتے ہوئے ۲۰۰ برس ہو گئے، کوئی بتلائے کہ انھوں نے ہندستان کے مفاد میں کیا کیا؟ ہاں چند ایک پارک جن میں ملکہ معظمہ ایڈورڈ ہفتم یا دوسرے انگریزوں کے مجسمے نصب ہیں یا پرانے زخموں کو تازہ کرنے کے لئے کانپور کا میموریل ویل، لکھنؤ ریزیڈنسی کی عمارتیں ان کی منحوس یادگاریں ہیں۔ انگریز حکمراں ہمیشہ ہم سے الگ تھلگ رہے ہمارے یہاں کی انھیں کوئی چیز پسند آئی تو پہلے تو اس کو بمبئی یا کلکتہ کے عجائب گھر میں پہنچایا گیا اور پھر جہاز پر لاد کر لندن بھیجدیا گیا۔ مسلمان بادشاہ بھی باہر سے آئے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تمام فلک بوس عمارتیں، خوبصورت باغات، عمدہ قلعے، شاندار محلات وغیرہ سب اپنی زبان حال سے اعلان کر رہے ہیں کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان کو اور یہاں کے رہنے والوں کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔

کیا اخلاقی اعتبار سے موجودہ زمانہ میں ہم نے ترقی کی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی انتہائی مایوس کن ہے۔ مسلم دور حکومت میں ہماری اخلاقی حالت کہیں بہتر تھی جس کا پرتو آجکل کے بوڑھوں میں ہم کو نظر آتا ہے۔ ہماری موجودہ اخلاقی پستی کا اندازہ جیل کمیٹی کی رپورٹوں سے بخوبی ہوتا ہے اور عدالتوں کی مصروفیتیں اس سلسلہ میں ناقابل تردید شہادت مہیا کرتی ہیں۔ جیل کے محکمہ پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں کروڑوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ لیکن حال یہ ہے کہ دو روپیہ میں ایمان و ضمیر سب کچھ خرید لیا جاتا ہے اور یہ سودا ملک کے ترقی یافتہ طبقہ کے ہاتھوں اور اس کے سامنے بالاعلان ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ جو شخص جھوٹ بولنے کو عار اور فریب دینے کو گناہ سمجھتا ہے اس کو "بُدھو" یا "گنوار" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، چاپلوسی اور خوشامد ہماری تہذیب کا جزو بن گیا ہے۔ ہمت و جرأت کا یہ حال ہے کہ جو کام ہمیں پسند نہیں ہے یا اس کو ہم کرنا نہیں چاہتے ہیں اس کا اظہار نہیں کر سکتے بلکہ سائل کو حیلوں سے ٹال دیتے ہیں غرض اس افسوسناک اخلاقی پستی کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ لیکن کیا یہ برائیاں ہم نے پیدا کی ہیں یا خود بخود پیدا ہو گئی ہیں؟ اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ خرابیاں نہ ہم نے پیدا کی ہیں اور نہ خود پیدا ہوئی ہیں۔ بلکہ ان کی بنیادیں ہمارے موجودہ حکمرانوں کی عنایت پر قائم ہیں اسی لئے آج ہندوستان آزادی کی جنگ میں مصروف ہے اور اس نے سمجھ لیا ہے کہ ملک میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کئے بغیر ہماری پستیاں دور نہیں ہو سکتیں اور اسی لئے آج ہندوستان کا ہر خوددار بچہ نعرے لگا رہا ہے کہ

انقلاب زندہ باد!

علما اور سیاست

(از مولانا سید علی صاحب ندوی اُستاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلامی ممالک بالخصوص ٹرکی میں بیسویں صدی کی ابتدا سے جدید تعلیم یافتہ اور ترقی پسند گروہ میں مذہب و سیاست کی تفریق کا رجحان پیدا ہوا۔ جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے اسلام جو مذہب کے نمایندے تھے۔ سیاست، ملک کے نظم و نسق اور قانون سازی سے علحدہ کر دیے جائیں اور ان کا منصب خالص دینی رہنمائی اور مذہبی رسوم و فرائض کی ادائیگی قرار پائے ۱۹۲۳ء میں یہ گروہ ٹرکی میں برسر اقتدار ہو گیا، اور مارچ ۱۹۲۴ء میں اس نے خلافت کے خاتمہ کے ساتھ ریاست اور مذہب کی تفریق مکمل کر دی، ہندوستان میں جدید تعلیم کے ساتھ یہ رجحان پہلے سے موجود تھا لیکن ۱۹۳۶ء سے مختلف اسباب کی بنا پر یہ خیال جدید طبقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب و محرکات ٹرکی سے بالکل مختلف ہیں مگر دینی اقتدار اور اسلامی زندگی کے حق میں نتیجہ یکساں ہے یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے نہایت اہم ہے اور جذبات و اثرات سے ہٹکر فریقین کے کامل غور و فکر کا محتاج ہے میں اس مسئلہ کی تاریخ، مختلف ممالک میں اس کے اسباب و دواعی، اس کے سیاسی اور تاریخی ماحول اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ کم از کم ہندوستان میں ابھی اسلامی نقطۂ نظر کی اہمیت باقی ہے اور اکثر جگہ یہی بحث و نظر کی بنیاد ہے۔

مذاہب و سیاست کی تاریخ میں سب سے پہلے مذہب و سیاست کی تفریق اور علما و سیاست کی بحث مذہب عیسوی اور اس کے حاملین کی تاریخ میں ملتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی مسیحی ذہنیت اس وقت اسلامی ممالک میں کام کر رہی ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس کی تاریخ اور اس کے ماحول کا مطالعہ کرنا ہے۔

مسیحیت اور مذہب و سیاست کی تقسیم

مسیحی مذہب خالص روحانی اور متصوفانہ تعلیم تھی جس کا سرمایہ پہلی صدی عیسوی سے اس وقت تک صرف حضرت مسیح کے آخری تین سال کے غیر مرتب واقعات معجزات اور مواعظ و امثال ہیں۔ ان میں کوئی دستور جہانبانی، نظام سیاست، اور قانون و آئین نہیں تھا یا تھا لیکن یہودیوں کے خوف سے ہمیشہ باغیانہ اور انقلابی لٹریچر کی طرح چھپایا گیا۔ یہاں تک کہ حقیقتاً گم ہو گیا اور دنیا نے اس کے متعلق کبھی بھی کچھ نہ جانا یا ان حوادث میں جو ابتدائی مسیحی صدیوں میں پیش آئے مسیحی تعلیم کے بہت بڑے سرمایہ کے ساتھ ضائع ہو گیا، بہر حال بات ایک ہے مسیحی علما کے پاس ایسی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ زمین کے کسی مختصر حصہ میں مختصر مدت کے لئے کوئی اس نوع کی زندگی گذاریں جس کو سیاسی یا حاکمانہ زندگی کہتے ہیں۔ مذہب کے ابتدائی پیرو علما و غیرہ ناموافق حالات اور اپنے مذہب کے رو سے مجبور تھے کہ راہبانہ اور صوفیانہ زندگی گذاریں، تیسری صدی تک ان کے تصور میں نہ تھا کہ ان کے مذہب کو کبھی مادی اقتدار حاصل ہوگا نہ انھوں نے کبھی اس کی کوشش کی۔ قسطنطین اول نے ۳۱۲ء میں مسیحی مذہب قبول کیا اور مسیحی مذہب سرکاری مذہب بن گیا، حضرت مسیح کے صلح کل سراپا آشتی صوفیانہ اور خالص غیر سیاسی مذہب کی تعلیم تھی کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی لے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا" "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو" (انجیل متی)

فاتحوں کا ایک دن ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مگر ہندوستان کے بدھ سلاطین کی طرح مسیحی سلاطین نے محض اپنی شاہانہ قوت سے اس آب و آتش کو جمع کر دیا۔ علما و پیشوایان مذہب نے بادشاہ کو سیاسی و انتظامی امور میں آزاد و خود مختار رکھا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اسکی دنیاوی رہنمائی نہیں کر سکتے لیکن علما، اپنے معاشی حالات کی وجہ سے نیز اپنے جاہ و منصب کے لئے دربار کی سرپرستی سے اور دربار اپنی سیاسی مصالح و ضروریات کی وجہ سے باہم ایک دوسرے کی خدمات و امداد سے زیادہ دنوں تک بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ اس مشترک احتیاج کی وجہ سے سرحدیں برقرار نہیں رہ سکیں اور رفتہ رفتہ علما، اور مشائخ نے وقت کی سیاست، قصر شاہی کے معاملات اور قوم کی ذہنیت اور نفسیات میں دخل پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مذہب سے زیادہ اپنے مذہبی اقتدار اور اپنی ذاتی قابلیت سے فائدہ اٹھایا کچھ ہی عرصہ بعد کلیسا کو وہ اقتدار حاصل ہو گیا جس پر بڑی سے بڑی شنشاہیت رشک کر سکتی تھی۔ ارباب کلیسا سلاطین کا عزل ونصب کرتے تھے۔ اور بساط سیاست پر شطرنج کھیلتے تھے، روحی کلیسا مسیحی دنیا کا روحانی قبلہ ذہنی سرچشمہ اور قصر حکومت تھا، اس وقت حقیقۃً سیاست مذہب کے اقتدار میں آگئی تھی، لیکن یہ کشتی جس میں دو مختلف سمتوں میں بادبان لگے ہوئے تھے۔ صرف اسوقت تک چل سکتی تھی جب تک ایک رخ کی ہوا چلتی رہے، مذہب مسیحی اور سیاست مادی کے رخ بالکل مختلف اور ایک دوسرے کے مقابل تھے، شاید یہ کشتی کچھ دن اور طوفان کا مقابلہ کرتی۔ لیکن پیشوایان مذہب نے اپنا بادبان خود شکستہ کر دیا، انھوں نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا، وہ پاکباز، فرض شناس انسان اور مذہب کے محافظ بننے کے بجائے، مقدس دیوتا، لالچی سوداگر اور عیاش فاتح بن گئے۔ انھوں نے قوم کی انفرادیت کو اپنی شخصیت میں فنا کرنا چاہا۔ علم واجتہاد کے چشمے خشک کر دیئے، فکر ونظر کے راستوں پر چوکی پہرے بٹھا دیئے، دین کو سراسر دکانداری اور علم کو تمامتر عیاری کا فن بنا دیا، اپنے اقتدار اور جاہ کے لئے ہزاروں عقائد اور فرقے بنا دیئے، فضول مذہبی مناظروں کا بازار گرم کیا، ایک دوسرے کی تکفیر وتذلیل کی، دوراز کار جزئیات وفروع پر اپنا اور قوم کا وقت اور قوت ضائع کرنی اور اپنی تمام تر توجہ اور قابلیت مضحکہ خیز مسائل کی تحقیق وتدقیق پر صرف کرنی شروع کی، تحقیق اور علمی ترقی کا دروازہ بند کر دیا اور ہر مفید و معقول تحریک، ہر ضروری تبدیلی اور ترقی کی بھی سختی سے مخالفت کی، روشن خیال، ترقی پسند اور علم دوست گروہ کو جو پیدا ہو رہا تھا اور جس کو پیدا ہونا تھا کچل دینے کی کوشش کی، ان کو قتل کیا اور جلایا، گرفتار کیا اور جلا وطن کیا، ہر نئے علمی انکشاف کو کفر وبغاوت کا مرادف سمجھا، (ملاحظہ ہو معرکۂ مذہب و سائنس از ڈریپر) اور بے ضرورت عقل ومذہب میں ہمیشہ کے لئے رقابت پیدا کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلیت پسند طبقہ ان مکار و عیاش مذہبیوں کی وجہ سے مذہب ہی سے متنفر ہو گیا۔ یہ حالات سو پچاس برس نہیں، صدیوں قائم رہے۔ پندرھویں صدی کی انتہا اور سولھویں صدی کی ابتدا، یورپ میں اس عقلی جمود اور اس مذہبی بربریت کا تاریک عہد ہے۔

رہنمایان مذہب کے خلاف بغاوت

ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کے خلاف ردّ عمل ہو، اور اس غلط قسم کی مذہبیت اور اس نوع کے نمایندگان مذہب کے خلاف علَم بغاوت بلند ہو۔ چنانچہ پندرھویں صدی میں یورپ میں دو شخص پیدا ہوئے، اٹلی میں میکاولی فرنساوی (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۲۷ء) اور جرمنی میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۴۶ء) دونوں کے مبادی واساس میں فرق تھا، مگر دونوں کی کامیابی کلیسائی اقتدار پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ میکاولی کی تحریک خالص سیاسی اور وطنی تحریک تھی، اس کی تبلیغ تھی کہ ——

"مذہب کو سیاست کے ماتحت رکھنا چاہئے کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے جو ہر شے پر مقدم ہے۔ عیسائیت کا تعلق دوسری زندگی سے ہے۔ اسے ہماری دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، نیکوکار انسانوں کا وجود کلیسا کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن حکومت کے لئے مفید نہیں کیونکہ وہ لوگ ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کر سکتے، انسان فطرتاً مجبور ہے، اس لئے ساری طاقت حکومت کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، اخلاق کی دو قسمیں ہیں، پبلک اور پرائیویٹ، پرائیویٹ اخلاق سے حکومت کو کوئی تعلق نہیں"

لوتھر کی تحریک مذہبی اور اصلاحی تحریک تھی۔ اس کو اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے جرمن قوم کی شرافت وعظمت سے اپیل کرنی پڑی اور رومی کلیسا کے اقتدار کے خلاف جذبہ قومیت کو بیدار کرنا پڑا۔ اور اس کا خاتمہ بھی۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار کے بیان کے مطابق) اسی بات پر ہوا کہ کلیساؤں کو حکومت کے ماتحت کر دیا جائے۔ اور اس طرح لوتھر اور میکاولی دونوں کی کوششوں سے مذہب کو حکومت سے الگ کر کے اُسے حکومت کے زیر اثر کر دیا گیا۔

کلیساؤں کی ذہنی غلامی سے آزادی اور کلیسائی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ یورپ میں علمی تحقیقات وانکشافات اور مادی ترقی کا دور شروع ہوا جو اس وقت تک قائم ہے،

انقلاب کے نتائج

لیکن اس عظیم الشان تبدیلی سے یورپ کو جو فوائد حاصل ہوئے ان کے ساتھ اس کو چند شدید نقصانات بھی پہونچے۔ اول تو یہ کہ مسیحی دنیا کی وہ وحدتِ فکر اور وحدتِ سیاسی ختم ہو گئی جو مرکز (رومی کلیسا) کی وحدت کی وجہ سے قائم تھی۔ یہ وحدت ایک ایسی وحدت تھی جس کی نظیر صرف خلافت اسلامی میں مل سکتی ہے۔ اس وحدت کی جگہ وطنیت اور قومیت نے لے لی۔ جن سے بڑھ کر انسانیت کی اجتماعی صحت کے لئے آج تک کوئی زہر دریافت نہیں ہوا۔ لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس میں بالکل صحیح کہا تھا کہ

"جب لوتھر کی تحریک نے جس کو اصلاح مذہب کی تحریک کہا جاتا ہے۔ یورپ کی تہذیبی (کلچرل) اور مذہبی وحدت کو فنا کیا تو یہ براعظم مختلف قومی ریاستوں میں بٹ گیا جن کے آپس کے جھگڑے دنیا کے امن کے لئے مستقل خطرہ بن گئے ہیں"

دوسرا نقصان یہ پہونچا کہ یورپ کی سیاست "دیو بے زنجیر" بن گئی۔ جس کے لئے اخلاق وشریعت کی کوئی روک نہیں رہی۔ میکاولی نے جو آج یورپ کا سیاسی پیغمبر اور اسکی کتابیں صحف سماوی کا درجہ رکھتی ہیں، پہلے ہی لکھدیا تھا کہ ———— "اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا ہے، اس میں اخلاق وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔ قومی اقتدار کا سوال ہو تو عدل وظلم، رحم وبیرحمی، مدح وذم سب باتوں کو بالائے طاق رکھدینا چاہیے۔ ایفاء عہد ضروری نہیں، حکمرانوں کو اپنے اندر لومڑی کی سی صفات پیدا کرنی چاہئیں"

بہرحال یہ دن مسیحی مذہب کے نقص کی وجہ سے کبھی نہ کبھی پیش آنے والا تھا۔ حاملین مذہب کی نا قابلیت نے اسکو اور قریب کر دیا۔ مذہب مسیحی کی ساخت ایسی تھی کہ وہ ایک دن کے لئے بھی دنیا کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، لیکن افسوس ہے کہ لوگ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ یورپ میں مذہب وسیاست کے مابین نباہ نہ ہو سکا۔ مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کس مذہب وسیاست میں نباہ نہ ہو سکا۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے،

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی	سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں	کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا	چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی	ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی	دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا	بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہو اک جنیدی اور اک اردشیری

مذہب وسیاست اور اسلام

لیکن اسلام مسیحیت کی طرح چند عقائد اور مذہبی رسوم کا نام نہیں جو کسی تمدن میں، کسی قانون وحکومت کے ماتحت کسی طرز زندگی کے ساتھ برتے جا سکتے ہیں، اسلام ایک مکمل مذہبی واخلاقی سیاسی اور شہری نظام ہے، اس کا دنیا میں ایک مخصوص معاشرتی اور اخلاقی پروگرام ہے جسکے کسی ایک جز پر عمل کر لینا اسلام پر عمل کر لینے کے ہم معنی نہیں۔ اس میں مذہب وسیاست کی کوئی تفریق نہیں۔ اس کا مذہب سیاست ہے اور اس کی سیاست مذہب ہے۔ وہ کسی سیاسی صحیفہ کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس کو کسی دنیاوی ضمیمہ اور الحاق کی ضرورت ہے، اس لئے قدرۃً اس کا پروگرام جاری کرنے کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کے ہر جز کو مانتے اور سمجھتے اور اس سے ہمدردی رکھتے ہوں۔

عہد رسالت وخلافت راشدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں دینی ودنیوی تمام صفات موجود تھیں۔ آپؐ مسجد نبوی کے امام، مدینہ کی عدالت عالیہ کے قاضی القضاۃ، شہر کے حاکم ومنتظم، قوم کے امیر ومشیر اور میدان جنگ کے سب سے بڑے قائد تھے، اسلئے آپ کی موجودگی میں ایک منٹ کیلئے بھی مذہب وسیاست کی تفریق کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کے ابتدائی جانشین جن کو تاریخ اسلام خلفاء راشدین کہتی ہے، آپ کے پرتو تھے اور دین ودنیا کی صفات ان میں کامیاب ترین طور پر جمع تھیں۔ اسلام کے دینی ودنیوی پروگرام کے ہر جزو سے ان کو ہمدردی اور دلچسپی تھی، اور ان کو اس بارہ میں کامل اطمینان تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو صرف ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ متوازن ترقی ہوئی۔ یعنی دین و روحانیت، خدا پرستی واخلاق، حکومت واقتدار اور ملک گیری وفتوحات کو یکساں ترقی ہوئی۔ سیاسی نظام کے ساتھ وہ دینی نظام اور دینی ماحول بھی پیدا ہوا جو صرف اسی قسم کی دیندار حکومت میں پیدا ہو سکتا ہے، یہ کامیابی اس پیشینگوئی کی تکمیل تھی جو قرآن نے بہت پہلے کی تھی،

الذین ان مکّنّٰھم فی الارض	یہ مسلمان وہ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں با اقتدار
اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا	کرینگے تو یہ نماز وزکوٰۃ کا نظام قائم کرینگے بھلائی
بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج)	کا حکم کرینگے، برائی سے روکیں گے۔

ان خلفائے راشدین کو اپنے زمانہ میں کوئی مشیر دینی یا شیخ الاسلام رکھنے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانہ کا بڑا عالم دین اور فقیہ تھا،

اسلام کا عہد زوال لیکن یہ عہد سعادت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ ان خلفا کے بعد اسلام کی مسند حکومت پر وہ لوگ آئے جن کی دینی تربیت وتعلیم نہیں ہوئی تھی اور جو دین ودنیا کے جامع نہیں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو غیر متوازن ترقی ہوئی، یعنی اس کی سلطنت کے حدود وسیع ہو گئے، اسکی سلطنت کا رقبہ بڑھ گیا، اس کا بیت المال جو اب خزانۂ شاہی تھا پہلے سے زیادہ معمور ہو گیا، اسکی دار السلطنت میں بڑی شاندار اور نادر عمارتیں تعمیر ہو گئیں، پرشکوہ اور حسین مسجدیں، شاندار خانقاہیں اور وسیع مدارس بھی بن گئے، تمدن انتہائی ترقی کر گیا، فنون لطیفہ اور علوم کو بیحد فروغ ہوا، یہ سب کچھ ہوا مگر اسلام کا اخلاقی اور دینی معیار (آئیڈیل) ختم ہو گیا، اس آسمانی نظام حکومت ومعیشت کی جگہ (جس کا قائم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا) انسانی نظام، افلاطون و ارسطو کے نظریۂ حکومت، بازنطینی رومی اور ایرانی نظام حکومت نے

لے لی۔ مذہب و نمایندگان مذہب کے اقتدار کے ختم ہو جانے سے ایک معزول بادشاہ کی طرح علی زندگی اور سوسائٹی پر مذہب کا کوئی اثر نہیں رہا اور اس کو اپنی جگہ زندگی کی کشمکش سے ہٹکر پُرامن مسجدوں اور سنسان خانقاہوں میں ڈھونڈنی پڑی۔

اسلامی حکومت کے آخری عہد تک ہر سلطنت میں مشیر دینی، قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام ہوتے تھے۔ مگران کی حیثیت سلطنت کے ملازمین کی سی تھی اور زندگی کے دوسرے لوازم اور سلطنت کے دوسرے سامان آرائش کی طرح یہ عہدے بھی ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ان وابستگان حکومت میں سے علمائے حق نے اپنا فریضہ ادا کیا۔ اور سلطنت کو چند دینی مشورے دیئے، تاریخ اسلام رجاء بن حیوۃ اور قاضی ابو یوسف کو نہیں بھول سکتی کہ اول الذکر نے سلیمان بن عبدالملک کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا جس سے زیادہ مبارک مشورہ اسلام میں ایک بادشاہ کو نہیں دیا گیا، اور قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو اسلامی مالیات، خراج اور شرعی بندوبست کے ضروری مشورے دیئے لیکن ان سب کی حیثیت مشورے کی تھی، حکم کی نہیں تھی اور دنیا کی اصلاح حکم سے ہوتی ہے، مشورہ سے نہیں ہوتی۔

دربار سے باہر علمائے ربانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے اور ہمیشہ حکومت وقت کے غیر دینی رجحانات کا مقابلہ غیر معمولی استقلال اور ثابت قدمی سے کرتے تھے۔ لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں اور غیر دینی حکومت کے جو برے اثرات سوسائٹی پر پڑتے تھے ان کو روک نہیں سکتی تھیں،

ٹرکی اور مذہب و سیاست کی تفریق

ہم اسلامی ممالک میں ٹرکی کو انتخاب کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دنیائے اسلام میں مشرق و مغرب اور ان کے متقابل رجحانات کی کشمکش کی سب سے بڑی جولانگاہ ہے اور اسلامی ممالک اور سلطنتیں ٹرکی کی ذہنی قیادت قبول کر رہی ہیں۔ مصر و ہندوستان و افغانستان و ایران کے نوجوان مسلمانوں میں تمامتر نوجوان ترکوں کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔ ہم پہلے دکھائیں گے کہ سلطنت عثمانی میں علمائے اسلام کی پہلے کیا حیثیت تھی اور کس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جن سے مذہب و سیاست کی تفریق ہوئی۔

عثمانیوں کا سیاسی مزاج مختلف اسلامی و غیر اسلامی اجزا سے مرکب تھا۔ ان کا نظام سلطنت دنیا کے مختلف ریاستی تجربات اور اصول حکومت پر مبنی تھا جس میں اسلامی عدل و مساوات، اسلامی پرسنل لا (شریعت) کے ساتھ بعض قدیم قومی خصوصیات، بازنطینی تنظیم، رومی سیاست اور افلاطون کی ریاست کے نظریات شامل تھے۔

سلطنت کے بنیادی عناصر میں سے ایک طبقہ علمائے اسلام کا تھا۔ جن کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا، خالدہ ادیب خانم اس طبقہ کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں،

"یہ ایک بہت قوی اور با اثر طبقہ تھا جس کی خاص تربیت ہوتی تھی۔ اس کا اصلی فرض یہ تھا کہ ملت اسلامی کے مذہبی اور قانونی معاملات کی نگرانی کرے۔ مگر اس کے علاوہ سلطان کے استبداد کو حد اعتدال میں رکھنے کے لئے وہ ایک اخلاقی قوت کا بھی کام دیتا تھا، صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جو سلطان کو معزول کرنے کا اختیار رکھتی تھی، بغیر اس کی منظوری کے کوئی نیا قانون نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ وہ تمام ملتوں کی طرف سے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی سلطنت کے مقابلہ میں رعایا کے حقوق کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر جبری تبدیلی مذہب کی مخالفت کی"

یہ نظام قرون متوسط کے مسیحی نظام حکومت سے اصولاً متحد ہونے کے باوجود اس سے برتر اور اس سے زیادہ بے ضرر تھا۔ اس میں سلطنت کے عناصر کے حدود و اختیارات متعین تھے اور کام کی تقسیم تھی، مذہب و سیاست کی تفریق سولھویں صدی کے بعد کے نظام حکومت سے کم لیکن اس کے پیشتر کے نظام سے زیادہ تھی۔

سترھویں صدی سے جب ترکی قوم کا زوال شروع ہوا تو علماء بھی اس عام قومی زوال سے محفوظ نہیں رہے۔ علماء کے زوال کی تاریخ کے دو باب بہت اہم ہیں۔ (۱) اخلاقی انحطاط۔ (۲) علمی انحطاط۔

۱۔ اخلاقی انحطاط کی تفصیل یہ ہے کہ علماء بعد کی صدیوں میں اپنے قدیم اخلاقی معیار اور اصول پر قائم نہیں رہے، اور انھوں نے بھی ارباب کلیسا کی طرح اپنے مذہبی اقتدار سے ذاتی منافع حاصل کئے۔ خالدہ خانم کہتی ہیں۔

"سلطان کو معزول کرنے کا حق جو علماء کو حاصل تھا ایک مستقل اخلاقی قوت کی حیثیت سے ظلم و استبداد کو روکنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسے فوج سے اتحاد کرنا پڑا، اور سیاسی امور میں دخل دینا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی جماعت اب ایک غیر سیاسی اور مذہبی جماعت نہیں رہی۔ مذہب بھی بساط سیاست کا ایک مہرہ بن گیا"

۲۔ علمی انحطاط کی صورت یہ ہے کہ ٹرکی میں علماء کی ذمہ داریاں اور فرائض تمام اسلامی ممالک کے علماء سے بڑھ کر تھے،

اس کے کئی اسباب تھے (۱) اول یہ کہ وہ یورپ میں رہتے تھے جو علوم و فنون کے طلوع ہونے والے آفتاب کا مشرق تھا۔ اور جہاں اقبال کی زبان میں "تاروں کی گردش تیز اور ہر ذرہ کے دل میں غوغائے رستاخیز تھا"

(۲) ان کا مقابلہ ان اقوام سے تھا جنھوں نے اختراعات و انکشافات کی نئی دنیا دریافت کر لی تھی، جو قوائے طبعیہ کی تسخیر اور اسرار فطرت کی نقاب کشائی اور دنیا کی ہونیوالی سیاسی و اقتصادی و ذہنی جنگ کے لئے نئے نئے اسلحہ دریافت کر رہی تھیں اور قلعے تعمیر کر رہی تھیں۔

(۳) یہ وہ زمانہ تھا جس کا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر تھا جس میں قوموں کی قسمتیں لکھی جا رہی تھیں، اور دنیا کا آیندہ نقشہ تیار کیا جا رہا تھا،

ناممکن تھا کہ اس عام تلاطم کے زمانہ میں ٹرکی کے بحر خاموش میں تموج نہ پیدا ہوتا۔ اس حالت میں علماء کا صرف یہی فرض نہیں تھا کہ وہ زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھیں، اور اسکے سینہ کی دھڑکن کو دیکھیں، بلکہ یہ بھی فرض تھا کہ وہ زمانہ کی رہنمائی کریں۔ نئے رجحانات اور تقاضوں کی نگرانی کریں، صحیح تقاضوں کو پورا کریں اور غلط تقاضوں کی اصلاح کریں، نوجوانوں کی ایسی اسلامی تعلیم و تربیت کریں جو مغربی علوم و فنون کے برے اثرات اور "سیاسی و معاشرتی الحاد" کا مقابلہ کر سکے، نیز اسلامی تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی ثقافت کی برتری ثابت کریں، اور ان کو اسلامی رنگ میں کم سے کم اتنا رنگ دیں کہ ان کے ہاتھوں سے سیاست و تمدن میں جو انقلاب ہو وہ سراپا غیر اسلامی نہو، اپنے قدیم طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاح و تغیر اور ترمیم و اضافہ کریں، علوم جدیدہ کو دینی مدارس میں داخل کریں، ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ انقلاب کو روکنے سے زیادہ انقلاب کے رُخ کو صحیح راستہ کی طرف پھیر کر اسے مفید بنانا ضروری ہے،

لیکن اسلام اور ٹرکی کی بدقسمتی تھی کہ علماء نے اپنے اس فریضہ کے ادا کرنے میں کوتاہی کی، اس کی تفصیل خالدہ ادیب خانم کی زبان سے سنئے۔

"ملت اسلامی کی تعلیم انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی، جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے، مدرسۂ سلیمانیہ اور مدرسہ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے۔ مگر جب مغرب نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنیاد ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت علمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی، یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا۔ وہیں ... اب تک ہے، آگے نہیں بڑھا یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا۔ انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اسقدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدے اور تجربے کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی۔ سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے دقیانوسی فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد صرف خشک استدلال پر رہنے دیں۔ چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا،

۱۸۶۰ء سے ریاست نے ابتدائی تعلیم کے مدارس بھی قائم کئے جن میں جدید نصاب رائج تھا۔ مگر ان کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے طلبہ کی کثیر تعداد بدستور مسجدوں کے مکاتب میں پڑھتی رہی۔ چنانچہ عوام کی تعلیم پر بھی جمود طاری رہا، اور آگے چلکر جو کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں وہ بجائے اس کے کہ صحیح ارتقا اور نشو و نما کا نتیجہ ہوتیں حکمراں طبقہ کی طرف سے زبردستی عائد کی گئیں۔ ان کو نافذ کرنے والی عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو علماء کو نہ صرف تعلیم سے بے دخل کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ ان کی اخلاقی اور روحانی حکومت کی بیخ کنی کے بھی درپے تھی،"

نوجوانوں کی مذہب سے بیزاری اور بدگمانی کے وجوہ میں ایک بڑی وجہ ان سلاطین کا طرز عمل، جبر و تشدد، جمود اور توہم و بدگمانی بھی تھی جو خلیفۃ المسلمین کہلاتے تھے اور نائب رسولؐ و حامیٔ اسلام سمجھے جاتے تھے خصوصاً خلافت کے سب سے بڑے مدعی و مبلغ سلطان عبدالحمید خان کے سلوک و رویہ نے نوجوان ترکوں کو اور زیادہ مشتعل اور زخم خوردہ بنا دیا ٹرکی کے ان پچھلے سلاطین نے سلطنت عثمانیہ میں قرون متوسط کے ہاتھ ارباب کلیسا کا پارٹ ادا کیا، اور مذہب کی غلط نمایندگی کی۔

ان تمام اسباب کے ساتھ پھر بھی نوجوان ترک اپنے جلد بازانہ فیصلوں میں بری الذمہ اور معذور نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ ان کے فرائض میں صرف

سلطنت کا حفظ وبقا اور میدان جنگ کا فتح کرنا نہیں تھا، وہ صرف میدان جنگ کے سپاہی اور ماہر جنگجو نہیں تھے، بلکہ ان کو سنجیدہ مفکر بھی بننا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وہ ملک و تمدن کی جدید تعمیر کر رہے تھے، ان کو مذہب اور اہل مذہب میں امتیاز کرنا چاہئے تھا۔ انھوں نے جہاں سوستان (سوئٹزرلینڈ) کے قانون اور یورپ کے طرز حکومت کا مطالعہ کیا تھا، وہاں ان کا فرض تھا کہ قرآن و حدیث کا بھی مطالعہ کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ انقلاب ٹرکی کے آخری سال موت و حیات کی کشمکش، قومی مصائب اور میدان جنگ کی مصروفیت کے ایسے سال تھے کہ ان میں دماغی توازن قائم رکھنا مشکل تھا۔ جن لوگوں کی تربیت ان غیر متوازن حالات میں ہوئی ان کی تربیت نہایت ناہموار ہوئی۔ نوجوان ترک جن کے ہاتھوں جدید جمہوریت کی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہت معمولی صلاحیت، انتہا پسند، کم غور کرنے والے اور عجلت پسند تھے۔ خالدہ ادیب خانم جو انجمن اتحاد و ترقی کی رکن رکین رہ چکی ہیں اعتراف کرتی ہیں،

"اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے ابتدا میں ان میں ایک بھی شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لیکر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے۔ مگر یہ لوگ جمہوریت سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے۔ ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بیرحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گذرتے ہیں، اسلئے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے برے بھلے وسائل بے تکلف اختیار کر لیتے تھے،،

بہرحال جو دن یورپ میں ضروری طور پر آیا ٹرکی میں غیر ضروری طریقہ پر آگیا ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں علمار کا رہا سہا گروہ جو ۱۹۲۰ء میں منتخب ہو گیا تھا اور جس نے تین سال قومی مجلس عالیہ میں قوم کے دوسرے نمائندوں کے ساتھ کام کیا تھا، منتخب نہیں ہو سکا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مجلس نے جمہوری حکومت اور نظام کابینہ کا اعلان کیا اور مارچ ۱۹۲۴ء میں اس نے خلافت کا خاتمہ کر کے ریاست اور مذہب کی تفریق کو مکمل کر دیا۔ شیخ الاسلام کا عہدہ توڑ دیا گیا اور امور مذہبی کا محکمہ وزیر اعظم کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ وزارت اوقاف بھی توڑ دی گئی اور اسکا کام وزارت مالیات کے سپرد کر دیا گیا۔ جو مذہبی مدارس وزارت اوقاف کے ماتحت تھے وہ بند کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۵ء سے انتہا پسند عنصر غالب ہو گیا، اس نے اصلاحات کو سختی سے جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامی قانون کے بجائے سوئٹزرلینڈ کا قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ اس مذہب و ریاست کی تفریق کے متعلق یہ بے لاگ رائے بھی سن لینی چاہئے۔ جو خالدہ خانم نے نقل کی ہے۔

"اس قانون پر کھلا ہوا اعتراض یہ ہے کہ گو اس نے حکومت کو مذہب کے سیاسی اثر سے آزاد کر دیا، مگر مذہب حکومت کے سیاسی اثرات کا پابند کر دیا گیا۔ جو لوگ ابتدا میں مذہب و حکومت کی تفریق کے حامی تھے۔ انہیں یہ امید تھی کہ مذہب آزاد ہو جائے گا۔ اس میں خالص روحانیت کی شان پیدا ہو جائے گی، اور وہ پہلے کی طرح لوگوں کی اخلاقی تعلیم و تہذیب کا کام انجام دیگا، مگر نئے قانون کی رو سے ترکی میں عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہبی امور میں بالکل آزاد ہیں

لیکن مسلمانوں کا مذہب حکومت کا دست نگر ہے،،

اب ترکوں سے کون کہے کہ اے اسلام کے قابل صد فخر فرزندو! تم نے اپنے مذہب کو مسیحی مذہب پر قیاس کیا جو سیاست کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا اور نہیں چل سکا مگر تمہارا مذہب دنیا کی عادل سیاست کے ساتھ چل سکتا ہے، تم نے اسلامی سیاست پر غور نہیں کیا جس کی مدد سے حضرت عمرؓ نے تمہاری سلطنت سے کہیں زیادہ بڑی سلطنت پر حکومت کی، تم کو تمہارے ملک کے غلط عالمان مذہب نے مشتعل کر دیا۔ مگر مدبر مشتعل نہیں ہوا کرتے،

یہ اگر ترکوں سے نہیں کہا جا سکتا، تو ان کے ہندوستانی مقلدوں کو انہیں کے حکیم شاعر کے یہ شعر ضرور سنائے جا سکتے ہیں۔

دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی ۔۔۔ دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا ۔۔۔ بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہو اک جنیدی اور اک اردشیری

ہندوستان

ہم کو اسلامی ممالک میں کسی ملک کے علمار کا سیاسی بیداری، معاملہ فہمی اور قوت عمل کا اتنا شاندار ریکارڈ نہیں معلوم جتنا ہندوستان کے علمار کا۔ نہ صرف دوسرے اسلامی ممالک کے علمار کے مقابلہ میں بلکہ اپنے ملک کے دوسرے اسلامی طبقوں اور مسلمان سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں بھی، بہت سے لوگوں کے لئے یہ تاریخی حقیقت نیا انکشاف ثابت ہوگی اسلئے ہم کو تفصیل کی اجازت دیجائے۔

ہم اس سلسلہ میں مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں سیاسی بیداری اور جہاد و تنظیم کی سب سے بڑی اور پہلی تحریک تھی۔ اور اس وقت تک ہندوستان میں مسلمانوں میں اتنی وسیع، دور رس، ہمہ گیر اور منظم تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ یہ تحریک سراسر علمار اور مذہبی طبقہ کی تحریک تھی۔

مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان اور سلسلہ کے علمار نے ہندوستان کے مذہبی طبقہ کی رفاقت اور اعانت سے تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان میں جہاد و احیار خلافت اسلامیہ کی تحریک شروع کی، اور ہندوستان کے شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک مسلمانوں میں عام مذہبی جوش، سرفروشی کا جذبہ، اور سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ اس تحریک سے ہندوستان کے لاکھوں مسلمان وابستہ تھے۔ اور سارے برطانوی علاقہ میں اس کے مرکز تھے۔ سید صاحبؒ نے اپنا اصل مرکز ہندوستان کی شمالی سرحد کو بنایا تھا۔ جو ایک آزاد اور جنگجو علاقہ تھا اور جس سے اسلامی سلطنتوں اور آزاد قوموں کا قرب تھا۔ اسوقت تک آپ کا محاذ جنگ پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا۔ جس کے علاقہ میں مسلمان مذہبی آزادی اور شہری حقوق سے محروم تھے، لیکن آپ کا ارادہ تھا کہ قوت کے فراہم ہو جانے اور مرکزیت قائم ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہندوستان میں ایک آزاد شرعی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے اور غیر مسلم اقتدار کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کو ابتدا میں پوری کامیابی ہوئی۔ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سرحدی قبائل امرا و خوانین ہندوستانی مجاہدین اور علمار و مشائخ نے بالاتفاق آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو اپنا امام و خلیفہ تسلیم کر لیا۔ بیت المال قائم ہو گیا، زکوٰۃ و عشر کا نظام اور شرعی حدود و تعزیرات جاری ہو گئے، کچھ مدت اور متعدد جنگوں کے بعد پشاور فتح ہو گیا اور نئی اسلامی حکومت میں داخل ہو گیا۔

لیکن مسلمانوں کی خیانت اور غداری اور ناسازگار حالات سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ء مطابق ۱۸۳۱ء کو سید صاحبؒ، اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ بعض دوسرے رفقا و مجاہدین کے ساتھ مقام بالاکوٹ (ہزارہ) میں شہید ہو گئے اور آپ کی باقیماندہ جماعت نے سرحد میں ستھانہ اور ہندوستان میں پٹنہ کو اپنا مرکز بنایا۔

لیکن سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی شہادت سے یہ آگ بجھی نہیں، بلکہ اندر ہی اندر اور پھیل گئی۔ ڈاکٹر اسٹاورڈ، جدید دنیائے اسلام میں لکھتا ہے۔

"شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد نے پنجابی مسلمانوں کو ابھار کر حقیقۃً ایک مذہبی سلطنت قائم کر لی، مگر ان کی ناگہانی موت (؟) سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۰ء میں برباد کر دیا۔ لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب بھی وہابی عقائد کی سلگتی ہوئی چنگاریوں نے انھیں بہت کچھ پریشان کیا۔ یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں معاون ہوئے، اور انہیں عقائد نے افغانستان اور شمالی مغربی سرحد کے وحشی قبائل کو ہمیشہ کے لئے مذہبی تعصب میں رنگ دیا"

ہندوستان کے مرکز صادقپور پٹنہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ بے نظیر تنظیم، اور جہاد کی وہ عظیم الشان تبلیغ و تربیت کی جس کی مثال مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لیکر اسوقت تک نہیں ملتی۔ اس تنظیم و تبلیغ کی وسعت، اس اسلامی نظام کی برتری اور ان علمار کی سیاسی قابلیت اور انتظامی لیاقت کا تصور کرنے کے لئے اس تحریک کے سب سے بڑے دشمن، ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی کتاب "مسلمانان ہند"، کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھنے چاہئیں۔

"یہ لوگ مشنریوں کی طرح ان تھک کام کرتے تھے، وہ بے لوث و بے نفس لوگ تھے جن کا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ یہ لوگ روپیہ اور آدمی پہنچانے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیہ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس و متعدد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ آخر تک مذہب کے لئے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے تھے"

یہی مصنف، مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی امیر جماعت کے متعلق لکھتا ہے۔

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغین سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انھوں نے ایک اصطلاحی زبان میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں جن کو وہ خود استعمال کرتے اور جن کے ذریعہ وہ اطمینان سے بڑی بڑی رقمیں سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ ستھانہ بھیجتے تھے۔ وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے اور مذہبی دیوانوں کی فوج کو بندوقیں چلانے بھیجتے"

"لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ (یا ان لوگوں کی زبان میں "چھوٹی خانقاہ") اسے سرحد پار باغیوں کے مرکز (بڑی خانقاہ) کو رنگروٹ بھیجنا تھا، بنگالی تبیعین کو راستہ میں صدہا بے تکے اور پریشان کن سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اُن کو پنجاب اور شمال مغربی ہندستان کے وسیع صوبوں میں سے ہوکر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا، جہاں ہر گاؤں میں ان کی جسمانی شکل اور زبان ان کو اجنبی ثابت کرتی تھی۔ لیکن اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت کام کر رہی تھی۔ انھوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیرو متعین کر دیئے تھے جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے۔ یحییٰ علی کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب کئے ہوئے آدمیوں میں سے کسی شخص کو بھی پکڑے جانے کے بعد خوف وخطرہ، شناخت ہو جانا یا انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف آمادہ نہ کر سکا"

(مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر)

اس تنظیم کی وسعت کا اندازہ بنگال کے کمشنر پولیس کی اس شہادت سے ہو سکتا ہے۔

"اس جماعت کے ایک مبلغ کے پیرو اسّی ہزار ہیں جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اس کو کسی کام سے عذر نہیں ہوتا"۔

(خلوط ۱۰۰ مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۴۳ء و نمبر ۵ ۱۸۴۷ء)

ہندوستان میں اس جماعت نے جو عام جذبۂ جہاد پیدا کر دیا تھا اس کا اندازہ ڈاکٹر ہنٹر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار ذیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کی شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے۔ اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہکر چند ماہ کی رخصت لے لیتے تھے کہ انھیں فریضۂ جہاد کے ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔

(انڈین مسلمانز)

قدیم وجدید طبقہ

ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ اُس وقت کی باتیں ہیں جب ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا۔ اور وہ علما اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا، جدید تعلیم کی دعوت نہیں دی گئی تھی اور اس کے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کا مدرستہ العلوم قائم ہوا جو بعد میں کالج پھر یونیورسٹی بنا۔ اس وقت سے ہندوستان میں قدیم وجدید تعلیم کا فرق نمایاں ہوا،

علما نے اس وقت تک حکومت سے مکمل ترک موالات کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں خود شریک ہوئے تھے اور دست بدست جنگ کی تھی۔ "بدنام اور شوریدہ سر وہابیوں" کے علاوہ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی جو دہلی میں رزیڈنٹ کے میر منشی تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اس جہاد میں علی شرکت کی تھی۔ ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد مولانا فضل حق صاحب اور مولوی عنایت احمد صاحب کاکوروی وغیرہ کو بغاوت اور شرکت ہنگامہ کے جرم میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑی۔ اور دوسرے حضرات کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۱۸۶۳ء، ۱۸۶۴ء میں محمد جعفر صاحب تھانیسری، مولانا احمد اللہ صاحب عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ پر حکومت ہند کے خلاف سازش کرنے اور مجاہدین سرحد کی خفیہ امداد کرنے کے جرم میں انبالہ کا مشہور مقدمہ سازش چلایا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کو اول پھانسی اور پھر حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ صادق پور (پٹنہ) کے مکانات مسکونہ اور ملزمین کی عمارتیں جوش انتقام میں کھود کر پھینک دی گئیں، اور ان کی جگہ میونسپلٹی کی عمارتیں بنا دی گئیں ۱۸۵۷ء کے بعد ذرا ذرا سے شبہ پر علماء کو پھانسیاں دی گئیں۔

اس کے برخلاف علیگڈھ کے تعلیمی وسیاسی مرکز نے حکومت اور انگریزی قوم سے تعاون وموالات کی پُرجوش دعوت دی، انگریزی تہذیب ومعاشرت، شعائر ونظام تعلیم کے قبول کرنے کی زبردست تبلیغ کی۔ حکومت نے اس کی پوری امداد وسرپرستی کی۔ الغرض ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں کے اتحاد وتعاون، اختلاط واجتماع کی علیگڈھ میں پہلی مرتبہ داغ بیل پڑی۔ پھر جب ۱۸۸۳ء میں بظاہر کالج کی پرنسپلی اور درحقیقت مسلمانوں کی زمام قیادت مسٹر تھیوڈر بیک نے لی تو علیگڈھ کالج ہندوستان میں شملہ و دہلی کے ایوان حکومت کے بعد برطانوی سیاست کا سب سے بڑا مرکز اور انگریزوں کی کامیاب رزیڈنسی تھی جس میں مسلمان نوجوانوں کو ذہنی غلامی، خوف وبزدلی، خوشامد وچاپلوسی، پست ہمتی وملازمت پرستی، نقالی ونمائش اور کھیل کود کی تعلیم دیجاتی تھی۔ اس میں کبھی فوج میں اضافہ کرنے کی تجویز پاس کی جاتی تھی، اور سرحد پر پیش قدمی اور حملہ کو جائز بتایا جاتا تھا، اور کبھی ان نوجوان مسلمانوں کے ذریعہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر حکومت کے محضر وفاداری پر مسلمانوں سے دستخط لئے جاتے تھے۔ اسی شاطر پُرفن کا جادو صرف نوجوانوں ہی پر نہیں بلکہ اُس "پیر دانا" پر بھی چل گیا، جس نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور جس نے "اسباب بغاوت ہند" جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی تھی۔ اور یہ جادو بھی ایسا چلا کہ اس نے مسلمانوں کی قسمت پورے طور پر انگریز مدبر کے ہاتھ میں دیدی (ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل)

مسٹر بیک کے بعد مسٹر ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ مسلمانوں کی سیاست پر مسلط رہے۔ ان فرنگی شیشہ سازوں کے ہاتھوں سے قوم کا جو طبقہ نیا ہوا اس کی ذہنیت، عقیدہ اور ہمت کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس ذہنی تقابل کا نمونہ دیکھنا ہو تو سرسید کی وہ مشہور تقریر جو انھوں نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۸ء میں لکھنؤ میں کی، علماء کے اس فتوے کے ساتھ پڑھنی چاہئے جو مولوی عبدالقادر صاحب لدھیانوی نے کانگریس میں شرکت کے جواز میں شائع کیا تھا اور جس پر تقریباً اسوقت کے تمام نامور ومعتبر علماء کے دستخط تھے، جن میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا لطف اللہ صاحب علیگڈھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس زمانہ میں بھی جس شخص نے علیگڈھ میں بیٹھکر اس وفادارانہ سیاست کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو آزاد سیاست کی طرف دعوت دی، وہ طبقہ علماء کے ایک ممتاز فرد مولانا شبلی نعمانی کی ذات تھی جنھوں نے مسلم گزٹ کے پُرمغز مدلل اور پُرجوش مضامین سے مسلمانوں کے تعلیمیافتہ طبقہ میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی،

اس کے بعد مسلمانوں کی عام سیاسی بیداری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، اور پھر طبقہ علماء ومذہبی گروہ کے نئے مہمانوں، مولانا محمد علی و مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علی خاں، اور مولانا حسرت موہانی کا جو حصہ ہے وہ تمام جدید سیاسی اختلافات کے باوجود واجب التسلیم ہے۔

پھر ان کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم میں جمعیۃ العلماء اور جمعیۃ احرار کے علماء کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے قیام کے لئے مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا منصور اور مولانا سیف الرحمن صاحب نے جو کوششیں کی ہیں ان کی نظیر مسلمانوں میں نہیں مل سکتی بلکہ ہندوؤں میں بھی اپنی قوم کے لئے ملنی مشکل ہے،

۱۹۱۴ء سے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لئے جو کام کیا گیا اس میں علماء وغیر علماء دوش بدوش تھے، اور بعد کی تمام اسلامی تحریکوں کا امتیاز یہ رہا کہ ان پر مذہبی رنگ غالب تھا،

قبل اس کے کہ ہم اس باب کو ختم کریں جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے متعلق ہم کو ڈاکٹر ہنٹر کی یہ رائے بھی پڑھ لینی چاہئے،

"ایک باقاعدہ گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ دنیادار لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے انگریزی سکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔ ان کے علاوہ ہمیں آرام طلب جماعتوں، ضعیف الایمان لوگوں اور کچھ جائداد والوں کی امداد حاصل ہے جو آن بان کے ساتھ مسجدوں میں جاتے ہیں اور معاملات کے متعلق بہت کم سوچتے ہیں"

(مسلمانان ہند)

ہندوستان اور ٹرکی کے علماء

گذشتہ بیان سے واضح ہو گیا کہ ہندوستان میں علماء کا گروہ ملک اور مسلمانوں کا ترقی یافتہ، آزاد اور بیدار عنصر رہا ہے اور وہ سیاسی بیداری ہندوستان کی جنگ آزادی، اور مذہبی قربانی وسرفروشی میں ملک کی کسی سیاسی وغیر سیاسی جماعت سے ایک قدم پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ ٹرکی کے برخلاف ہندوستان میں سیاسی بیداری کے دور کا آغاز مذہبی طبقہ اور علماء سے ہوا۔ پس مسلمانوں کے کسی طبقہ کو جو ٹرکی کے انقلابی طبقہ کا ہندوستان میں قائم مقام ہو سکتا ہے (اور مسلمانوں میں ایسا کوئی طبقہ اسوقت تک موجود نہیں) علماء سے وہ شکایت نہیں ہو سکتی جو انجمن اتحاد وترقی کے نوجوانوں یا موجودہ جمہوریت ترکیہ کے بانیوں کو اپنے علماء سے تھی اور جس کی تفصیل پچھلے صفحوں میں "ٹرکی اور مذہب وسیاست کی تفریق" کے ضمنی عنوان کے تحت گذر چکی ہے۔ اگر یہاں کبھی مذہب وسیاست میں تفریق کی گئی تو اس کے اسباب ومحرکات یقیناً وہ نہیں ہوں گے جو ٹرکی میں تھے،

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جدید تعلیمیافتہ مسلمانوں میں علماء کے خلاف رجحان موجود ہے اور وہ تقریر وتحریر میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ موجودہ اسلامی سیاست کے ایک قائد نے بارہا اپنے اس کارنامہ پر فخر کیا ہے کہ ان کی جماعت نے علماء کو سیاست سے نکال دیا ہے (حالانکہ ایسا واقعہ نہیں ہے، علماء سیاست میں موجود ہیں)۔ لکھنؤ کے ایک روزنامہ نے

اس موضوع پر مسلسل افتتاحیے لکھے ہیں کہ علماء کو سیاست سے خارج کر دینا چاہیئے۔ مقالات و رسائل کا تو کوئی حد و شمار ہی نہیں۔ علماء سے صاف صاف مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ حسب معمول قدیم درس و تبلیغ کا کام سنبھالیں، اور اس میدان کو اس میدان کے شہسواروں کے لئے چھوڑ دیں۔ ایک عالم نے خوب فرمایا کہ جب علماء سیاست میں شریک نہیں تھے تو ان پر اس حجرہ نشینی اور دنیا سے بے خبری کا سب سے بڑا الزام تھا اور ان کو سیاست میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، لیکن جب وہ اس میدان میں آئے اور انھوں نے اپنے اثر اور قربانی سے اپنی جگہ پیدا کر لی تو ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ واپس جائیں اور ان ہی حجروں میں معتکف ہو جائیں۔

ہم کو علم ہے کہ اس جدید طبقہ میں کثرت سے مخلص اور صاحب حمیت مسلمان ہیں اور ان میں سے بہت سے اسلامی حقائق کو شاید ہم سے علماء سے اچھا سمجھتے ہیں، ہم ان سے کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب و سیاست کا یہ انفصال، الحاد کا پیش خیمہ، اور وہ "مسیحی فتنہ" ہے جس نے یوروپ کی جمہوریت کو چنگیزی بنا دیا۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علماء کی خدمت میں

اب ہم کو علماء کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ کے فرائض اس عہد انقلاب میں اتنے بڑھ گئے ہیں جتنے شاید تاریخ اسلام کے کسی عہد میں نہوں۔ شریعت، تہذیب اور عظمت اسلامی کی حفاظت اور وہ تمام فرائض جو کسی اسلامی سلطنت کے کسی زمانہ میں ہو سکتے تھے، اب غالباً آپ کے فرائض ہیں۔ آپ ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچیئے۔ جو قرون متوسط کے مذہبی طبقہ اور انیسویں صدی کے ترکی علماء سے ہوئیں اور جن کی تفصیل گذشتہ ابواب میں گذر چکی ہے، ورنہ نوجوانوں کے الحاد، لاکھوں مسلمانوں کے سوئے خاتمہ، اور ساری قومی زندگی کی غیر مذہبیت کا گناہ آپ کے سر ہوگا، جس کا کفارہ کوئی عبادت، کوئی علمی، تدریسی اور تصنیفی خدمت نہیں کر سکے گی۔ تاریخ اسلام آپ کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میں آپ کو "بازمانہ بساز" کی تعلیم نہیں دیتا، میں تو اس فلسفہ کا قائل ہوں۔

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

لیکن اس "بازمانہ ستیز" کے لئے آپ کو نئے ہتھیاروں سے مسلح ہونا پڑے گا۔ اور جدید فنون و طریقہ جنگ سے آگاہی پیدا کرنی ہوگی۔ طریق و اسلحہ جنگ کے اختلاف و تنوع سے آپ کے مقصد جنگ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آپ کا مقصد ایک ہی ہونا چاہیئے، اور وہ اسلامی شریعت اسلامی وقار، اسلامی تہذیب کی حفاظت اور اسلام کے نظام حکومت و معاشرت کو قائم کرنا ہے۔ آج الحاد، فلسفہ یا سائنس کی راہ سے نہیں آتا، اور اگر آتا بھی ہے تو بہت کم آتا ہے۔ آج الحاد، سیاست کی راہ سے اور جدید سیاسی، اقتصادی اور تمدنی نظریوں اور تحریکوں کی راہ سے سرعت اور قوت کے ساتھ آ رہا ہے اور اس لئے اس الحاد کو روکنے کا سب سے بہتر اور سب سے بہتر اور موثر طریقہ سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

آپ سیاست میں ضرور شریک ہوں، لیکن اپنے ذاتی وقار کو قائم کرنے، اور پادریوں کی طرح اپنی پرستش کرانے کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کا صحیح نمونہ پیش کرنے اور انسانیت کا مرتبہ بلند کرنے کے لئے آپ اس ہنگامہ میں اپنا مقصد نہ بھولنے پائیں اور آپ کی حیثیت ایک منٹ کے لئے بھی کسی جماعت کے آلۂ ‌ ‌ ‌ ت یا آلۂ کارگی نہ ہونے پائے اور آپ کو کوئی سیاسی جماعت اپنے مقصد سے غافل نہ کرنے پائے نہ اپنے مقصد کے لئے فریب دینے پائے۔

اس وقت عالم انسانیت کا سب سے مقدس اور اولین فریضہ یہ ہے کہ اسلام کا نظام حکومت اور نظام حیات قائم کیا جائے۔ دنیا میں یہ مقصد صرف آپ کا ہو سکتا ہے اور یہ کام صرف آپ سے انجام پا سکتا ہے۔ اگر آپ نے اپنی زندگی اور اپنی سیاسی جدوجہد کا کوئی دوسرا مقصد قرار دے لیا تو پھر خدا یہ منصب آپ سے لے کر مسلمانوں کو کسی دوسری جماعت کو سپرد فرمائے گا۔ اور اس کو اسکی اہلیت و توفیق عطا فرمائے گا،

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم

تلخیٔ حیات

(از جناب بسمل سعیدی ہاشمی)

آہ بسمل جب بدن میں روح گھبرانے لگے
اور قضا کمبخت کو آتے بھی موت آنے لگے

دل میں جب وہم مآل زندگی آنے لگے
جب نظر گورِ غریباں کی طرف جانے لگے

دل کو جب کردہ گناہوں کا خیال آنے لگے
شوق، ناکردہ گناہوں پر ترس کھانے لگے

اے معاذ اللہ، دعا کی ناپذیرائی پہ جب
پاکبازی پر جوانی دل کو بہکانے لگے

شام غم پھر صبحِ عشرت سے نہیں اندوہناک
بزم ناونوش پر جب خامشی چھانے لگے

ہائے، تشہائے جوانی کی ہوں صبحیں یوں خموش
کان میں اللہ اکبر کی صدا آنے لگے

وائے ذوقِ مے کہ نظریں بھی ہوں بن مے فروش
جب نگہ ملنے سے پہلے آنکھ شرمانے لگے

قرض کی اس طرح پینے سے نہ پینا خوب ہے
شیخ صاحب کی ضمانت پر اگر آنے لگے

مفت میخواری کی جب آ جائے نوبت وائے ننگ
نام سے زاہد کے جب میخوار منگوانے لگے

عشق کے جذبات سب بے کیف ہو ایسے ہیں دل
حسن کی جانب سے جب پیغامِ شوق آنے لگے

باہمہ ذوقِ محبت باہمہ شوقِ وفا
دل رہ و رسمِ محبت سے بھی تنگ آنے لگے

دوست کی جانب سے کرکے اعتمادِ دوستی
ہائے وہ حالت کہ جب دشمن ترس کھانے لگے

تلخیٔ نامہربانی ہائے دنیا، آہ جب
دل کسی کی مہربانی سے بھی گھبرانے لگے

دم بہ دم لحظہ بہ لحظہ وہ فراوانیٔ غم
جب کوئی ساعت گذر جائے تو یاد آنے لگے

آہ موجودہ مصیبت کی بھیانک شکل میں
آنے والی بھی مصیبت جب نظر آنے لگے

شاد کامِ شوق جب اہل ہوس کو دیکھکر
حسرتوں کو آہ جنت کا خیال آنے لگے

جستجوئے شوق کی بے آبروئی ہائے ہائے
جب تلاشِ گنج مقصد خاک چھنوانے لگے

نالۂ دل متصل، اشکِ مسلسل، ہائے جب
ساتھ ہر آنسو کے اک لختِ جگر آنے لگے

ہائے مجبوری میں وہ خودداریوں کی بیکسی
ناکسوں کے جب زمانہ ناز اٹھوانے لگے

ہو زمانہ ٹھوکروں کا جس کی ٹھکرایا ہوا
پھر زمانہ ٹھوکروں سے اسکو ٹھکرانے لگے

آہ بسمل، زندگیٔ غم کی وہ نوبت کہ جب
جامۂ ہستی سے بدبو موت کی آنے لگے

اسلام میں تصوّف کا نظریہ اور اس کی عملی شکل

(جناب ایس۔ ایس۔ محمد شریف علی خاں۔ افق۔ رامپوری)

اسلام نے زندگی کے دو ٹکڑے نہیں کئے ہیں۔ یعنی دینی زندگی اور دنیاوی زندگی کے دو جدا جدا تصور اسلام میں نہیں پائے جاتے۔ اسلام تو ایک ایسا نسخۂ کیمیا اور ایک ایسا سنگ پارس ہے جو دین کو دنیا اور دنیا کو دین بنا کر دونوں میں ایک ایسا اتحاد پیدا کر دیتا ہے کہ دیکھنے والے کے لئے دین و دنیا کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دین و دنیا کے اس مقدس اتحاد کی مقدس مثال ہمیں نبی کریم کی زندگی میں ملتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو دنیا سے واسطہ نہ تھا، آپ کو گھر بار سے سروکار نہ تھا، آپ کو دوستوں اور عزیزوں سے تعلق نہ تھا یا آپ کو سیاست و معیشت کے مسائل سے دلچسپی نہ تھی؟ لیکن اسکے باوجود کیا کوئی ہے جو آپ کی دینی پرہیزگاری، طہارت و پاکبازی اور روحانی تقدس و بلندی کا اعتراف کرنے میں تامل کرے؟ آپ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین یعنی سیدنا ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نے آپ کے قدم بقدم چلکر دنیا کے سامنے دینی و دنیوی زندگی کے درمیان مضبوط اتحاد کا ایک ایسا عملی نمونہ پیش کیا کہ اسے دیکھ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان بزرگوں کی زندگیوں کا کونسا حصہ دینی ہے اور کونسا دنیوی۔ اسلام نے دنیا و دین کو شیر و شکر کی طرح گھول کر ایک کر دیا تھا۔ اسلام سے قبل دنیا نے رہبانیت اور دنیا پرستی کے نام سے زندگی کے دو جدا جدا شعبے قائم کر رکھے تھے۔ لیکن اسلام نے آکر ان کا خاتمہ کر دیا۔ رہبانیت کیا تھی؟ پہاڑوں، جنگلوں، بنوں اور غاروں میں تنہا بیٹھکر، دنیا اور اہل دنیا پر لات مار کر، زندگی کی تمام ذمہ داریوں سے خود کو بے تعلق کر کے اور معاشرت و معیشت کے ہر فریضہ سے بے نیاز ہو کر یاد خدا میں مصروف ہو جانا یہی رہبانیت تھی۔ مصر و فلسطین میں اس اصول پر عمل کرنے والے عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک کافی تعداد بستی تھی۔ مگر اسلام نے سب سے پہلے اس رسم کے خلاف آواز بلند کی اور ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔ دنیا کی تمام ذمہ داریوں کو چھوڑ کر ایک گوشہ میں بیٹھ رہنا اسلام میں جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام کے اسی اعلان کا نتیجہ تھا کہ عہد سعادت کے بعد کئی صدی تک مسلمانوں میں نہ تو کوئی خانقاہ بنی اور نہ عزلت و تنہائی کے گوشوں میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کا رواج ہوا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے متقی اور پارسا افراد بھی شادیاں کرتے تھے، بچوں کی خبرگیری کو اپنا فرض جانتے تھے، کسب حلال کے لئے محنت مشقت کرتے تھے اور عزیزوں، پڑوسیوں اور دنیا والوں کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام انس ابن مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے تقوے اور بزرگی سے کسے انکار ہو سکتا ہے، قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی دینی برتری کی بارہ میں کون شبہ کر سکتا ہے، غرض قرن اوّل کے سینکڑوں صحابی، تابعی، امام اور بزرگ ہیں جن کی زندگی کے حالات پڑھ کر آج بھی ہمارا ایمان تازہ ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے گھر چھوڑ کر خانقاہ کو آباد کیا ہو، جو اپنی روزی آپ نہ پیدا کرتا ہو اور جو اپنی بیوی بچوں کی خبرگیری کو اپنے اوپر لازم نہ جانتا ہو۔

مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا مسلمانوں پر غیر اسلامی چیزوں کا اثر پڑنے لگا۔ چنانچہ ان ہی غیر اسلامی اثرات میں سے ایک اثر یہ بھی ہے کہ اسلام میں تصوّف کے نام سے ایک نئی رسم قائم کی گئی صوفیا پیدا ہوئے، گیروے کپڑے ایجاد ہوئے، خانقاہیں بنیں، حال و قال کے حلقے تیار ہوئے اور سماع و نغمہ کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب مسلمان عرب سے نکلکر شام، فلسطین، عراق، ایران اور مصر کی سرزمینوں میں پھیل گئے اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں یہودی، عیسائی، مجوسی اور زندشتی مذہب کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو اسلام میں نئے نئے خیالات کی آمیزش ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل تو ضرور ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود اپنے پُرانے مذہب کی پُرانی رسمیں ان کے دل میں اس طرح گھر کئے ہوئے تھیں کہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان کا اثر ان کے دلوں سے نہ مٹ سکا۔ یہی زمانہ تھا جب خلافت راشدہ کی سادگی کی جگہ بنی امیہ اور بنی عباس کے شاہانہ تزک و احتشام نے لی، اور عمر فاروقؓ جیسے خلیفہ کی جگہ پر مروان و ہارون جیسے خلیفہ دنیا نے دیکھے جن کی حرم سراؤں کی آب و تاب سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اسی زمانہ میں رہبانیت کے تصور نے بھی سر اٹھایا اور عراق میں ترک دنیا کرنے والے کچھ ایسے گوشہ نشین پیدا ہوئے جنھوں نے خانقاہ بنانے پر زور دیا۔ لیکن اس وقت تک اسلامی تعلیمات کا اثر لوگوں پر باقی تھا اس لئے اس بات کی بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ خانقاہ نہ بن سکی۔ اور نہ تصوف، صوفیت یا پیری مریدی کے نام سے وہ رسم پڑ سکی جو آجکل ہمارے درمیان رائج ہے۔

لیکن جب اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف امارت و ثروت کے تمام مظاہر مسلمانوں میں آ گئے اور خلفائے راشدین کے "چھوٹے سے کچے دار الخلافت" کی جگہ فلک بوس و عالیشان دار الخلافت تعمیر ہونے لگے، ہزاروں مہ جبین کنیزیں خلیفہ کے حرم میں رہنے لگیں، غلاموں، خوجہ سراؤں اور خادموں کی صفیں کی صفیں شاہی سواری کے ساتھ نکلنے لگیں۔ غرضکہ جب جاہ و جلال کے وہ تمام جلوے جو خود مختار بادشاہوں کی سلطنتوں میں پائے جاتے تھے، اسلامی خلفا کی خلافت میں بھی نظر آنے لگے تو قدرتاً لوگوں میں خوشامد و چاپلوسی، حرص و جاہ طلبی، مکر و فریب غرضکہ وہ تمام عیوب پھر عود کر آئے جو اسلامی سوسائٹی میں ناپید سے ہو گئے تھے دربار میں مدح گو شعرا پیدا ہوئے جو بادشاہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر اپنے لئے سامان عیش فراہم کرتے تھے، غرض ہر ایک اپنی اپنی ذہانت و قابلیت کے مطابق روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان حالات میں حلال و حرام کی تمیز قدرتاً اٹھ جاتی ہے۔ اور لوگ جائز و ناجائز، ظلم و انصاف، اچھے بُرے ہر طریقے سے دولت کمانے کو ضروری سمجھتے ہیں لہٰذا ایسے زمانہ میں ایماندار و دیانتدار لوگوں کا دنیا سے متنفر ہو جانا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ تھا جب تصوف کے نام سے ایک رسم کی بنیاد مسلمانوں میں پڑی، خانقاہیں بنیں، صوفیا پیدا ہوئے، ترک دنیا کا وعظ شروع ہوا، گوشوں میں چھپکر بیٹھ رہنے کی تلقین ہوئی اور دنیا اور دنیا والوں سب سے بے تعلق ہو کر صرف یاد خدا میں زندگی گذار دینے کی تلقین کی گئی۔

مسلمانوں میں تصوف کے نام سے اس رسم کی ابتدا ساتویں صدی ہجری میں ہوئی۔ ایران کے مشرقی حصہ اور خراسان کو اس رسم کا پایۂ تخت سمجھنا چاہئے۔ گویا عہد سعادت کے بعد سات آٹھ سو سال تک یہ رسم اسلام میں نہ تھی۔

اس کے بعد تصوف مستقل ایک فن بن گیا۔ "ہمہ اوست" اور "ہمہ از وست" کی اصطلاحیں وضع ہوئیں، حال و قال کے تصور سے لوگ آشنا ہوئے، ریاضت کے نام سے وہ چیز لوگوں کے سامنے آئی جس پر عیسائی رہبانوں اور ہندو اور بدھ ملت کے یوگیوں کے اصول کا کافی اثر ہے۔ اور اب تو ہندوستان میں تصوف کے نام سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے اس میں ہندو اور بدھ مت کے خیالات کی بہت کافی آمیزش ہے۔

رفتہ رفتہ صوفیوں کا ایک جداگانہ گروہ بن گیا، ان کا لباس، وضع قطع، رہنے سہنے کا ڈھنگ، معاشرت و معیشت کے آداب تمام چیزوں میں ایک امتیازی شان پیدا ہو گئی، چنانچہ آج ہندوستان میں تصوف کے نام سے بہت سی ایسی باتیں ہو رہی ہیں جن میں عیسائیت یا ہندو مت اور بدھ مت کے اصولوں کا رنگ صاف طور سے جھلکتا نظر آتا ہے۔ ہمارے صوفیوں نے توکّل کے مسئلہ کو کھینچ تان کر اپنے مقصد کے مطابق بنا لیا ہے اور اب معاش حاصل کرنے کی فکر کرنا ان کے نزدیک توکل کے خلاف ہے۔ پھر یہ صحیح ہے کہ ان صوفیوں میں اچھے اور برے ہر طرح کے ہیں لیکن غالباً بُرے صوفیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بُرے صوفیوں سے ہماری مراد ▪ افراد ہیں جو یا تو مکار ہیں اور یا محض رسمًا صوفی بن گئے ہیں۔ خود مختار بادشاہوں کی طرح جانشینی اور ولیعہدی کی رسم ہمارے صوفیوں میں بھی ہے۔ اور اس لئے باپ کی جگہ پر جب بیٹا سجادہ نشین ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں بھی قدرت نے باپ کی سی تمام صفات دی ہوں۔ لیکن چاہے اس میں وہ صفات ہوں یا نہ ہوں لوگ اُسے باپ کا

جانشین ہی سمجھتے ہیں، اور وہ بھی ایسا ہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے کہ اس کی معاش کا سلسلہ لوگوں کی عقیدت وارادت ہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ایسا نہ سمجھائے تو نذر و نیاز کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری سوسائٹی میں معاش پیدا کرنے کی ایک شاخ تصوف بھی ہے۔ واضح رہے کہ تصوف کو اس کے وسیع معنی میں مراد لیجئے جس میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن میں ترک دنیا کی تعلیم ہو اور جس میں اپنی معاشی فکر کو دوسروں کے سپرد کر دینے کا تصور کارفرما ہو۔

اس گروہ میں حقیقی صوفیا تو شاید سو میں دو چار ہی ہوں گے۔ اکثر تو بس یونہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عوام کو اپنی طرف مائل کرنے اور ان میں عقیدت وارادت کے جذبہ کو ابھارنے کے لئے بعض صوفی مسمریزم اور ہپناٹزم سیکھتے ہیں۔ پھر عوام زود اعتقاد اور واہمہ پرست تو ہوتے ہی ہیں، ان کی زود اعتقادی اور واہمہ پرستی سے فائدہ اٹھانا کونسی بڑی بات ہے۔ اصل چیز اصول ہے۔ جب یہ اصول ایک بار مان لیا جائے کہ دین و دنیا دو جدا جدا چیزیں ہیں اور خدا والے لوگ دنیا سے بے تعلق رہ کر تنہائی کے گوشوں میں پڑے رہتے ہیں تو پھر نیک و بد میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور اسی لئے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں سجادہ نشینی یا خانقاہی کا وجود کہیں نہیں ملتا۔

تصوف ہمارے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان رساں؟ یہ سوال جتنا آسان ہے اتنا ہی اس کا جواب مشکل ہے۔ ہماری ساری سوسائٹی بگڑی ہوئی ہے۔ سیاست، معیشت، تہذیب و اخلاق ہر ایک میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ اور اس لئے جب تک یہ سارا نظام نہ بدلے اُس وقت تک اس نظام کی کسی ایک شاخ کے متعلق کوئی قطعی رائے کیسے دی جا سکتی ہے۔ ہاں اتنا یقینی ہے کہ جو تصوف ہمیں دنیا کی جد و جہد میں حصہ لینے سے روکے، جو ہمیں زندگی کی کشمکش سے ڈرائے جس میں پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ رہنے کی تلقین ہو وہ یقیناً اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ اسلام دنیا میں کرامات دکھلانے والے گوشہ گیر انسان پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ خالدؓ و فاروقؓ اور حیدرؓ و حسینؓ جیسے افراد کو پیدا کرنا اس کا مقصود تھا جن کا ایک پاؤں مسجد میں تھا اور دوسرا زندگی کی کربلا میں۔

در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ذیل میں جو مضمون درج کیا جا رہا ہے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ تصوف پر بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن کو مضمون نگار نے نہیں چھوا ہے اور اس لئے اس مقالہ کو تصوف پر کوئی جامع مقالہ نہیں سمجھنا چاہئے تاہم مضمون نگار کی سعی، سعی مشکور ہے۔ (ایڈیٹر)

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر آنند
آں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

موجودہ اسلامی تصوف کی شکل مسخ شدہ ہے جس میں یونانی توہمات، ایرانی خیالات، ہندوستانی رسوم اور اس کے علاوہ اور بہت سی غیر اسلامی عناصر شامل ہو گئے ہیں۔ موجودہ اسلامی تصوف کا اگر نظر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے کچھ اجزاء تو ضرور اسلامی نظر آتے ہیں لیکن اکثر اجزاء کا تعلق دیگر اقوام و ملل سے ہے جو ان کے ارتباط سے ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے صوفیا کی زندگی میں بھی داخل ہو گئے ہیں۔ ایران کے متصوفین جو فرقۂ اسمٰعیلیہ سے خلا و ملا رکھتے تھے وہ "حلول" کے قائل ہو گئے۔ تصوف کا یہ عقیدہ خالص فرقۂ اسمٰعیلیہ کا عقیدہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو صوفیائے متاخرین تک خاص اسمٰعیلیہ فرقہ سے پہنچیں۔

اسلام کے آنے سے قبل دنیا بھر میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً عبادت و ریاضت کا اصل الاصول ترک دنیا کو تسلیم کیا گیا تھا یہی اصول تھا جسے مسیحیوں اور یہودیوں کی اصطلاح میں رہبانیت کہتے تھے اور جسے ہندوؤں، بدھوں اور جینیوں کی زبان میں تپسیا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ لیکن اسلام ہی دنیا کا . . . پہلا اور واحد مذہب ہے جس نے سب سے پہلے رہبانیت اور ترک دنیا کے خیال کو مٹایا اور اُس ریاضت و نفس کشی کو جس پر ترک دنیا کا اطلاق ہو سکے ممنوع قرار دیا۔ لیکن ہندوستانی اور ایرانی تصوف میں آج بھی سب سے پہلا سبق ترک دنیا ہے۔ اور یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آج ہم میں بھی ایسے صوفیا پیدا ہو رہے ہیں جو اس غیر اسلامی سبق کو اسلامی سبق سمجھتے ہیں۔

لفظ صوفی صفا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی باطن کی صفائی اور قلب کی پاکیزگی کے ہیں۔ شروع شروع میں نیک و پارسا لوگوں کو صاف باطن صاف دل، صافی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ بعد میں صوفی کی اصطلاح ہی پارسا لوگوں کے لئے بن گئی اور پھر اسی اصطلاح سے تصوف، صوفیت، متصوف وغیرہ وغیرہ الفاظ مشتق کر لئے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف، اسلام کی بعثت کے بہت بعد ظہور میں آیا۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صوفی کا لفظ صفا سے نہیں بلکہ "اصحاب صفہ" کے "صفہ" سے نکلا ہے۔ یہ اصحاب صفہ وہ تھے جن کی زندگی کا ہر پہلو طالبان طریقت کے لئے درس ہدایت رکھتا ہے۔ یہ گروہ دنیا کی تمام فکروں سے بے پروا تھا اور شمع نبوت کے گرد شب و روز پروانہ وار نثار رہنا ہی اس کا کام تھا۔ ان کی تمام زندگی توکل، صبر و ضبط اور عشق الٰہی کا ایک مسلسل سلسلہ تھی لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس گروہ کے توکل و قناعت کو موجودہ صوفیا کے توکل و قناعت سے بہت بُعد تھا کیونکہ یہ لوگ صرف سنت نبوی کے اتباع ہی کو فخر جانتے تھے اور توکل یا قناعت کو گداگری یا کاہلی کی حد تک نہ پہنچاتے تھے۔

صوفی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ "صوف" سے مشتق ہے۔ چونکہ اس قسم کے لوگوں کا لباس وہ موٹا جھوٹا کپڑا ہوتا تھا جسے "صوف" کہتے ہیں اس لئے لوگ ان کو صوفی یعنی صوف کپڑا پہننے والا کہتے تھے۔ بعد میں صوفی ہر اس شخص کو کہنے لگے جو زہد و اتقا کی مخصوص زندگی بسر کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ ایک فن بن گیا۔

لیکن ہم تو اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو جس طرح اور تمام علوم بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئے تھے اسی طرح تصوف کا علم بھی آپ کو خدا کی طرف سے دیا گیا تھا۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ کی وفات کے بعد خلفائے اربعہ (یعنی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ) کو تصوف کی یہ میراث ملی اور اس لئے تصوف کی تحقیق و تفتیش کرنیوالوں کو صرف ان ہی نفوس قدسیہ کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان لوگوں کی زندگی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تصوف جن صفات کا نام ہے وہ مختصراً یہ ہیں۔ خواہشات نفسانی پر غلبہ پانا۔ جن باتوں سے خدا اور اس کے رسولوں نے منع فرمایا ہے ان سے بچنا۔ حق و انصاف کے اصول پر قائم رہنا، مصائب و آلام کے مواقع پر صبر و تمکین سے کام لینا، دین کے معاملات میں ثبات و استقامت دکھانا، خدا کی وحدت پر یقین رکھتے ہوئے دنیا کی تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ صرف اسی ذات واحد کو سمجھنا اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام چیزوں کو ہیچ و لایعنی جاننا۔ وغیرہا من الامثال۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں علمائے امت کو انبیاء بنی اسرائیل فرمایا ہے۔ پس جو لوگ کتاب اللہ کا سررشتہ مضبوط تھامنے والے اور رسول کریمؐ کی متابعت کرنے والے اور صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں ایسے اشخاص کو مراتب کے اعتبار سے تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا طبقہ اہل حدیث یا محدثین کا ہے۔ یعنی وہ افراد جن کو لاکھوں حدیثیں زبانی یاد ہوں اور جو ان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ دوسرا طبقہ فقہا کا ہے اس طبقہ میں وہ محدثین داخل ہیں جو احادیث کے ماہر و عامل ہونے کے علاوہ ان میں غور و خوض کرنے کی قدرتی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں نئے نئے مسائل اخذ کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس طبقہ کا مرتبہ پہلے طبقہ کے مقابلہ میں زیادہ بلند ہے۔ اب تیسرا طبقہ صوفیا کا ہے۔ اس طبقہ کے افراد محدث و فقیہ ہونے کے علاوہ نفس کشی اور ریاضت کا بھی قابل تقلید نمونہ ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں خدا کی محبت اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں رہتا۔ چنانچہ رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ

"کیا آپ شیطان سے نفرت کرتی ہیں؟"

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

"نہیں، میں شیطان سے نفرت نہیں کرتی"

پوچھنے والا حیران رہ گیا اور اس نے متحیر ہو کر پھر سوال کیا کہ "کیوں، کیا شیطان آپ کے نزدیک نفرت کرنے کے قابل نہیں؟" اس پر آپ بولیں کہ "ہوگا، مگر میرے دل میں تو خدا کی محبت اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ اب اس میں کسی اور کی محبت یا نفرت کی جگہ ہی نہیں اس لئے میں خدا کی محبت کے سوا نہ کسی سے نفرت کر سکتی ہوں اور نہ محبت"

اس اعتبار سے صوفیا کا درجہ بہت بلند ہے۔ گویا صوفی بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان میں امام بخاریؒ اور امام ابوحنیفہؒ جیسے بزرگوں کا سا علم و تقویٰ بھی ہو اور ______ رابعہ بصریؒ کا سا سوز و گداز بھی۔ تب کہیں جا کر وہ صوفی ہو سکتا ہے۔ اور یہی وہ صوفی ہے جسے صحیح معنی میں رسولؐ کا جانشین اور انبیائے بنی اسرائیل کا مثیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ تصوف، اسلام کے منافی نہیں لیکن وہ تصوف البتہ اسلام کے منافی ہے جس میں شریعت و طریقت کی دو جدا جدا اصطلاحیں وضع کر کے ان

دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے۔ اسلامی تصوف میں شریعت ہی کی تکمیل کا نام طریقت ہے۔ یعنی یہ تو ممکن ہے شریعت ہو اور طریقت نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ طریقت ہو اور شریعت نہ ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ پابند شریعت انسان صوفی نہ ہو لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک صوفی پابند شریعت نہ ہو۔ صوفی کے لئے نبی کریم صلعم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقش قدم پر چلنا بیحد ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے الگ اسلام میں تصوف کوئی شے نہیں۔ اسلام میں تصوف کا اصل الاصول عبادت وانقطاع الی اللہ اور دنیا کی بری زندگی سے الگ تھلگ رہنا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائے تصوف کا بہترین نمونہ ہمارے سامنے نبی کریم اور صحابہ کی زندگی ہے لیکن افسوس ہے کہ بعد میں جب مسلمانوں سے دینی احساس کم ہونے لگا اور وہ حرف دنیا کی طرف بری طرح جھک گئے تو جن لوگوں نے گوشہ نشینی اور عبادت وریاضت اختیار کی ان کو صوفی اور متصوف کہا گیا۔

موجودہ موضوع کے لئے یہ ضروری ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ اقوال اپنے موضوع کے استدلال میں پیش کروں۔ آپ کا جدی نسب امام حسن علیہ السلام تک پہنچتا ہے اور سلسلۂ مادری امام حسین علیہ السلام تک اسلئے آپ کے نام کے ساتھ حسنی وحسینی لکھا جاتا ہے۔ چونکہ آپ کے صوفی باکمال ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس لئے آپ کے اقوال اس سلسلہ میں ہمارے لئے شمع ہدایت بن سکتے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں فتوح الغیب ایک بے نظیر کتاب ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کے لئے ہر حال میں تین چیزیں لازمی ہیں ایک یہ کہ اوامر الٰہی کی تعمیل کرتا رہے دوسرے یہ کہ جن باتوں سے شریعت نے روکا ہے ان سے بچتا رہے تیسرے قضا وقدر الٰہی پر راضی رہے۔ ایک مسلمان کے لئے کم سے کم رتبہ یہ ہے کہ کسی حالت میں وہ ان تین چیزوں سے خالی نہو۔ (صفحہ ۱۰۰۹)

ہر مومن کے لئے لازم ہے کہ سنت رسول کی پیروی کرتا رہے اور دین میں کوئی نئی بات اپنے دل سے نہ پیدا کرے۔ احکام شریعت کی اطاعت کرے اور دائرۂ اطاعت سے باہر نجائے۔ توحید خداوندی کو مانے اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائے۔ کیونکہ خدا جو چاہتا ہے اپنی مشیت اور ارادہ سے کرتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کو ہر نقص وعیب سے پاک سمجھو اور اس پر تہمت مت لگاؤ اس پر اعتماد رکھو اور شک وگمان میں نہ پڑو۔ صبر سے کام لیتے رہو اور بے صبری نہ کرو۔ اطاعت پر قائم رہو۔ اور جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (صفحہ ۱۴۰۱)

اسی کتاب میں (صفحہ ۰ پر) آپ نے اپنے صاحبزادہ کو وصیت فرمائی ہے کہ تقویٰ واطاعت اختیار کرو اور شریعت ظاہری کی پابندی لازمی رکھو۔ دل کو خواہشات نفس سے محفوظ رکھو۔ لوگوں کو آزار نہ پہنچاؤ۔ بزرگوں کی عزت کا خیال رکھو اور برابر والوں سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ایثار کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ اس کے علاوہ آپ فرماتے ہیں کہ فقر (یا تصوف) کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے بلکہ صرف خدا سے واسطہ رکھے اور مخلوقات سے کوئی آس نہ باندھے۔

تصوف کی بنیاد آپ نے مندرجہ ذیل آٹھ خصائل پر قائم کی ہے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ کی سی سخاوت۔ (۲) رضا برضائے الٰہی حضرت اسحٰقؑ کی طرح (۳) صبر حضرت ایوبؑ کا سا۔ (۴) مناجات حضرت زکریاؑ کی طرح۔ (۵) غربت حضرت یحییٰؑ کی طرح (۶) سادگی وخرقہ پوشی حضرت موسیٰؑ کی سی (۷) سیاحت وتجرد حضرت عیسیٰؑ کی طرح اور (۸) فقر حضرت رسول خدا خاتم النبیین کی طرح —————— یہ ہے معیار جسے مسلمان صوفیوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی روح حواس ظاہری کو چھوڑ کر باطن کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ تو ظاہری حواس ضعیف ہو جاتے ہیں۔ لیکن باطنی طاقتیں بام عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ روح کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ عبادت وریاضت غذائے روح ہے جو روح کو معراج کمال پر پہنچا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ علم الیقین سے گذر کر انسان حق الیقین وعین الیقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور علم لدنی کے اسرار جو خضرؑ کو عطا ہوئے تھے، صاحب ریاضت پر کھل جاتے ہیں اور انسان عالم انسانی سے نکل کر اُس عالم میں پہنچتا ہے جہاں پر فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن یہ اولیاء اللہ حکم الٰہی کے خلاف نہ تو مخلوق کو کسی واقعہ کی خبر دے سکتے ہیں اور نہ اس کا تذکرہ بغیر خدا کی مرضی کے کسی سے کر سکتے ہیں۔ یہی وہ صفات تھیں جن سے نبی کریم کے صحابۂ کرام متّصف تھے۔ غرضکہ صوفی وہی لوگ ہیں جو اپنی عقل سے سنت رسول کے مطابق کام لیتے ہیں اور جو اپنے نفس کی خباثتوں سے بچنے کے لئے سردار دوجہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ان ہی حضرات پر لفظ صوفی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور صرف یہی صوفی کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ جو ہیں وہ ریاکار ہیں صوفی نہیں۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

ہندی اور انگریز

(از جناب چراغ علی صاحب)

آجکل ہندی اردو کا سوال ہندوستان کے دو گروہوں کے درمیان فساد کی جڑ بنا ہوا ہے۔ "سیاسی" ہندوؤں میں ایسے افراد بکثرت پیدا ہو گئے ہیں اور روز بروز پیدا ہوتے جا رہے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں یا، بالفاظ صحیح تر، یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ زبان جو ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ دراصل ہندوستان کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی زبان وہ بھاشا ہے جو تلسی داس یا سورداس کی پستکوں میں لکھی ہوئی ملتی ہے۔ چنانچہ آجکل اچھے خاصے مستعمل لفظوں کو خواہ مخواہ جلاوطن کرنیکی کوشش کی جا رہی ہے۔ بعض لفظوں کا حلیہ بگاڑ کر انہیں آج سے سینکڑوں سال پہلے کا پرانا لباس پہنانے کی سعی ہو رہی ہے۔ مثلاً اب برس کو "ورش" کہا جائے گا۔ اور بدیشی کو "ودیشی"۔ وغیرہ وغیرہ

ہمارے ہموطنوں کی یہ کوششیں کیا نتائج پیدا کریں گی، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ زبان کسی کے بنانے سے نہیں بنا کرتی۔ یہ ایک قدرتی چیز ہے اور قدرتی طور پر ہی اس کی نشوونما ہوتی ہے۔ وہ زبان جسے آج ہم اردو کہتے ہیں اسی قدرتی نشوونما کا نتیجہ ہے۔ اسے نہ مسلمانوں نے بنایا نہ ہندوؤں نے، نہ بادشاہوں نے نہ فقیروں نے۔ دہلی کے قلعہ یا لکھنؤ کی محلسرا میں بیٹھکر اس زبان کو بنانے کی کوئی اسکیم تیار نہیں کی گئی تھی۔ اس کے برخلاف قدرتی طور پر وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک زبان بن گئی، بنتی رہی حتیٰ کہ آج وہ غالبؔ و ذوقؔ کی لطیف وشیریں زبان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور اس لئے اب اس زبان کو محض تعصب وتنگ نظری کے خیال سے مٹانے کی کوشش کرنا، ہندوستان میں تباہی وبربادی کو دعوت دینا ہے۔ زبان کا کوئی فرقہ، کوئی مذہب اور کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔ وہ سب کی ہوتی ہے، لیکن اگر اس میں بھی عقیدہ ومذہب کا سوال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو پھر جھگڑے فساد کا ہونا یقینی ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج بعض ناعاقبت اندیش سیاسی رہنماؤں کی طرف سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہمارے یہ ناعاقبت اندیش افراد یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے فرقہ یا اپنے مذہب کی خدمت کر رہے ہیں حالانکہ اگر وہ ذرا سے غور وفکر سے بھی کام لیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ اس طرح وہ اپنے اور اپنے فرقہ دونوں کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جب انگریز نے پہلے پہلے قدم رکھا تو اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہاں حکومت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کی مختلف فرقوں کو مختلف سوالات پر باہم دست وگریباں رکھا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بہت سے کھیل کھیلے، بہت سی شاطرانہ چالیں چلیں اور بہت سے حربے استعمال کئے۔ ان ہی میں سے ایک ہندی اردو کا سوال بھی ہے۔ لیکن افسوس کہ آج ہمارے بہت سے ہموطن اس حقیقت کو نظر انداز کر چکے ہیں اور وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اردو ہندی کا سوال خود اُن کے دماغ کی پیداوار ہے۔ کاش انہیں یہ معلوم ہوتا کہ اس سوال کو پیدا کرنے کی واحد ذمہ داری صرف انگریزوں پر ہے اور وہ بھی صرف، اس لئے کہ ہندوستان پر ان کی حکومت تادیر قائم رہ سکے۔

ہندی ہندوستان کا جھگڑا انگریزوں کی شہ سے اٹھایا گیا ہے۔ ان ہی کی حمایت میں اس کو ابھارا گیا اور ان ہی کی سرپرستی میں اسے پھیلایا گیا، میرا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں۔ جو لوگ پچھلی سو سالہ تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اس بارے میں میری تائید کریں گے۔ ہندوستان میں اس ہندی کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا جس پر آجکل زور دیا جاتا ہے۔ مگر یہ انگریز ہی تھے جنھوں نے محض "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس گڑے مردے کو اکھاڑا اور آخرکار اس سوال کو سبب بنا کر ہمارے دماغوں پر مسلط کر دیا۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں میں ذیل میں بنگال وبہار کے لفٹنٹ گورنر مسٹر کیمبل کے چند ارشادات کو نقل کرتا ہوں جو موصوف نے آج سے ۷۰ سال قبل، ۲ نومبر ۱۸۷۱ء کو مظفر پور (بہار) کے سنٹرل کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم کے موقع پر فرمائے تھے۔ اور جن کو پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ . . . انگریزی شاطروں نے کس خوبی وحکمت سے اس سوال کو اٹھا کر ایک بے بات کی بات پیدا کر دی۔ مسٹر کیمبل کے ان ارشادات کو فرانس کے ایک فاضل مستشرق موسیو گارساں ڈی ٹاسی نے اپنے مقالات میں درج کیا ہے اور پھر خود ہی ان کا جواب بھی دیا ہے۔ میں ان دونوں کے خیالات کو ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

جس سے اصل حقیقت بے نقاب ہوکر سامنے آجائے گی۔ موسیو گارساں ڈی تاسی چونکہ فرانس کے رہنے والے ہیں اور ان کو ہندوستان میں پھوٹ ڈلوانے کی ضرورت نہیں اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے خیالات میں کوئی خود غرضی نہیں ہوسکتی۔ پھر چونکہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان اس لئے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے کوئی بات تعصب وطرفداری کی خاطر کہی ہے۔

بنگال و بہار کے لفٹنٹ گورنر کے ارشادات

"اس میں شبہ نہیں کہ عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تعلیمی ترقی کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور وسطانی تعلیم ملکی زبان کے ذریعے دی جائے۔ اس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اس لئے کہ وہ اب تک سرکار کے مدرسوں اور کالجوں سے دور رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی مادری زبان اور قدیم کلاسیکل زبانوں سے محبت ہے، میں ہندوستانی زبان کا دل سے ہوا خواہ ہوں۔ جہاں تک پنجاب اور صوبجات شمال مغربی کا تعلق ہے۔ ان علاقوں میں اسی زبان کے ذریعے سب کارروائیاں ہوتی ہیں اور انگریزی کو اب تک کم رواج حاصل ہوا ہے۔ لیکن صوبہ بہار کے حالات دوسرے ہیں۔ اس کا تعلق صوبہ بنگال سے ہے جہاں انگریزی زبان نے جڑ پکڑلی ہے۔ اس لئے یہاں بجائے قدیم مشرقی زبان سکھانے کے انگریزی کی تعلیم پر زور دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بلاشبہ سنسکرت زبان میں مٹھاس پائی جاتی ہے۔ اور اس کا ذخیرہ الفاظ بھی بہت وسیع ہے۔ اس کا تعلق یورپ کی اکثر السنہ سے ہے۔ اسی طرح عربی بھی ایک جاندار زبان ہے۔ اور اس میں فلسفہ اور تاریخ کے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔ لیکن پھر بھی ان قدیم زبانوں کے سکھانے پر بیکار بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ مسلمان لوگ اپنی قدیم مذہبی کتابوں کو سمجھنے کے لئے عربی اور فارسی سیکھیں مگر ان زبانوں کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر ملک کی زندہ زبان میں تعلیم دینے کا انتظام نہیں ہوسکتا تو بہتر ہوگا کہ انگریزی ہی ذریعہ تعلیم رہے۔ مغلوں کے عہد حکومت میں فارسی سیکھنی پڑتی تھی تو اب جبکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے امن وامان قائم کیا ہے اگر اہل ہند میں انگریزی زبان کی اشاعت کی جائے تو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ حکومت نے وسطانیہ مدارس کی تعلیم کے لئے یہ سہولت بہم پہنچا دی کہ مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اگر طلبہ انگریزی زبان سیکھیں گے تو آیندہ انھیں یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے کہ یونیورسٹی میں قدیم مشرقی زبانوں سے واقفیت کام نہ آئے گی اور انگریزی کے توسط سے مغربی علوم کو . . . حاصل کرنے میں بے حد سہولت ہوگی۔

میں چونکہ زبان سے ناواقف ہوں اس لئے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کرسکا کہ یہ تقریر اردو میں تھی یا فارسی میں کہ اردو دیسی زبان نہیں ہے۔ اور تعلیم عامہ میں اس کو رواج نہیں دیا جاسکتا۔"

موسیو گارساں ڈی تاسی کا جواب

"تعجب ہے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال اردو زبان سے ناواقف ہیں۔ لیکن انھوں نے اس قسم کی تقریر کو روا رکھا بنابریں ہم یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ لفٹنٹ گورنر بنگال کے نزدیک دیسی زبان سے کیا مراد ہے؟ کیا دیسی زبان ان کے نزدیک وہ ہے جو فوجی لوگ یا قلی بولتے ہیں؟ افسوس ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دیسی زبان کا اطلاق جیسا ہندوستانی اردو پر ہوتا ہے کسی اور زبان پر نہیں ہوتا۔ یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بالکل فطری طور پر شامل ہوئے۔ عربی کے لفظوں نے دراصل فارسی ہی کے راہ سے اس زبان میں بار پایا۔ اس زبان میں بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بول چال کے محاورے علمی اور ادبی زبان سے مختلف ہیں یہ درست ہے کہ مسلمان اردو میں ایسے بہت سے لفظ استعمال کرتے ہیں جو عام بول چال میں نہیں برتے جاتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لفٹنٹ گورنر بہادر بنگال کو یہ بات ہرگز پسند نہ آئے گی کہ کوئی انہیں ایسی زبان میں خطاب کرے جو رکیک اور بازاری ہو۔ مشرق کی اور دوسری زبانوں میں سوائے عربی کے ہمیں یہ بات ملتی ہے۔ چنانچہ ترکی اس باب میں ہندوستانی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ ترکی میں بھی بہت سے ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو ترکی لفظ کے ساتھ عربی رسم کے ملانے سے بنائے جاتے ہیں۔ ترکی مصنفین اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ ان کی تحریر کو نہیں سمجھتے؟ مشرقی زبانوں کی اس خصوصیت کو ہمیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ خود انگریزی زبان میں لاطینی محاورے استعمال ہوتے ہیں پارلیمنٹ کے جلسوں میں اراکین ورجل اور ہورس کے اشعار لاطینی زبان میں پڑھتے ہیں۔ اور کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا۔

سرجارج کیمبل لفٹنٹ گورنر بنگال نے ہندوستانی اردو کے خلاف جو تقریر کی اور جس میں مولوی امداد علی کی تقریر کو معرض بحث میں لایا گیا وہ دراصل ان کے ایک اور اہم بیان کا پیش خیمہ تھی جسے ہم سرکاری کہہ سکتے ہیں۔ ہماری مراد ہے اُس یادداشت سے جو دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کے متعلق ۱۳ر دسمبر ۱۸۷۱ء کو شائع کی گئی ہے۔ کوئی شخص اس کا گمان بھی نہیں کرسکتا کہ اس قسم کی تحریر خود اعتمادی کے ساتھ حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ نئے وائسرائے بہادر اس تحریر کو منسوخ قرار دیں گے۔ یہ تحریر اس قدر عجیب وغریب اور غیر متوقع ہے کہ ہم یہاں اس کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔"

(اس سرکاری سازش کی طرف موسیو گارساں نے ہمیں خوب توجہ دلائی۔ اب آپ ذیل میں اس یادداشت کو پڑھئے جو لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر بنگال نے محکمہ تعلیمات میں بھیجی تھی اور جس میں سرکاری طور سے ہندی اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا سوال بنانے کی کھلی ہوئی سازش کی گئی ہے۔ یہ یادداشت بھی موسیو گارساں ہی کے مقالات سے نقل کی گئی ہے۔ ح - غ)

لفٹنٹ گورنر بنگال کی یادداشت

(مجریہ ۱۳ر دسمبر ۱۸۷۱ء)

"فارسی زبان کو جو ہندوستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی کلیتاً ترک کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندوستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کردی گئی تھی۔ میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اُس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت مرغوب ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہوچکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اسکے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے (جس کو دیکھ کر آپ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ ح - غ) بہار میں میں نے جو زبان سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان (ورنیکلر) کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھلاتے ہیں، وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں (اس لئے کہ اس طرح ہندوستانیوں میں پھوٹ پڑنے کا امکان کم سے کم ہوتا جارہا تھا۔ ح - غ) اس زبان کے لئے اردو کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جو نہایت غیر موزوں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بنگال کے محکمہ تعلیمات نے رائج کیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کئے جاسکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کچھ لکھا جائے کہ اردو زبان اہل دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہو لیکن اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے (ذرا جوش تو ملاحظہ فرمایئے۔ ح - غ) میں نے پورا ارادہ کرلیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں دی جاتی ہے روکنے کی کوشش کروں گا۔ میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں یہ ایک نفیس اور بے تکلف زبان ہے۔ اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں۔ (اور حالات کے ناموافق ہونے کا فیصلہ آپ پہلے صادر فرما ہی چکے ہیں۔ ح - غ) لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں کچھ تھوڑے سے ہندوستانی کے افعال و حروف عطفیہ (Conjunction) شامل کرلئے گئے ہیں جسے اردو کہتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جائے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اردو میں سے فارسی الفاظ چن چن کر علٰحدہ کردیئے جائیں۔ یہ ہندوستانی زبانوں کی خصوصیت خاص معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی اجنبی زبان کے محاورے اور لفظ کسی مطلب کو ادا کرنے کے لئے آسانی سے اپنے میں شامل کرلیتی ہیں اس لئے کہ خود ان میں اس کے ادا کرنے کے لئے لفظ موجود نہیں۔ چنانچہ ہندوستانی زبانوں میں بہت سے فارسی الفاظ نے راہ پائی۔ اسی طرح سے انگریزی لفظ اپنائے جارہے ہیں اور غالباً آیندہ اور اپنائے جائیں گے یہ دوسری زبانوں کے لفظ جو ہندوستانی زبانوں میں اپنائے گئے ہیں بچوں کو سکھلانے ہوں گے۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کو جو زبان سکھائی جائیں وہ ملک کی حقیقی زبانیں ہونی چاہئیں۔ جو عام طور پر بولی جاتی ہیں اور جنھیں عوام الناس سمجھتے ہیں۔ مصنوعی زبانیں سکھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جنھیں عام لوگ نہیں سمجھتے اور نہ بولتے ہیں۔ اگر جدید تصورات کو ادا کرنے کے لئے جدید الفاظ کی ضرورت ہے، تو میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا کہ انگریزی الفاظ رائج کئے جائیں۔ بجائے اس کے کہ کسی اجنبی زبان کے اجنبی الفاظ قبول کئے جائیں (اور انگریزی تو ہندوستان کی بالکل دیسی زبان ہے۔ ح - غ)

اسلئے میں ڈائرکٹر تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کراتا ہوں:-

(۱) اُردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی متروک ہوچکی ہے۔

(۲) ڈائرکٹر تعلیمات اور مہتمم تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہو اور جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جاچکا ہو اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ صوبجات شمال مغربی میں ہندی اور ہندوستانی کی جو کتابیں شائع کی جارہی ہیں وہ نصابی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتیں۔

(۳) اگر تعلیمات کے کسی شعبہ میں ایسی کتب موجود نہ ہوں جو مروجہ زبان میں ہوں تو اس کے متعلق مجھے خاص رپورٹ بھیجی جائے۔ میں ان کتب کی فراہمی

کا انتظام کروں گا۔

"میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ ہونے دیں۔ البتہ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہاں وہ علی حالہ رہے گی۔ (ہیر پھیر!!) مجھے توقع ہے کہ اس بارہ میں ہائیکورٹ بھی ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہائی کورٹ کے جج دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے۔"

موسیو گارساں کی تنقید

"مسٹر کیمبل لفٹنٹ گورنر بنگال کی دیسی زبانوں کے متعلق یہ یادداشت ہے جو عجیب وغریب نوعیت رکھتی ہے۔ میں نے اس کو یہاں اس واسطے درج کر دیا ہے کہ یورپ میں بھی لوگ اس سے واقف ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یورپ میں ان خیالات کو سن کر وہ لوگ جو ہندوستان کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں ناک بھوں چڑھائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی لوگ اس یادداشت سے خوش نہیں ہیں جیسا کہ بنگال کے ڈائرکٹر تعلیمات کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس یادداشت کے جواب میں لکھی گئی ہے۔

بنگال کے ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر ڈبلیو۔ ایس۔ اٹکلسن کے علاوہ دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں مثلاً مسٹر سٹ کلف اور مسٹر فیلن ——— وغیرہ نے بھی اس کے جواب دیئے ہیں۔ اگرچہ ان جوابات کا لب ولہجہ بہت مؤدبانہ ہے۔ لیکن ان کا مفہوم واضح ہے۔ ان سب نے مسٹر کیمبل کے خیالات کو ناقابل عمل بتایا ہے۔ اور ان کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال کے خیالات شرمندہ عمل نہ ہو سکیں گے۔

انڈین ڈیلی نیوز نے مسٹر کیمبل کے عجیب وغریب لسانی نظریہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس اخبار نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ ہندوستانی زبان نہیں بنائی جا سکتی اور اس کو سرکاری طور پر ہندوستانی اردو کی جگہ نہیں رائج کرایا جا سکتا۔ اسی مسئلہ کے متعلق لفٹنٹ گورنر بنگال اور کلکتہ یونیورسٹی کے درمیان سخت اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن مسٹر کیمبل کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی اردو نے جس طرح ہندوؤں کی رجعت پسندانہ حکمت عملی کا مقابلہ کیا ہے اس طرح وہ ان کی تنقید وتعریض کا مقابلہ کرے گی۔ ممکن ہے مسٹر کیمبل کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کی جائے اور بہار کے مدارس میں اردو کو ختم کر دیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم برابر جاری رہے گی۔ ایسے جلسوں میں جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شریک ہوں اسی زبان کے ذریعہ تبادلہ خیالات کیا جائے گا۔ حکومت ہند کے اس کی بابت احکام موجود ہیں کہ مقامی جلسوں اور انجمنوں کو مقامی زبان میں اپنی کارروائیاں کرنی چاہیئں۔ ان احکام کے اجراء پر اظہار اطمینان کیا گیا اور بالخصوص لاہور کی ادبی انجمن نے ان کو بہت پسند کیا۔ اسی ضمن میں حکومت نے عدالتوں کو بھی یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ اسی زبان کو ترجیح دیں جو ان لوگوں کی عام زبان ہے۔ جو لوگ دادرسی کے لئے آتے ہیں عدالتوں کو چاہیئے کہ ان کے لئے سرکاری کاغذات میں ہندوستانی اصطلاحات کو رائج رہنے دیں۔ ان کی جگہ انگریزی اصطلاحات سے احتراز کیا جائے۔ ان باتوں کے علاوہ انڈیا آفس کا حکم موجود ہے۔ جس کے بموجب سول سروس کے امیدواروں کو ہندوستانی یعنی وہ زبان جسے اردو کہتے ہیں اس کا سیکھنا لازمی کیا گیا ہے۔ حالانکہ ملک کی کسی دوسری زبان کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

بہار کے ایک مسلمان مضمون نگار نے اس سلسلہ میں ایک مضمون لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر عنایت پہلے پہل مسلمانوں پر رہی لیکن اس کے بعد حکومت کی نگاہیں بدل گئیں جسکی وجہ غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں ہے اس لئے انہیں سرکاری خدمات سے محروم کیا گیا۔ مسلمانوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کیا تو حکومت نے وعدہ کیا کہ ان کے لئے ان کی قومی زبان (اردو) میں وسطانیہ (مڈل) کے امتحانات لینے کا انتظام کیا جائے گا۔ اور بغیر انگریزی زبان کی واقفیت کے انہیں سرکاری ملازمتیں دی جائینگی۔ آگے چلکر مضمون نگار کہتا ہے کہ وسطانیہ کے امتحان کی یہ رعایت جنوری ۱۸۷۲ء سے منظور کی گئی لیکن اسی وقت سے آنریبل جارج کیمبل لفٹنٹ گورنر بہار وبنگال نے تہیہ کر لیا ہے کہ اردو زبان بالکل مٹا کے چھوڑیں گے۔ اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب ہوں گے یا نہیں، اس کا علم خدا ہی کو ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ ایسی زبان کو مٹانا جو چھ سو برس سے سوسائٹی کے ہر طبقہ میں اٹک سے لیکر چین کی سرحد تک بولی جاتی ہے ناممکن ہے۔ یہی زبان صوبجات شمال مغربی (یو۔پی) اور بہار کے لوگوں کی مادری زبان ہے۔ مسٹر کیمبل نے اس زبان کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ صرف ایک آدھ ایسے شخص کی تقریر سننے کا نتیجہ ہے جس میں عربی اور فارسی کے بہت لفظ استعمال کئے گئے ہونگے۔ دراصل بول چال کی زبان علمی زبان سے مختلف ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مسٹر کیمبل صرف کسی ایک تقریر کو سنکر حکم دیدیں کہ لوگوں کی زبان بدل دیجائے۔ لیکن ہمیں توقع ہے کہ یہ خیال شرمندہ عمل نہ ہو سکے گا۔ اگر حکومت کیجانب سے ہر پانچویں سال اسی قسم کے احکام جاری ہوتے رہے تو یہ رعایا کیلئے سخت زحمت کا باعث ہوگا۔ مسٹر کیمبل اور ان کے جانشین چاہے کچھ ہی کریں۔ لیکن انگریزی زبان ہندوستان کی عام زبان کبھی نہیں بن سکتی۔

میں اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ ہندوستانی ادب میں ادائے مطلب کے نئے نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندی زبان کو ہندو لوگ سنوارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن میں ان کو رجعت پسند خیال کرتا ہوں خالص ہندوستانی جسے اردو کہتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے۔ دونوں جماعتوں کے ترقی پسند افراد نے اس زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔"

(موسیو گارساں ڈی تاسی کے مذکورہ بالا مقالات کا اردو ترجمہ حیدرآباد میں ہو چکا ہے پ۔ ع)

بادۂ محبّت

(اصغر شعری بھوپالی)

زہے کوشش کامیابِ محبت
ہمیشہ رہے ہم خرابِ محبت

ٹھہرنا ذرا اضطرابِ محبت
وہ آیا، وہ آیا، جوابِ محبت

جنونِ فغاں، اضطرابِ محبت
یہ بیداریاں بھی ہیں خوابِ محبت

ہلاکِ تمنا، خرابِ محبت
ہمیں ہم ہیں گویا جوابِ محبت

مری زندگی کا نہ پردا اٹھاؤ
مری زندگی ہے حجابِ محبت

ابھی وجد آجائے دونوں جہاں کو
اگر چھیڑ دوں میں ربابِ محبت

سکونِ محبت جو ممکن نہیں ہے
بڑھا دیجئے اضطرابِ محبت

جھکی جا رہی ہیں وہ معصوم نظریں
دیا جا رہا ہے جوابِ محبت

خوشا اسکی مستی، زہے اسکی ہستی
جو ہو جائے غرقِ شرابِ محبت

کہاں تک وہی ہم، وہی منزلِ غم
نیا اب کوئی انقلابِ محبت

بلا واسطہ ہم سے آنکھیں ملاؤ
رہے درمیاں کیوں حجابِ محبت

نظر خسروانہ، ادا والہانہ
وہ آتا ہے خانہ خرابِ محبت

ق
خیالوں میں رقصیدہ جلوہ کسی کا
نگاہوں میں کیفِ شرابِ محبت

تری بزم جنت تھی لیکن کروں کیا
اٹھا لے گیا اضطرابِ محبت

مکمل ہے بیداریٔ زندگانی
میسر ہے آغوشِ خوابِ محبت

نہ ترسا، نہ ترسا محبت کے ساقی
پلا دے، پلا دے، شرابِ محبت

ہوئے ہیں وہ جس دن سے ناراض شعری
ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت

ہماری زبان اور برہمنوں کا سودائے خام

(از جناب حبیب احمد صدیقی، ایجاد۔ تھانوی۔ سہارنپور۔)

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں آجکل عام طور سے جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ بدیسی زبان ہے۔ یہاں کی اصلی زبان سنسکرت ہے۔ اسی بنا پر سمپورنانندجی نے اعلان کیا کہ ہمیں ہندی میں سنسکرت کے الفاظ بے تحاشا استعمال کرنے چاہئیں، تاکہ یہ زبان صحیح معنی میں ہماری دیس کی اصلی زبان بن جائے۔ سمپورنانندجی کے اس ارشاد پر جب لوگوں نے اعتراضات کئے تو گاندھی جی ڈنڈا ٹیکتے ہوئے اٹھے اور انھوں نے سمپورنانندجی کی پیٹھ ٹھونک دی۔ اب کیا تھا، گاندھی آشرم کا فتوی صادر ہو جانے کے بعد سمپورنانندجی کے قول کی صداقت میں کسے شبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس سنسکرت پر اتنا زور دیا جا رہا ہے اس کے متعلق (مسلمانوں کو چھوڑ دیجئے) خود ہندوؤں کا کیا خیال ہے۔ دھاندلی کی تو بات ہی دوسری ہے۔ لیکن اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ۹۵ فیصدی ہندو سنسکرت سے نہ کوئی لگاؤ رکھتے ہیں اور نہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سنسکرت اُن آریاؤں کی زبان ہے جو آج سے ہزاروں سال قبل ہندوستان میں لوٹ مار مچاتے داخل ہوئے اور جنھوں نے یہاں کی اصل قوموں کو اچھوت اور ویش کا نام دیکر اپنا ماتحت بنا لیا۔ اور ماتحت بھی ایسا کہ غلام سے بدتر۔ چنانچہ موجودہ ذات پات کی تقسیم ان ہی آریوں کی لائی ہوئی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہندوستانیوں سے بہت اونچا سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے سب سے اونچا درجہ برہمنوں کو دیا۔ یعنی وہ لوگ جو آریائی مذہب کے عالم ہوں۔ اور سب سے نیچا درجہ ہندوستان کے اصلی باشندوں کو دیا یعنی اُنہیں اچھوت کا نام دیکر اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ غریب کسی برہمن کے پاس سے بھی گذر سکیں۔

یہ آریہ اپنی ہر چیز کو ہندوستانی چیزوں کے مقابلہ میں بہت مقدس سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی کہ ان کی کسی چیز میں یہاں کے گندہ و ذلیل لوگوں کی کسی چیز کی آمیزش نہ ہو سکے۔ شادی بیاہ، کھان پان وغیرہ وغیرہ سب پر اسی لئے پابندی عائد کی کسی ہندوستانی کو اجازت نہ دی گئی کہ وہ کسی آریہ نسل کے آدمی کے ساتھ بیٹھکر کھا سکے۔ شادی بیاہ کا تو ذکر ہی کیا۔ بالکل اسی طرح کسی ہندوستانی کو اجازت نہ دیگئی کہ وہ آریوں کی مقدس زبان، سنسکرت کو سیکھ سکے۔ سنسکرت کا سیکھنا، لکھنا، بولنا اور پڑھنا صرف آریوں کے لئے مخصوص رکھا گیا۔ برہمن لوگ اس زبان کو سیکھنے سکھانے پر مامور ہوئے۔

ایک عرصہ تک ہندوستان میں آریوں کا سکّہ چلتا رہا۔ برہمنوں کا راج تھا۔ اصلی ہندوستانی کول، دڑاوڑ، بھنگی چمار بنکر رہے جن کو نہ پڑھنے لکھنے کی اجازت تھی نہ عزت کے ساتھ رہنے سہنے کی لیکن زمانہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتا۔ آخر اس نے کروٹ بدلی۔ ہندوستان میں گوتم بدھ پیدا ہوا۔ اس نے ذات پات کی یہ تمیز بہت بڑی حد تک اٹھائی اور برہمنوں کے راج کو ضرب کاری لگائی۔ آریوں کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ مگر بے بس سے ہو گئے تھے۔ کیونکہ ہندوستان کے اکثر راجے مہاراجے گوتم بدھ کے معتقد ہو چکے تھے لیکن اسکے کچھ ہی دنوں بعد ہندوستان پر سکندر کی فوج نے یلغار بولا جس سے بدھ مذہب کے پرستاروں کی طاقت کو کافی نقصان پہنچا۔ اب بکرماجیت اور راجہ بھوج کا زمانہ آیا۔ ان لوگوں کو پھر اپنی بلندی و برتری کو قائم کرنیکا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ برہمنوں کا راج پھر عود کر آیا۔ اس درمیان میں سنسکرت کی اہمیت جاتی رہی تھی مگر اب پھر سنسکرت کو لوگ ... اوتاروں کی زبان سمجھنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ان راجاؤں کی سخت کوششوں کے باوجود بھی سنسکرت کا سکہ پوری طرح ہندوستانیوں کے دل پر نہ بیٹھ سکا۔

آریوں کے زمانہ سے لیکر مسلمانوں کے حملہ تک ہندوستان میں زبان کی صورت حال یہ تھی کہ سنسکرت کو صرف آریہ نسل کے لوگ یعنی برہمن اور کھشتری وغیرہ استعمال کر سکتے تھے۔ باقی عام لوگوں کو نہ اس کے الفاظ بولنے کی اجازت تھی اور نہ اسے سیکھنے کی۔ اس زمانہ میں عام لوگوں کی زبان کو پراکرت (یعنی بول چال کی عام زبان) کہتے تھے۔ ہر خطّہ کی پراکرت الگ ہوتی تھی۔ سکندر کے حملہ کے وقت ہندوستان میں پانچ پراکرتیں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ (۱) مہاراشٹری (۲) سوالستی (۳) ماگدی (۴) بیساچی اور (۵) ابھ نسار۔

برہمن لوگ ان پراکرتوں کو گھٹیا اور حقیر سمجھتے تھے لیکن غیر برہمنوں کے نزدیک یہ ایسی نہ تھیں۔ وہ ان کو اتنا ہی عزیز رکھتے تھے جتنا برہمنوں کے نزدیک سنسکرت تھی۔ ان پراکرتوں میں ہندوستان کی غیر برہمن قوم کی مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ کتابیں ہوتی تھیں اور آج بھی جنوبی ہند اور بمبئی کی ان زبانوں میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ ہے۔

مذکورہ بالا زبانوں میں سواستی بہت خاص درجہ رکھتی تھی۔ اس کو برج بھاشا بھی کہتے تھے۔ جب ہندوستان میں مسلمان داخل ہوئے تو اس زبان کو بڑی اچھی حیثیت حاصل تھی۔

مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان کا رنگ بالکل بدلنا شروع ہوا۔ آریوں نے مذہب کا نام دیکر غیر آریاؤں کو حقیر و ذلیل رکھنے کے لئے جو ترکیبیں نکال رکھی تھیں ان سب کے تار و پود بکھرنے لگے مسلمانوں نے چھوت، اچھوت کے امتیازات کی ہنسی اڑائی، علوم و فنون کو صرف برہمنوں کے ایک مخصوص طبقہ کی جاگیر قرار دینے پر تمسخر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پست اقوام کے وہ ہندو جو اب تک دبے پڑے تھے یکایک چونک اٹھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی شکل میں خدا نے ان کے لئے رحمت کے فرشتے نازل کئے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے عام باشندے دوڑ دوڑ کر ان رعایتوں سے فائدے اُٹھانے لگے۔ اب تک تو ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ سنسکرت جیسی مقدس زبان کو سیکھنے کا حق صرف برہمنوں کو حاصل ہے مگر مسلمانوں نے عربی فارسی پڑھنے کی انھیں کھلی اجازت دی۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں تعلیم عام کر دی گئی۔ ہندوؤں نے یہ دیکھا تو عربی فارسی کے ذخیروں سے خوب فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ خود بخود داخل ہونے لگے۔ یہی چیز ترقی کرتے کرتے آج اُردو زبان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

لیکن اب برہمنوں کا پھر یہ اصرار ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے اپنی اپنی پراکرتوں کو چھوڑ کر صرف سنسکرت کے دامن کے ساتھ اپنا دامن باندھ لیں۔ یہ برہمن ایک بار پھر اپنا وہی اگلا سا عروج دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ زبان کو سنسکرت کی طرف لوٹا کر سنسکرت بنا دینے کی کوشش میں برہمنوں، بنیوں اور کھشتریوں یعنی آریائی نسل کے لوگوں کا یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ جنوبی ہند میں چونکہ آریائی نسل کے لوگ بہت کم ہیں (کیونکہ یہ آریا ہندوستانیوں کو شمال کے اچھے اچھے علاقوں سے دھکیل دھکیل کر جنوب میں بھیجتے رہے) اس لئے وہاں اس سمپورنانندی ہندی کی خلاف کافی احتجاج ہو رہا ہے۔ وہ لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس طرح برہمنی لوگ ہمارے سر پر برہمنی اقتدار کو تھوپنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پنڈت راجہ گوپال اچاریہ وزیر اعظم صوبہ مدراس نے جب سے وہاں ہندی زبان کو لازمی قرار دیا ہے ہندی کے خلاف ہندوؤں ہی میں زبردست ایجی ٹیشن برابر جاری ہے۔

یہ ہے اردو کی مختصر تاریخ۔ انگریز جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے بھی اس حقیقت کو محسوس کیا۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم اردو کالج زیر نگرانی جان گلگرسٹ کلکتہ میں قائم ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل گیارہ آدمی اردو کی تصنیف و تالیف کے لئے رکھے گئے۔

سید قمر الحسن حیدری۔ سر بہادر علی حسن۔ مرزا علی لطف۔ بابو نہال چند نہال۔ میر امن۔ حفیظ الدین۔ شیر علی افسوس۔ کاظم حسین جوان۔ مظہر علی۔ اکرام علی اور راما لال کوی۔

اس کے بعد ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں کی سرکاری زبان اُردو قرار دی گئی۔ ۱۸۳۶ء میں سب سے پہلا اردو اخبار نکلا۔ اسی زمانہ میں چار درویش، آرائش محفل، باغ اردو وغیرہ کتابیں لکھی گئیں، اخلاق محسنی کا اردو ترجمہ ہوا، ڈاکٹر جان گلگرسٹ نے انگریزی میں اور میر انشاء اللہ خاں نے اردو میں قواعد اُردو کے نام سے اردو کی صرف و نحو مرتب کی، شاہ عبد القادرؒ نے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا، غرض کہ اردو کو عام لوگوں کی زبان سمجھا گیا۔ اور جب عام لوگوں کو مخاطب کرنے کا سوال آتا تو اسی زبان کی طرف رجوع کیا جاتا۔

اسی زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ میں بھی اردو کی آبیاری ہو رہی تھی کیونکہ اس وقت تک دہلی اور اودھ کی حکومتیں برائے نام ہی سہی مگر قائم ضرور تھیں۔ دہلی میں عمدۃ الملکی کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی۔ اور امیر محمد خاں انجام کی صدارت میں بڑے بڑے زباندان زبان کے محاوروں اور لفظوں کی تحقیق و تفتیش کے کام پر مامور ہوئے۔ ان لوگوں کی بحث و تمحیص کے بعد جو الفاظ و محاورات صحیح قرار پاتے وہ انجمن کے فائل میں درج کئے جاتے اور ہندوستان بھر میں ان کی نقلیں بطور سند کے بھیجی جائیں۔ اس انجمن کے ممبروں میں میر ضاحک اور میر حاتم بھی داخل تھے۔

لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سیاست نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ ابھی مسلمانوں میں کچھ جان باقی ہے اسلئے مسلمانوں کو فنا کرنے اور مٹانے کی کوشش شروع ہوئی نیز یہ محسوس کیا گیا کہ انگریز کے لئے ہندوستان میں امن چین سے حکومت کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک وہ یہاں کے بسنے والے مختلف فرقوں میں پھوٹ نہ ڈلوائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو کچلنے اور ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی اس اسکیم میں سے ایک اسکیم ہندی اردو کا قضیہ بھی تھا۔ ... انگریزوں نے ہندوؤں کو اکسایا اور ان سے کہا کہ تمہاری زبان تو ہندی ہے۔ تم اردو سے اپنی بیزاری کا اظہار کرو۔ یہ جذبہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا رہا۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ لیکن ہندی کو رواج دینے کی کوششیں برابر ہوتی رہیں ۱۹۰۰ء میں حکومت نے ان کوششوں میں جان ڈالنے کے لئے یو۔ پی میں اُردو کے

پہلو بہ پہلو ہندی زبان کو بھی سرکاری اور عدالتی زبان تسلیم کرنیکا اعلان کیاگیا بہرحال آج ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ انگریزوں اور برہمنوں کی اسی ملی بھگت کا کرشمہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی کوششیں کچھ دن کیلئے باہمی منافرت وعناد کی خلیج کو تو وسیع کرسکتی ہیں لیکن ان سے کوئی دیرپا مفید نتائج نہیں نکل سکتے۔ اور اس لئے اردو کو مٹانے اور ہندی کو رواج دینے کی کوششوں کا اثر زبان پر تو بہت کم پڑتا ہے البتہ اس سے ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ کاش ہمارے ہموطن بھائیوں کو اپنی اس فتنہ پردازی کا احساس ہوتا!!

اُردو کا ترانہ

(از جناب سید احمد عروج قادری سہسرام)

اٹھو نوجوانو، اٹھو نوجوانو   بڑھو نوجوانو، بڑھو نوجوانو
زباں اپنی ہرگز مٹانے نہ دینگے   ہم اُردو کو ہندی بنانے نہ دینگے
اُٹھو نوجوانو، اُٹھو نوجوانو   بڑھو نوجوانو، بڑھو نوجوانو
شرارت کی کالی گھٹا چھارہی ہے   ہمارے سروں پر بلا آرہی ہے
محاذ ایک مضبوط سا بن رہا ہے   تکبّر سے ہر سور ما تن رہا ہے
کہیں گورے سینوں میں مخفی سیہ دل   کہیں شربتوں میں ملا زہرِ قاتل
کہیں مکر و دجل و فریب و دغا ہے   رواداریوں کا غلط ادّعا ہے
بغل میں چھری منہ پہ بے لاگ باتیں   کہیں چپکے چپکے مٹانے کی گھاتیں
کہ پہلے زباں ان کی بیکار کردو   تمدن کی تعمیر مسمار کردو
پھر ان شودروں کو مٹانا ہے آساں   غلام ان کو اپنا بنانا ہے آساں

یہ تجویز تم نے سُنی نوجوانو؟   مرے دوستو، بھائیو، مہربانو
تمہاری طرف اُٹھ رہی ہیں نگاہیں   ہیں تہذیب قومی کے ہونٹوں پہ آہیں
بہ بانگِ دُہل کہہ دو تیار ہیں ہم   مے حُبّ قومی سے سرشار ہیں ہم
یہ پودا ہے وہ جس کو سینچا لہو سے   بڑی کاوشوں سے بڑی آرزو سے
لہو دے کے اپنا بچائینگے اس کو   وطن کی زباں ہم بنائیں گے اسکو
عرب، چین و جاپاں میں اسکا ترانہ   ہے یورپ میں مشہور اس کا فسانہ
اِدھر ہے اُدھر ہے یہاں ہے وہاں ہے   حقیقت میں اردو تو شاہِ جہاں ہے
لطافت میں قوسِ قزح اس سے کم تر   نزاکت میں یہ برگِ گل سے بھی بہتر
جواہر سے مہنگے سفینے ہیں اس میں   ہر اک علم و فن کے خزینے ہیں اسمیں
دل آویز و دلچسپ اس کی کہانی   بہار آفریں اس کی کافر جوانی
یہ آتش نوا ہے، یہ شیریں بیاں ہے   سلاست، فصاحت، بلاغت کی جاں ہے
ہمارے تمدن کا دلکش نشاں ہے   زمیں اس کی ہم پایۂ آسماں ہے
عَلَم حریت کا بڑھاؤ جوانو   کوئی نغمۂ گرم گاؤ جوانو

اٹھو نوجوانو، اٹھو نوجوانو
بڑھو نوجوانو، بڑھو نوجوانو

مشاہدہ اور پیام

(از جناب ماہر القادری)

پھر نظمِ جہاں، زیر و زبر دیکھ رہا ہوں   تہذیب کی کوشش کا اثر دیکھ رہا ہوں
اخلاق کا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں   دیکھا نہیں جاتا ہے، مگر دیکھ رہا ہوں
کردار کی کھیتی کو ہے پانی کی ضرورت   افسردگیٔ برگ و شمر دیکھ رہا ہوں
شاید یہ فلسطیں کے شہیدوں کا لہو ہے   امید کی رنگین سحر دیکھ رہا ہوں

استالن و ہٹلر پہ زمانے کی نظر ہے
میں مردِ مسلماں کی نظر دیکھ رہا ہوں

وہ تیغ ہے دراصل مسلماں کی وراثت   جو تیغ کہ اقوام کی تقدیر بدل دے
تو رزم کا خوگر ہے، تجھے بزم سے کیا کام   تہذیب کے ہر پھول کو خشکی سے مسل دے

پھر نانِ جویں، مائل خیبر شکنی ہے
اے کاش! خدا پھر تجھے توفیقِ عمل دے

کبتک خس و خاشاک کی الجھن میں رہے گا   طوفاں ہے تو الوند کی چوٹی سے گذر جا

دنیا تجھے مرنے کی بھی مہلت نہیں دے گی
ناموس محمدؐ پہ جو مرنا ہے تو مرجا

وطن

(شاعر حریت حضرت شاطر حکیمی کامٹی سی پی)

اے وطن اے راحت و آرام کے آئینہ دار   تیرے جلووں کی نمائش پر مجھے آتا ہے پیار
حسن میں تو بے بدل ہے عشق میں تو لاجواب   تجھ میں "سینا" کی جوانی تجھ میں "راما" کا شباب
تیری کھیتی کیف ساماں تیرے دریا نوربار   تجھکو بخشی ہے مشیت نے متاعِ زرنگار
تجھ میں ہیں آباد دولت مند بھی نادار بھی   سیم و زر کے ڈھیر بھی ہیں ریگ کے انبار بھی
ایک ہی ساعت میں تو ہے شاد بھی ناشاد بھی   تیرے چہرے سے عیاں ہے داد بھی بیداد بھی
ہے کہیں ہمراہ مزدوروں کے وقفِ مفلسی   ہے کہیں سرمایہ داروں کے لئے وجہ خوشی
عزمِ راسخ بھی ہے تجھ میں شوکتِ دارا بھی ہے   لشکرِ جرّار بھی ہے افسرِ اعلیٰ بھی ہے
اے وطن سب کچھ ہے تجھ میں روحِ آزادی نہیں   کھا رہا ہے تیرے بچّوں کو غلامی کا یقیں

ہورہی ہیں ہندو و مسلم میں خانہ جنگیاں
بُغض کے سینے پہ لہرادے اُخوّت کا نشاں



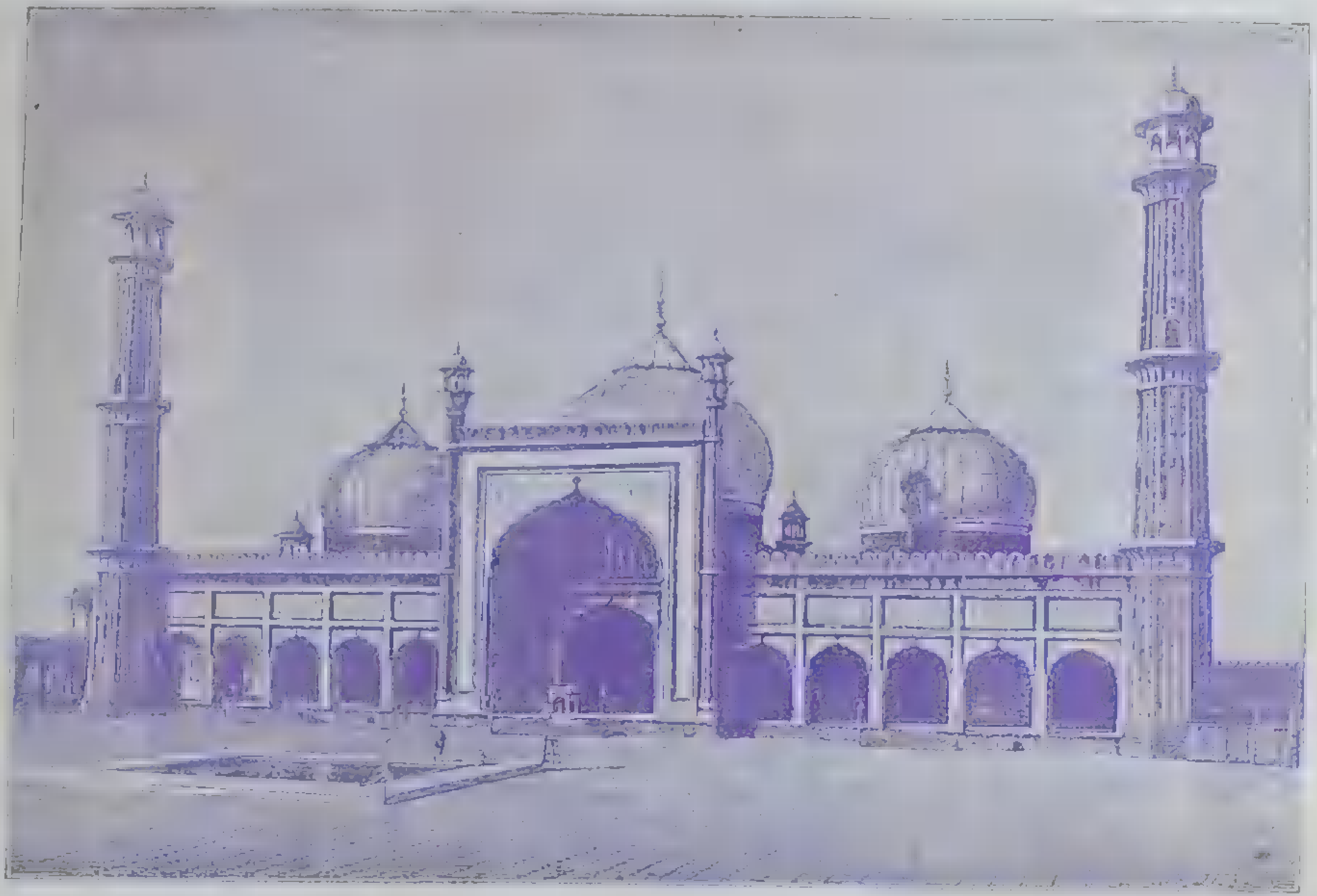
مدینہ منورہ



جامع دمشق کا صحن



قطب صاحب کی لاٹ



جامع مسجد دہلی



تاج محل۔ آگرہ

غور و فکر

(از مولانا ابوالاشرف معز الدین احمد شہودی سہسرامی)

نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "تفکّر ساعةٍ خیر من عبادة سنةٍ" یعنی ایک ساعت کا تفکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ کلام اللہ میں بھی متعدد جگہوں پر تفکر و تدبر کی طرف دعوت دی گئی ہے لیکن جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تفکر کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ اسکا حکم کس چیز میں ہے، اور کس لئے ہے اور اس کا ثمرہ کیا ہے؛ اس وقت تک اس کی فضیلت کا اندازہ لگانا غیر ممکن ہے۔ اگرچہ اس کی تفصیل دشوار ہے، تاہم اسی جگہ اشارہ بقدر استفادہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "ایک گروہ کے لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر مت کرو بلکہ اسکی خلقت پر اور اس کے مصنوعات پر غور کرو۔ اسلئے کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے ہو کہ خدا کو اپنی غور و فکر سے پہچان سکو"۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کے لئے روتے ہوئے جا رہے تھے میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ "آپ تو بیگناہ ہیں پھر آپ کے رونے کا کیا سبب ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "میں کیوں نہ روؤں جبکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ" (آل عمران) یعنی آسمانوں اور زمینوں میں اور رات دن کے بار بار پھر پھر کر آنے میں عقلمندوں کے لئے بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔

ایک بار بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ "یا روح اللہ اس وقت روئے زمین پر آپ کے جیسا کوئی اور شخص بھی ہے یا نہیں؟" تو آپ نے فرمایا کہ "وہ شخص جس کی تمام گفتگو خدا کا ذکر ہو۔ اور جس کی تمام خاموشی فکر ہو۔ اور جس کی ہر نظر عبرت ہو۔ وہ یقیناً مجھ جیسا ہے"

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اپنی آنکھوں کو بھی عبادت میں حصہ دو" لوگوں نے دریافت کیا "کیسے؟" آپ نے فرمایا کہ "قرآن دیکھ کر پڑھو۔ اس پر غور و فکر کرو اور اس کی ہر بات سے عبرت پکڑو"۔

ایک روز حضرت داؤد طفائی چھت پر بیٹھے غور و فکر کر رہے تھے۔ خدا اور خدا کی شان کا تصور کرکے آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہاں تک کہ اسی عالم بے خودی میں چھت سے نیچے گر پڑے۔ ہمسایہ چور سمجھکر دوڑا ہوا آیا۔ لیکن جب قریب آکر اپنے پڑوسی کو زمین پر پڑا دیکھا تو گھبرا کر پوچھا "کیوں، کیا بات ہوئی آپ گر کیوں پڑے؟" یہ سوال سُن کر آپ نے فرمایا "میں کیا بتلاؤں کہ کیسے گر پڑا۔ مجھے کچھ خبر نہیں"،

یہ ہے غور و فکر کی بلند ترین سرحد!

لیکن اب سوال یہ ہے کہ غور و فکر کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں، علم و عقل دو چیزیں اس کے لئے درکار ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ اپنے ہمعصر اور گذشتہ لوگوں کے تجربات و معلومات سے پہلے باخبر ہو اور پھر ان میں اپنی عقل کو کام میں لائے۔ اسی لئے اسلام میں علم کی فضیلت ہے کہ تفکر علم کے بغیر ناممکن ہے۔

انسان جہل و لاعلمی کی تاریکی میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو ایک نور کی ضرورت ہے۔ تاکہ جہل کی اندھیاری سے نکلکر صحیح راستہ تلاش کرے اور یہ سمجھ سکے کہ اس کو کس طرف جانا چاہئے۔ یہی نور ہے جسے دوسرے لفظوں میں تفکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ "خَلَقَ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَةٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَیْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ" یعنی خلقت کی پیدائش تاریکی سے کی گئی اور پھر اس پر نور کی بارش . . . ہوئی جس طرح کوئی شخص تاریکی سے عاجز آچکا ہو اور کسی طرف راستہ نہ پاتا ہو، پھر لوہے کو پتھر سے ٹکرا کر آگ نکالے، اُس آگ سے چراغ روشن کرے اور چراغ جلتے ہی اسکی حالت بدل جائے، راستہ تلاش کرلے اور چل پڑے —— بالکل اسی طرح آہن اور سنگ بمنزلہ علوم کے ہیں۔ جن کے اجتماع سے خداشناسی پیدا ہوتی ہے گویا جس طرح لوہے کو پتھر سے ٹکرانے سے آگ پیدا ہوتی ہے اسی طرح علوم پر غور و فکر کرنے سے خداشناسی کا نور انسان کے دل و دماغ میں بھر جاتا ہے۔

تفکر ہی پر انسان کے عمل کا دار و مدار ہے۔ جب انسان کے دماغ میں ایک بات کی خوبی بیٹھ جائے گی تو پھر قدرتاً اس کا عمل بھی اسی کے مطابق ہونے لگے گا۔ جو لوگ غور و فکر کے عادی ہوتے ہیں وہ یقیناً گناہ سے بچیں گے۔ گناہ وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا کی مخلوق اور قرآن و حدیث پر غور نہیں کرتے۔

اب تفکر کی مختلف صورتیں ہیں۔ انسان اچھی بات پر بھی تفکر کر سکتا ہے اور بُری بات پر بھی۔ خدا اور خدا کی مخلوقات پر بھی غور کر سکتا ہے۔ اور صرف اپنی ذات اور اپنے ہی فائدے کی چیزوں کو بھی سوچ سکتا ہے۔ سو بہترین تفکر تو وہی ہے جس کا سلسلہ خدا تک پہنچتا ہو۔ اور جو آخر کار خدا کے عشق پر جاکر ختم ہو جس کے بعد انسان کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی گنجائش ہی نہ رہے۔ لیکن عشق الٰہی کے اس بلند مرتبہ تک پہنچنے سے پہلے انسان کو اپنے اعمال و افعال کے بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔

انسان کو سوچنا چاہئے کہ فلاں کام یا فلاں صفت خراب ہے یا نہیں۔ اگر خراب ہے تو زیادہ اس میں ہے یا نہیں۔ پس اگر اس کا غور و فکر اُسے یہ بتلائے کہ کوئی خراب صفت اس میں ہے تو پھر یقیناً اُسے چھوڑ دینا چاہئے۔ اس لئے انسان کو لازم ہے کہ روزانہ صبح کو چند منٹ تک کے لئے اپنے گناہوں پر غور کرے اور سوچے کہ اس میں کون کونسے عیب ہیں اور پھر ان سے بچنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ اُسے چاہئے کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان تمام اعضاء کو گناہ سے بچانے کی صورتوں پر غور کرے۔ اس کے بعد اچھی باتوں کا خیال کرے اور ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی صورتوں کو سوچے۔ مثلاً یہ خیال کرے کہ زبان خدا کے ذکر اور مسلمانوں کو راحت پہنچانے کے لئے پیدا کی گئی ہے اسلئے ہم کو چاہئے کہ فلاں بات کہیں تاکہ عام مسلمانوں کا اس سے فائدہ ہو۔ اسی طرح یہ سوچیں کہ آنکھ اس لئے بنائی گئی ہے کہ ہم اُس سے نیکی حاصل کریں اور اس کی صورت یہ ہے کہ کلام اللہ پڑھا جائے۔ دنیا کے اچھے اور برگزیدہ لوگوں کی زیارت کی جائے۔ برے، آزار رساں اور گندہ ضمیر رکھنے والوں کو بنظر حقارت دیکھا جائے وغیرہ وغیرہ

اگر انسان روزانہ چند منٹ کے لئے اس طرح غور و فکر کرنے کی عادت ڈال لے تو وہ یقیناً نیکوں کی صف میں آجائے گا۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک ساعت کا غور و فکر تمام عمر کے لئے گناہوں سے بچا دے سکتا ہے۔ اور یہی مطلب ہے نبی کریمؐ کے اس قول کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ "ایک ساعت کا تفکر یکسالہ عبادت سے بہتر ہے"۔

اگر کوئی شخص غور و فکر کرنے کے بعد اچھی اور بُری باتوں کو . . . . ایک کاغذ پر لکھ لے اور کوشش کرے کہ ایک ایک برائی کو چھوڑ چھوڑ کر ایک ایک بھلائی اختیار کرتا جائے۔ اور جب ایک میں کمال حاصل ہو جائے تو دوسری کو اختیار کرے تو اس طرح کرنے سے یقیناً ایک دن وہ آجائیگا کہ وہ خدا کے اولیا میں شامل ہو جائیگا جن کی شان میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (اولیا اللہ کو نہ کسی بات کا ڈر ہے نہ غم)

آسمان، زمین، ابر، برق، دریا اور پہاڑ وغیرہ عجائبات قدرت خدا کی مصنوعات کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔ اور انہیں کی طرف کلام پاک میں اشارہ ہے "وکاین من اٰیة فی السمٰوٰت والارض یمرون علیها وهم عنها معرضون" اور ایک جگہ ارشاد ہے "اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وما خلق اللّٰه من شیءٍ"، اسی طرح ایک مقام پر بتلایا گیا ہے کہ "اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ" اور ایک موقع پر یوں فرمایا گیا ہے کہ "وفی انفسکم افلا تبصرون"

بنابریں غور و فکر کے لئے کسی دوسری چیز کی تلاش سے پہلے انسان کو چاہئے کہ اپنی ہی تخلیق اور ابتدا پر غور کرے۔ کہ ہم کیا تھے۔ اور کیسے بنائے گئے اور اب کیا ہیں۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان خود عجائبات کا ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز نمونہ ہے۔ اور اس طرح دنیا کی اور دوسری تمام چیزیں ہیں، جو زبان حال سے ہم کو دعوت فکر دیتی رہتی ہیں۔ چنانچہ زمین اور اس کی تمام چیزیں۔ کانیں اور اس کے اندر کی کارآمد اشیاء۔ ہوا، پانی، چشمے، دریا غرضکہ ہر چیز میں ایسی ایسی عجائبات پوشیدہ ہیں کہ اگر سینکڑوں سال بھی ان پر غور کیا جائے تو بھی ان کی حقیقت کما حقہ معلوم نہ ہوگی اور یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ "سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا"، ذرا اپنی غفلت کو تو دیکھو کہ جب تم کسی امیر کے گھر مدعو ہوتے ہو۔ تو وہاں سے واپس آنے پر عرصہ تک مکان کے در و دیوار، چھت پردے، چلمن، نقش و نگار اور سامان آرائش و آسائش کی تعریفیں کرتے رہتے ہو۔ مگر افسوس کہ تم زندگی بھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے عجائب خانہ میں موجود رہتے ہو۔ لیکن اسکی صنعتوں اور کاریگریوں کی طرف سے ایکدم آنکھیں بند کئے ہوئے ہو۔ کم از کم اتنا تو سوچو کہ یہ دنیا خدا کا گھر ہے، زمین اسکا فرش اور آسمان اس کی چھت ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ یہ فرش فضا میں معلق ہے اور چھت بغیر ستون کے قائم ہے۔ ذرا بتلاؤ تو سہی کہ وہ کونسی حکمت ہے جس پر آسمان و زمین کا قیام ہے۔ پہاڑ اس کے خزانے دریا اس کے گنجینے ہیں۔ اس گھر کا چراغ ماہتاب ہے۔ اور دن کی روشنی آفتاب ہے۔ اور تم خود اس مکان کے عجائبات میں سے ایک عجیب اور حیرت انگیز چیز ہو۔ مگر افسوس کہ غفلت نے تمہاری مثال اُس حقیر چیونٹی کی سی کر دی ہے جو کسی بادشاہ کے محلسرا کے سوراخ میں رہتی ہو لیکن اپنے سوراخ، اپنی غذا، اور اپنے ساتھیوں کے علاوہ دوسری تمام چیزوں سے ناواقف ہو۔ محل کی خوبصورتی نوکروں چاکروں کے زرق برق لباس، اور آرائش و زیبائش کی اسے کوئی خبر نہ ہو۔ مگر چیونٹی تو معذور ہے۔

اُسے خدا نے اتنی عقل ہی نہیں دی کہ کچھ سوچ سمجھ سکے لیکن تم کو تو یہ صلاحیت عطا کی گئی ہے، اور تمہارے دل و دماغ میں تو اس کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ اس پر بھی تم اگر غفلت سے کام لو تو صاحبانِ علم و حکمت کی نظروں میں تمہارا وجود اس چیونٹی سے بھی زیادہ ذلیل ہے جو عدم استطاعت کے سبب سے ایک حد تک قابل معافی ہے۔ خبردار ہو جاؤ، غفلت کو چھوڑو دیکھو بوستانِ معرفت کے تمام دروازے آغوش کھولے ہوئے منتظر کھڑے ہیں۔ آؤ۔ اور تماشہ دیکھو۔ غور و فکر میں ڈوب جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کی لذت ابدی حاصل کرو۔ یاد رکھو کہ دولت و ثروت میں تم چاہے کتنا ہی بڑھ جاؤ۔ تدبر مملکت میں چاہے تم ہٹلر اور مسولینی سے بھی سبقت لیجاؤ۔ لیکن اگر تم اس کتب کی ابجد سے واقف نہیں ہو، تو تمہارا شمار صرف عوام ہی میں ہو سکتا ہے اور بس " فاعتبروا یا اولی الابصار "

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ فقط

یادِ ظفر آباد (سرنگا پٹم)

(از محمود خاں محمود (مصنف تاریخ سلطنت خداداد میسور) بنگلور)

اس ظفر آباد میں محمود جب آتا ہوں میں — اک نئے عالم میں اپنے آپ کو پاتا ہوں میں
آہ! دلّی، داغ تھا اُسکے لئے ماتم کناں — میری قسمت میں ظفر آباد تھا شاید نہاں
حسرتوں کی اک نئی دنیا یہاں آباد ہے — مسلمِ ہندی کا یہ اک خانہ برباد ہے
کارواں جاتا رہا پر کارواں کا نقش ہے — ذرہ ذرہ پر حیاتِ کامراں کا نقش ہے
آہ جو ٹوٹے ہوئے باقی در و دیوار ہیں — سطوتِ شاہانِ ماضی کے علمبردار ہیں
ان سے پوچھے کوئی کیا تھا حیدری جاہ و جلال؟ — ان سے پوچھے کوئی کیا تھا ہند کا علم و کمال
طائرِ بامِ حرم کا آشیانہ تھا یہاں — یعنی تہذیبِ حجازی کا خزانہ تھا یہاں
ہاں! یہیں لوٹی گئی ہیں ہند کی آزادیاں — ہاں یہی وہ شہر ہے جس میں ہوئیں غداریاں

آہ۔ اس سنسان ویرانے میں۔ آبادی سے دُور — قبر میں آرام فرما ہے وہ سلطانِ غیور
نوبتِ سلطان ابھی باقی ہے باصد کرّ و فر — کج کلاہوں کے اسی دربار میں جھکتے ہیں سر

بجھ چلی تھی شمع عالمگیر ہندوستان میں — چھا چکی تھی تیرگی اسلام کے ایوان میں
پھر کیا قدرت نے پیدا وہ شہِ عالی صفات — ہند میں جس نے دیا مسلم کو پیغامِ حیات
وہ مجاہد مردِ غازی جس کا ٹیپو نام تھا — جس کی ہیبت سے زمانہ لرزہ براندام تھا
اس کا وہ شوقِ شہادت۔ اسکا وہ ذوقِ جہاد — کربلا کے معرکہ کی جس نے تازہ کی ہے یاد
یک بیک گلشن میں پھر چلنے لگی بادِ خزاں — گردشِ ایام نے لوٹا ہمارا کارواں
حاملانِ عرش بھی چلّا اُٹھے۔ یہ کیا ہوا — خونِ مسلم آب کا ویری سے بھی ارزاں ہوا
حاملِ قرآں ہوئے توحید سے جب بے نیاز — شورِ ناقوسِ کلیسا میں چھپی بانگِ حجاز

گو بظاہر سو رہا ہے وہ شہِ عالی مقام — مسلمِ ہندی کو اب بھی دے رہا ہے یہ پیام
اُٹھ کہ عالم میں نیا ہنگامہ اک پیدا تو کر — آبروئے شیوۂ اہلِ وفا پیدا تو کر
اُٹھ کہ آزادی ہمیشہ شیوۂ اسلام ہے — یعنی جو آزاد ہیں۔ ان کا ہی بس اسلام ہے
گونج اُٹھیں وادیاں پھر نعرۂ تکبیر سے
عقدۂ مشکل کو حل کرنا ہے تدبیر سے

رازِ ارتقا

(از سحبان العصر حضرت آرزو۔ غازی پوری۔ گورکھپور۔ (یو۔پی)

اے کہ خود اپنی حقیقت کا نہیں ہے جوہری — ہے ترے پانی کے ہر قطرہ میں آبِ گوہری
اے کہ اپنا آپ ہے ناآشنائے رازِ بود — اے کہ تیرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے قیصری
اے کہ تیری ہر نگاہِ گرم اک برقِ بلا — اے کہ تیرے بازوئے شل میں ہے زورِ حیدری
انقلابِ دورِ حاضر۔ رہبرِ راہِ نجات — اور۔ تو اب تک ہلاکِ شیوۂ غارتگری
آج دنیا خاک بر سر۔ دشت پیمائے طلب — تو گھروں میں کشتۂ نازِ بتانِ آزری
عاقبت بینی سے بیگانے، عمل سے بے نیاز! — خود نما و خود کش و خود کام و مستِ خود سری
خود سفینہ حلقۂ گرداب میں ڈالے ہوئے — پھونک دینے والے اپنی آپ ہی، شاخیں ہری

ہے نگاہِ اہلِ بینش سے جو تو اُترا ہوا — قعر میں ہے، رہ کے بھی بالائے چرخِ چنبری
پائمالِ غم اگر ہو کر رہا تو کیا رہا! — ہو جو عمرِ خضر بھی کس کام کی ذلت بھری
سُن کہ بیزارِ عمل! کہتا ہوں بات اک راز کی — دل سے سُن لی، تو یہی کر جائے گی جادو گری
"پھونک ہی ڈالی نہ ہو۔ بادِ سموم یاس نے — میرے نخلِ آرزو کی گلفشاں شاخیں ہری"
"ہو چکے ہوں پست، ناکامی سے بڑھتے حوصلے — ق — لاکھ پامالِ فلک ہو کر طبیعت ہو مری"
"ولولوں کی لہر دوڑا کر دلِ مجروح میں — خونِ آبا کی عروقِ خشک میں دیکر تری"
"تازہ تر جانبازیوں کے پی کے جامِ بیخودی — ق — پھر سرِ میداں جو آ جائے۔ تو ہے مردِ جری"
"جنبش پا سے تری۔ کوہِ گراں بھی خاک ہوں — بازوئے شل میں نہاں ہو زورِ دستِ حیدری"
بے خبر! ہے وہ عمل ہی کیمیائے زندگی — ہو کے جس سے رہتی ہے کھوٹی سے کھوٹی بھی کھری
سر فروشانِ طلب کو آستانِ شوق کا — ہے نشانِ جبہ سائی۔ دُرِّ تاجِ قیصری
ہو نہیں سکتا ہے کوئی زندۂ جاویدِ عشق — ہو نہ لے جب تک۔ شہیدِ تیغِ نازِ دلبری
خارزارِ سعی ہیں۔ دیوانگانِ شوق کو — اک نویدِ نیک انجامی ہے۔ آشفتہ سری
ہے اگر فی الاصل علوی آشیاں ہونا تجھے — تُو ہے پرِ پرواز قدسی ہیں، میانِ بے پری
نغمہ ریزِ روح افزا ہو ہر اک سازِ الم
کر رہا ہو آپ دردِ جاں گسل چارہ گری

سوشلزم اور اسلام

(از جناب محمد یونس خالدی)

جس نظریہ کو آج دنیا سوشلزم کے نام سے پکارتی ہے اس کے اصول کو اگر اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو مندرجہ ذیل پانچ اصول ہیں :۔

۱۔ حکومت کا تعلق صرف عوام سے ہے۔ وہ کسی فرد واحد یا خاندان کی ملک نہیں۔

۲۔ تمام اہل ملک ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ کسی کو کسی قسم کا کوئی امتیاز کسی پر نہیں۔

۳۔ حکومت کا خزانہ عوام کی ملک ہے اور عوام جس کو اپنا نمائندہ منتخب کریں وہی اس کے صرف کرنے کا مجاز ہے۔

۴۔ دولت کی تقسیم مساوی ہو اور ہر شخص کی معاشی ضروریات کو فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت پر ہو۔

۵۔ ذاتی ملکیت کوئی چیز نہیں۔

اب آیئے ان اصولوں کا اسلام کی روشنی میں جائزہ لیں :۔

۱۔ سوشلزم کے مذکورہ بالا پہلے اصول کو اسلام بلا کم و کاست تسلیم کرتا ہے ——— چنانچہ اسی اصول کی بنا پر نبی کریمؐ کی وفات کے بعد آپ کے داماد یعنی جناب علیؓ کو آپ کا جانشین نہیں بنایا گیا بلکہ عوام کی رائے کے مطابق جناب ابوبکرؓ کو یہ منصب سپرد کیا گیا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد بھی یہی عمل ہوا یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ کے بعد آپ کے خاندان کے کسی فرد کو جانشین بنایا جائے بلکہ جناب عمر فاروقؓ کو اس مسند پر بٹھایا گیا۔ عمر فاروقؓ کے بعد عثمان غنیؓ کو یہ عہدہ ملا جن کو جناب عمرؓ سے کوئی خاندانی تعلق نہ تھا۔

اس زمانہ میں ایک گروہ ایسا ضرور پیدا ہوا جس نے خلافت و جانشینی کے اس منصب کو صرف آل نبی میں محدود کر دینے کا آوازہ بلند کیا اور جناب علیؓ ہی کو رسولؐ کا داماد ہونے کی وجہ سے جانشینی کا مستحق قرار دیا لیکن اس گروہ کی اس آواز پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے مطلق توجہ نہ کی یہی مختصر سا گروہ بعد میں شیعہ کے نام سے مشہور رہا لیکن اس گروہ کے افراد کی تعداد دنیائے اسلام میں پانچ چھ فیصدی سے زیادہ نہ ہوگی اور اس لئے جہاں تک عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنے کا سوال ہے، اس گروہ کا عقیدہ ہماری بحث سے خارج ہے۔

۲۔ سوشلزم کا مذکورہ بالا دوسرا اصول بھی اسلام ہی کا اصول ہے۔ اسلام میں "تمام اہل ملک مراتب حقوق اور فوائد ملک میں مساوی ہیں۔ درحقیقت یہ اسلام کی واضح ترین خصوصیت ہے کہ اس کی نظر میں آقا اور غلام، معزز اور حقیر، چھوٹا اور بڑا، امیر اور فقیر سب برابر ہیں صہیبؓ و بلالؓ جو آزاد شدہ غلام تھے، سرداران قریش کے پہلو بہ پہلو ان کا نام ہے۔" (ابوالکلام)

خلیفۂ ثانی جناب عمرؓ کے خلاف ایک معمولی شخص ابی ابن کعب نے یزید بن ثابت کی عدالت میں ایک شکایت پیش کی۔ یزید بن ثابت نے عمر فاروقؓ کو طلب کیا۔ عمر فاروقؓ حاضر ہوئے۔ خلیفہ کو آتا دیکھ کر یزید ابن ثابت تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر خلیفۂ اسلام نے برہمی کے ساتھ فرمایا۔ "ابن ثابت! میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔ میں اپنے لئے کوئی امتیاز نہیں چاہتا۔"

جناب ابوبکرؓ نے خلافت کی مسند پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلی جو تقریر کی تھی اس کے بعض فقرے یہ ہیں :۔

"لوگو میں تمہارا امیر بنایا گیا ہوں۔ لیکن میں تم سے افضل نہیں ہوں۔"

میں صرف نبی کریمؐ کی پیروی کرونگا۔ کوئی نئی بات اپنی طرف سے کرنے کا ہرگز مجاز نہ ہوگا۔ اگر میں اپنے اس عہد پر قائم نہ رہوں تو تم میری مدد کرنا۔ اگر پھر بھی میں ٹھیک نہ ہوں تو تم مجھے سختی کے ساتھ ٹھیک کرنا۔

(طبقات ابن سعد)

اسی طرح جناب عمرؓ نے خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں ارشاد کیا :۔

"میں بھی تمہاری طرح تم میں کا ایک انسان ہوں۔ بالکل تمہارے برابر۔ میرا یہ منشا نہیں ہے کہ میں جو چاہوں تم سے منواؤں۔" (کتاب الخراج مصنفہ قاضی ابو یوسفؒ)

ایک صحابی معاذ ابن جبل نے قیصر روم کے سامنے اسلام کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی :۔

"ہمارا خلیفہ ہم میں کا ایک فرد ہے۔ جب تک وہ ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر کے طریقہ کی پیروی کریگا ہم اس کو اپنا خلیفہ باقی رکھیں گے۔ لیکن اگر وہ چوری کرے تو ہم اس کو وہی سزا دیں جو دوسرے چوروں کو دی جاتی ہے یعنی اس کا ہاتھ کاٹ ڈالیں۔ اگر وہ زنا کرے تو اُسے سنگسار کر دیں، اگر وہ ہم میں سے کسی کو گالی دے تو دوسرا بھی برابر کی گالی دے، اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو دوسرا بھی اُسے زخمی کرے۔ وہ ہم سے چھپکر عالیشان محلوں میں نہیں بیٹھ سکتا۔ نہ وہ ہم پر رعب جما سکتا ہے نہ ہمیں اپنی شان دکھا سکتا ہے۔ وہ ہم میں کے ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے اور بس"

(تاریخ واقدی)

چنانچہ جب امیر معاویہؓ کے مقرر کئے ہوئے ایک گورنر نے مدینہ میں تقریر کرتے ہوئے امیر معاویہؓ کے بیٹے یزید کی خلافت کا اعلان کیا تو اسی وقت ایک مسلمان بپھر کر کھڑا ہوا اور چلا کر کہنے لگا :۔

"تم جھوٹے ہو۔ اسلام اس مطلق العنانی، استبداد اور وراثت کو روا نہیں رکھتا۔ یوں کہو کہ ایران و روم کے بادشاہوں کی طرح تم نے یزید کو بادشاہ بنایا ہے۔ اسلام کے اصول کے مطابق وہ ہرگز بادشاہ نہیں ہے"

۳۔ سوشلزم کا تیسرا اصول حکومت کے خزانہ سے متعلق ہے۔ اسکے بارے میں اسلام جو کچھ کہتا ہے اُسے خلیفۂ ثانی کی ایک تقریر کے ان لفظوں میں سنئے۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"میں خود بتلاتا ہوں کہ حکومت کے خزانہ سے مجھے کتنا لینا جائز ہے۔ سال میں دو جوڑے کپڑے، ایک جاڑے کے لئے اور ایک گرمی کے لئے۔ ایک سواری جس پر حج کیلئے جا سکوں۔ اور ملک کے ایک معمولی آدمی کے لائق گذر بسر کا خرچ جس سے میں اور میرے بیوی بچوں کی کفالت ہو سکے۔ میں ادنیٰ مسلمان ہوں، جو تمہارا حال ہے وہی میرا حال۔"

(طبقات ابن سعد)

چنانچہ جب تک اسلام کے اصول کے مطابق حکومت کی گئی خزانہ کا روپیہ عوام میں برابر تقسیم ہوتا رہا۔ عرب کے ہر بسنے والے کو وظیفہ دیا جاتا تھا اور بیت المال کے حساب کے متعلق ہر شخص سوال کرنے کا مجاز تھا۔

۴۔ سوشلزم کے چوتھے اصول کو بھی اسلام معقولیت کی حد تک تسلیم کرتا ہے البتہ مقدار مساوات تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہر شخص کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ عزت و بلندی کے بڑے سے بڑے مرتبہ تک پہنچ سکے لیکن یہ نہیں کرتا کہ عقل و علم یا اخلاق و دیانت کے شرف کو نظر انداز کر کے خط مراتب کو مٹا دے۔ اچھے برے کا امتیاز اسلام میں ضرور ہے لیکن برے آدمی کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو اچھا بنا کر اچھوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پیدا کر سکے۔ بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ہر شخص کے سامنے زندگی کا ایک اعلیٰ نمونہ (آئیڈیل) رکھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جو شخص اس نمونہ پر پورا اُترے گا وہی بہترین شخص ہے۔ ہندوستان کے آریوں کی طرح اس نے یہ روک نہیں لگائی کہ فلاں کام کو صرف فلاں ذات ہی کے لوگ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی پادریوں کی طرح اس نے عابدوں زاہدوں کا کوئی "نسلی گروہ" بھی نہیں بنایا۔ بلکہ ہر شخص کو اسکی کوششوں کا پھل دینے کا اعلان کیا اور پکار کر یہ اعلان کر دیا کہ شرف و بزرگی کا معیار دولت، نسل یا نسب پر نہیں بلکہ صرف اخلاق کی بہتری، اعمال کی عمدگی اور انسانیت کے کمال پر ہے ——— "تم میں امتیاز صرف اسی کو ہے جو متقی ہے" (یعنی جو برائیوں سے بچے اور نیکیوں کو اختیار کرے) (قرآن)

۵۔ اب آپ سوشلزم کے پانچویں اور آخری اصول کو لیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے قبضہ میں کچھ نہیں رکھ سکتا۔ سب کچھ حکومت کا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کمائے گا اُسے حکومت لے لیگی۔ البتہ اسکی گذر بسر کے لائق حکومت کی طرف سے اسے روزینہ ملتا رہے گا۔ اسلام اس اصول کو یقیناً تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک ذاتی ملک جائز ہے لیکن اس ملک پر زکوٰۃ اور خیرات و صدقات کے اتنے دباؤ ڈال دیئے گئے ہیں کہ کوئی شخص قرآن کی زبان میں "قناطیر مقنطرہ" یعنی دولت کے ڈھیر لگا کر نہیں بیٹھ سکتا۔

غور کیجئے کہ اگر آپ ذاتی ملکیت کو بالکل اڑا دیں تو پھر انسان کے لئے سعی و عمل میں کونسی لذت، کونسی کشش اور کونسی مٹھاس باقی رہ جاتی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اسے کھانے پینے کے لئے جو روزینہ ملتا ہے اس میں نہ کبھی زیادتی ہو سکتی ہے نہ کمی، پھر وہ کیوں فضول اپنا سر کھپائے۔ آپ کہینگے کہ سوشلسٹ اسٹیٹ میں ہر شخص کام کرنے پر مجبور ہے۔ میں مانتا ہوں، مگر یہ کام بس مشین کا سا کام ہوگا، کام کرنے والے میں ذاتی امنگ، جوش اور جذبہ نہ ہوگا۔ اسی لئے اسلام نے ذاتی ملکیت کو بالکل اڑایا نہیں۔

البتہ اسے کم سے کم کرنے پر زور دیا ہے اور یہی بہترین اصول ہے۔ ان تمام حقائق کو دیکھنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ "سوشلزم جس قسم کی مساوات مبنی کرتا ہے وہ بالکل غیر فطری ہے۔ کیونکہ دنیا کا وجود کشمکش پر قایم ہو، پھر غیر فطری مساوات کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ آج دنیا میں سوشلزم اور اشتراکیت کے اصول پھیلائے جا رہے ہیں اور دنیا بھی ایک اصول کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن اگر آج ساری دنیا اسلامی اصول اختیار کر لے تو سوشلزم کی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ صرف اسلامی اصول ہی دنیا کی پیاس اور تشنگی کو بُجھا سکتے ہیں!

اشتراکیت

(از جناب عبدالرحمٰن طارق بی اے)

دنیا کی شش جہات میں ہلچل سی ڈالدی
رشیا نے پیدا کر کے یہ تقسیم کا سوال

اقوامِ ایشیا کو تن آسان دیکھ کر
پھیلا دیا ہے اس نے تعطّل کا ایک جال

جوشِ عمل کے حق میں ہے یہ مرگِ ناگہاں
دریا کی مرگ جیسے سمندر کا ہے وصال

سچ بات عرض کرتا ہوں ملت کے سامنے
محسوس ہو نہ اہلِ سیاست کو گر ملال

یہ نظم و نسق مقصدِ فطرت سے ہے بعید
حجت نہیں ہے صرف یہاں عیش کا خیال

میں تو یہ جانتا ہوں، دو حرفوں کی بات ہے،
انجم کی ضو سے چاند کو ہوتا نہیں زوال

افراد میں جو چاہ ہو الفت ہو درد ہو
پھر قومیت کے چرخ پہ چھاتا ہے کیا جمال!

چشمے کی طرح فیض ہو جاری جو دہر میں
ہو جائے باغِ امّتِ احمدؐ بس نہال

خورشید کی ضیا سے منور ہے اک جہاں
پھر اُس کی شان و آن میں آتا نہیں زوال

پس جاہ و حشم والے جو ہمدرد ہوں ذرا
مزدور کا ذلیل و زبوں ہو نہ جائے حال

یوروپ کا مستبد بھی نہیں سامری سے کم
شیروں کے دل میں ڈالدی محکومی شغال

کیا قہر ہے کہ مستی زر میں یہ سود خوار
سمجھے ہے خوں سی کھیلنا ہولی کا اب حلال

اس چیز سے ہے شاہ کے ایواں میں کھلبلی
یہ چیز ہی غریب کو دیتی ہے اشتعال

جب دیکھتا ہوں آج تفاوت ہوس کی میں
ماتھے سے میرے بہتا ہے بس عرقِ انفعال

سرمایہ دارو! ہوش میں آؤ صلح کرو
پھر تھم سکے گا تم سے نہ مزدور کا جلال

الفت کے چھینٹوں سے اسے کر دو ابھی خموش
پھر بجھ سکے یہ شعلہ بھلا کس کی ہے مجال

چیونٹی بھی مار دیتی ہے ہاتھی کو بعض وقت
تاریخ ہے فرانس کی دعوے پہ میرے دال

انسانیت کا درد ہی نقشِ دوام ہے
امدادِ باہمی ہی سے فطرت کا ہے کمال

حفظِ حقوق کے لئے اخلاص ہے ضرور
فتنوں کا ورنہ ہو نہیں سکتا ہے انفصال

یوروپ بھی خودکشی کو ہے خنجر اٹھا رہا
اپنے عمل کا پڑ گیا خود جان پر وبال

قوموں کو ہے جو امن و دنغاوں کی جستجو
قرآں سے عمدہ ضابطہ ملتا ہے اب محال

العفو ہی ہے تیرے مصائب کا ایک حل
گمراہ و تیرہ عقل کی رہنے دے قیل و قال

مسلم! خدا کے واسطے فرقوں کو توڑ دے
پابند ہو زکوٰۃ کا، سوچ اپنا کچھ مآل

ایثار و صدق و راست روی کر لے اختیار
تیری جبین چمکے گی خورشید کی مثال!

افسانۂ دل

(از حضرت باسط بھوپالی)

ان کا ہر بارِ کرم کہنے کے قابل ہو گیا
دل حقیقت میں جہاں ٹوٹا وہیں دل ہو گیا

نامکمل زندگی کے کچھ مکمل حادثات
جب مرتّب ہو گئے افسانۂ دل ہو گیا

میں نے جو پردہ اٹھایا تمکو دیکھا سامنے
تم نے جس دل پر نظر ڈالی مرا دل ہو گیا

بارہا دیکھا ہے دل نے او مری محشر خرام
حشر اٹھا اور ترے قدموں میں شامل ہو گیا

دل جہاں اُچھلا فضائے دوجہاں پر چھا گیا
عرصۂ کونین جب سمٹا مرا دل ہو گیا

بے خبر رہنا ہی اچھا اس جہانِ غیر میں
مٹ گیا جو واقفِ آدابِ محفل ہو گیا

جو نگاہِ شوق اُٹھی حسن بنکر رہ گئی
جو قدم ہم نے اٹھایا نقشِ منزل ہو گیا

یا کبھی منزل تھی مقصودِ مذاقِ جستجو
یا مذاقِ جستجو مقصودِ منزل ہو گیا

ہائے باسطؔ یہ مرے خونِ تمنا کا اثر
اور بھی رنگین کچھ دامانِ قاتل ہو گیا

برقِ حسن

(از حضرت باسط بھوپالی)

شوق کو بے ادب کیا عشق کو حوصلہ دیا
عذرِ نگاہِ دوست نے جرمِ نظر سکھا دیا

جان کو درد کر دیا درد کو دل بنا دیا
ضبط کے اہتمام نے اور سکوں مٹا دیا

ان کے تصورات نے عشق کو جگمگا دیا
آئی تھی شامِ غم مگر میں نے سحر بنا دیا

یہ تو گلہ نہیں کہ کیوں پردۂ رُخ اٹھا دیا
تم نے تو ہر نگاہ کو میری نظر بنا دیا

شوقِ جنوں اثر دیا دردِ طرب فزا دیا
جس کو تری نگاہ نے مار دیا جلا دیا

آہ وہ بدنصیب آہ نالۂ عندلیب آہ
میرا فسانۂ الم جیسے مجھے سُنا دیا

ٹوٹ سکا نہ پستئ فکر و نظر کا سلسلہ
دام و قفس کو ہم نے خود دام و قفس بنا دیا

میرے مذاقِ دید کی شرم اسی کے ہاتھ ہے
جس نے شعاعِ حسن کو حسنِ نظر بنا دیا

ناز و نیاز آشنا، لطفِ تغافل اعتبار
ہائے کس اہتمام سے تم نے مجھے مٹا دیا

خوب علاج کر دیا اپنے مریضِ عشق کا
درد مٹانے آئے تھے درد دیا مٹا دیا

ایک خمارِ تشنگی لاکھ سرور و سرخوشی
ذوقِ نگاہ کے نثار مجھ سے مجھے بُھلا دیا

ہائے وہ حسن و عشق جب باسطؔ بیقرار کو
برقِ نگاہِ دوست نے پھونکدیا جلا دیا

اردو اخبار نویسی

(از ص - ع)

اردو اخبار نویسی کی ابتدا کب سے ہوئی، سب سے پہلا اردو اخبار کس نے نکالا، اس کے بعد اس فن میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، اس پر کیا کیا دور گذرے، کن لوگوں نے اس کی ترقی میں حصہ لیا اور کن لوگوں نے اس کو نقصان پہنچایا؟ یہ اور اسی قسم کے بہت سے وہ سوالات جن کا تعلق اردو اخبار نویسی کی تاریخ سے ہے میرے اس مقالہ کا موضوع نہیں ہیں۔ اردو اخبار نویسی کی تاریخ پر اس سے قبل کسی نہ کسی حد تک لکھا جا چکا ہے میں اسے یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف اس مقالہ کا موضوع موجودہ اخبار نویسی پر ایک سرسری ناقدانہ نظر ڈالنا ہے اور حقیقت میں یہی کام ذرا مشکل ہے۔ کئی سو برس پہلے کی پرانی ہڈیاں اکھاڑ کر ان کے رنگ روپ پر بحث و تمحیص کرنا، ان کو ایک خاص سلسلہ میں منسلک کرنا، اُن کو کسی خاص ترتیب کے ماتحت لانا اور اُن پر لمبے چوڑے مضمون لکھنا بہت آسان کام ہے۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ "جب کوئی واقعہ ہو چکتا ہے تو پھر ہر شخص عقلمند بنکر اس پر تبصرے کیا کرتا ہے" حقیقت یہ ہے کہ کسی واقعہ کے صدور پذیر ہو جانے کے بعد یہ معلوم کرنا بہت آسان ہوتا ہے کہ اسکی کونسی چیز اچھی تھی اور کونسی بُری۔ اُس وقت چونکہ تمام اسباب سامنے ہوتے ہیں اور اُن اسباب کے نتائج بھی پیش نظر ہوتے ہیں اس لئے دماغ کو زیادہ کُریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس وقت بڑی آسانی سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اگر یوں ہوتا تو یوں ہوتا اور اگر یوں نہ ہوتا تو یوں نہ ہوتا" لیکن واقعہ کے وقوع سے پہلے یا عین اس کے وقوع کے وقت ایسا کہنا ہمارے دماغ کی کافی مزاج پرسی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نازک موقعہ پر رائے زنی کرنے کے لئے جرأت وہمت کی بھی ضرورت ہے۔ کسی شخص کی رائے سے اختلاف کرنا اور پھر اس پر ڈٹے رہنا ہر آدمی کا کام نہیں۔ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے اس مقالہ کا موضوع جتنا اہم اور نازک ہے اُسے آپ جان سکتے ہیں صحافت کی تاریخ لکھنا اور پرانے صحافیوں پر تبصرہ کرنا ایک عالمانہ کام ضرور ہے لیکن جتنا عالمانہ ہے اتنا مشکل نہیں۔ آپ جس کو جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔ کوئی غریب قبر سے اُٹھ کر آپ سے اُلجھنے تھوڑی آئیگا۔ لیکن موجودہ صحافیوں کے بارے میں لب کھولنا آسان کام نہیں۔ بہرحال اس طرح میں اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف موضوع کی اہمیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔

کہتے ہیں کہ اُردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۳۶ء میں پروفیسر محمد حسین آزاد مرحوم کے والد نے نکالا تھا۔ اس اعتبار سے اردو اخبار نویسی پر ایک صدی سے زیادہ گذر گئی لیکن شروع شروع میں اردو اخبارات کا رنگ آجکل . . . . کے اخبارات سے بالکل مختلف تھا۔ اخبارات تو قوم کی ذہنیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ قوم جس قسم کے خیالات و افکار کو پسند کرتی ہے۔ اخبارات ان ہی کا عکس ہوتی ہیں۔ اسی لئے انیسویں صدی کے اخبارات میں سیاسی رنگ بہت کم بلکہ مفقود سا ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کے عوام شخصی حکومت کے علاوہ اور کسی حکومت کے تصور ہی سے ناآشنا تھے، اسلام نے جمہوریت کی جو شاندار بنیاد ڈالی تھی اسے تو امیر معاویہ نے (خدا ان پر رحم کرے) پہلی صدی ہجری کے نصف آخر ہی میں متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ اور اس لئے جب سے اسلامی دور حکومت کا پایہ تخت مدینہ سے اُٹھ کر دمشق و بغداد پہنچا تو دنیا پھر یہی سمجھنے لگی کہ حکومت صرف ایک شخص کی ذاتی جائداد ہے، عام لوگوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ جیسے آزاد منش بزرگ تک ایک جگہ فرماتے ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمے کنی
منت شناز ازو کہ بخدمتِ گذاشتت

یعنی اگر تو بادشاہ کی خدمت گذاری پر مامور کر دیا گیا ہے تو یہ کوئی تیرا احسان نہیں، بلکہ یہ تو الٹا بادشاہ ہی کا احسان ہے کہ اس نے تجھے اپنی خدمت کے قابل سمجھا۔ اسی بنیاد پر حافظ شیرازیؒ نے عام لوگوں کو سیاسی امور میں گفتگو کرنے سے ان الفاظ میں روکا ہے۔

رموز مصلحتِ ملک خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ہائے! کیسا مایوسانہ انداز ہے۔ صدیوں کی مطلق العنانی نے ہماری خودداری و خود اعتمادی کو اس طرح کچل کر رکھدیا تھا کہ حافظ جیسا خوددار بزرگ بھی جب سیاسی مسائل کا تصور کرتا ہے تو اسکے منہ سے بے ساختہ یہی نکلتا ہے کہ "ان باتوں سے تجھے کیا سروکار، یہ تو بادشاہوں کے کام ہیں تو ایک گوشہ نشین فقیر ہے اس لئے سیاسی مسائل پر گفتگو کرنا تیرے لئے روا نہیں ہوسکتا"

پھر ہندوستان میں جمہوریت کے نظریوں سے ہندو تو انیسویں صدی کے اوائل بلکہ اٹھارویں صدی کے اواخر ہی سے آشنا ہو چلے تھے۔ بنگال اور مدراس میں بہت پہلے سے ہندوؤں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ عیسائی مشنری بھی ہندوؤں ہی کو "زرخیز زمین" سمجھکر اُن کی طرف زیادہ متوجہ ہونے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمان کے پاس تو خود ایک مکمل مذہب اور شاندار روایات ہیں اسلئے اس کو عیسائیت کی طرف مائل کرنا کارے دارد ہے۔ لیکن ہندو بیچارہ، صدیوں کا مارا، آریوں اور برہمنوں کا ستایا، بہت جلد عیسائیت کے ریوڑ میں داخل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر کے بموجب ہندوؤں میں عیسائی تبلیغی مشنریوں نے بہت کام کیا۔ ان کو انگریزی پڑھائی اور یورپ کے خیالات سے روشناس کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر ہندو ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ تعداد اتنی بڑھی کہ رام موہن رائے کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تھوڑے دنوں میں ساری ہندوستان کے ہندو عیسائی ہو جائیں اس لئے انھوں نے برہمو سماج کے نام سے ایک نیا مذہب قائم کیا جس کی بنیاد تو ہندو مذہب کی روایات پر رکھی لیکن اس میں سے اُن غیر معقول مراسم و قیود کو نکال دیا جن سے اُکتا اُکتا کر لوگ عیسائیت کی طرف جا رہے تھے

بہرحال اس وقت تو مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہندو تو بہت پہلے سے کسی نہ کسی حد تک جمہوریت کے تصور سے روشناس ہو گئے تھے۔ انقلاب فرانس یا روسو اور والٹیر کو ان کے بہت سے افراد جاننے لگے تھے لیکن مسلمان انیسویں صدی کی آخری چوتھائی تک انگریزی سے نفرت کرتے رہے اور ہونا بھی یونہی چاہئے تھا۔ ہندو کی ہندوستان میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ نہ فارسی عربی اس کے گھر کی زبانیں تھیں اور نہ انگریزی۔ وہ فارسی عربی کو صرف عزت ووجاہت کا وسیلہ سمجھکر پڑھتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اب فارسی وعربی کا چراغ ماند ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ انگریزی لے رہی ہے تو قدرتاً اس نے بھی اسی سے رشتہ جوڑ لیا۔ مگر مسلمان کی صورت حال اس سے بالکل الگ تھی۔ فارسی عربی اس کی اپنی زبانیں تھیں، ان میں جو علوم تھے ان کو وہ اپنے علوم سمجھتا تھا۔ اس لئے مسلمان کے واسطے ان زبانوں سے بے تعلق ہو کر انگریزیت کی طرف مائل ہونا بڑا کٹھن کام تھا۔ علاوہ ازیں ابھی حکومت کا نشہ بھی اس کے دماغ سے نہ اترا تھا۔ اودھ اور دہلی کی حکومتیں غدر سے کچھ پہلے تک باقی رہیں۔ پھر چاہے وہ کتنی ہی کمزور تھیں مگر تھیں تو آخر حکومتیں ہی۔ اسلئے مسلمان کے لئے ان تمام تصورات وخیالات سے بیگانہ ہو کر انگریزی علوم وفنون کی طرف جھک پڑنا انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے علماء نے انیسویں صدی کے آخر تک انگریزی پڑھنے کو حرام قرار دیا۔ اور بعض بعض تو آج تک اسی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ لیکن بہر نوع زمانہ کی رفتار کا مقابلہ مسلمان کب تک کر سکتے تھے۔ آخر انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ انگریزی حکومت کا آفتاب جلال نصف النہار پر تھا۔ وکٹوریہ جیسی طمطراق والی ملکہ کا زمانہ تھا، چار دانگ عالم میں انگریزی حکومت کا ڈنکہ بج رہا تھا، ان حالات میں بیچارے ہندوستانی مسلمان کب تک اکڑ کر بیٹھ سکتے تھے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے۔ مگر چونکہ انگریزی علوم کی طرف توجہ بہت دیر میں ہوئی تھی اسلئے نئے خیالات کو دماغوں میں جگہ پکڑنے کے لئے کافی زمانہ چاہئے تھا۔ آدمی جب اندھیرے سے نکلکر ایکدم دھوپ میں جاتا ہے یا دھوپ سے نکلکر ایکدم سایہ میں آتا ہے تو کچھ دیر تک اُسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب انھوں نے انگریزی میں علوم وفنون پڑھنا شروع کئے تو جمہوریت، دستوریت، اشتراکیت پارلیمنٹ وغیرہ وغیرہ مسائل کو معلوم کر کے وہ ہکے بکے رہ گئے۔ یورپ کی حکمرانی کا جگمگاتا ہوا آفتاب، جگمگاتی ہوئی کتابیں، جگمگاتے ہوئے پروفیسر اور جگمگاتی ہوئی یونیورسٹیاں ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں ـــــــــ غور کیجئے کہ اس جگمگ جگمگ کے سامنے اُن غریب طالب علموں کی نظریں کیا ٹھیر سکتی تھیں جو ابھی ابھی اس ہال میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ مسلمان آنکھیں بند کر کے والہانہ ومجنونانہ انداز میں یورپ کی تعریفوں کے راگ گانے لگے۔ وہ خود کو بیحد حقیر وفرومایہ سمجھکر صاف صاف یہ کہنے لگے کہ حکومت کا طرہ تو کچھ یورپ ہی کے سر پر زیب دیتا ہے۔ کسی "حقیر فقیر، سراپا تقصیر شیخ بدر منیر" کے بس کا یہ کام نہیں۔

مسلمان بیچارہ شخصی حکومت کا ستایا ہوا تو تھا ہی۔ شروع شروع میں جب آقا بدلا تو وہ ذرا بپھرا، ۱۸۵۷ء میں اس کا یہ بپھرا رنگ بھی لایا مگر آخر کار جب اس نے دیکھ لیا کہ اب بہادر شاہ کی جگہ ملکہ وکٹوریہ آ ہی گئیں تو اس نے نیاز مندی کے ساتھ بہادر شاہ کے بجائے وکٹوریہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ نیازمندی تو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اب تک دہلی دربار کی طرف منہ کر کے قصیدے پڑھتا تھا، اب اس نے زمانہ کو پلٹا ہوا دیکھا تو لندن کی طرف منہ کر لیا۔ چنانچہ آج یہ دیکھ کر حیرت

ہوتی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے خوددار باعزت بزرگوں نے گورنر، لفٹنٹ گورنر اور ملکہ معظمہ کی شان میں بڑے مزے لے لیکر قصیدے کہے ہیں۔ لیکن آخر اس زمانہ کو بھی ختم ہونا تھا۔ آہستہ آہستہ مسلمان کی نظریں بھی تنقیدی رنگ اختیار کرنے لگیں۔ لیکن چونکہ وہ یورپ کی نمائش گاہ میں بہت دیر کر کے داخل ہوا تھا اس لئے اپنے پیشرو ہندوؤں کے مقابلہ میں اس کا تنقیدی رنگ آج تک ہلکا ہے۔ ہندو پر تخریب و تنقید کے دونوں زمانے گذر چکے۔ اب وہ "تعمیر آشیانہ" کی طرف متوجہ ہے جس کے لئے وہ مشرق و مغرب دونوں جگہ سے تنکے چن رہا ہے۔ ہر تنکے کی نوعیت کو خوب سمجھ چکا ہے اور خوب اچھی طرح جانتا ہے کونسا تنکا کیسا ہے، کیا کام دیتا ہے اور کہاں ملے گا۔ لیکن مسلمان ابھی تک تخریب سے نکل کر بمشکل تنقید کے میدان میں آیا ہے "تعمیر آشیانہ" کی منزل تو ابھی کوسوں دور ہے۔ ابھی تک وہ یہی طے نہ کر سکا کہ جمہوریت اچھی ہے یا بری۔ سوشلزم کے اصول اپنانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اور قومیت و وطنیت کو سراہنا چاہئے یا کوسنا۔

اس سیاسی ماحول میں اردو اخبارات کا جو رنگ ہونا چاہئے وہ ظاہر ہے۔ بدنصیبی سے چونکہ ہندو نے اردو کو چھوڑ دیا اور مسلمان کے ہاتھ میں اس کی جان حزیں کا رشتہ دیکر خود ہندی ساہتیہ سمیلن میں چلا گیا، اس لئے ہندو کے خیالات سے اردو صحافت کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہ پہنچ سکا۔ اب ہندو یا تو انگریزی میں لکھتا ہے یا ہندی میں۔ ڈاکٹر بھگوان داس کی طرح کہ یا تو آپ انہیں بنارس کے "آج" میں دیوناگری پنڈال کے اندر بیٹھا دیکھیں گے اور یا "ہندوستان ٹائمز" کے انگریزی صوفوں پر محو سخن پائیںگے۔ انقلاب، زمیندار یا مدینہ پڑھنے والے تو ان کے نام سے بھی آشنا نہیں۔

غرض ان سیاسی حالات کو سامنے رکھ کر اب آپ اپنے اخبارات کی "صف بندی" آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ یعنی:۔

۱۔ ایک تو وہ اخبار جن پر ہمارے لیڈروں کی طرح ابھی تک انگریزی حکومت کا رعب چھایا ہوا ہے اور جو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کہ اگر کچھ مل سکتا ہے تو انگریز کی خوشامد ہی سے مل سکتا ہے۔ اس صف کا سب سے بڑا امام لاہور کا "انقلاب" ہے۔

۲۔ دوسرے وہ جو ذرا اس منزل سے آگے ہیں۔ مگر پھر بھی زیادہ دور جاتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے۔ اس صف کی امامت کے لئے ہم لاہور کے "احسان" کو منتخب کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرے وہ جو بہت آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن چونکہ قوم ان کے پیچھے نہیں اسلئے صرف چند ساتھیوں کے ساتھ سنسان بیابانوں میں اکیلے گھوم رہے ہیں۔ اس طبقہ میں آپ کلکتہ کے "ہند"، میرٹھ کے "کرتی لہر" یا لکھنو کے "ہندوستان" جیسے اخبارات کو شامل کر لیجئے۔

۴۔ چوتھا طبقہ ان اخبارات کا ہے جن کے ارباب کار کا مقصد اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ یہ اخبارات ہر مسئلہ کو صرف اپنی لیڈری کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ لیڈری کی آنکھ کے علاوہ اور کوئی آنکھ ان کے پاس نہیں ہوتی۔ اس نوع کے اخبارات میں مولانا ظفر علی خاں کا زمیندار، مولانا مظہر الدین مرحوم کا الامان، علی بہادر خاں کا ہلال (بمبئی)، اور کسی حد تک مولانا احمد سعید کا انصاری داخل ہیں۔

۵۔ پانچواں طبقہ وہ ہے جس میں ہم صرف "الجمعیۃ" جیسے اخبارات کو رکھ سکتے ہیں۔ یہ قسم چوتھی قسم کے قریب قریب ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی قسم کے اخبارات صرف کسی ایک کو "حضرت مولانا" لکھتے ہیں اور اس دوسری قسم کے اخبارات کے لئے چند لیڈروں کے مجموعہ کو سراہنا پڑتا ہے۔

۶۔ اور ایک چھٹی قسم وہ ہے جس میں صرف نام پیدا کرنے یا بیروزگاری سے تنگ آکر کچھ پیسے کمانے کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے اخبارات کے نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ ہمارے ۸۰ بلکہ ۹۰ فیصدی اخبارات اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

۷۔ ساتویں اور آخری طبقہ میں ہندو اخبارات کو رکھ لیجئے جن میں بھائی پرمانند کے کٹر مہاسبھائی پرچہ "ہندو" (لاہور) کے علاوہ پرتاپ، ملاپ، ویر بھارت، تیج وغیرہ داخل ہیں جو اگرچہ قوم پروری اور کانگریس نوازی کا دم بھرتے ہیں لیکن ڈھلکتے مہاسبھائیت ہی کی طرف ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ میں نے اخبارات کی اتنی بہت ساری قسمیں کر ڈالیں لیکن ان میں سے کوئی ایک قسم بھی ایسی نہیں جس میں معقول قسم کا اخبار داخل ہو۔ جس میں سنجیدگی کے ساتھ، سیاست کو سمجھ کر پوری بے لوثی و بے تعصبی سے مسائل پر بحث کی جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اس خانہ کی خانہ پُری کرنے کے لئے کوئی اخبار نکال سکوں لیکن افسوس ہے کہ کوئی اخبار مجھے ایسا نہ مل سکا جسے میں یہ درجہ دے سکتا۔ اتفاق سے میرا یہ مضمون مدینہ میں چھپ رہا ہے اس لئے مدینہ کے بارے میں میرا جو خیال ہے اسے کہتے ہوئے ذرا شرم آتی ہے کہ شاید پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ مضمون شائع کرانے کی خاطر ایڈیٹر مدینہ کی خوشامد کر رہا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں معیاری اخبارات کی صف میں صرف "مدینہ" کو رکھتا۔

البتہ بعض ماہوار رسالے ایسے ضرور ہیں جن کو میں یہ درجہ دے سکتا ہوں۔ مثلاً جامعہ (دہلی)، ہمایوں (لاہور)، نگار (لکھنو)، معارف (اعظم گڈھ)، الاصلاح (سرائمیر) لیکن ان میں جامعہ کے علاوہ صرف ابتدائی دو ایک صفحوں کے ایڈیٹوریل نوٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ بہرحال اگر آپ ان رسائل کو اخبار نویسی کی صف میں شامل کریں تو یہ اچھے رسائل ہیں۔ مگر صرف ان سے اخبار بیں طبقہ کی پیاس تو نہیں بجھ سکتی۔ یہ تو اونٹ کی داڑھ میں زیرہ کا کام بھی شاید نہ دے سکیں۔ ہمیں تو ضرورت ایسے اخبارات کی ہے جو روزانہ تازہ بتازہ خبریں دیں، اُن پر ٹھنڈے دل کے ساتھ مدبرانہ انداز سے نوٹ لکھیں اور وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز سیاسی رہنماؤں کے سیاسی مقالات کو شائع کرتے ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے یہ چیز ہندوستان کے کسی ایک اردو اخبار میں بھی نہیں۔ مدینہ میں بھی سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ ہفتہ میں دو بار ہونیکی وجہ سے تازہ ترین خبریں روز کے روز ہم کو نہیں دے سکتا۔ علاوہ ازیں اس میں ہمارے سیاسی رہنماؤں کے مقالات بھی نہیں چھپتے۔ جس کا الزام مدینہ پر نہیں بلکہ ہمارے سیاسی رہنماؤں پر ہے جو انگریزیت میں اتنے غرق ہو چکے ہیں کہ اب ان کی اردو بھی انگریزی کا ترجمہ ہوتی ہے اور اس لئے ان سے اردو انشاپردازی کی توقع رکھنا ناممکن ہے۔ پٹنہ لیگ کے اجلاس میں مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں تقریر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ "ہم نے اس مسئلہ پر کافی روشنی پھینکی ہے"۔ سبحان اللہ! بیچارہ نواب زادہ کر کر کیا۔ آخر انگریز تو to throw light ہی کہتا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ "روشنی پھینکنا" ہی ہو سکتا تھا۔ اردو بیچارے نے کبھی پڑھی ہوتی تو اُسے معلوم ہوتا کہ ہمارے یہاں روشنی پھینکی نہیں جاتی بلکہ ڈالی جاتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے رہنما آج بھی شیکسپیر اور ملٹن کے علاوہ اردو کے مصنفوں کو پڑھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اُردو کے کمزور ہونے کو فخریہ بیان کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر یہ بیچارے اُردو میں مضمون نہیں لکھتے تو ان کو معذور ہی سمجھنا چاہئے۔

مسلمانوں کی سیاست کے بارے میں اوپر مختصراً جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خدا کے فضل سے ابھی ہمارے یہاں انگریز، انگریزی اور انگریزیت کے دالہ و شیدا کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ہندو تو اس منزل سے عرصہ ہوا گذر چکا لیکن مسلمان ابھی اسی منزل کو منزل مقصود سمجھے ہوئے ہے۔ ہندوؤں میں تو آج آپ کو ایسے لوگ بڑی کثیر تعداد میں مل جائیں گے جو ہندی اخبارات، ہندی رسائل اور ہندی تصانیف کا مطالعہ کرنے، ان میں مضمون لکھنے اور ان کو تصنیف کرنے پر فخر کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے پڑھے لکھے نوجوان کو چار لفظ انگریزی کے آئے نہیں کہ اب اُردو کی ہر تحریر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اب وہ انگریزی کے سوا کسی سے بات بھی نہ کرے گا۔ اخبار پڑھے گا تو ٹائمز آف انڈیا اور رسالہ دیکھے گا تو ماڈرن ریویو۔ اُردو اخبارات میں اُسے سینکڑوں عیب نظر آنے لگتے ہیں۔ اخبارات کا ٹائپ اچھا نہیں ہوتا، ان میں خبریں صحیح نہیں چھپتیں، ان کے اداریتی مقالے فضول ہوتے ہیں، ان کی تحریر ناکارہ ہوتی ہے۔ غرضکہ دنیا کی کوئی ایک خوبی بھی ہمارے پڑھے لکھے ذہین نوجوانوں کو اردو اخبارات میں نظر نہیں آتی۔ اس کس مپرسی میں اُردو اخبارات کا جو کچھ حال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ہندو تو اُردو سے کوئی لگاؤ رکھنا ہی نہیں چاہتا۔ اب رہ گیا مسلمان، سو اس کے یہاں ابھی لنڈن ٹائمز اور اسٹیٹسمین ہی کا چراغ جل رہا ہے، اس لئے بیچاری اردو صحافت کی حالت دگرگوں نہ ہو تو کیا ہو۔ ہندوستان سے جو انگریزی اخبارات نکلتے ہیں ان کی اشاعت ساٹھ اور اسّی ہزار کے بیچ میں ہے۔ ہندی کے بہت سے اخبارات و رسائل بھی تیس اور چالیس ہزار کے بیچ میں چھپتے ہیں۔ لیکن اردو اخبارات کی لاوارثیت کا یہ عالم ہے کہ مدینہ کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی اخبار ایسا ہو گا جو اپنے تمام مصارف کو بآسانی پورا کرنے کے بعد اسٹاف کی گذر اوقات کیلئے معقول رقم دے سکے۔ مدینہ کے بعد لاہور کے انقلاب اور دہلی کی الامان کی حالت اچھی بتائی جاتی ہے۔ سو اول الذکر اخبار کی مالی بہتری کی ذمہ داری اخبار کی فروخت پر اتنی نہیں جتنی اور دوسرے ذرائع پر ہے اس لئے کہ اخبار کی اشاعت مشکل سے تین چار ہزار ہو گی۔ اور وہ بھی سر سکندر حیات خاں کی وزارت کے بعد۔ اس سے قبل تو اس کی اشاعت بہت ہی کم تھی۔ سر سکندر حیات خاں کی وزارت نے اس اخبار پر جو نظر کرم فرمائی اس کی حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ تو انہوں نے پبلک جلسہ ہی میں کہدیا کہ "انقلاب میرا اخبار ہے"۔ مگر حق یہ ہے کہ انقلاب نے بھی احسان ماننے میں کمی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ جو اخبار صرف عوام کی اعانت و سرپرستی کی مدد پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھے گا اس کا حشر وہی ہو گا جو ملک کے اور اخباروں کا ہے۔ اس لئے اس نے روز اول ہی سے اس سودائے خام کو دل سے نکال دیا۔ اور اسی لئے اس پرچہ نے کبھی کسی ایسی تحریک کی حمایت میں حصہ نہیں لیا جسے "اوپر کے لوگوں" نے پسند نہیں کیا۔ قادیانیت کے خلاف ہندوستان میں کتنا ہنگامہ مچا، لیکن اسکے باوجود "انقلاب" نے عوام کی اس آواز پر لبیک کہنے کے بجائے سر فضل حسین مرحوم

اور اُن کے حاشیہ نشینوں ہی کی ہمنوائی کرنے کو پسند کیا، کانگریس کی مخالفت پر تو گویا اس نے اپنی عمارت ہی کھڑی کی تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مذہب کی آڑ لے کر انگریزی حکومت کی حمایت کرنا اتنا آسان کام ہے کہ شاید اس سے زیادہ آسان کام اور کوئی نہ ہو۔ ریاست راجکوٹ میں انگریزی ایجنٹ کی شہ پر فرمانروائے ریاست نے معاہدہ کی جو خلاف ورزی کرنا چاہی تھی اس کی حمایت کرنا کھلے طور پر سرمایہ داری و ریاست پروری کی حمایت کرنا تھا۔ مگر پھر بھی ہندوستان میں "اسلام" کے نام پر اس کی حمایت میں آواز بلند ہوئی اور اگر وائسرائے مداخلت کر کے اس معاملہ کا تصفیہ نہ کرا دیتا تو آپ دیکھتے کہ یہی معرکہ کفر و اسلام کا معرکہ بنجاتا۔ انقلاب کو اس قسم کے معرکوں میں ہماری صحافت کا امام تسلیم کرنا چاہیئے۔ اس کو اس فن میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ رجعت پسندی کی کتنی ہی بدترین قسم کیوں نہ ہو لیکن اس پر اسلام کا غازہ ملنا اسے خوب آتا ہے۔

الغرض اس وقت کہنا تو یہ ہے کہ انقلاب کی مالی حالت اگر بہتر ہے تو اس پر عوام کو مبارکباد نہیں دی جا سکتی۔ اب رہ گیا "الامان" سو اس نے جن جن حربوں کو استعمال کر کے اپنی مالی حیثیت کو اچھا بنایا ہے انھیں صحافتی نقطۂ نظر سے قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ اگر یہ اخبار ناخواندہ و نیم خواندہ عوام کے صرف جذباتی تاروں پر حد سے زیادہ مضراب لگانے کا فن اختیار نہ کرتا تو اس کی اشاعت پر کوئی اچھا اثر مرتب نہ ہوتا۔ اس اخبار نے اس حقیقت کو پہلے ہی دن سے بھانپ لیا تھا کہ پڑھے لکھے سمجھدار طبقہ میں کسی اردو اخبار کو مقبول بنا دینا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ اس لئے اب اگر کامیابی کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ معمولی پڑھے لکھے عوام تک وہی باتیں پہنچائی جائیں جن کو وہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خبروں کی ترتیب، اداریہ نویسی کی تحریر اور سرخیوں کی تعیین میں ہمیشہ اسی گُر کو پیش نظر رکھا۔ ہندوؤں کو موقعہ بے موقعہ برا بھلا کہنا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مسلسل ان کے خلاف اشتعال میں لاتے رہنا یقیناً ایک ایسی چیز ہے جسے عوام بیحد پسند کریں گے۔ "الامان" نے اسی چیز میں کمال پیدا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس سے عوام کی ذہنی تربیت تو نہ ہو سکی (جو صحافت کا صحیح مقصود ہے) لیکن خود اس کی معاشی کفالت کا سوال خطرہ میں نہیں رہا۔

ان اخبارات کے علاوہ باقی اور جتنے اردو اخبارات ہیں ان کے متعلق میری معلومات یہی ہیں کہ ان کی مالی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ ان میں سے "ہند" (کلکتہ) اور احسان (لاہور) کی قسم کے چند ہی اخبارات بھی ایسے ہیں جو شتم پشتم اپنے مصارف نکال لیتے ہیں اور جو کم از کم اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ بہرحال مالی اعتبار سے ہمارے اخبارات کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ جن کو "اوپر کے لوگوں" کی امداد حاصل ہے۔ اس قسم کے اخبارات میں بات بات پر مذہب کی حفاظت کا آوازہ بلند کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس نوع کے اخبارات کی پہچان یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے بجائے اُن کی توپ کا رُخ ہمیشہ ہندو مسلم اختلاف کی طرف رہتا ہے۔ یعنی اگر انگریزی حکومت کبھی "انتظاماً" کوئی مسجد یا مندر ڈھا دے تو ان کے احتجاج کی آواز اول تو نکلے گی ہی نہیں اور اگر نکلے گی تو بہت مدھم سُروں میں۔ لیکن اگر کسی ہندو یا مسلمان کے ہاتھوں "غلطی ہی سے" کسی مسجد یا مندر کی ایک اینٹ بھی سرک جائے تو پھر ان کے غضب آلود نعروں سے زمین آسمان گونج اٹھے گا۔ ہندو مسلم افتراق ہی ہندوستان میں انگریزی حکومت کا آخری سہارا ہے، اس لئے اُدھر کے لوگ "ہمیشہ اختلاف کی اسی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔

۲۔ وہ اخبارات جن کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا بلکہ جو صرف عوام کے جذبات سے کھیلنا جانتے ہیں۔ یہ اخبار اس کے قائل ہوتے ہیں کہ اگر جھوٹی خبریں گھڑ کر یا سچی خبروں میں کانٹ چھانٹ کر کے عوام کو جوش میں لایا جا سکتا ہے اور اس طرح اخبار کی خریداری میں اضافہ ہو سکتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۳۔ وہ بدنصیب اخبارات جن کے سامنے ایک نصب العین ہے، جو عام جذبات کے دھارے میں بہنا نہیں چاہتے اور جو حتی الامکان صحافت کے ایماندارانہ اصول کو اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو عوام کی بدمذاقی کی وجہ سے اپنے اس عزم پر ثابت قدم رہ سکے ہوں۔ بہت قدم جمانے کی کوشش کے باوجود بعض اوقات عام جذبات کے سیلاب میں یہ اپنی جگہ سے سرک ہی جاتے ہیں۔ ورنہ پھر انھیں اپنی دکان بڑھانا پڑے۔

اردو صحافت کی اس مالی ابتری کا اثر یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ذہین و تعلیم یافتہ حوصلہ مند نوجوان صحافت کو بطور پیشہ کے اختیار کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاتا۔ اور جن لوگوں نے ایسا کیا وہ بعد میں پچھتاتے ہیں۔ انگریزی اخبار نویسی تو وکالت یا ڈاکٹری وغیرہ کی طرح ایک اچھا خاصہ پیشہ ہے جس میں آدمی اگر اپنی ساری زندگی وقف کر دے تو بہت کچھ ترقی کر سکتا ہے۔ لیکن اُردو اخبار نویسی میں معراج کمال پر پہنچ جانے کے باوجود بھی حالت یہ رہتی ہے کہ

شب چو عقدِ نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم؟

حضرت جالب مرحوم کی اخبار نویسی کے کمال سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں آخر عمر تک ایک معمولی تھانیدار کا سا مالی اطمینان بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس وقت بھی اردو صحافت کے مایۂ ہوئے بہت سے بدنصیب آپ کو ہندوستان کی گلیوں میں خاک چھانتے نظر آئیں گے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ بقول شخصیکہ "بھولے باہمن گائے کھائی، اب کھائیں تو رام دھائی" اگر کوئی تعلیم یافتہ و سنجیدہ شخص اس لائن میں آ بھی جاتا ہے تو وہ کف افسوس ہی ملنے پر مجبور ہوتا ہے اور آخرکار اپنی زبان حال سے حوصلہ مند نوجوانوں کو یہی مشورہ دیتا ہے کہ

من نکردم، شما حذر بکنید

خالی پیٹ دنیا کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ ارسطو اور افلاطون کا سا دماغ رکھنے والوں کو بھی اگر کھانے کو نہ ملے تو ساری عقل و دانش دھری کی دھری رہ جائے۔ اس لئے بھوکا آدمی صحافت کیا کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ محض اپنے عزم و حوصلہ سے مجبور ہو کر ایسا کرے بھی تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی کوئی عزت نہیں۔ ہمارے یہاں حالت یہ ہے کہ ایک معمولی وکیل کی تو عزت ہوتی ہے لیکن اخبار کی ایڈیٹری سے زیادہ فضول اور کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی۔ وجہ یہ ہے کہ اردو صحافت کے تھنوں میں اتنا دودھ تو ہے نہیں کہ اس کو دوہنے کے بعد کسی کا پیٹ بھر سکے، اس لئے اس کی طرف وہی لوگ توجہ کرتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا، جو جاہل ہی نہیں ہوتے بلکہ ناکارہ بھی ہوتے ہیں۔ جو دنیا کے کسی کام کا اہل ثابت نہ ہوا، اس نے اخبار نکال دیا۔ عدالتوں سے سمن لئے اور حسب ضرورت اسکے پرچے چھپوا کر بکوا دیئے۔ اگر ہو تو چلا تو شہر کے کسی مالدار آدمی کو ذرا دھمکا کر کچھ روپیہ اینٹھ لیا۔ یہ ہے ہمارے اکثر اخبار نویسوں کی گذر بسر کا ذریعہ۔

جو اخبارات بڑے اخبار کہلاتے ہیں اور جن کی اشاعت بھی خاصی ہے ان کی حالت بھی اچھی نہیں۔ ان میں بھی کام کرنے والے قسمت ہی کو جھینکتے رہتے ہیں۔ انصاری، الجمعیۃ، احسان، زمیندار، ہند جیسے دس پانچ اخبارات کا شمار اچھے اخباروں میں ہوتا ہے لیکن اگر کبھی آپ کو ان کے دفتروں کے اندرونی کمرے میں جھانکنے کا موقعہ ملے تو آپ کو نظر آئیگا کہ ہر کام کرنے والا اپنی جگہ پر پریشان ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ ہمارے اخبارات چونکہ خالص تجارتی لائن پر کافی سرمایہ کے ساتھ نہیں چلائے جاتے، اس لئے ان کی انتظامی حالت بڑی ابتر ہوتی ہے۔ اور اس لئے وہی ایڈیٹر جو اخبار کے صفحات پر گورنر اور وائسرائے سے باتیں کرتا ہے، گھر پہنچنے پر قرض سودا دینے والے ایک معمولی سے دکاندار کی ترچھی نظریں برداشت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ البتہ یہ خصوصیت کسی نہ کسی حد تک "مدینہ" کو حاصل ہے کہ اسکی مالی حالت بھی غنیمت ہے اور انتظامی حالت بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ دوسرا کوئی اخبار ایسا نہیں۔ اگر اور اخبارات کی حالت کم از کم مدینہ جیسی ہی ہوتی تو یقیناً اردو صحافت کو بطور پیشہ اختیار کرنے والے حوصلہ مند نوجوان، یونیورسٹی کے فارغ التحصیل حضرات میں سے کافی نکل آتے۔ لیکن جس چیز میں نہ عزت ہو نہ دولت اُسے "ذوق خامہ فرسائے ستم زدہ" کے علاوہ اور کون اختیار کر سکتا ہے۔

غرض ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ہمارا تعلیم یافتہ اور مالدار طبقہ اردو اخبارات کے بجائے انگریزی اخبارات پڑھتا ہے اور اسی کو پڑھنا پسند کرتا ہے اسلئے اردو اخبارات کی حالت ابتر ہے۔ نہ ان کی مالی ساکھ اچھی ہے اور نہ یہ رائے عامہ پر کوئی مستقل اور دیرپا اثر ڈال کر کوئی مفید کام کرا سکتے ہیں۔

ان حالات میں قدرتاً اردو اخبارات صرف ناخواندہ و نیم خواندہ عوام کو خوش کرنے کے لئے اُن ترکیبوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جن کے بغیر ان کا جینا محال ہے۔ اخبارات کا لب و لہجہ در اصل پڑھنے والوں کی ذہنیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اسٹیٹسمین اور پائنیر کے پڑھنے والے جس نوع کے ہیں اُسی نوع کا ان کا لب و لہجہ ہے۔ لیکن اگر آپ یہ توقع کریں کہ اردو اخبارات کو پڑھیں تو بدھو خاں لیکن لکھا جائے وہ سر شاہ سلیمان کے سمجھنے کے لئے تو یہ ناممکن بات ہے۔ اردو صحافت کی مصیبت یہ ہے کہ سر شاہ سلیمان کی قسم کے افراد کبھی کوئی اُردو اخبار نہیں پڑھتے لیکن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اگر کوئی قسمت کا مارا اردو اخبار ان کے ہاتھ پڑ گیا تو اب وہ اس کے ہر ہر لفظ پر ناک بھوں چڑھا کر فرمائیں گے!

what a bogus thing!

(کیا فضول چیز ہے)

سر تیج بہادر سپرو نے تعلیم یافتہ افراد کی بیروزگاری دور کرنیوالی کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے جو رپورٹ ترتیب دی تھی اس میں ملکی صحافت کی ابتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ یونیورسٹیوں میں صحافت کا بھی ایک شعبہ کھولا جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کا یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا۔ ورنہ ہمارے نوجوان صحافیوں کا وہی حشر ہوتا جو کسی غیر ضروری مال کا حشر تجارتی منڈیوں میں ہوتا ہے۔ اگر کسی مال کی کھپت نہیں ہے تو اس کو منڈی میں لانے سے اس کی بیقدری کے سوا

اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اُردو صحافت کو ترقی دینے کے لئے سب سے پہلے ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کو انگریزی اخبارات پڑھنے کے بجائے اردو اخبارات پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ اگر ہندوستان میں ایسا رجحان پیدا ہو جائے تو قدرتاً صحافت کا نقشہ بھی بدل جائے گا۔ مثال کے طور پر حیدرآباد کو لیجئے۔ یہاں اُردو کا رواج بہت ہے بڑے بڑے عہدہ دار بھی اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ساری ریاست میں شاید ہی کوئی شخص آپ کو ایسا ملے گا جو صرف انگریزی اخبار پڑھتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے اخبارات کی اشاعت بھی اچھی ہے اور لب ولہجہ بھی معقول ہے۔ یہاں سے پیام اور رہبر دکن دو مشہور اخبار نکلتے ہیں، دونوں کی مالی حالت اچھی ہے۔ البتہ ریاست حیدرآباد کی شخصی اور مطلق العناں حکومت میں رائے کی آزادی پر جو پابندی ہو سکتی ہے اور اس جاگیردارانہ ارسٹاکریسی میں سوسائٹی کے مذاق میں جو عفونت پیدا ہو گئی ہے اس کا اثر اخبارات میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ "پیام" اس اثر کو زائل کرنے یا کم از کم زائل کرنے کی نمائش کرنے کی کافی جد وجہد کرتا ہے لیکن پھر بھی یہ یقینی ہے کہ برطانوی ہند کے پریس کی سی آزادی حیدرآبادی پریس کو حاصل نہیں۔ بہرحال اس چیز کو چھوڑ کر باقی ادر کسی اعتبار سے ان اخبارات کا پایہ گرا ہوا نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان میں اردو اخبار پڑھنا ہی پڑھے لکھے آدمی کی کسر شان ہے۔ یہاں ہر گریجویٹ کی میز پر صرف انگریزی اخبار ہی آپ کو ملے گا۔ پھر آپ ہی کہئے کہ غریب اردو اخبار نویسی کا کیا قصور ہے۔ یہ قصور تو خود آپ کا ہے۔

کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر
کیا ہنسی آتی ہے مجھکو حضرت انسان پر

بنا بریں ہمارے اردو اخبارات میں ذاتیات، جھوٹ، افترا پردازی، اشتعال انگیزی اور جہل مرکب کے جو نمونے نظر آتے ہیں وہ صرف اسی کس مپرسی کا نتیجہ ہیں۔ اردو اخبارات دراصل نکالے ہی اس لئے جاتے ہیں تاکہ عوام کے جذبات سے کھیلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اخبار میں بھی خبروں کی فراہمی کا معقول انتظام نہیں ہے۔ سارا زور صرف ادارتی مقالوں پر صرف کیا جاتا ہے، حالانکہ ادارتی مقالے تو خبروں کے مقابلہ میں ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ اخبار کا سب سے پہلا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ تازہ ترین خبریں بلا کم وکاست پڑھنے والے تک پہنچائے۔ لیکن ہمارے اخبارات میں اس کا عکس ہوتا ہے۔ آپ کسی روزانہ اردو اخبار کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں کبھی بھی تازہ خبریں آپ کو نہ ملیں گی۔ اول تو یہ اخبار دوسرے دن انگریزی اخبارات سے ترجمہ کر کے خبریں دیتے ہیں اور دوسرے سب خبروں کا ترجمہ بھی نہیں کرتے۔ پھر سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ترجمہ نہایت ناقص بلکہ بعض اوقات غلط ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنے والے بہت معمولی قابلیت کے آدمی رکھے جاتے ہیں۔ اکثر اخبارات میں تو کالج یا اسکول کے کسی لڑکے سے دو ایک گھنٹے کے لئے یہ کام لے لیا جاتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ خبروں کا کام کوئی اہم کام ہی نہیں، حالانکہ یہی سب سے زیادہ اہم کام ہے۔ سمجھدار اخبار پڑھنے والے کے لئے اصلی چیز خبریں ہی ہوتی ہیں، ایڈیٹر کی رائے اس کے لئے اتنی اہم نہیں۔ جو لوگ سیاست کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ خبریں پڑھ کر خود اپنی ایک رائے قائم کرتے ہیں، اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ جو ایڈیٹر کی رائے ہو اسی کو پڑھنے والا بھی تسلیم کر لے۔

ہمارے روزانہ اخباروں میں ایسوشی ایٹڈ پریس کی بڑی سروس کسی اخبار کے پاس نہیں (اس وقت میں ہندو اخبارات سے بحث نہیں کر رہا جن میں سے بعض کے پاس بڑی سروس ہے) بہت سے روزانہ اخبار تو صرف انگریزی اخبارات ہی سے کام چلاتے ہیں۔ لیکن جنھوں نے ذرا زیادہ زور مارا تو ایسوشی ایٹڈ پریس کی چھوٹی سروس لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اردو اخبارات پڑھنے والے کو ساری خبریں تمام کی تمام وقت پر نہیں ملتیں۔ وقت گذر جانے کے بعد بھی پوری خبر صحیح طور سے ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔

پھر ایک مصیبت اور ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارا اخبار نویس اپنی مالی ابتری اور معاشرتی کس مپرسی کی تلافی کرنے کے لئے لیڈری کا سہارا ڈھونڈنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آخر جب وہ غریب معاشی اعتبار سے سکون کی زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور در بدر کی خاک چھانتے رہنا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے تو کیا وہ اپنی تباہ حالی کو لیڈری کے پردے میں بھی نہ چھپائے۔ آپ اسکی عزت نہیں کرتے، وہ آپ کو اسکے لئے مجبور نہیں کر سکتا لیکن وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ جب موقع پائے لیڈری کے دروازہ سے آکر آپ پر برس سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تقریباً ہر ایڈیٹر کے لئے لیڈر ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر جب وہ لیڈر ٹھیرا تو اپنا پروپیگنڈا بھی چاہے گا اور ظاہر ہے کہ اس غریب کے پروپیگنڈے کی ذمہ داری اس کے اپنے اخبار کے علاوہ اور کون قبول کر سکتا ہے۔ الغرض آپ کو ایسے اخبارات کافی تعداد میں ملیں گے جن کے بیشتر کالم اُن کے ایڈیٹروں، یا ڈائرکٹروں یا مالکوں کے کارناموں کے قصیدوں سے بھرے رہتے ہیں۔

لیکن اس سلسلہ میں ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُن اردو اخبارات کی حالت بہت اعتبارات سے اچھی ہے جن کا اہتمام وانتظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ مثلاً تیج، ملاپ، پرتاپ وغیرہ۔ ہندو عوام میں چونکہ سیاسی ذوق کافی پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ کافی تعداد میں اخبار پڑھتے ہیں۔ اسی بنا پر ان اخبارات کی اشاعت بہت کافی ہے۔ ان میں خبروں کا انتظام بھی بہت اچھا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کا کوئی مسلمان اخبار ان اخبارات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ان پرچوں کی پالیسی مہاسبھائیت کی طرف مائل نہ ہوتی اور ان کے ارباب کار پر آریہ سماجیت بلا بنکر مسلط نہ ہوتی تو مسلمانوں میں ان کی اشاعت بہت ہوتی۔ پھر بھی مسلمان اخبار بیں طبقہ کی ایک کثیر تعداد محض خبروں کی خاطر ان اخبارات کو خریدتی ہے۔ اگر یہ اخبارات اپنی زبان کی اصلاح کر لیں اور ادبیانہ انداز تحریر میں مسلمان صحیفہ نگاروں کا مقابلہ کر سکیں تو مسلمانوں میں انکی خریداری اور بھی زیادہ بڑھ سکتی ہے لیکن موجودہ حالات میں تو ان اخبارات کے بھدّے انداز تحریر اور مہاسبھائیت کی طرف مائل پالیسی کی بنا پر عام مسلمان ان کی خبر رسانی کی خوبیوں کے باوجود مسلم اخبارات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اخبارات کی یہ خوبیاں مسلمان اخباروں کو مقابلہ ومسابقت (Competition) کی دعوت نہیں دیتیں۔ تجارت میں مال کو بہتر بنانے والی چیز مسابقت ومقابلہ کا جذبہ ہی ہوا کرتا ہے لیکن بدنصیبی سے ہماری صحافتی لائن میں یہ بھی مفقود ہے۔

مسلم لیگ بڑے زور شور سے اٹھی تھی اس لئے یہ توقع ہوئی تھی کہ شاید اس کے رہنما اردو کا کوئی اچھا پرچہ نکلوا دیں گے۔ لیکن اب دوسری تمام توقعات کی طرح اس توقع پر بھی پانی پھر گیا اس لئے کہ اس کے صدر دفتر دہلی سے "منشور" کے نام سے جو ہفتہ وار پرچہ نکلا وہ معیار کی پستی اور مذاق کی خرابی میں اپنی نظیر آپ تھا۔

داستان طویل ہوتی چلی جاتی ہے، حالانکہ میں نے شروع ہی سے اختصار کی کوشش کی ہے۔ بات یہ ہے کہ صحافت کا سوال کوئی ایسا سوال نہیں جو ہماری معاشرت، معیشت اور سیاست کے بنیادی مسئلوں سے الگ کیا جا سکے۔ کسی ملک کی صحافت پر بحث کرنا درحقیقت اس ملک کی معاشرت، معیشت اور سیاست پر گفتگو کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو صحافت کا صحیح نقشہ پیش کرنا ممکن نہ تھا۔ اب بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ بہرحال جہاں تک میری سعی کا تعلق ہے میں نے کوشش کی ہے کہ مسئلہ کا کوئی اہم پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ میرا ارادہ تھا کہ ذرا اور کھل کر لکھتا اور اُن دلچسپ باتوں کو بھی ان صفحات پر لے آتا جو کبھی عوام کے سامنے نہیں آتیں لیکن اس سے میرے رفیقوں کا گلہ ذرا زیادہ بڑھ جاتا۔ اس لئے میں کیوں ان کا بھرم کھوؤں۔ البتہ اتنا کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے اچھے اچھے اخباروں کے ایڈیٹران کرام میں سے شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوگا جسے ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور یورپ کی بین الاقوامی سیاست سے صحیح واقفیت ہو۔ اسکے برعکس ان کی اکثر معلومات ادھوری اور ناقص ہوتی ہیں جن کی بنیاد چند مقالوں یا سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے بعض اوقات تو ان سے بحث کر کے ہنسی آتی ہے، یہ تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اردو اخبار نویسوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس نے کارل مارکس کی معرکۃ الآرا تاریخی تصنیف "کیپٹل" کی تینوں جلدوں ہی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہو، لیکن اس کے باوجود جب وہ سوشلزم پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو کارل مارکس کو بھی مشورے دیتے ہیں۔ چونکہ میں گھر کا بھیدی ہوں اس لئے مجھے ان باتوں پر ہنسی آیا کرتی ہے اور سوچتا ہوں کہ غلام قوم کی ہر چیز کیسی ناکارہ ہو جاتی ہے۔ آج ہماری غلامی نے ہمارے دلوں پر انگریزیت کی ایسی مہر لگا دی ہے کہ ہم نے اپنی ہر چیز کو ترک کر دیا نتیجہ یہ ہے کہ صحافت کے میدان میں صحیح آدمی تو مفقود ہیں، البتہ بھوت ناچ رہے ہیں۔ جو لوگ اس قابل ہیں کہ اس شعبہ کو اپنائیں وہ اوّل تو آئی سی ایس کے امتحان مقابلہ میں بیٹھتے ہیں اور اگر اس میں ناکام رہے تو پھر وکالت یا ڈاکٹری کی طرف دوڑتے ہیں۔ چنتامنی کی سی صلاحیت کا آدمی انگریزی میدان صحافت کا شہسوار تو بن سکتا ہے لیکن اردو میں آپ کو ایسا کوئی آدمی صحافت کے میدان میں نہ ملیگا۔ اور اگر بھولے بھٹکے آ نکلے گا تو پھر چند ہی روز کے بعد الٹے پاؤں واپس جانے پر مجبور ہو گا۔

لیکن ہمارے موجودہ اخبار نویسوں میں بعض حضرات ایسے ضرور ہیں جو اپنی انشا پردازانہ قابلیت کے لحاظ سے ہماری تعریف کے مستحق ہیں۔ عبدالمجید سالک کو روزمرہ کی صاف ستھری سلیس زبان میں ظرافت آمیز تحریر لکھنے پر جو ملکہ ہے اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں نصراللہ خاں عزیز، اور چراغ حسن حسرت کے سوا اور کسی کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نصراللہ خاں عزیز کی سنجیدہ ادبی تحریر بھی خوب ہوتی ہے۔ غلام رسول مہر کے انداز تحریر میں جو اثر، سادگی اور دلکشی ہے اس کی مثال اردو صحافت میں مشکل سے ملے گی۔ محمد عثمان فارقلیط کی

زبان میں ایک اثر انگیز خطیبانہ شان ہوتی ہے۔ ابو سعید بزمی کی تحریر میں بہ جنگی روانی، سلاست اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ خطیبانہ انداز کی بہت دلکش آمیزش ہوتی ہے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کی انشا میں سلاست دبیاختگی کی وہ شان پائی جاتی ہے جسے بے ضرورت اینچ پینچ سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں نہایت سادگی کے ساتھ کم سے کم لفظوں میں برملا لکھتے ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی اُن کا یہ اندازِ تحریر پڑھنے والے کے لئے "جھنجوڑنے والا" ثابت ہوجاتا ہے جس کا ردعمل پڑھنے والے پر اچھا نہیں ہوتا مگر پھر بھی عام طور سے اُن کی تحریر موثر اور دل میں بیٹھ جانے والی ہوتی ہے۔ ظفر علی خاں اب اگرچہ ایڈیٹر نہیں بلکہ لیڈر ہو گئے ہیں مگر چونکہ میں ان کی لیڈری کا قائل نہیں اس لئے ان کو اسی زمرے میں شامل کرکے ان کے زورِ قلم کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ اُن کے الفاظ کی حسین بندش اور جملوں کی خطیبانہ شان بہت اثر آفریں ہوتی ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ ضرورت سے بہت زیادہ الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں لیکن چونکہ الفاظ بہت حسین ہوتے ہیں اسلئے ان کی زیادتی ناگوار نہیں گذرتی۔ اگر پتے خوشنما ہوں تو پھل کے چاروں طرف وہ کتنے ہی یادہ کیوں نہ ہوں، پھل ٹٹولنے والا اُن کو ہٹانے میں کوفت محسوس نہ کرے گا۔ قاضی عبدالغفار کا طرزِ انشا نہایت صاف ستھرا اور سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کے جملوں میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ظرافت اور طنز کا جو ہلکا سا چھینٹا ہوتا ہے وہ ایک بہت ہی عجیب چیز ہے جو ہمیں اور کہیں نہیں ملتی شگفتگی، سنجیدگی، ظرافت اور طنز کی آمیزش سے جو چیز تیار ہوگی اس کی اثر انگیزی میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔

بہرحال ان حالات میں ہم اپنی صحافت کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔ دنیا توقع پر قائم ہے۔ پھر ہم اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس کیوں ہوں؟ علاوہ ازیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی ہماری صحافت نے بہرحال کی ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے اخبارات کی جو حالت تھی وہ آج سے پچاس سال پہلے کے مقابلہ میں اچھی تھی۔ اور آج جو حالت ہے وہ آج سے بیس پچیس سال کے مقابلہ میں اچھی ہے اسلئے اگر آیندہ ہم نے اس سست رفتاری سے بھی ترقی کی تب بھی مستقبل بُرا نہیں لیکن زمانہ نے جو کروٹ بدلی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ اب ہم سست رفتاری سے نہیں بلکہ بہت تیز رفتاری سے قدم بڑھائیں گے۔ اس وقت ہمارے اخبارات کتنے ہی ناقص سہی مگر پہلے کے مقابلہ میں اچھے ہی ہیں اور بہت بھی ہندوستان میں ہندی کی اشاعت کے لئے کتنا ہنگامہ مچایا گیا ہے، کتنا پروپیگنڈا کیا گیا ہے اور کس بیدریغ طریقہ سے روپیہ کو پانی کی طرح بہایا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اب بھی ہندی اخبار و رسائل کے مقابلہ میں اُردو اخبار و رسائل کی تعداد دوچند کے قریب ہے۔ ہندوستان کا کوئی ایسا مشہور شہر نہیں جہاں سے دو چار اردو اخبارات نہ نکلتے ہوں۔ اگر ان تمام اخبارات و رسائل کو شمار کیا جائے جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے نکلتے ہیں تو ڈھائی تین سو سے کم نہ ہوں گے۔ مگر ان میں سے لاہور کا زمزم، احسان، شہباز، منشور، انقلاب اور زمیندار، دہلی کا الجمعیۃ، انصاری اور الامان، بجنور کا مدینہ، پشاور کا خدائی خدمتگار اور انگار، بمبئی کا اجمل اور خلافت، حیدرآباد کا پیام اور رہبر دکن، لکھنؤ کا ہندوستان، پرچم اور حقیقت، کوئٹہ کا استقلال اور کلکتہ کا ہند اور عصر جدید خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ ذیل میں ان اخبارات کی ایک مجمل فہرست ملاحظہ فرمایئے جو ہندوؤں کے ہاتھ میں بہت عمدہ طور سے چل رہے ہیں۔

لاہور:۔ روزانہ نیشنل کانگریس، روزانہ پرتاب، روزانہ ویر بھارت، روزانہ ملاپ، روزانہ ہندو، پارس (ہفتہ وار)، کرم ویر (ہفتہ وار)

دہلی:۔ روزانہ تیج، ریاست (ہفتہ وار)، روزانہ وطن، پیغام وطن (ہفتہ وار)

میرٹھ:۔ کرتی لہر (ہفتہ وار)

لکھنؤ:۔ آزاد (ہفتہ وار)، دیپلو (ماہوار)

الہ آباد:۔ ہل (ماہوار)

واردات

(از حضرت باسطؔ بھوپالی)

نہیں یہ جلوہ ہائے رازِ عرفاں دیکھنے والے
تمہیں کب دیکھتے ہیں کفر و ایماں دیکھنے والے

نگاہِ شوق کو آئینہ ساماں دیکھنے والے
تجھے حیراں نہ کردیں خود کو حیراں دیکھنے والے

ادھر آئیں مرے اشکوں کی بھی گہرائیاں دیکھیں
کہاں ہیں جوشِ موج و زورِ طوفاں دیکھنے والے

نہ جانے اس میں کتنے تیرے افسانے بھی پنہاں ہیں
حیاتِ عشق کو عنواں بعنواں دیکھنے والے

خدا رکھے ترے غم کا بہت نازک زمانہ ہے
سحر دیکھیں نہ دیکھیں شام ہجراں دیکھنے والے

یہ کس نے لا کے رکھدی سامنے تصویر محشر کی
ابھی چونکے ہی تھے خوابِ پریشاں دیکھنے والے

کہاں تک آئینہ دارِ تجلیّاتِ خود بینی
یہ پردہ بھی الٹ دے او دل و جاں دیکھنے والے

یہ دیوانے سجودِ شوق کی عظمت کو کیا جانیں
مجھے کیا پائیں فرقِ کفر و ایماں دیکھنے والے

نگاہوں نے جو دیکھا ہے زباں پر آ نہیں سکتا
سمجھتے ہیں سکوتِ اہلِ عرفاں دیکھنے والے

کبھی گرداب سے بھی کھیل موجوں سے بھی ٹکرا جا
ارے ساحل پہ رہ کر جوشِ طوفاں دیکھنے والے

ترے قربان باسطؔ اور باسطؔ کی ہر اک دنیا
بہارِ وحشتِ آشفتہ حالاں دیکھنے والے

چیست ہستی؟

(از جناب ماہرؔ القادری)

چیست ہستی؟ اضطراب و انقلاب
بوئے گل، برقِ تپاں و موجِ آب

بوئے گل، خود را پریشاں میکند
ہر فضا را عطر افشاں میکند

برق در ظلمت فشاند نور را
رہ نماید، رہروِ مجبور را

موج را مرگ است یک لحظہ قرار
زندگی موج پیہم انتشار

بوئے گل شو، برق شو، یا موج شو
بعد ازیں در منزلِ ہستی بِرَو

زندگی را از عمل آراستند
جام، چوں از موجِ مے پیراستند

گوشۂ صبر و قناعت را مگیر
ہمچو راہب کنجِ خلوت را مگیر

از عمل شمعِ تمنا برفروز
تا شود شبہائے تو مانندِ روز

مردِ مؤمن مالکِ خشک و تر است
مردِ مؤمن، نائبِ پیغمبر است

ہر نگاہِ مردِ مؤمن، انقلاب
گلشنِ عالم از و یابد شباب

مردِ مؤمن در عمل، چوں موجِ آب
فطرتِ بے تابِ اُو، بوئے گلاب

مردِ مؤمن، شعلۂ جوالہ ایست
در لغاتِ اُو، سکوں را نام نیست

مردِ مؤمن را محمدؐ ابتدا است
مردِ مؤمن را محمدؐ انتہا است

مجھے لیڈروں سے بچاؤ

(”قوم“ کے قلم سے)

”غائبانہ میرا ذکر سننا، مجھے دیکھنے سے بہتر ہے“

صدیاں گذریں عرب کے ایک شاعر عنترہ نے یہ جملہ کہا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عنترہ سے زیادہ آجکل ہمارے لیڈروں پر یہ جملہ صادق آتا ہے۔ یہاں لیڈروں سے میری مراد گاندھی، جواہر لال، ابوالکلام یا خان عبدالغفار خاں کی قسم کے چوٹی کے لیڈر نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ باقی اور تمام لیڈروں سے ہے۔ اور سچ پوچھئے تو لیڈروں کی رونق ان ہی کے دم قدم سے ہے بھی۔ جواہر لال کی قسم کے لیڈر ہندوستان بھر میں ہیں ہی کتنے سے۔ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہماری ہزاروں مقامی کانگرس کمیٹیوں، مقامی مسلم لیگوں، مقامی ہندو سبھاؤں، مقامی مجلس احراروں، مقامی جمعیت علماؤں اور اسی قسم کی اور بہت سی مقامی جماعتوں کے لیڈروں کو آپ لیڈری کی صف سے نکال دیں تو پھر آپ کے لیڈرستان میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟

اور اس لئے آپ چاہیں کچھ ہی کہا کریں، میں تو اپنے ملک کے لیڈروں کی اس بھری محفل کو اُجاڑنا نہیں چاہتا۔ البتہ خدا سے یہ دعا ضرور مانگتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے لیڈری اور لیڈر دونوں سے بچائے رکھے۔ کیوں؟ اس کا جواب دینا ذرا مشکل ہے، تاہم میں کوشش کرتا ہوں مگر جواب دینے سے قبل یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسوقت میرا روئے سخن زیادہ تر مسلمان لیڈروں کی طرف ہے۔ ہندو لیڈروں کی دنیا ہی دوسری ہے، جس کا تماشا دیکھنے کے لئے کسی اور فرصت کی ضرورت ہے۔

لیڈر کسے کہتے ہیں؟ اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ آپ لیڈر کو پہچاننا چاہیں یا نہ چاہیں، وہ خود اپنے آپ کو پہچنوا دیتا ہے۔ پھر ممکن ہے کہ آپ خود بھی یہ نہ بتلا سکیں کہ لیڈر کسے کہتے ہیں مگر اتنا آپ ضرور بتلا دیں گے کہ آپ جس بستی، گاؤں، قصبہ یا شہر میں رہتے ہیں وہاں کے لیڈر کون کون ہیں۔ اس لئے میں لیڈر کی تعریف یا اس کی ”حدود اربعہ“ بتانے کی الجھن میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ رہ کر لیڈر کو دیکھیں۔ دیکھئے اگر لیڈر جیل میں نہیں ہے، اور آجکل جبکہ کانگریسی مہاتما وزارت کے دسترخوان پر آسن جمائے بیٹھے ہیں اور مسلم لیگ کے کرتا دھرتا اپنی محرومی پر دور سے کھڑے غرا رہے ہیں، جیل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بہرحال اگر لیڈر جیل میں نہیں ہے تو پھر وہ پانچ جگہ ملے گا۔ گھر پر، بازار میں، احباب کی محفل میں، عوام کی مجمع میں یا کسی باضابطہ جلسہ میں۔

اگر آپ لیڈر کے گھر پر جائیں اور وہاں آپ کے سوا اور کوئی نہ ہو تو پھر لیڈر دانت نکالکر آپ کا خیر مقدم کریگا۔ آگے بڑھ کر آپ سے مصافحہ کریگا۔ اور بڑی خندہ پیشانی سے باتیں کرنے کی کوشش کرے گا۔ ان باتوں میں وہ آپ کو بتلائیگا کہ اُسنے قوم کے لئے کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس طرح آج تک آفتوں پر آفتیں انگیز رہا ہے۔ وہ آپ کو بتلائیگا کہ اگر وہ لیڈر نہ ہوتا تو اس وقت ایک بڑے عہدہ پر ہوتا یا اس کے پاس روپے کی کمی نہ ہوتی۔ اگر وہ کبھی جیل جا چکا ہے تو آپ کو جیل کے واقعات ضرور سنائیگا۔ وہ جو بات بھی کرے گا اسکی ابتدا میں یہ ضرور کہے گا کہ یہ واقعہ اُس کے جیل جانے کے بعد کا ہے یا پہلے کا۔ دراصل جیل جانے کا یہ زمانہ ہی اُس کا سنہ ہوتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو اسی تاریخ سے ناپتا ہے۔ سنہ کا وہ قائل نہیں ہوتا اسی لیئے وہ سنہ کا ذکر آپ کے سامنے بہت کم کریگا۔ اگر آپ کسی بات پر سنہ کا حوالہ پوچھیں گے بھی تو وہ جیل جانے کے زمانہ سے حساب لگا کر ہی آپ کو بتلائے گا۔

وہ آپ کو بولنے کا موقعہ بہت کم دیگا۔ وہ قوم سے یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ بولے کم اور سنے زیادہ۔ بولنے کی خدمت وہ خود کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ کوئی غلط بات آپ سے کہے اور آپ اُسے ٹوکیں اور کہیں کہ ”مگر اخبار میں تو میں نے یہ پڑھا ہے“، تو وہ ہنسکر کہے گا ”ہاں یہ تو خاص بات تھی جو میں نے آپ سے کہہ دی۔ دراصل یہ چیز راز میں رکھی گئی ہے۔ ایسی باتیں اخباروں میں تھوڑی لائی جا سکتی ہیں۔“ اگر آپ اس سے کہیں کہ ”دیکھئے فلاں کام یوں ہونا چاہیئے تھا، مگر ایسا نہیں کیا گیا جس پر عام لوگ بہت برہم ہیں“، تو وہ ذرا پہلو بدل کر رازدارانہ انداز میں آپ سے کسی قدر قریب ہو کر کہے گا ”ہاں! مجھے خود اس کا احساس ہے لیکن میں آپ کو کیا تبلاؤں کہ میں نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔“ اس کے بعد وہ جواہر لال یا ابوالکلام کی قسم کے دو چار بڑے لیڈروں کا نام لے کر کہے گا کہ ”میں کئی گھنٹے تک ان لوگوں سے اس بات پر جھگڑتا رہا ہوں۔ آخر انہیں میری بات ماننا پڑی۔ مگر بس ڈرتے ہیں۔ وہ دراصل چیز یہ ہے کہ ان میں ایک خبیث گھسا ہوا ہے۔ یہ سب اسی کی حرکت ہے“

یہ سُنکر قدرتاً آپ پوچھیں گے کہ ”کون؟“

آپ کے اس سوال پر وہ چھت یا دیوار کی طرف غور سے دیکھنے لگے گا، گویا بڑی گہری سوچ میں پڑ گیا ہے۔ اور پھر اس طرح جواب دیگا گویا بہت دور سے، عدم سے بھی دور سے، وہ بول رہا ہے۔ وہ کہے گا ”میں آپ کو کیا بتاؤں، خیر جانے دیجئے۔ یہ تو بڑی الجھی ہوئی باتیں ہیں۔ انہیں آپ کہاں تک سنیں گے۔ بھائی ہمارا دماغ تو اب ان ہی باتوں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم تو نہ گھر کے رہے نہ باہر کے۔ آج چار روز سے چھوٹی بچی بیمار پڑی ہے، بڑے لڑکے کو نمونیہ ہو گیا، بیوی دائم المریض رہتی ہی ہیں، مگر قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ایک گھنٹہ بھی انکی تیمارداری کے لئے نہیں ملتا۔ اور پھر جب سے سیاسی کام شروع کیا ہے سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا ہے۔ خرچ وہی ڈھائی تین سو روپے ماہوار کا ہے لیکن آمدنی گھٹتے گھٹتے سو سے بھی کم رہ گئی۔ اب آپ دیکھتے نہیں کہ اس گھر کی کیا حالت ہو گئی، دیکھئے چاروں طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ بھلا میں ان کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اب تو کسی بات کا وقت ہی نہیں ملتا لیکن اس پر بھی آپ کی قوم کہتی ہے کہ روپیہ لے کر کھا گئے“ آخری جملہ کہتے وقت وہ ذرا داد طلب انداز سے مسکرائیگا۔

آپ یقیناً یہ سنکر عقیدت کے ساتھ گردن ہلائیں گے۔ اور کہیں گے ”اونہ! لوگ تو کہا ہی کرتے ہیں، آپ اس کا خیال کیوں کرتے ہیں۔“

اس پر وہ بولے گا ”جی ہاں یہ مصیبت بھی مسلمانوں ہی میں ہے۔ ہندوؤں میں لاکھوں روپیہ ادھر سے ادھر ہو جاتا ہے لیکن کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں۔ اب آپ دیکھئے انوپ سنگھ نے تیس ہزار روپیہ پر ہاتھ صاف کر دیا۔ مگر آج تک کسی نے حساب بھی نہیں مانگا۔ اور انوپ سنگھ ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ لیجئے۔ یہ سب سینکڑوں روپے ماہوار خرچ کرتے ہیں، فرسٹ سیکنڈ میں گھومتے ہیں۔ آخر یہ سب کہاں سے آتا ہے؟ قوم ہی تو دیتی ہے۔ مگر ہمارے لئے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ بھی نہیں۔ جلسوں میں تقریر کرنے کی دعوت البتہ روز چلی آتی ہے۔ آج یہاں سے بلاوا آ رہا ہے تو کل وہاں سے پھر ہم سے تو یہ بے غیرتی ہوتی نہیں کہ منہ پھاڑ کر اُن سے سفر خرچ مانگیں۔“

”تو آپ نہ جاتے ہونگے؟“ یہ سُن کر آپ یہی پوچھیں گے ”جی نہیں“ وہ ذرا فخر سے جواب دیگا ”جانا تو پڑتا ہی ہے۔ ہر مہینے خرچ کی ایک مد یہ بھی ہے۔ اب البتہ میں یہ اعلان کرنے والا ہوں کہ جسے بلانا ہو انٹر کلاس کا ڈبل کرایہ بھیجے۔ جس کو ضرورت ہوگی آپ بھیجے گا۔ ورنہ مجھے کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ مارا مارا پھروں۔“

اگر اتفاق سے لیڈر کو کہیں باہر جانا ہوا تو وہ آپ سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہے گا لیکن جب آپ اُس کے ساتھ ہو لیں گے تو وہ آپ سے اس طرح بے نیازی کے ساتھ باتیں کرتا جائیگا گویا آپ نے خواہ مخواہ اس کا پیچھا پکڑ رکھا ہے۔ اور وہ محض از راہ رحم اپنے مرتبہ سے نیچے اتر کر آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ اب اگر راستہ میں اُسے آپ سے کوئی بڑا آدمی مثلاً میونسپل کمشنر، آنریری مجسٹریٹ، چیرمین یا کامیاب قسم کا کوئی وکیل یا مختار مل گیا تو وہ زور سے اُسے آواز دیگا بڑے تپاک سے اُس سے ہاتھ ملائیگا۔ اور اس کے بعد اُس سے اسطرح مخاطب ہو جائیگا گویا بڑے اہم مسائل طے کر رہا ہے۔ اب وہ آپ کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ آپ کچھ دور اُسکے پیچھے پیچھے گھسٹتے جائیں گے جب زیادہ دیر ہو جائیگی تو آپ اُس سے کہیں گے ”اچھا تو اب میں جاتا ہوں“ آپ کا یہ جملہ سنکر وہ اس طرح چونکے گا گویا کسی بڑی گہری فکر کے عالم میں آپ نے اُسے گڑبڑا دیا ہو۔ اس کے بعد وہ کہے گا ”اچھا خدا حافظ“ اور پھر نئے ملاقاتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مصروف سخن ہو جائے گا۔

راستہ میں جس شخص کو وہ اپنے سے فروتر سمجھے گا (اور قوم کا ہر وہ آدمی فروتر ہے جس کے پاس روپیہ یا عہدہ نہ ہو) اُس سے سلام کا خواہشمند رہے گا، لیکن ۷۵ فیصدی گستاخوں سے اس کی یہ توقع پوری نہ ہوگی۔ ۲۵ فیصدی جو اُسے سلام کرینگے اُن کو اس طرح جواب دیگا۔ گویا وہ ان کا بڑا بوڑھا ہے اور اُن کے اس سعادتمندانہ فعل پر اُن کو آشیرباد دے رہا ہے۔ لیکن اگر اُسے اپنے سے بلند یا اپنی ٹکر کا کوئی ملے گا تو اس سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ مخاطب ہوگا، تاکہ آس پاس کے سننے والے یہ سمجھیں کہ یہ دونوں بڑے لنگوٹیا یار ہیں۔

آخر چلتے چلتے وہ وقت آئیگا کہ اس کے ساتھ چار پانچ آدمیوں کا جمگھٹا ہو جائیگا جو سب کے سب لیڈر ہوں گے۔ اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی لیڈری کا احساس بھی ہوگا۔

لیکن لیڈر کی شانِ لیڈری دراصل جلسوں میں نظر آتی ہے۔ جہاں وہ

قوم کے کسی لیڈر آدمی کا تو ذکر ہی کیا ہے، کسی ایسے مدعیِ لیڈری کو بھی منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتا۔ جس کو وہ لیڈری میں اپنے سے کم سمجھتا ہو۔ وہ کوشش کر کے ڈائس پر چڑھ کے بیٹھتا ہے، اور اگر وہاں جگہ نہ ہو تو پھر ٹہلتا رہتا ہے۔ خواہ مخواہ آنے جانے والے لیڈر سے باتیں کرتا ہے۔ اور اگر اس کی بدنصیبی سے کوئی لیڈر اُسے باتیں کرنے کے لئے نہ ملے تو پھر دور سے اشاروں ہی اشاروں میں کسی ڈائس پر بیٹھنے والے سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب اُسے ڈائس پر جانے کا موقعہ مل جاتا ہے تو سب سے بڑے لیڈر کے پہلو میں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اس سعادت کو حاصل کرنے کی کوشش ہر لیڈر کی طرف سے ہوتی ہے اس لئے اکثر لیڈروں کو اس میں ناکامیابی ہوتی ہے۔ مگر لیڈر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتا۔ یعنی گو اُس کا جسم دور ہو مگر اس کا "دیدہ و دل" ہمیشہ بڑے لیڈر ہی کے ساتھ رہتا ہے وہ اپنے ان رقیبوں کو جو پہلے سے آ کر بڑے لیڈر کے پہلو میں بیٹھ گئے ہیں، ہمارے شاعرِ مشرق کی طرح قہر کی نظر سے تو نہیں دیکھتا۔ لیکن دیکھتا صرف انہی کی طرف ہے۔ اور بات کرنے کا موقعہ ہو یا نہ ہو وہ بڑے لیڈر سے مخاطب ہونے کی یا کم از کم اسکی کسی بات پر زور سے ہنس دینے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ واضح ہو کہ بڑے لیڈر سے میری مراد اُن لیڈروں سے ہے جو ہماری آل انڈیا جماعتوں میں ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنائے جانے میں یا جو آجکل وزارتوں کی مسند پر بٹھلانے کے قابل سمجھے گئے ہیں۔

اس کے بعد ہمارا لیڈر تقریر کرنے کی نبض بھڑاتا ہے۔ اگر اُسے موقعہ ملجائے تو پھر وہ وقت کی پرواہ نہیں کرتا۔ بے تحاشا بولے چلے جاتا ہے جب صدر گھنٹی بجاتا ہے تو وہ "صرف پانچ منٹ" اور مانگتا ہے۔ گویا اگر اُسے یہ پانچ منٹ نہ ملے تو دنیا کا بین الاقوامی نظام درہم برہم ہو جائیگا وہ تقریر کرتے وقت مسولینی اور ہٹلر کی تصویروں کو ضرور ذہن میں رکھتا ہے اور اسی انداز سے مٹھیاں بھینچ کر بار بار ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس میں اور ہٹلر میں صرف خوش قسمتی و بدقسمتی کا فرق ہے۔ ورنہ قدرت نے صلاحیت دونوں میں ایک ہی قسم کی دی ہے۔ وہ اکثر یہ کہا کرتا ہے کہ "بھائی کیا کریں بدنصیب ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں جہاں پیغمبر بھی پیدا ہوں تو خاک چھانتے پھریں" کبھی یہ لیڈر سوشلزم کے اصول کے مطابق غیر جذباتی تقریر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھی جواہرلال کا چربہ اتارتا ہے۔ لیکن سمجھتا وہ یہی ہے کہ اسی کا اندازِ تقریر بہترین انداز ہے۔

ایک دفعہ ایک لیڈر کے ساتھ ایک کانفرنس میں جانے کا اتفاق قوم کے مجھ جیسے فرد کو بھی ہو گیا تھا۔ ان کے دولتکدہ پر پہنچا تو انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ پھر میں اور وہ دونوں چلے۔ لیکن جوں جوں جلسہ گاہ قریب آتی جاتی تھی، میں اپنے لیڈر کی نظر میں اُن کا ساتھی ہونے کے بجائے ان کا پرائیویٹ سکرٹری بنتا جاتا تھا۔ آخر وہ وقت آیا کہ پنڈال نظر آنے لگا۔ ایک موٹے سے لیڈر صاحب جن کی گمانیوں کا، موٹا سا، دھندلا سا چشمہ آنکھوں پر چڑھائے ہوئے میرے لیڈر کو دور سے دکھائی دیئے۔ اُس نے وہیں سے ہاتھ کا اشارہ کر کے بلند آواز سے انہیں پکارا۔ وہ آگے بڑھے۔ اب دونوں اس طرح ملے گویا اس عالم کا قیام صرف ان ہی دونوں کی ملاقات پر منحصر ہے لیکن ان دونوں میں... جو گفتگو ہوئی اُس میں تسلسل نہیں تھا۔ دونوں گھبرائے ہوئے سے تھے میں نے ایسا محسوس کیا جیسے دو ولی یا قطب یا غوث یا ابدال ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور رموز و نکات میں کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔

"آخر وہی ہو کر رہا نا جو میں کہتا تھا۔ وہ تو صاحب ریزولیوشن کے اسی حصہ سے انجیں چڑتی ورنہ ...."

ابھی میرے لیڈر کا یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دوسرے نے فرمایا "مگر بھائی اس کی تو خبر لینا چاہیئے۔ اب کے تمہاری باری ہے۔ کس کر رگڑ دو۔ دیکھو........"

میرے لیڈر نے بھی اپنے رفیق کی تقلید کی اور اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑا "مگر وہ جنید صاحب پھر خوشامدیں کریں گے۔ بس مجھے ان ہی کا خیال ہے۔ اور بھائی بات سچی یہ ہے کہ......"

پھر دوسرے لیڈر نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"اور ہاں بھائی وہ گورکھپور کا کیا رہا۔ میاں وہ شریف کو تو بہرحال لانا ہی ہے"

میرا لیڈر یہ سنکر بڑے زور سے ہنسا اور کہنے لگا "ارے میں تمہاری بدمعاشیاں خوب جانتا ہوں۔ مگر یاد رکھو جب تک اینجانب ہاتھ نہ جُڑوالیں گے یہ بات نہیں ہو سکتی"

"اہاہا!" دوسرا لیڈر ہنسی کو منہ میں بھر کر بولا "پھر بلواؤں صفدر کو"

اس کے بعد ایک تیسرا لیڈر آگیا.... اور اب یہ تینوں پنڈال کی طرف بڑھے۔ کچھ دیر تو میں نے اپنے ساتھی کا حق رفاقت ادا کیا مگر جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں پرائیویٹ سکرٹری کے منصب سے بھی معزول کر دیا گیا ہوں تو پھر میں ایک کونہ میں جا کر بیٹھ گیا۔

لیڈر کبھی کبھی مجھے دیکھتا تھا، لیکن دیکھنے کے باوجود اس طرح آنکھیں چرا لیتا تھا گویا دیکھ ہی نہیں رہا۔ وہ ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ جیسے جلسہ کا سارا نظم صرف اسی کی ذات سے قائم ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ جلسہ ہوا، لیڈر نے تقریر کی اور دیر تک کی۔ دوبار گھنٹی بجی تب وہ بیٹھا۔ اس کے چند منٹ بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور باہر جانے لگا۔ میرے قریب سے گذرا تو میں نے کہا "کہئے آپ چل دیئے" بولا "ہاں سر میں درد سا ہونے لگا" میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ پھر میں نے کہا "آج تو آپ خوب بولے۔ مگر کیا بات ہے وقت آپ کو بہت کم دیا" یہ سن کر لیڈر صاحب بولے "جی ہاں، وہ ہمیں وقت کیوں دینگے۔ وہ تو جنہیں بڑھانا ہوتا ہے، انہیں کو وقت ملتا ہے۔ ہم بھی ان کی جوتیاں سیدھی کرنے لگیں، جا بیجا اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں تو ہمیں بھی وقت ملنے لگے گا"

اس کے بعد لیڈر بہت دیر تک یہ بتلاتا رہا کہ چونکہ وہ بہت نڈر ہے، اور ہر ایک کو کھری کھری سنا دیتا ہے اس لئے وہ نمایاں نہیں ہوتا۔ ورنہ جواہرلال یا جناح یا ابوالکلام نہیں تو ان کے بعد کم از کم دوسرا نمبر تو اسی کا ہونا چاہیئے۔

لیڈر کی جو حالت کسی باقاعدہ جلسہ میں ہوتی ہے قریب قریب وہی بیقاعدہ محفل میں بھی ہوتی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس بیچارہ کو رکھ رکھاؤ کا خیال رہتا ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ دوسرے لوگ اس بات کا خیال نہیں کرتے۔ آپ ہی سوچیئے کہ اگر وہ بیچارہ خود ہی محفل و مجلس کے موقعوں پر آگے نہ بڑھے، خواہ مخواہ کسی کی بات پر نہ ہنسے، کسی پر کوئی فقرہ چست کرنے کی کوشش نہ کرے (اگرچہ اس کی یہ کوشش اکثر ناکام ہوتی ہے) یا اُس بڑے لیڈر سے قریب تر ہونے کی فکر میں نہ رہے جو محفل میں شمعِ محفل کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر اس غریب کی ساری لیڈری کرکری ہو کر نہ رہ جائے۔ اس لئے جہاں کہیں قوم بیٹھی ہوتی ہے وہاں ہمارا لیڈر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی لیڈری پر بٹہ لگے۔

لیڈر یہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا اُسے جانتی ہے لیکن وہ کسی کو نہیں جانتا۔ اس لئے وہ قوم کے کسی آدمی سے تعارف کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہماری یعنی قوم کی معمولی مجلسوں اور محفلوں میں آدابِ محفل کا جو خیال رکھا جاتا ہے اور ان میں ایک دوسرے کا جو احترام کیا جاتا ہے۔ لیڈر اپنے لئے اُسے ضروری نہیں سمجھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے لیڈر کے علاوہ یا اس شخص کے علاوہ جس سے اُسے کچھ فائدہ کی توقع ہو، کسی دوسرے کو اپنی برابری کی عزت نہیں دیتا۔ وہ قوم سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی عزت کرے اور عقیدتمندوں کی طرح اس سے ملے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو پھر وہ اس کے ساتھ سرپرستانہ اخلاق سے پیش آتا ہے۔ اگر وہ مولوی لیڈر ہے تو ذرا سنجیدگی اور تقشف کے ساتھ تول تول کر باتیں کریگا، اگر بہت آزاد خیال لیڈر ہے تو سموئل ہور اور لن لتھگو کی انداز میں آپ سے مخاطب ہونیکی سعی کریگا۔ لیکن اگر وہ اس سے بھی ذرا آگے ہے یعنی سوشلسٹ ہے تو پھر وہ بے نیازی کے ایک خاص انداز میں آپ سے ہمکلام ہو گا۔ مگر لیڈر کوئی سا بھی ہو، وہ اپنی ملاقات میں یہ ضرور ظاہر کرتا رہتا ہے کہ "تمہیں میری ضرورت ہے، مجھے تمہاری ضرورت نہیں"، اسی لئے وہ قوم سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ قوم کے پاس زیادہ دیر تک کھڑا نہیں ہوتا۔ اور قوم کو کسی سنجیدہ بحث کے ناقابل سمجھ کر یا تو اُسے سمجھاتا ہے اور یا پھر اُسے بُرا بھلا کہتا ہے۔ وہ لیڈری کا مطلب یہی سمجھتا ہے کہ ناصح مشفق بنکر قوم کو سمجھائے، اگر قوم اس کی بات مان لے تو پھر اُس سے کہے کہ لگاؤ اللہ اکبر، زندہ باد، اور جے کے نعرے، نکالو اس کے جلوس، ڈالو اس کے گلے میں ہار اور بناؤ اس کو ہر جلسہ کا صدر۔۔۔۔

لیکن اگر قوم اس کی بات ماننے سے انکار کرے یا بحث و تکرار کرنا چاہے تو پھر وہ قوم کی بدنصیبی پر صرف ماتم کرتا ہے۔ پھر وہ صرف یہ کہتا ہے۔

خدا جانے اس بدنصیب قوم کا حشر کیا ہو گا میں نہیں
سمجھ سکتا کہ دنیا میں اتنے احمق بھی بستے ہیں۔ ان بدنصیبوں
کو ذرا بھی شعور نہیں۔ وغیرہ وغیرہ،

میں لیڈر کی صفات، کمالات اور خصوصیات کو بیان کرنیکی کوشش تو کر رہا ہوں لیکن الحق کہ یہ کام ہے بڑا مشکل۔ لیڈر کی صفات و خصوصیات اتنی کثیر ہیں کہ اگر ان سب کو قلمبند کیا جائے تو کئی جلدوں کی ایک کتاب تیار ہو جائے۔ دراصل لیڈر ایک قوم ہے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہو گا کہ اسے ایک نسل کہا جائے۔ اس لئے کہ لیڈر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں۔ اگر خدا نے آپ کو لیڈر بنا کر پیدا کیا ہے تو پھر آپ کا ماحول کچھ ہی ہو آپ ضرور لیڈر بن جائیں گے۔ لیڈر کے لئے نہ عمر کی کوئی قید ہے اور نہ پڑھا لکھا ہونیکی ضرورت ہے۔ اسے تو کچھ اور باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیڈروں کی صف میں آپ کو ایسے لیڈر بھی مل جائیں گے جو الف کے نام بھالا بھی نہیں جانتے اور ایسے بھی ملیں گے جو پی ایچ ڈی، ڈی لٹ اور بار ایٹ لا ہیں۔

ان میں عاقل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں جو مےِ جہل سے سرشار بھی ہیں۔

غرض لیڈروں کے بہت سے درجے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دہلی کے قطب مینار کی جتنی سیڑھیاں ہیں اس سے زیادہ سیڑھیاں ہمارے لیڈروں کی ہیں۔ نچلی سیڑھی والا لیڈر ہمیشہ اگلی سیڑھی پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سب سے نچلی سیڑھی والا لیڈر بھی خود کو قوم کے بڑے سے بڑے فرد سے کمتر نہیں سمجھتا بس ان درجات کے اعتبار سے تو لیڈروں لیڈروں میں بہت کچھ امتیازات ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک قوم کا تعلق ہے ہر لیڈر قوم کے ہر فرد کو "کالا آدمی" سمجھتا ہے۔ پھر چونکہ لیڈر کو چندہ، اللہ اکبر اور زندہ باد کی ضرورت اکثر رہا کرتی ہے اس لئے وہ قوم کو "کالا آدمی" سمجھنے کے باوجود خود کو اس سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ وہ قوم کو اپنی اولاد کے برابر سمجھتا ہے ———— اور اگر وہ خود ابھی اولاد کے برابر ہو تب؟ تب خدا جانے وہ کیا سمجھتا ہوگا۔ شاید اسوقت قوم کو چھوٹا بھائی سمجھتا ہو۔

لیڈروں میں خطابات تقسیم نہیں ہوتے۔ اور نہ شاہی درباروں کی کی طرح جلسوں میں اُن کی کرسیاں نمبروار ترتیب سے رکھی جاتی لیکن اگرچہ یہ سب کچھ نہ کہا جاتا ہے اور نہ کیا جاتا ہے لیکن ہونا ایسا ہی ہے۔ بڑا لیڈر جب جلسہ میں آئیگا تو بیچ میں بیٹھے گا، اس کے بعد اس سے چھوٹا، پھر اس سے چھوٹا، پھر اس سے چھوٹا وَقِسْ علیٰ ھٰذا۔

واضح رہے کہ لیڈری میں بڑائی چھوٹائی کا معیار مقرر کرنے میں قوم کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا خود لیڈر کو ہوتا ہے۔ لیڈر کو اختیار ہے کہ وہ جس نمبر کا لیڈر چاہے اپنے کو سمجھ لے لیکن اس کا اعلان کرنا اور اسے قوم سے نیز اپنے ساتھی لیڈروں سے منوانا اسی کا کام ہوتا ہے مثلاً فرض کیجئے کہ نمبر ۶ کے لیڈر نے ایک رات بستر پر لیٹ کر عالم تنہائی میں یہ طے کیا کہ کل سے وہ نمبر ۵ کا لیڈر ہے، تو اب اس کا کام یہ ہوگا کہ ہر جلسہ میں اس مقام پر اچک کر بیٹھے جو نمبر ۵ کے لئے موزوں ہے۔ نمبر ۶ کے لیڈروں سے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ذرا کھنچ کر گفتگو کرے اور نمبر ۴ کے لیڈروں سے ربط ضبط بڑھائے۔

لاحول ولاقوۃ! میں نے بھی کیا جنجال مول لے لیا۔ لیڈری کی کہانی بیان کرنا امیر حمزہ کی داستان سنانے سے کم تھوڑی ہے۔ شیطان کی آنت کی طرح بات میں بات نکلتی ہی چلی آتی ہے۔ اچھا اب اس چیز کو تو چھوڑیئے آیئے کچھ دیر اس پر غور کریں کہ ہمارا لیڈر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

مسلمانوں کی حالت اس قافلہ کی سی ہے جو چل تو رہا ہے لیکن اسے یہ پتہ نہیں کہ جانا کہاں ہے۔ اس کے قریب ہی کچھ اور قافلے بھی جا رہے ہیں جن کے سامنے ایک خاص منزل ہے اور منزل کا راستہ بھی اُنہیں معلوم ہے۔ لیکن مسلمان کو نہ منزل کا علم ہے نہ راستہ کا۔ کچھ ہیں جو انگریزی سامراج کو نکالدینے والے قافلے کے پیچھے ہو لیئے ہیں، کچھ ہارون رشید و مامون رشید کی شان و شوکت کو یاد کر کر کے آنسوؤں کی لڑیاں پرو رہے ہیں، کچھ ان سب باتوں کو بھول کر صرف کھانے پینے کی زبان میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اس قافلہ کے ہمراہ چلے جا رہے ہیں جس کا کعبۂ مقصود روس کا پایۂ تخت ہے۔ بعض افراد کو یہ فکر پڑی ہے کہ پچھلی افراتفری میں ان کے ہاتھ جو مال غنیمت لگ گیا ہے وہ کہیں ضائع نہ ہو جائے، اسلئے وہ لوگوں کو ایک اور قافلہ کا ساتھ دینے پر اکسا رہے ہیں۔ کوئی ہندوستان کی آزادی کا تصور باندھے ہوئے ہے، کوئی اسلام کی آزادی کے خیالات میں غلطاں پیچاں ہے، کسی کو صرف دیہات کی فکر ہے، کوئی کلچر کا تحفظ چاہتا ہے، کسی کو قاضیوں اور مفتیوں کا محکمہ بنانے کی فکر دامنگیر ہے۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے مقصد کی سچائی پر کامل یقین نہیں۔ ہر ایک مذبذب سا ہے لیکن اس کے برعکس ہندو قوم کے سامنے ایک نصب العین ہے۔ وہ ہندوستان کو غیروں کے تسلط سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، وہ گیتا اور رامائن کے بھولے ہوئے سبق کو ایکبار پھر اہل ہند کو یاد دلانا چاہتے ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی جو تہذیب ڈیڑھ ہزار سال سے لٹ رہی ہے اسے لٹنے سے بچائیں، اور لٹی ہوئی چیزوں کو پھر نئے سرے سے ترتیب دے کر رکھیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کہیں ودیا پیٹھ کھول رکھی ہیں تو کہیں چرخہ سنگھ بنا رکھا ہے۔ کہیں آشرموں کی بنیاد ڈالی ہے تو کہیں اچھوت اُدھار کا کام شروع کیا ہے، کہیں ہندی پرچار کی انجمنیں کھول لی ہیں تو کہیں ودیا مندر بنائے ہیں، ہندو کے سامنے ایک منزل ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے جس کا نام گاندھی جی نے ستیہ اور اہنسا یعنی سچائی اور عدم تشدد رکھا ہے۔ اس لئے ہندو کی زندگی کے ہر شعبہ میں ایک خاص توافق و توازن، ایک خاص ہم آہنگی و یکرنگی اور ایک خاص اتحاد و اتفاق پایا جاتا ہے۔ سب کی شاہراہ ایک ہے البتہ ہر ایک نے اپنے لئے راستہ کا ایک ایک حصہ مخصوص کر لیا ہے۔ کسی نے کہا میں صرف قوم کو ہندی علوم سے آشنا کر کے اُسکے سامنے ہندو قوم کی عظمت و شوکت کا نقشہ پیش کرونگا اور اس طرح اس کے خون کو گرماؤں گا، تا کہ پھر وہ آزادی کی جنگ میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ شریک ہو، کسی نے کہا میں قوم کی توجہ پرانی گھریلو صنعتوں کی طرف مبذول کر کے اسے کام بھی دونگا اور پرانی صنعتوں سے محبت بھی پیدا کرا دونگا، تا کہ اسے معلوم ہو کہ وہ ہندوستان کتنا شاندار تھا جسے آج انگریز نے تباہ کر کے رکھدیا اور اس لئے اُسے پھر آزاد کرانا چاہئے۔ پہلی جماعت نے اپنے مقصد کے لئے ہندی ساہتیہ سمیلن بنائی اور دوسری جماعت نے اپنے کام کرنے کے ادارہ کا نام چرخہ سنگھ رکھا۔ تیسری جماعت نے راستہ کے اُس حصہ کو منتخب کیا جس میں پست طبقہ کو ابھارنے کا کام تھا تا کہ یہ طبقہ ہندو مذہب کو چھوڑ کر عیسائیت یا اسلام کو قبول نہ کر لے جس سے ہندوؤں کی اکثریت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اچھوت اُدّھار کی طرف رُخ کیا اور اچھوتوں کو یہ بتلایا کہ تم ہندو ہو اور ہندوؤں کو یہ سمجھایا کہ دیکھو اچھوتوں کو اپنے سے بدظن نہ ہونے دینا ورنہ اگر چھ کروڑ کی یہ تعداد ہمارے بیچ سے نکل گئی تو پھر آزاد ہندوستان کے مستقبل کا جو نقشہ ہم نے کھینچا ہے وہ سب خاک میں مل کر رہ جائیگا۔ غرضکہ اسی قسم کے مختلف کام ہر ایک نے شروع کر رکھے ہیں اور پھر چونکہ ان سب میں مرکزیت کو قائم رکھنے کی سخت ضرورت تھی اس لئے گاندھی کو بطور وسطی نقطہ کے سب نے قبول کر لیا۔ سیاست سے لیکر معاشرت و معیشت تک کے تمام کام اسی نقطہ کے چاروں طرف گھومتے ہیں۔ ہر ایک کام کی باگ ڈور گاندھی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں کہیں اس نے کسی کو دائرہ کے خط سے ذرا اِدھر اُدھر ہوتے دیکھا اور چپکے سی رسی کو جھٹکا دیا۔ گاندھی کی اسی مرکزیت کو باقی رکھنے کے لئے کچھ لوگوں نے گاندھی سیوا سنگھ کے کام کے لئے خود کو وقف کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ جب کسی قوم کے آگے نصب العین ہوتا ہے تو پھر اس کا ہر کام اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ دیکھیئے ہندو مہاسبھا کانگریس کی کتنی مخالف ہے، لبرل فیڈریشن کو کانگریس سے کتنی چڑ ہے، مدراس کی جسٹس پارٹی کو کانگریس سے کتنا بیر ہے مگر اس کے باوجود چونکہ ہندو قوم کے ایک متفقہ نصب العین کی طرف کانگریس قدم بڑھا رہی ہے۔

اس لئے چند افراد کے شور و غوغا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر کھارے نے ذرا چیں پٹاخ کی تو آج اس طرح غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ مسٹر نریمان نے بھی ذرا اکڑفوں دکھلانا چاہی تھی، مگر ہوا کیا، آخر چپ ہو کر بیٹھنا پڑا۔ اور پھر سب سے بڑی اور تازہ مثال تو سوبھاش بوس کی ہے۔ انھوں نے بغاوت کرنا چاہا تھا مگر ہندو قوم نے ان کی پیٹھ پر ایک ایسا جما ہوا ہاتھ رسید کیا ہے کہ آج تک کمر سیدھی نہیں ہوئی اور جب کبھی ذرا ہوا تیز چلے گی وہ اپنی کمر میں درد محسوس کیا کریں گے۔

مگر مسلمان کا حال اس سے نرالا ہے۔ اُسے نہ یہ خبر ہے کہ وہ آزاد ہندوستان میں کیونکر رہے گا۔ اور نہ یہ پتہ ہے کہ غلام ہندوستان میں اس پر کیا گذریگی۔ اس لئے کبھی تو وہ مسلم لیگ میں چلا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انگریز سے دوستی اور ہندو سے دشمنی کر کے ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچ جائے لیکن جب اس طرح اُسے مقصد براری ہوتی نظر نہیں آتی تو پھر وہ جی کڑا کر کے کانگریس میں آ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہو سو ہو، پہلے ہندوستان کو آزاد کرا لو۔ کبھی وہ سوشلسٹوں کے کیمپ میں گھس جاتا ہے ———— لیکن کسی جگہ بھی اس کے دل میں وہ اعتماد، وہ جذبہ، وہ سکون، وہ جوش و خروش نہیں ہوتا جو ایک نصب العین کے حصول کے لئے ہندو میں پایا جاتا ہے۔ مسلمان کا تو یہ حال ہے کہ وہ مسلم لیگ میں ہوگا تو ہندو کو پانی پی پی کے کوسے گا اور اس کے بعد جو وقت بچے گا۔ اس میں گود پھیلا پھیلا کر جمعیت علمائی، کانگریسی اور احراری مسلمانوں کو بد دعائیں دیگا۔ وہ دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورہ پیٹتا پھریگا کہ یہ چند غدار اگر نہ ہوتے تو ہم نے میدان مار لیا تھا۔ اسی طرح غیر مسلم لیگی مسلمان مسلم لیگیوں کو بُرا کہنے میں وقت گذارتے ہیں۔ وہ ان کو ٹوڈی، رجعت پسند، خوشامدی ٹٹو، انگریز کے پٹھو کہہ کہہ کر جی خوش کیا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو دونوں سے الگ ہو کر صرف "عیش کرنے" کو زندگی کا مآل سمجھتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ:-

گولی ان دونوں کے مارو، ڈٹ کے قوالی سنو

الغرض قصہ مختصر یہ کہ ہمارے لیڈرستان کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے اس کا سبب میرے خیال میں مسلمانوں کی یہی "بے نصب العینی" ہے۔ ممکن ہے میرا یہ خیال صحیح نہ ہو۔ بہرحال اس وقت میں واعظ و ناصح کا پارٹ ادا کرنا نہیں چاہتا۔ آپ کو اختیار ہے میری یہ رائے مانیں یا نہ مانیں۔ البتہ یہ آپ کو ضرور ماننا پڑے گا کہ ہمارے لیڈروں کی حالت، بہت خراب۔ اوپر کے چند چوٹی کے لیڈروں سے اس وقت بحث نہ کیجئے۔ ابوالکلام، محمد علی جناح، حسین احمد، خان عبدالغفار خاں یا اسی قسم کے اور دو چار یا دس پانچ بزرگوں کو چھوڑ دیجئے۔ اس وقت تو آپ اُن ہزاروں پریزیڈنٹوں، وائس پریذیڈنٹوں، سکرٹریوں اور جوائنٹ سکرٹریوں کو دیکھئے جو ہر جگہ کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، اور جنھوں نے سیاست کی ساری فضا میں زہر پھیلا رکھا ہے۔ ہندوؤں میں بھی اس ٹائپ کے لیڈر بہت ہیں مگر ان میں عام طور سے انکساری، فروتنی اور اخلاق و مروت کے ساتھ خدمت و ایثار کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن مسلمان لیڈروں میں کم از کم میں نے تو ننانوے صحیح تین بٹہ چار فیصدی میں یہ جذبات نہیں دیکھے۔ پھر میں یہ مانتا ہوں کہ جب سے کانگریس کے ہاتھ وزارت کی "گانٹھ" لگی ہے، ہندو لیڈروں کے دماغ ذرا عالم بالا کی سیر کرنے لگے ہیں۔ مگر پھر بھی گاندھی کے فلسفہ کا اثر ان کے دماغ پر ابھی تک ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

ان میں بھی اینٹھنے اترانے والے اب کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں مگر صرف استثنا کی طرح جو کلیہ کو توڑ دیتا ہے لیکن بذات خود اتنا حقیر ہوتا ہے کہ اُسے دیکھنے کے لئے خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن الٰہ رکھے ہمارے مسلمان لیڈروں کا عالم تو بلا استثنا یہ ہے کہ وہ لیڈر ہوتے ہی چھپنے کے بھی شائق رہتے ہیں اور زندہ باد سننے، ہار پہننے اور جلسوں کے صدر بننے کی بھی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے نہ قوم ہوتی ہے نہ قوم کا باپ، یہ تو صرف لیڈری چاہتے ہیں یعنی یہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جواہر لال کی طرح اُن کے بیانات چھپیں، جہاں یہ جائیں وہاں ان کا جلوس نکلے، جلسوں کی صدارت کے لئے ان کا نام منتخب کیا جائے۔ کسی مجلس میں بیٹھیں تو ذرا اِترا اِترا کر اور بن بن کر باتیں کریں، اور چاہے خبر نہ ہو سبنت کی بھی مگر سیاست پر تبصرہ اس طرح کریں گو یا سیاست کی دی ہی ان پر اُتری ہے ——— درحاصل ان تمام مساعی کا یہ ہے کہ قوم انہیں لیڈر سمجھے اور بس۔ اس کے سوا رہے نام اللہ کا!!

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ بیچارے لاکھ جتن کرتے ہیں، جھوٹ یہ بولتے ہیں، پارٹیاں یہ بناتے ہیں، غرض کوئی ایسی "نیکی" نہیں ہوتی جو اس سلسلہ میں ان سے سرزد نہ ہوتی۔ اگر آپ ان سے کہئے کہ "یہ بات تو حق پسندی کے خلاف ہے" تو یہ تڑاق سے کہیں گے کہ "بس رہنے دیجئے اپنی حق پسندی کو سیاست میں حق پسندی کی کوڑیاں نہیں اُٹھتیں"!!

اگر کہیں جلسہ ہوگا تو یہ ضرور پہنچیں گے اور محض اس لئے تقریر کرینگے تاکہ لوگ ایکبار پھر ان کا چہرۂ انور دیکھ لیں۔ اگر کسی جگہ بڑے لیڈر بیٹھے ہونگے تو یہ گھس پیٹھ لگا کر وہاں تک ضرور پہنچیں گے اور کسی نہ کسی بہانہ سے اُن سے دو ایک باتیں کرنے کی کوشش فرمائیں گے تاکہ قوم انہیں چھوٹا لیڈر نہ سمجھ لے۔ وہ جب باتیں کریں گے تو ہمیشہ ابوالکلام، جناح، حسین احمد، سر سکندر، نواب اسمٰعیل، جواہر لال جیسے افراد کے ساتھ اپنی بے تکلف گفتگوؤں کا تذکرہ ضرور کریں گے تاکہ سننے والے پر یہ اثر پڑے کہ ان لوگوں سے ان کا کتنا یارانہ ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ایک ٹولی ہوتی ہے جو "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کے بموجب ایک دوسرے کی دوسرا ہی کرتی ہے۔ اگر کوئی نیا شخص محض خدمت کے جذبۂ خالص سے متاثر ہو کر میدان میں آتا ہے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ انہیں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لیڈری کے جس دسترخوان پر ہم بلاؤ بنے بیٹھے ہیں اس کی ساری پلیٹیں یہی چٹ کر جائے، اور ہم یونہی رہ جائیں۔ چنانچہ پہلے پہلے تو وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ یہ ہمارا زیر اثر ہو کر رہے تاکہ ہم جس طرح چاہیں اپنے مقاصد کے لئے اسے استعمال کرتے رہیں، لیکن اگر انہیں اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو پھر وہ اسے حقیر و بے وقعت بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

غرض ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ صرف اخبار پڑھتے ہیں اور دور سے سیاست کو دیکھتے ہیں، تب تو آپ کے دل میں سیاست کی، لیڈروں کی اور لیڈروں کی قربانیوں کی کافی وقعت رہ سکتی ہے، لیکن اگر سوئے اتفاق سے آپ لیڈروں سے قریب ہو گئے تو پھر آپ کی یہ رائے بھک سے اڑ جانیوالے مادے کی طرح ایکدم بھک سے اڑ جائیگی۔ اس لئے قوم کے ذہن و دماغ کی حفاظت کی خاطر میری دعا یہی ہے کہ جبتک ہمارے لیڈرستان کی آب و ہوا ٹھیک نہ ہولے خدا اس ——— بچاری قوم کو لیڈروں سے بچا!

جو ہر بات میں حق، انصاف اور معقولیت کے بجائے اپنی پارٹی، ٹولی اور جماعت کو دیکھتے ہیں اور اپنی پارٹی کے وقار کے لئے ایکبار نہیں اگر ایک لاکھ بار بھی حق و انصاف کی بھینٹ چڑھانا پڑے تو ہرگز کوئی تامل نہیں کرتے۔

مصر پر ایک سرسری نظر

(از۔ ا۔ ش)

اسلامی ممالک میں مصر ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ نہ صرف مسلمانان ہند کو بلکہ یہاں کے عام باشندوں کو بھی بہت گہری دلچسپی ہونی چاہئے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی دلچسپی کی وجہ تو بالکل صاف ہے کہ مصر ایک اسلامی ملک ہے جہاں کی کثرت آبادی اس مذہب کے نام لیواؤں پر مشتمل ہے جو ہمارا مذہب ہے اور جس نے قومیت و وطنیت کی زنجیروں سے آزاد کر کے ہمارے درمیان الفت و مودت کا نہایت مستحکم اور مضبوط رشتہ قائم کر دیا ہے جو اہل مصر کو بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا مسلمانان ہند کو۔ رہی دوسرے باشندوں کی دلچسپی کی وجہ تو وہ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ مصر و ہندوستان کی سیاسیات ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرا لگاؤ رکھتی ہیں۔ اتنا گہرا کہ اگر ہم یہ کہیں کہ ان دونوں کے کامل اتحاد اور یگانگت کے بغیر ان میں سے کسی ایک کا بھی برطانوی استعمار کی لعنتوں سے پوری طرح نجات پانا بہت زیادہ دشوار ہے تو غالباً یہ مبالغہ نہیں ہوگا اور کم از کم اتنی بات تو بہرحال کہی جا سکتی ہے کہ مصر کے ساتھ تعلقات قائم کر کے ہم اپنی تحریک آزادی کو بہت زیادہ تقویت پہونچا سکتے ہیں۔ ان دونوں ممالک میں سے ایک نہر سوئز کی وجہ سے اور دوسرا اپنی زرخیزی اور بعض دیگر خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے کی غلامی کا باعث ہیں۔ ہندوستان کی خصوصیات نے اگر انگریزوں کا دل بری طرح نہ موہ لیا ہوتا اور وہ اس کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے نہر سوئز کے (جو ہندوستان کا راستہ ہے) محتاج نہ ہوتے تو مصر کب کا آزاد ہو چکا ہوتا۔ اسی طرح اگر نہر سوئز کا راستہ انگریزوں کے لئے کھلا ہوا نہ ہوتا تو ہندوستان پر سے برطانیہ کی گرفت کب کی ڈھیلی ہو چکی ہوتی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ ہندوستان و مصر میں سے ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی پر موقوف ہے اور اگر بالفرض یہ نہ بھی تسلیم کیا جائے کہ ان دونوں کی آزادی کا باہم اتنا گہرا تعلق ہے تو ان کے تعارف و تعاون کی ضرورت کے لئے صرف اتنی ہی بات کافی ہے کہ دونوں کا سابقہ ایک ہی دشمن سے پڑا ہے اور اگر اس کے مقابلہ کے لئے دونوں کے درمیان اتحاد پیدا ہو جائے تو زیادہ آسانی کے ساتھ اس پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ مصر و ہندوستان کے باہمی دوستانہ روابط ہمارے ملکی آزادی کے نقطۂ نظر سے بھی بے انتہا مفید اور ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے وطن کے مخلص و فہیم لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر مصر کی سب سے بڑی مخالف استعمار پارٹی یعنی جماعت وفد کا ایک وفد ابھی حال میں ہندوستان آیا تھا اور اسی بنا پر وفد پارٹی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے وفد بھیجنے کا مسئلہ اس وقت کانگریس کے اعلیٰ حلقوں میں زیر غور ہے۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے اہل وطن مصر و ہندوستان کے تعلقات کیلئے کوشش کرنا تو درکنار مصر کے حالات سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ مصر کا وفد آیا بھی اور چلا بھی گیا لیکن اسکی آمد سے صحیح فائدہ حاصل کرنیکی بجائے ہم نے اس کو زیادہ تر اپنے چھوٹے چھوٹے اور حقیر اغراض کے لئے استعمال کیا۔ مسلم لیگ نے تو محض اس لئے کہ یہ وفد کانگریس کی دعوت پر اور اس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے آیا تھا، اس کے ساتھ اس درجہ بداخلاقی برتی کہ اس کے اتحاد اسلامی کے بلند بانگ دعاوی کا بھی پول کھل گیا اور جس جماعت نے اس کے استقبال و اعزاز کے شاندار مظاہرے کئے اس کی اکثریت نے بھی اپنے پیش نظر سوا اس کے اور کوئی مقصد نہیں رکھا کہ مسلمانوں میں کانگریس کا پروپیگنڈا کیا جائے اور اراکین وفد نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تقویت کے لئے جو بعض قیمتی مشورے دیئے تھے انھیں بھی اپنے مقصد کے مطابق ڈھال کر اپنے شرمناک اغراض کے لئے استعمال کیا جائے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وفد کی آمد اپنے حقیقی نتائج کے اعتبار سے اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک بے سود ثابت ہوئی اور اس سے اتنا بھی فائدہ نہیں ہوا کہ کم از کم مصر کے حالات سے ہمارے اندر دلچسپی پیدا ہو جائے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ مصر کے ساتھ نہ صرف مسلمانان ہند کا بلکہ یہاں کے عام باشندوں کا بھی بہت گہرا تعلق ہونا چاہئے اور اگر بحالات موجودہ کسی وجہ سے ہم اس کے ساتھ اپنے اتنے گہرے روابط قائم نہیں کر سکتے ہیں کہ اس کا اثر ہماری جنگ آزادی پر پڑے تو وہاں کے حالات سے کچھ نہ کچھ واقفیت تو ضروری طور پر ہونی چاہئے۔ یہ چیز ملکی آزادی کے نقطۂ نظر کے علاوہ اور گوناگوں اعتبار سے ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اور جہاں تک خالصًا مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ بہرحال مصر کے ساتھ لگاؤ اور دلچسپی رکھنے پر فطری طور پر مجبور ہیں۔ انہی وجوہ کو سامنے رکھ کر ہم چاہتے ہیں کہ مصر کے کچھ سرسری حالات ناظرین مدینہ کو سنائیں۔ امید ہے یہ ان کے لئے دلچسپ اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔

مصر کا دور غلامی

مصر اگرچہ کوئی بہت بڑا ملک نہیں ہے اس کا رقبہ زیادہ سے زیادہ چالیس لاکھ میل مربع ہوگا لیکن قدرت نے اس کو کچھ ایسی خصوصیتیں عطا فرمائی ہیں کہ ان کی بنا پر وہ ہمیشہ فاتح اقوام کا مطمح نظر رہا۔ جبتک نہر سوئز جاری نہیں ہوئی تھی اسوقت تک مصر کی زرخیزی اور خوشحالی بیرونی طاقتور قوموں کی دلکشی کا باعث بنتی رہی۔ چنانچہ بارہا دنیا کی طاقتور قوموں نے اس پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان میں بعض بعض اپنی کوشش میں تھوڑے عرصہ کے لئے کامیاب بھی ہوئیں اور جب نہر سوئز کے ذریعہ بحر احمر اور بحر ابیض کا اتصال ہو گیا تو اس کے بعد مصر کی اہمیت مستعمر قوموں کے نقطۂ نظر سے اتنی بڑھ گئی کہ اس کا حصول ان کا سب سے بڑا مقصد حیات قرار پا گیا۔ ان قوموں میں برطانیہ کو مصر پر اقتدار حاصل کرنے کی سب سے زیادہ فکر تھی کیونکہ اس کے مصالح بالخصوص ہندوستان پر قبضہ کے نقطۂ نظر سے نہر سوئز کے ساتھ نسبتہ زیادہ وابستہ تھے اور اسے اس کی خوش قسمتی کا نتیجہ کہئے یا اس کے مکر و فریب کے کمال کا کہ ان قوموں میں کامیابی اسی کے حصہ میں آئی۔ نہر سوئز جس کی تعمیر کی انگلستان نے اپنے بعض مصالح کی بنا پر ابتدا میں مخالفت کی تھی اس کی اجارہ داری میں وہ اپنی چالاکیوں کی بدولت اسقدر آسانی سے شریک ہو گیا کہ فرانس وغیرہ دیکھتے کے دیکھتے

ہو گئے۔ پہلے تو اس نے اسماعیل پاشا کا بال بال قرضے سے جکڑ دیا اور پھر ان سے چالیس لاکھ پونڈ میں کمپنی کے حصے اس طرح خرید لئے کہ خود برطانوی پارلیمنٹ کو اس کا علم معاملہ پوری طرح طے ہو جانے کے بہت دنوں بعد ہوا۔ یہی حال اس کے پورے مصر پر قبضہ حاصل کرنے کا ہوا۔ نہر سویز کے قیام سے بہت پہلے انگریز مصر میں اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے کے لئے خفیہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں مصروف تھے اور سلاطین عثمانیہ کی بے پروائی اور غفلت کی بنا پر ان کو اپنے اس مقصد میں اس حد تک کامیابی حاصل ہو گئی کہ اگرچہ مصر کے گورنروں کا تقرر باب عالی کے حکم سے ہوا کرتا تھا۔ لیکن ان کے عزل و نصب کا حقیقی اختیار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور انہی کے اشارۂ چشم و ابرو پر حرکت کیا کرتے تھے اور آخر میں تو انھوں نے مصر میں اتنا اثر و اقتدار حاصل کر لیا کہ جب ۱۹۱۴ء میں عباس حلمی پاشا جو انگریزوں سے طبعاً متنفر تھا، ٹرکی گیا تو انگریزوں نے اسکی عدم موجودگی میں سلطان حسین کامل کی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور خود حکومت ٹرکی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس تاریخ کے بعد مصر کا تعلق ٹرکی سے بالکل منقطع ہو گیا اور نظم و نسق کے تمام تر اختیارات انگریزوں کی مٹھی میں آ گئے۔

غلامی کے بعد

مصر پر انگریزوں کے استیلاء کے بعد اہل مصر کو جن بربادیوں اور تباہیوں کا منھ دیکھنا پڑا ان کے یہاں بیان کی کوئی حاجت نہیں ہے ان کا اندازہ کرنے کے لئے خود ہندوستان کی حالت کا تصور کر لینا ہمارے لئے کافی ہے، ہندوستان کی دولت لوٹنے، ہندوستانیوں کا خون چوسنے ان کے اخلاق و معاشرت کو بگاڑنے، ذہن و دماغ کو ماؤف بنانے اور صنعتوں و حرفتوں کو پامال کرنے وغیرہ کے سلسلہ میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں ہندوستان میں انجام دیئے ہیں بعینہ وہی کارنامے مصر میں بھی انجام دیئے گئے ہیں اور اس لحاظ سے مصر و ہندوستان کی حالت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ تاہم ہم ذیل میں مصر کے متعلق چند اعداد و شمار شائع کرتے ہیں جو ایک مصری رسالہ سے ماخوذ ہیں ان سے آپکو ہندوستان و مصر کی حالات میں تشابہ کا کسی قدر اندازہ ہو سکیگا۔

(۱) مصر کے ایک فرد کی مملوکہ زمین کا اوسط ۲۲ر۳ ایکڑ ہے اور غیر ملکیوں کا ۸۵ر۷ ایکڑ۔

(۲) کاروبار میں ۵۰ ملین کا سرمایہ لگا ہوا ہے جس میں صرف ۵ ملین اہل وطن کا ہے اور بقیہ غیر ملکیوں کا ہے۔

(۳) مصر کے چالیس لاکھ باشندے ایسے ہیں جو صرف ایک پونڈ ماہوار آمدنی پر گذارا کرتے ہیں اور ۵۵ لاکھ ایسے ہیں جن کی ماہوار آمدنی تین پونڈ ہے۔

(۴) ۱۲ ملین مصری ایسے ہیں جن کے پاس قابل کاشت زمین ایک انچ بھی موجود نہیں ہے۔

(۵) اموات کا تناسب ہزار میں ۲۵ سے ۲۷ تک ہے حالانکہ دوسرے ممالک میں یہ تناسب ۹ سے کسی حال میں نہیں بڑھتا ایک مصری کی اوسط عمر ۲۴ سال سمجھی جاتی ہے جبکہ متمدن ملکوں میں عمر کا تناسب ۴۵ اور ۶۰ کے درمیان ہوتا ہے۔

(۶) ملک میں تعلیم کا تناسب ۱۰ فیصدی سے بھی کم ہے۔

اگر صرف انہی مختصر و مجمل اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو ان سے بھی یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سرزمین جو علوم و فنون کا گہوارہ تھی جس کی صحت بخش آب و ہوا دنیا کے لئے قابل رشک تھی اور جو اپنی زرخیزی اور خوشحالی کے اعتبار سے اب بھی ایک خاص امتیاز کی مالک ہے، انگریزوں کی غلامی کی بدولت اس کی حالت کس درجہ خراب و ابتر ہو چکی ہے۔

تحریک آزادی

مصر میں غیر ملکی اثر و اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ، اہل مصر کی تباہیوں اور بربادیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ ملک کے سمجھدار اور دوراندیش لوگوں کو یہ خطرہ لاحق ہونے لگا کہ اگر حالات کی اصلاح و تدارک کی جلد کوشش نہ کی گئی تو اس کا انجام مصری قوم اور مصر کے لئے بے انتہا افسوسناک ہوگا، چنانچہ غیر ملکی اثر و اقتدار کے خلاف سب سے پہلی موثر آواز خدیو اسماعیل کے زمانہ میں جس نے مصر میں انگریزوں کو پوری طرح قدم جمانے کا موقع دیدیا تھا، جمال الدین افغانی کی بلند ہوئی اس آواز نے مصریوں کے دلوں میں حصول آزادی کی ایک زبردست تڑپ پیدا کر دی جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۸۸۲ء میں بغاوت کا آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا اور اعرابی پاشا کی زیر قیادت مصریوں نے آزادی کے حصول کے لئے اپنی جان و مال کی بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں لیکن آزادی کی یہ تحریک قوت و شدت کے ساتھ دبا دی گئی۔ اس کے بعد بظاہر کچھ دنوں کیلئے ملک میں سناٹا چھا گیا لیکن بغاوت کی آگ اندر اندر سلگتی رہی اور شیخ محمد عبدہ اور مصطفیٰ کامل جیسے مخلص اور پرجوش رہنماؤں نے مصریوں کے دلوں میں آزادی کا اتنا شدید جذبہ پیدا کر دیا کہ جب جنگ عظیم کے خاتمہ پر انگریز اپنے وعدہ اور اہل مصر کی توقع کے خلاف مصر پر سے اپنا اقتدار اٹھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو تمام ملک میں ایک عام شورش برپا ہو گئی اور وہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اس عزم کے ساتھ میدان میں نکل آئے کہ دنیا کی سخت سے سخت مصیبتیں بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کر سکیں گی خوش قسمتی سے ان کو اپنی رہنمائی کیلئے سعد زاغلول پاشا جیسا دلیر، مخلص، پرجوش اور صائب الرائے رہنما مل گیا جس میں نہ گاندھی جی کی تنگدلی اور فرقہ پرستی تھی اور نہ مسٹر جناح کی راحت طلبی و عیش کوشی۔ ایک طرف انھوں نے اقلیتوں کے تمام اندیشے قبل اس کے کہ ان کے دل سے زبان پر آئیں رفع کر دیئے اور دوسری طرف وہ خود سب سے پہلے جبر و استبداد کے مقابلہ کے لئے سامنے آ گئے۔ اور قید و بند اور جلاوطنی کی جس قدر مصیبتیں پیش کی گئیں سب کو انھوں نے مسرت اور اطمینان کے ساتھ خوش آمدید کہا! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مصر ایک ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور آزادی کے لئے اس درجہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا کہ بالآخر حکومت برطانیہ کو ۱۹۲۲ء میں جو شرائط کے ساتھ مصر کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔ تمام جلاوطن واپس بلائے گئے مصر کے لئے ایک جدید آئین مرتب کیا گیا، پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا اور خود زاغلول پاشا نے کیبنٹ مرتب فرمائی لیکن یہ آزادی بھی محض نمائشی تھی، کہنے کو تو انگریزوں نے بہت کچھ اختیارات اہل ملک کے ہاتھوں میں منتقل کر دیئے تھے لیکن نظم و نسق پر ان کی گرفت پہلے ہی کی طرح مضبوط تھی۔ شاہ مصر انگریزوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح حرکت کرتے تھے اور انگریز جو چاہتے تھے ان کے ذریعہ عمل میں لاتے تھے۔ ان حالات میں سعد زاغلول نے استعفا دیدیا اور ان کے بعد زیور پاشا کی رہنمائی میں اعتدال پسندوں کو وزارت قائم کرنے کا موقع ملگیا مگر اس اثنا میں عوام میں اس قدر بیداری اور جوش پیدا ہو چکا تھا کہ وہ زیور پاشا جیسے لوگوں کی وزارت کو قبول کرنے پر کسی حال میں تیار نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ شورشیں اور فتنے برپا ہوئے جن کے نتیجہ میں زیور پاشا کو مستعفی ہونا پڑا اور پارلیمنٹ کے نئے انتخابات ہوئے جن میں زاغلول پاشا کی پارٹی پھر نمایاں اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گئی۔ اب کے بار زاغلول پاشا نے وزارت نہیں بنائی صرف پارلیمنٹ کے صدر بن گئے لیکن برطانیہ کو پارلیمنٹ اور وزارت سے خطرہ بہرحال پیدا ہو گیا تھا اس لئے اس نے آئین دستور کو ہی سرے سے معطل کر دیا اور اس طرح شاہ مصر کو ڈکٹیٹرانہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ اور انگریزوں کی چشم و ابرو کی حرکت پر وزارتیں بننے اور بگڑنے لگیں۔ اس صورت حالات نے پرجوش مصریوں کو اور زیادہ مشتعل بنا دیا اور وہ انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے لیکن خوش قسمتی سے بین الاقوامی حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی کہ انھیں اپنے جذبہ حریت اور جوش آزادی کا زیادہ سخت مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبش پر حملہ کر دیا اور برطانیہ کو یہ خطرہ دامنگیر ہو گیا کہ مصر و اٹلی کا اتحاد اس کے لئے خطرات کا باعث نہ بن جائے۔ چنانچہ اس نے مصریوں کو رام کرنے کی کوشش کی، دستور بحال کیا گیا۔ پارلیمنٹ کا از سر نو انتخاب ہوا اور مصر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کے رو سے مصر سے برطانوی انتداب ختم کر دیا گیا۔ غیر ملکیوں کو مصر میں جو خصوصی مراعات حاصل تھیں منسوخ کر دی گئیں اور مصر کو جمعیۃ اقوام کا ممبر بننے کی بھی اجازت دیدی گئی۔

معاہدہ کے بعد

اس معاہدہ کی رو سے اگرچہ جیسا کہ آگے چلکر ہم بتائیں گے مصریوں کو کامل آزادی نہیں ملی ہے، مصر کو عسکری حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے برطانیہ نے معاہدہ میں اپنے لئے کافی مراعات رکھی ہیں اور مصریوں کو بعض ایسی باتوں کا پابند کر دیا ہے جو صراحۃً آزادی کے منافی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس معاہدہ نے مصریوں کے لئے آزادی کامل کا راستہ پوری طرح کھول دیا ہے اور معاہدہ کے بعد مصر جس طریق پر آگے بڑھ رہا ہے اس کے پیش نظر یہ توقع ہے کہ وہ آزادی کامل کے عروس سے مستقبل قریب میں ہمکنار ہونے والا ہے۔ یہ بات بدقسمتی کی ضرور ہے کہ معاہدہ کے بعد ہی مصر میں جماعتوں اور پارٹیوں کی شدید کشمکش رونما ہو گئی ہے یہاں تک کہ خود وفد پارٹی میں زبردست اختلاف پیدا ہو گیا ہے جس نے پارٹی کو دو مخالف جماعتوں میں جن میں سے ایک کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا اور دوسری (ھیئۃ سعدیہ) کے علی ماہر پاشا ہیں، تقسیم کر دیا ہے اور ان کے آپس میں اس درجہ تعیض بڑھ گئی ہے کہ موتمر فلسطین کے مقصد کے ساتھ اتفاق رکھنے کے باوجود وفد پارٹی نے اس میں محض اس بنا پر حصہ لینا پسند نہیں کیا کہ اس کے داعی مخالف گروپ سے تعلق رکھتے تھے[۱] اور . . . .

---

[۱] اخبار المصری "نے جو وفد پارٹی کا زبردست نقیب ہے فلسطین کانفرنس (منعقدہ مصر) کے موقع پر، قضیۂ فلسطین کے ساتھ وفد پارٹی کی دلچسپیوں کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل خیال ظاہر کیا تھا۔

" اہل عرب قضیۂ فلسطین کے سلسلہ میں وفد پارٹی اور اس کے مخالفین کے رویہ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اگر وفد نے کانفرنس کا مقاطعہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلسطین کے ساتھ وفد پارٹی کو ہمدردی نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں . . . . . . وفد پارٹی ایک ایسی کانفرنس میں کیسے حصہ لے سکتی تھی جس کے صدر علوبہ پاشا ہیں جو موجودہ انقلاب کے ایک بہت بڑے رکن ہیں اور جس کے سکریٹری محمود ابو رحاب آفندی اور جسکے کارکن اس عہد انقلاب کے [illegible]

سعد زاغلول پاشا کے مجسمہ کی نقاب کشائی کے جلسہ میں وفد پارٹی کو بحیثیت جماعت اس لئے مدعو نہیں کیا گیا کہ دعوت دینے والوں کو اس جماعت سے ذاتی رنجشیں ہیں حالانکہ دوسری پارٹیاں جن کا سعد پاشا سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا باقاعدہ مدعو کی گئیں ——— لیکن یہ اختلافات و نزاعات عارضی ہیں۔ جب کسی قوم کو مدتوں کی غلامی کے بعد اختیارات حاصل ہوتے ہیں تو بالعموم تفوق و اقتدار کے حصول کے لئے آپس میں اس قسم کے تنازعات شروع ہی ہوجایا کرتے ہیں اور پھر وہ ایک مدت کے بعد رفتہ رفتہ کم ہوتے ہیں۔ مصر اس وقت جس دور سے گذر رہا ہے وہ کوئی مستقل اور دیرپا دور نہیں ہے ہمیں توقع ہے اور حالات کی رفتار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مصری قوم کی مصلحت بینی وقتی رجحانات پر جلد غالب آجائے گی اور کامل آزادی کے حصول اور اس کی حفاظت کے لئے وہ پہلے کی طرح متحد ہو کر جدّ و جہد کریں گے۔

اصلاح و ترقی کے دور کا آغاز

یہ بات خوش آیند ہے کہ معاہدہ کے بعد اصلاح و تعمیر کے جس دور کا آغاز ہونا چاہیئے تھا وہ وسیع پیمانہ پر شروع ہوگیا ہے اور جماعتی جنگ و پیکار کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ برطانوی انتداب و سیادت کے دوران میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں وہ اتنی معمولی نہیں ہیں کہ ان کی اصلاح و تدارک کے لئے تھوڑا عرصہ کافی ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور ہر خرابی اپنی اصلاح کے لئے طویل جدّ و جہد کی محتاج ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مصر گذشتہ خرابیوں کی اصلاح و تدارک اور آیندہ ترقیوں کا راستہ ہموار کرنے میں پورے جوش و استقامت کے ساتھ مصروف عمل ہے اور اس کے اثرات روز بروز نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ مصر کی اس قسم کی اصلاحی و تعمیری کوششوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ان کے سرسری اندازہ کے لئے ہم چند باتیں بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

اقتصادی حالت سدھارنے کی کوشش

مصر کو ۱۹۳۶ء کے معاہدہ سے جو سب سے بڑا فائدہ پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ مالی نظام پر اسے کنٹرول کا پورا پورا اختیار حاصل ہوگیا ہے۔ مصر میں جب تک غیر ملکی اقتدار و سیادت قایم کی تھی اس وقت ایک طرف تو اس کے خزانہ کا بیشتر حصہ ایسے کاموں پر صرف ہوتا تھا جو صرف غیر ملکی اقتدار کے نقطۂ نظر سے ضروری تھے اور جن سے مصریوں کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہونچتا تھا اور دوسری طرف اسے اپنی خوشحالی وغیرہ کی اسکیمیں بر روئے کار لانے کا مطلق اختیار حاصل نہیں تھا۔ چنانچہ بدقسمتی کے اس دور میں مصری خزانہ کا تقریباً ۴۵ واں حصہ سرکاری حکام و ملازمین کی تنخواہوں پر صرف ہوتا تھا اور یہ فراخ حوصلگی محض اس بنا پر دکھائی جاتی تھی کہ غیر ملکیوں کے عیش و تنعم کا سامان فراہم کیا جائے۔ اسی طرح اور بے شمار چیزیں تھیں جو مصر کے خزانے پر مصر کے نقطۂ نظر سے محض بار تھیں۔ سب سے زیادہ تباہ کن چیز وہ مراعات تھیں جو غیر ملکیوں کو مصر میں حاصل تھیں اور جن کی بنا پر مصر کی دولت سمٹ سمٹ کر دوسرے ملکوں میں منتقل ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً غیر ملکی باشندے مصر میں کاروبار کے ذریعہ تقریباً چار ملین پونڈ سالانہ نفع حاصل کیا کرتے تھے لیکن وہ معمولی ٹیکس وغیرہ سے بھی مستثنیٰ تھے۔ ان کے کاروبار سے مصریوں کو اتنا بھی فائدہ نہیں پہنچتا تھا کہ کچھ لوگوں کو مزدوریاں مل جایا کریں۔ اس لئے کہ جس طرح رومانیہ میں ہر قسم کی غیر ملکی اقتصادی مہمتی اور مدنی اداروں اور کمپنیوں پر یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ ان کے ملازمین میں کم از کم ۸۰ فیصدی رومانی الاصل ہونے چاہئیں اور بقیہ ۲۰ فیصدی ملازمتوں میں بھی ان غیر ملکیوں کو ترجیح دینی چاہیئے جن کی رومانی عورتوں سے شادی ہوچکی ہو یا جس طرح فرانس وغیرہ میں غیر ملکی کمپنیوں پر ایسی پابندیاں عائد ہیں جن کی رو سے ان کی مجلس نظم و نسق اور ملازمین میں ایک مخصوص تعداد میں ملکیوں کا ہونا ضروری ہے اسطرح مصر میں غیر ملکیوں کے کاروبار پر کسی قسم کی پابندیاں عائد نہیں تھیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غیر ملکی اپنے کاروبار سے صرف نفع ہی نفع اٹھایا کرتے تھے اور مصریوں کو ان سے رتی بھر بھی فائدہ نہیں پہونچتا تھا۔ اول تو غیر ملکی کمپنیاں ان پیدا نہ ہونے کی صورت میں اپنے ہم وطنوں ہی کو ملازمتوں میں ترجیح دیا کرتی تھیں چنانچہ مصر میں اس وقت غیر ملکیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے اور ثانیاً اگر وہ اپنی خاص کسی مجبوری کی بنا پر مصریوں کے لئے ملازمتوں کا دروازہ کھلا بھی رکھتی تھیں تو چونکہ کاروبار ان کی ملکی ہی زبانوں میں ہوا کرتا تھا اس لئے ان کی اس "فیاضی" سے فائدہ اٹھانے والے مصری بہت کم ہوا کرتے تھے۔ اور اگر وہ اپنی تباہ حالی اور افلاس کی وجہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے تو انکو اس کی قیمت بھی بہت گراں ادا کرنی پڑتی تھی اس لئے کہ اس کا ان کی زبان وغیرہ پر بہت تباہ کن اثر پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں غیر ملکیوں کو مصر میں جو مراعات حاصل تھیں ان میں اکثر نہ صرف اہل مصر کے لئے توہین انگیز تھیں بلکہ ان کی بنا پر مصر کے خزانہ کی کثیر رقم انہی پر صرف ہوجایا کرتی تھی۔ مثال کے طور پر غیر ملکی عدالتوں کا معاملہ لے لیجئے، مصر میں اور غالباً صرف مصر میں غیر ملکیوں کے مقدمات کے فیصلہ کے لئے الگ الگ عدالتیں قائم تھیں جہاں ان کے اپنے ملک کے قوانین کے مطابق فیصلہ ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ فریقین میں سے اگر ایک ملکی اور دوسرا غیر ملکی ہو تو بھی ان کا معاملہ غیر ملکی ہی عدالت میں پیش ہوا کرتا تھا۔ اور اس قسم کے عدالتوں کے تمام مصارف مصری حکومت کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح غیر ملکیوں کو اپنے مدرسے، شفاخانے اور ڈاکخانے وغیرہ قائم کرنے کے بھی اختیارات تھے۔ ان حالات کا قدرتی انجام یہ تھا کہ مصر کی دولت و ثروت نہایت تیزی کے ساتھ غیر ملکوں میں منتقل ہو رہی تھی اور وہاں کے خاص باشندے، روز بروز افلاس و عسرت میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے لیکن معاہدہ کے بعد اب حالات نے پلٹا کھایا ہے اور اہل مصر کو اتنے اختیارات حاصل ہوگئے ہیں کہ وہ اس قسم کی خرابیوں کی اصلاح و تدارک کریں۔ چنانچہ معاہدہ مانٹرو کی رو سے غیر ملکی مراعات بہت حد تک کم کردی گئی ہیں۔ غیر ملکیوں کی علحدہ علحدہ جو عدالتیں قائم تھیں ان کی بجائے اب مخلوط عدالتیں قائم ہو رہی ہیں اور جب مصر کا ضابطہ قوانین "جدید اصول قانون سازی" کے مطابق بن کر تیار ہوجائے گا تو یہ مخلوط عدالتیں بھی توڑ دی جائیں گی اور ہر شخص بلا امتیاز مصری قانون کی اطاعت پر مجبور ہوگا۔ اب تک مصر کو غیر ملکیوں کے بارے میں کسی قسم کا قانون بنانے یا ان کے نام معمولی ہدایات جاری کرنے کا بھی اختیار نہیں تھا لیکن اب اسے کافی اختیارات مل گئے ہیں جن سے حکومت مصر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ چنانچہ کاروبار میں عربی زبان کو معقول اہمیت دینے اور ملازمتوں میں مصریوں کے مناسب تناسب وغیرہ کے بارے میں جدید قوانین وضع ہو رہے ہیں۔ مصر کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ ٹیکس کے متعلق اس سال جو قوانین بنے ہیں ان کا اطلاق غیر ملکیوں پر بھی ہونیوالا ہے۔ امید ہے اس قسم کے قوانین اہل مصر کے لئے بابرکت ثابت ہوں گے پھر اسی کے ساتھ حکومت مصر اہل ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے ایجابی وسائل بھی بر روئے کار لا رہی ہے۔ مثلاً اس وقت مصر کے کل رقبہ کو صرف ۱/۲۰ حصہ میں زراعت ہوتی ہے۔ بقیہ زمینیں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ اب حکومت مصر کی کوشش یہ ہے کہ ذرائع آبپاشی کے ... بہم رسانی وغیرہ کے ذریعہ ایک تو اس مزروعہ رقبہ کی پیداوار میں اضافہ کی صورتیں پیدا کرے اور دوسرے غیر مزروعہ علاقوں کو قابل کاشت بنایا جائے اس سلسلہ میں وہ خصوصیت کے ساتھ مغربی صحرا کی اصلاح کی طرف متوجہ ہے۔ اس لئے کہ تاریخی آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صحرا، بالخصوص اس کا وہ حصہ جو بحر ابیض کے متوازی ہے کسی زمانہ میں اپنی زرخیزی کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں جا بجا رومانی عہد حکومت کے کوئیں موجود ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ اس عہد میں یہ علاقہ کاشت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ حکومت مصر کا خیال ہے کہ جب زمانہ قدیم میں یہ صحرا، کاشت کا کام دے سکتا تھا تو اس بیسویں صدی کے اندر جبکہ نت نئے آلات ایجاد ہوچکے ہیں اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ اگر حکومت اپنی اسکیم میں کامیاب ہوجاتی ہے جیسا کہ توقع ہے تو اس سے نہ صرف ملک کی خوشحالی و فارغ البالی میں اضافہ ہوجائیگا بلکہ کثرت آبادی کا مسئلہ بھی آسانی کے ساتھ حل ہوجائیگا۔ اس وقت مصر کی آبادی میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اضافہ کی موجودہ رفتار باقی رہی تو ۱۹۶۰ء میں مصر کی آبادی ۲۰ ملین ہوجائیگی۔

اصلاح تعلیم

معاہدہ ۱۹۳۶ء کے بعد تعمیر و اصلاح کی کوششوں کے سلسلہ میں اصلاح تعلیم پر مصر میں خاص توجہ صرف کیجا رہی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ ملک کی خوش آیند مستقبل کا دار و مدار تمامتر اچھی تعلیم و تربیت پر ہے۔ برطانوی سیادت کے عہد میں تو یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ مصر میں صحیح تعلیم پر توجہ صرف کی جائیگی اس کا مقصود تو صرف اتنا تھا کہ حکومت کے لئے سستے اور قابل اعتماد کلرک تیار کئے جائیں لیکن بدقسمتی سے ۱۹۲۲ء کے اعلان آزادی کے بعد بھی جو بظاہر آزاد تعلیمی وزرا، مقرر ہوئے وہ بھی تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں کوئی نمایاں کام نہیں کرسکے جس کی وجہ سیدھی سادی یہ ہے کہ اس وقت ملک میں آزادی کی جنگ اتنے زور و شور کے ساتھ جاری تھی کہ تمام ملک کی توجہ اسی کی طرف مبذول ہوگئی تھی حتیٰ کہ طلبہ بھی عملاً جنگ آزادی میں شریک تھے اور مدارس میں بڑی حد تک سناٹا چھایا ہوا تھا علاوہ ازیں مصر میں طلبہ کی قوت سب سے بڑی قوت سمجھی جاتی تھی اس لئے وزارتوں کو اصلاح تعلیم سے زیادہ فکر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی پڑی رہا کرتی تھی۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ طلبہ کی رضا جوئی کے لئے وزارتیں بسا اوقات ان کے طفلانہ مطالبات کے آگے بھی سر جھکا دیا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ امتحانات میں ناکام ہوجانے والوں کو کامیاب بنانے کے لئے بعد میں اضافی امتحانات ہوا کرتے تھے اور کامیابی کا معیار ان کے لئے بہت پست کردیا جاتا تھا۔ ان حالات کے لحاظ سے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ مصر میں تعلیم کا دائرہ بہت محدود ہے اور اس دائرہ کے اندر بھی مختلف قسم کی خرابیاں موجود ہیں۔ مگر چونکہ معاہدہ استقلال کے بعد اب سابقہ حالات برقرار نہیں رہے، جنگ فی الحال ملتوی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اہل ملک کو سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی خرابیوں

عذر کرنے اور ان کی اصلاح کے لئے جد وجہد کرنے کا وقت اور موقع مل گیا ہے اس لئے اب رفتہ رفتہ دائرہ تعلیم کو بھی بڑھانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور موجودہ تعلیم کی خرابیاں بھی ایک ایک کرکے دور کی جارہی ہیں۔

مصر کے وزیر تعلیم اس وقت ڈاکٹر محمد حسین ہیکل سابق اڈیٹر السیاسۃ ہیں جو اصلاح و تجدید کے بہت بڑے علمبردار خیال کئے جاتے ہیں۔ آپ نے مصر کے آیندہ نظام تعلیم کو جس قالب میں ڈھالنے کا تہیہ کرلیا ہے اس کا اندازہ گذشتہ سال کی تعلیمی رپورٹ کے حسب ذیل اقتباس سے ہوسکتا ہے۔

"مصر کے جدید سیاسی دور کی ابتدا میں وزارت تعلیم نے یہ محسوس کیا کہ یہ بات بے انتہا ضروری ہے کہ تعلیم قوم کی ترقی کا ذریعہ ہو اور وہ اس طور پر کہ طلبہ کی اخلاقی عقلی اور جسمانی حالت کو اعلیٰ معیار پر پہونچایا جائے اور ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا جائے جو عملی زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا عنصر ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وزارت نے تعلیمی نظام میں زبردست اصلاح کی ہے۔ اس نے اپنی توجہ سب سے پہلے ایسے مدرسین فراہم کرنے پر صرف کی جو آیندہ نسل کو عہد جدید کی ضروریات و مقتضیات کو بآسانی پورا کرنے کا اہل بنا سکیں۔ اس کے بعد اس نے ابتدائی تعلیم کے مسئلہ پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کی جو ملک کی ترقی میں ایک بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے اور جبری تعلیم نافذ کرنے کے لئے چند نہایت اہم اقدامات کئے جن کے پیش نظر یہ توقع ہے کہ وہ آیندہ چند سال میں ملک سے جہالت کا خاتمہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوجائے گی۔ ساتھ ہی اس نے عام تعلیم کے ہر مرحلہ کی خرابیوں پر بھی نظر رکھی اور جہاں جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی اصلاح کی۔

فن تعلیم کا مسئلہ بھی وزارت کی نظروں میں عام تعلیم کے مسئلہ سے کچھ اہم نہیں سمجھا گیا۔ وزارت اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ نوجوانوں کو اقتصادی ترقی کے میدان میں کامیاب بنانے کے لئے فنی تعلیم کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ وزارت نے فنون جمیلہ کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے کیونکہ ان کا حسن ذوق اور حسن احساس پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جسمانی ورزشوں کو نوجوانوں کے اخلاقی اور مدنی ترقی میں جو دخل حاصل ہے اس کا بھی پورا پورا لحاظ کیا ہے اور مدارس میں اور مدارس سے باہر ورزشوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ وزارت نے عمومی ثقافت کی نشر و اشاعت کے جدید اصول سے بھی کام لینا شروع کردیا ہے چنانچہ اسکولی لاسلکی اور تعلیمی سنیما وغیرہ کو عام طور سے رواج دیا گیا ہے جس سے مقصد میں بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ اسی طرح وزارت نے تعلیمی ادارہ (نظم و نسق) کی بعض خرابیوں کی اصلاح کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ اس سے پہلے تعلیمی نظم و نسق کے اختیارات میں مرکزیت پائی جاتی تھی اور ان کے استعمال میں بہت شدت برتی جاتی تھی۔ لیکن اب تعلیمی اداروں کے افسروں کے اختیارات وسیع کردیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کے عادی بن جائیں اور ان کو اپنی ذاتی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے"

اس اقتباس کے بعد ہمیں مصر کی تعلیم کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ یہاں یہ تذکرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رپورٹ میں اصلاحی اقدامات کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اس پر نہایت شدت اور تیزی کے ساتھ عمل ہورہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصر کی تعلیمی حالت روز افزوں ترقی پر ہے۔ سنہ ۲۶ء میں تعلیم کی مد کے لئے بجٹ میں صرف ۲۳۰۰۰۰۰ پونڈ رکھے گئے تھے لیکن سنہ ۳۷ء میں ۴۰۰۰۰۰۰ پونڈ تعلیم پر صرف ہوئے اور موجودہ سال کے بجٹ میں اس رقم میں بھی معقول اضافہ کردیا گیا ہے۔ جبری تعلیم مصر میں بہت پہلے سے رائج ہے۔ لیکن اب تک اس کا دائرہ سات اور بارہ سال کی درمیانی عمر کے صرف ایک تہائی بچوں تک محدود تھا۔ اب موجودہ وزارت تعلیم نے اس کو اس حد تک وسیع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے کہ پانچ سال کے بعد مصر سے جہالت کا بالکلیہ خاتمہ ہوجائیگا۔ تعلیم بالغان کی طرف اب تک مطلق توجہ نہیں ہوسکی تھی لیکن اب جابجا مدارس شبینہ قائم ہوگئے ہیں اور اس سال پانچسو دیہاتوں میں ریڈیو کے ذریعہ تعلیم کی نشر و اشاعت کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ نصاب تعلیم اور طریق تعلیم وغیرہ میں بھی اصلاحات ہورہی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان اور اسلامی ثقافت کو نصابوں میں مناسب جگہیں دی جارہی ہیں اور عربی صرف و نحو اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم میں جو بعض دشواریاں حائل تھیں ان کو حل کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر کردی گئی ہیں۔ تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہورہی ہے کہ تعلیم کو سیاسیات کی مداخلت سے محفوظ کرنے کی کوشش ہورہی ہے

تحریک آزادی کے میں سیاسیات میں طلبہ کے عملی حصہ لینے کو نہ صرف گوارا کیا جاتا تھا بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی۔ لیکن اب جبکہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں باقی نہیں رہی ہیں، مصر کے مفکرین یہ اچھی طرح محسوس کرنے لگے ہیں کہ طلبہ کی سیاسی ہنگامہ پروری تعلیمی نقطۂ نظر سے مستحسن نہیں ہے چنانچہ ابھی حال میں جامع ازہر کے طلبہ ملازمتوں کے سلسلہ میں اپنے بعض مطالبات ہڑتالوں اور مظاہروں کے ذریعہ منوانا چاہتے تھے لیکن موجودہ وزیر اعظم نے نہ صرف یہ کہ اس کا کچھ اثر قبول نہیں کیا بلکہ ان کے اس فعل پر نہایت شدت کے ساتھ اظہار ناراضگی کیا جو مصر میں ایک بالکل نئی چیز خیال کی گئی ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف طلبہ کی تعداد میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ اس وقت مصری یونیورسٹی میں ۸۸۴۹ مدارس ثانویہ میں ۲۹۵۲۴ مدارس ابتدائی میں ۸۳۰۱۴ مدارس اولیہ میں ۱۰۰۵۲۱ اور صنعتی تجارتی مدارس اور مدارس معلمین وغیرہ میں ۴۹۷۳ (کل ۱۱۹۶۸۹۱) طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں ان مدارس کے طلبہ شامل نہیں ہیں جو وزارت کی نگرانی سے علٰحدہ ہیں اور جن کی تعداد سنہ ۳۴ء کی رپورٹ کی رو سے ۱۳۰۰۰۰ کے قریب ہے۔ گویا اس وقت مصر کی کل آبادی کا آٹھواں حصہ مدارس میں موجود ہے[1] ـــــ اور دوسری طرف تعلیم اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے اچھی اور قابل اطمینان ہوتی جارہی ہے۔

مصر کی فوجی تیاریاں

مصر جدید کی ایک اور قابل ذکر بات اس کی فوجی تیاریاں ہیں معاہدہ سنہ ۱۹۳۶ء کی رو سے اب مصر آزاد اور خود مختار ہوچکا ہے اس لئے قدرتی طور پر اسے اپنی آزادی و خود مختاری کی حفاظت کے لئے اپنے دفاعی وسائل میں اضافہ کرنا پڑرہا ہے۔ یہ چیز عام حالات میں بھی ضروری تھی لیکن موجودہ بین الاقوامی صورت حال اور بالخصوص اٹلی کے جنگجویانہ عزائم نے اس کی اہمیت اور ضرورت کو بے انتہا بڑھا دیا ہے۔ مصر کو نہر سویز سے جہاں فائدے پہونچ رہے وہاں اس سے اس کو ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو ہر وقت خطرہ محسوس ہوتا ...... رہتا ہے پھر اس کے علاوہ لیبیا میں اٹلی کا اقتدار بھی ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ اگرچہ حکومت اٹلی بار بار اعلان کرتی رہتی ہے کہ لیبیا میں اطالوی فوجوں کا اجتماع کسی برے مقصد سے نہیں ہے لیکن مصر والے اتنے بھولے نہیں ہیں کہ وہ حبشہ، آسٹریا، زیکوسلاویکیا اور اب آخر میں البانیہ کا حسرتناک انجام دیکھتے ہوئے بھی اس اعلان سے مطمئن ہوکر اپنے مستقبل کی طرف سے بیفکر ہوجائیں۔ باقی مضمون صفحہ ۱۳۵ پر

[1] مدارس ثانویہ مدارس ابتدائی اور مدارس اولیہ کے گذشتہ سالوں کے صحیح اعداد و شمار ہمیں نہیں مل سکے ہیں لیکن یونیورسٹی کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۳۱-۳۲ء میں یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد ۴۲۸۷ تھی۔ گویا پانچ سال کے اندر تقریباً ۳۶ فیصدی کے حساب سے اضافہ ہوا ہے۔ اسی پر مدارس ثانویہ وغیرہ کے طلبہ کے اضافہ کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

حبیب دو عالمؐ

(از زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی)

مدینہ ہے اور جلوہ سامانیاں ہیں
حبیب دو عالمؐ کی مہمانیاں ہیں

ادھر عاصیوں کو پشیمانیاں ہیں
اُدھر رحمتوں کی فراوانیاں ہیں

نگاہوں کی فردوس ہے بزم طیبہ
جدھر دیکھئے جلوہ سامانیاں ہیں

شب قدر ہو یا فروغ سحر ہو
ترے روئے انور کی تابانیاں ہیں

کہاں تیرا جلوہ کہاں اپنی آنکھیں
مگر شوق دل کی یہ حیرانیاں ہیں

تصدق ہوں اے قبۂ نور تجھپر
عجب تیرے جلووں کی تابانیاں ہیں

اُنھیں کو ہے سجدوں کی معراج حاصل
جُھکی تیرے در پر جو پیشانیاں ہیں

مرے غم کی ناصح تجھے کیا پڑی ہے
مبارک مجھے میری نادانیاں ہیں

مرے دل کی بربادیوں کو نہ پوچھو
یہی رشک فردوس ویرانیاں ہیں

جنون محبت کو اللہ رکھے
مبارک یہ میری پریشانیاں ہیں

میسر ہیں جن کو ترے در کے سجدے
انھیں کی سرافراز پیشانیاں ہیں

جنون محبت میں احساس کس کو
یہ دانائیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں

مدینہ کہاں اور کہاں میری قسمت
تری رحمتوں کی فراوانیاں ہیں

حمیدؔ اُن کی رنگیں اداؤں کے صدقے
یہ اشعار ہیں یا گل افشانیاں ہیں



سابق بشیر منزل جامعہ ملیہ کے ثانوی درجے کے بچّوں کی اقامت گاہ



خاکسار منزل سابق ہوسٹل جامعہ ملیہ، ابتدائی درجے کے بچوں کی اقامت گاہ



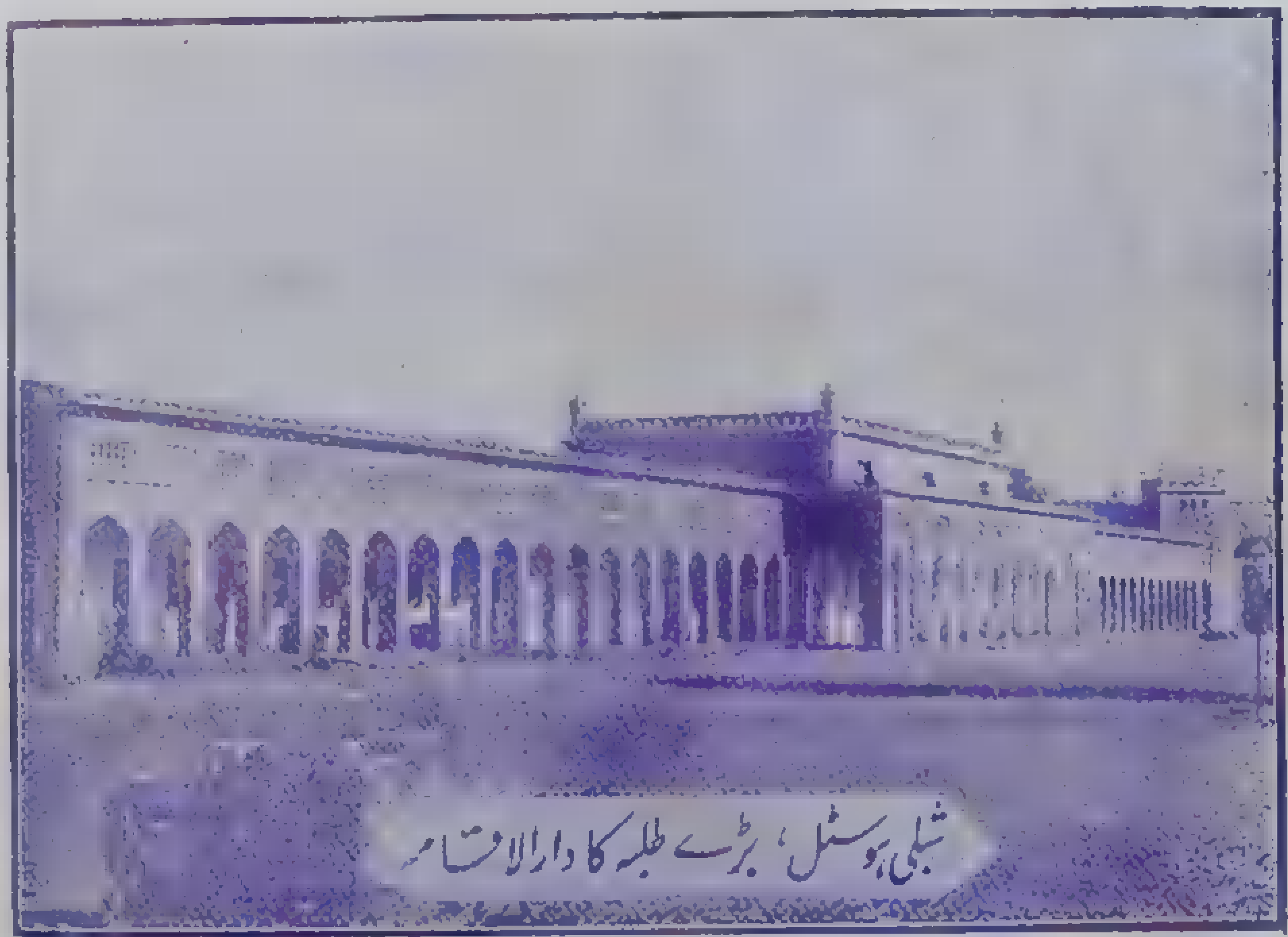
دارالعلوم دیوبند



دارالحدیث دیوبند



عمارت دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ



شبلی ہوسٹل، بڑے طلبہ کا دارالاقامہ



مسجد دارالمصنفین اعظم گڈھ



کتب خانہ دارالمصنفین

"چند تعلیمی ادارے"

دار العلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی

(از جناب شہباز)

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و نفوذ نے ہندوستان کی علمی دنیا کو نیست و نابود کر دیا تھا جس کی وجہ ڈاکٹر سید محمود کے الفاظ میں یہ تھی کہ

"تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں اس لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام سمجھتے تھے" (تاریخ التعلیم)

ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے اس عقیدہ میں اتنی زیادہ سخت تھی کہ جب مسٹر ولبرفورس نے ۱۷۹۳ء میں پارلیمنٹ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں عیسائیت کی اشاعت و تعلیم کے ذرائع مہیا کئے جائیں تاکہ ہندوستان کے لوگ تعلیم پاکر عیسائی ہو جائیں اور سلطنت زیادہ محفوظ ہو جائے تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس تجویز کی زبردست مخالفت کی اور کہا کہ

"ایک مذہب کے قائم ہو جانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہو جاتے ہیں اور اگر یہ ہو گیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارویں صدی میں خلاف مصلحت ہے اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہو گئے تو اس سے سخت مصیبت آجائیگی امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی طرح نوجوان پادری جب اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(تاریخ تعلیم از میجر باسو)

اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز گر گئی لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا اور انتظام و انصرام کے سلسلے میں ہندوستانیوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی چنانچہ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ۱۷۸۱ء میں کلکتہ میں مسلمانوں کی عربی فارسی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کیا اور دوسرا سنسکرت کالج ۱۷۹۱ء میں بنارس میں قائم کیا گیا لیکن ان دونوں کالجوں کے قیام کی غرض یہ تھی کہ "قانونی اور عدالتی خدمات کی انجام دہی کے لئے ہندو اور مسلمان افسر تیار کئے جائیں" (مسلمانوں کا روشن مستقبل) لیکن ضروریات کے لحاظ سے یہ کالج ناکافی تھے۔ چنانچہ ۱۸۱۱ء میں لارڈ منٹو وسیرائے ہند نے ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس کی بنا پر ۱۸۱۳ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کی سفارش پر سب سے پہلی مرتبہ پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا مسئلہ منظور کیا گیا لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ۱۸۱۴ء میں ڈائرکٹران کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک سرکلر جاری ہوا جس میں درج تھا کہ

"سنسکرت کی سرپرستی کی جائے اور ہندوؤں کے علوم کی ہمت افزائی کی جائے" چنانچہ ۱۸۱۶-۱۷ء میں کلکتہ میں پہلا انگریزی کالج قائم ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں جے نراین کالج مدراس۔ ۱۸۲۱ء میں ہندو کالج پونا اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج قائم کیا گیا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ معافیات ۱۸۲۸ء میں ضبط کر لی گئیں جو مسلمان نوابوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے دی تھیں۔ وقف ہگلی کا بیجا استعمال کیا۔ یہ وقف ۱۸۰۶ء میں کیا گیا تھا لیکن گورنمنٹ نے اس کو واقف کی مرضی کے خلاف انگریزی کالج بنا دیا۔ اور مسلمانوں کو نہ صرف اس کے انتظام سے بلکہ اس کی تعلیم سے بھی اس طرح محروم کیا کہ بقول ہنٹر اس کے تین سو طلبا میں سے صرف ۲ مسلمان طالب علم تھے۔ اسی طرح لارڈ ولیم بنٹنک نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک مراسلہ کے ذریعہ یہ حکم نافذ کیا کہ تعلیم عامہ اور وظائف کا کل روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کیا جائے جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمان کو جو کچھ تھوڑا بہت روپیہ مدرسہ کلکتہ میں عربی تعلیم کے وظائف کی شکل میں مل جاتا تھا وہ اس سے بھی محروم کر دئے گئے۔ ان کالجوں میں علوم کی تعلیم مشرقی زبانوں میں دیجاتی تھی اور انگریزی بھی بطور ثانوی زبان کے کہیں کہیں نصاب میں داخل تھی چنانچہ ۱۸۳۴ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۹۳۵ء کو لارڈ میکالے کی صدارت میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے ہی کی فیصلہ کن ووٹ کے ذریعہ انگریزی کے اجرار کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اس تازہ اقدام کی اصل وجہ ایک تو لارڈ میکالے نے حسب ذیل الفاظ میں تحریر فرمائی ہے

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

(تاریخ التعلیم از میجر باسو)

اور دوسری حقیقی وجہ لارڈ میکالے نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے والد ماجد کو ایک خط میں لکھ کر بھیجی تھی

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجویز پر عمل ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا"

اس سلسلہ میں سررشتہ مدراس کی اس تجویز (۱۸۴۶ء) کا ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ اسکولوں میں انجیل کو بطور اختیاری مضمون پڑھایا جائے۔ اس تجویز کی تائید میں مارکوئیس آف ٹویڈل گورنر مدراس نے متعدد دلائل پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"رفتہ رفتہ کل لڑکے انجیل کے اختیاری مضمون کو پڑھنے لگیں گے جس سے اُن میں اخلاقی ترقی ہوگی سرکاری ملازمت کے لئے ضرورت ہے کہ بنسبت ہندو یا مسلمانوں کے مذہب کے، اخلاق کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل)

لیکن کورٹ آف ڈائرکٹران نے ۲۳ مارچ ۱۸۴۶ء کو یہ تجویز نامنظور کر دی تاہم تعلیمی مد کا روپیہ عیسائیت کی تبلیغ پر صرف ہوتا رہا چنانچہ ۱۸۵۲ء میں گورنر مدراس نے ایک یادداشت کے ذریعہ پارلیمنٹ سے اس بے عنوانی کی شکایت کی جس پر حکومت کو اعلان غیر جانبداری کرنا پڑا۔ مگر اس غیر جانبداری کا نتیجہ سر چارلس ٹریولین کی شہادت سے ظاہر ہے جو ۲۰ جون ۱۸۵۳ء کو موصوف نے دار الامراء کے سامنے دی تھی۔

"سرکاری درسگاہوں میں انجیل کا مضمون داخل نہیں ہے بعض لوگ اس طریقے پر اس لئے اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے مذہب عیسوی کی صداقت کی ترقی کی مخالفت پائی جاتی ہے مگر یہ رائے بالکل غلط ہے جب سے ۱۸۳۵ء کی تجویز کے مطابق سرکاری اداروں کے متعلق انگریزی کتب خانے قائم کئے گئے تو ان میں انجیل رکھی گئی اور میرا خیال یہ ہے کہ انجیل کی شرح مصنفہ منٹ اور دیگر شروح بھی رکھی جاتی ہیں جو کتابیں کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں انجیل کے حوالے ہیں جس کی وجہ سے طلبا انجیل کو پڑھتے ہیں۔ اُستادوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے طلبا سے انجیل کے مضامین پر گفتگو کریں بعض مضامین ایسے پڑھائے جاتے ہیں جن میں مذہب عیسوی کے مضامین ہیں۔ اگر واقعی نتائج کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن اچھے تعلیم یافتہ لوگوں نے مذہب عیسوی اختیار کیا ہے اُن کی تعداد ہندو کالج اور دوسرے گورنمنٹ کالجوں سے نکلی ہوئی اتنی ہی ہے جتنی کہ عیسائیوں کے کالجوں سے

(تاریخ تعلیم از سید محمود)

اسی سلسلہ کی ایک اور شہادت بھی پیش کی جاتی ہے جو سر فریڈرک ہیلیڈے نے دار العوام میں دی تھی اُنھوں نے کہا تھا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں نہیں ہے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل)

بہرحال مذکورہ بالا افسوسناک حالات سے ہندوستان گذر رہا تھا سرکاری حکمت عملیوں کے علاوہ عیسائیت کی اشاعت کے لئے تصانیف کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن عیسائیت کے لئے ہندوؤں میں جتنا میدان وسیع تھا اُتنا ہی مسلمانوں میں تنگ نظر آتا تھا۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے عیسائیوں نے جہاں اسلام کے خلاف ذلیل

کتابیں تصنیف کیں۔ وہاں مناظرے کی داغ بیل بھی ڈالی۔ غرضکہ ہر ممکن طریقہ سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کردی گئی۔ سلطنت دہلی کی آخری شمع کے گل ہوجانے کے بعد مسلمانوں پر زیادہ شدت کے ساتھ حملہ کیا گیا...... حتیٰ کہ مسلمانوں کا مذہبی شیرازہ بکھرتا نظر آنے لگا۔ شرک، بدعت دہریت ونیچریت وغیرہ کی سمیت سے مسلمان متاثر ہونے لگے۔ مغربیا کی الحاد پرور ہواؤں نے مسلمانوں کو متزلزل بنادیا اور وہ گم کردہ راہ قافلے کی طرف اُمید رہنمائی کے ساتھ بڑھتے دکھائی دیے۔

ان واقعات کے ساتھ ہی جن کا اوپر مذکور ہوا غدر ۱۸۵۷ء یا آزادی ہند کی پہلی کوشش کو سامنے رکھئے اور اُن مظالم کو یاد کیجئے جو بغاوت کے دوران میں اور اس کے بعد خاص طور پر مسلمانوں پر توڑے گئے۔ یہاں ان سفاکیوں، درندگیوں، بربریتوں اور ظلموں کو بالتفصیل بیان کرنے کا موقعہ نہیں ہے اس لئے مجملاً یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ مسلمانوں کی حیثیت۔ حالت اور مذہب کو نیست ونابود کرنے کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا گیا جس کو مناسب سمجھا گیا ———— غرضکہ مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی۔ اُن کی کشتی حیات بھنور میں ڈگمگا رہی تھی اور ہندوستان سے مسلمانوں کے خاتمہ کا قوی اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ چند نفوس قدسیہ کے قلوب میں مسلمانوں کے تحفظ کا ایک جذبۂ صادق پیدا ہوا، اُنھوں نے حالات کے مطابق صحیح طور پر تجویز کیا کہ مسلمانوں کو مذہب سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رکھا جائے۔ کیونکہ مسلمان اگر واقعی طور پر مسلمان ہوں تو اُن کو دنیا کی کوئی قوت نہیں مٹا سکتی۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے مبارک ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا قیام غدر ۱۸۵۷ء کے ۹ سال بعد یعنی ۱۸۶۶ء میں عمل میں آیا۔ دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد، ایک اُستاد ملا محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ (دیوبندی) اور ایک شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ (دیوبندی)، یہ تھی کُل کائنات اُس دارالعلوم کی جو آج سر بفلک عمارتوں میں قائم ہے اور جس کے فارغ التحصیل طلبا ہندوستان کے ہر گوشہ میں نہیں بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور بحمد اللہ کہ دارالعلوم دیوبند اپنے اس مقصد میں بالکل کامیاب ہے۔ چنانچہ "دارالعلوم دیوبند کی سرسٹھ سالہ زندگی پر ایک نظر" نامی رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

"۱۲۸۳ھ سے ۱۳۵۰ھ تک...... صوبہ سرحد و پنجاب میں (۱۶۵۸) صوبہ متحدہ آگرہ واودھ میں (۲۱۵۶) صوبہ بہار واڑیسہ میں (۴۸۳) صوبہ بنگال میں (۲۷۱۰) صوبہ آسام وبرما میں (۳۰۰) ممالک متوسط واجمیر میں (۱۴) صوبہ بمبئی وسندھ میں (۲۰۵) صوبہ مدراس میں (۵۱) ریاستہائے ہند میں (۴۱۰) منتسبین ومتوسلین دارالعلوم موجود ہیں"

آگے چل کر اسی رسالہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

"بیرون ہند عام بلاد اسلامیہ مثل یاغستان، افغانستان، تبت، مشرقی چین، عراق، شام، حجاز، خیوا، بخارا، قازان، روس، ایشیائے کوچک، مشرقی یمن وغیرہ بھی اُس کے فیوض سے بے بہرہ نہیں رہے۔ ان بلاد اسلامیہ کے اُن طالبان علوم کی تعداد جو اس درسگاہ میں آکر داخل ہوئے (۲۵۴) تک ہے"

مزید برآں دارالعلوم دیوبند کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ اتنا بڑا ادارہ صرف مسلمانوں کے چندوں پر خدمات انجام دے رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ چندے طلبا واساتذہ کی ضروریات کے لئے کافی ہوتے ہیں بلکہ ان ہی چندوں سے دارالعلوم کی عمارتیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ اس وقت ۳ ۲ بڑی بڑی درسگاہیں ہیں۔ ۸ چھوٹے بڑے دارالطلبہ ہیں۔ مجموعی حیثیت سے تقریباً ۰۰ ۴ حجرے ہیں جن میں سے دارالطلبہ جدید، دارالحدیث، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ اور دارالاضیاف بالخصوص بہت بڑی اور قابل دید عمارتیں ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مسلمانوں کے مذہبی شغف اور بانیان وکارکنان دارالعلوم کی نیک نیتی کا۔

نوعیت تعلیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہم موجودہ مہتمم صاحب کا حسب ذیل قول درج کرتے ہیں۔

"اس ولی اللہی اور قاسمی جماعت کا مسلک علمی حیثیت سے فقط نقل وآثار روایت ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ روایت کے ساتھ درایت وتفقہ کے ذریعہ اُن آثار کا صحیح محل متعین کرنا اور احادیث مختلفہ میں شارع علیہ السلام کی مراد کو متعین کرکے تمام روایات کو اپنے اپنے محل پر چسپاں کردینا بھی اُس کا جزو لاینفک رہا ہے اس لئے اس جماعت کا اصول حنفیت کے زیر سایہ تطبیق روایات اور جمع بین النصوص ہے"

دارالعلوم دیوبند کا وجود چونکہ مسلمانوں کے تمدن، اُن کی تہذیب اور اُن کے مذہب کے استحفاظ کے لئے عمل میں آیا تھا اور اُس کا مقصد اُن حملوں کی مدافعت تھا جو انگریزوں کے اثر واقتدار کے بعد الحاد ودہریت کی صورت میں تواتر کے ساتھ پادریوں کی جانب سے کئے جارہے تھے اس لئے دارالعلوم کے نصاب تعلیم کو مجوزین نے خالصاً مذہبی لائنوں پر مرتب کیا۔ ممکن ہے کہ قیام دارالعلوم کے وقت یہ نصاب کسی ترمیم کا محتاج نہ سمجھا جاتا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ ایسے مذہبی مبلغین پیدا کرنا جو میدان معاش میں بے دست وپا نظر آئیں اور جنھیں علوم وفنون جدیدہ سے کوئی واقفیت نہ ہو نہ صرف یہ کہ مناسب نہیں ہے بلکہ مذہبی احترام ووقار کے اعتبار سے نقصان رساں بھی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں علوم وفنون جدیدہ کو بالکل نظرانداز کرکے نصاب قدیم (درس نظامیہ وبطلیموسی فلسفہ) کو رواج دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فارغ التحصیل طلبہ جدید ترقیات وضروریات اور علوم وفنون سے ناواقف محض رہتے ہیں اور ضرورت کے وقت بسا اوقات ان کی زبانیں گنگ اور اُن کے قلم خاموش ہوجاتے ہیں۔ فلسفۂ یونان اُن کے دماغوں پر اس طرح مستولی رہتا ہے کہ اُس کے آگے اُنھیں کچھ نظر نہیں آتا، وہ دنیائے جدید کے سامنے جو ترقی کی بے شمار منزلیں طے کرکے کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے پامال وفرسودہ اور متروک ومنسوخ نظریوں کو پیش کرکے سامان تضحیک فراہم کرتے ہیں۔ جہاں تک معلومات عامہ کا تعلق ہے اُن کے دماغ میں کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا نہ اُنھیں ممالک عالم کی جغرافیائی حدود کا علم ہوتا ہے اور نہ اُن کی سیاسی تاریخ سے واقفیت ہوتی ہے یہی حال معاشی کیفیت کا ہے یعنی جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں وہ اس میدان میں بالکل بے دست وپا ہوتے ہیں۔ ان تمام گذارشات کا مقصد خدانخواستہ دارالعلوم کی مخالفت نہیں ہے بلکہ راقم الحروف کے نزدیک دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کا ایک بہت ضروری ادارہ ہے اور اس نے اپنے مخصوص دائرے میں بہت بڑی خدمات انجام بھی دی ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ ارباب اختیار ضروری اصلاحات کی طرف فوراً متوجہ ہوں اور اس محبوب علمی درسگاہ کو جلد نقائص سے پاک کرکے مسلمانوں کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ دارالصحت، دارالتربیت اور دارالصنائع کے اصلاحی اقدامات یقیناً اُمید افزا اور مستحسن ہیں لیکن زمانے کا تقاضہ ہے کہ زیادہ تیزی کے ساتھ قدم اُٹھائے جائیں اور اُس نقص کو دور کردیا جائے جس کو نیم رہبانیت کہا جاسکتا ہے اور جو دیوبند کے طلبہ میں بالعموم پائی جاتی ہے۔

"مسلم یونیورسٹی علی گڈھ"

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا تذکرہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ سرسید علیہ الرحمۃ اور اُن محرکات کا تذکرہ کیا جائے جنھوں نے سرسید کو علی گڈھ میں ایم اے او کالج کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ ہم اس مضمون کی ابتدائی سطور میں عرض کرچکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں مسلمانوں کو تعلیم سے بے بہرہ بنانے کے لئے کیا کچھ کیا گیا۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ مسلمانوں کو معاشی دشواریوں میں کس حد تک مبتلا کیا گیا اور حکام کے اس طرز عمل نے مسلمانوں پر کیا اثر ڈالا لیکن پہلے یہ معلوم کرلیا جائے تو مناسب ہے کہ ابتداءً مسلمانوں کی کیا حالت تھی جس کا تذکرہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں بدیں الفاظ کیا ہے

"انگریزی حکومت کے شروع میں سرکاری ٹیکسوں کی وصولی کا کام (یعنی کلکٹری) آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا اور یہ کام قریباً اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ پولیس کی ملازمت تھی اس کے افسر بھی مسلمان ہوتے تھے۔ آمدنی کا تیسرا ذریعہ عدالتیں تھیں اُن پر بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے لیکن سب سے بڑی چیز فوج تھی جس کے قبضہ میں فتوحات ملکی کی باگ ہوتی تھی۔ فوجی افسروں کو سرکاری محصولات کی وصولی پر بنک کے کم شرح سود کے بقدر تنخواہیں ہی نہیں ملتی تھیں بلکہ فوجی افسر اپنے کاشتکاروں کو فوج میں بھرتی کرتے تھے اور سلطنت سے اُن سب کی تنخواہیں وصول کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء کے شروع میں بنگال کے کسی اچھے خاندان کے مسلمان کا غریب ہونا ناممکن تھا کیونکہ دولت کے چشمے جو ہمیشہ جاری رہتے تھے مسلم گھرانوں کے صندوق کو ہمیشہ لبریز رکھتے تھے"

لیکن ۱۸۳۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیا نظام تعلیم مکمل کرکے جس کو مسلمان پسند نہ کرسکتے تھے مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کردئے ۱۸۶۴ء میں قاضیوں کو برطرف کردیا اور انتہا یہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے بالکل نکال کر پھینک دیا گیا۔ سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں کلکتہ کے ایک فارسی اخبار ۱۸۶۹ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں اُن پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے"

اس خبر کے بعد تحریر ہے کہ

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کرلیتے ہیں تب بھی اُنھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کردیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو اُن کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی شان سمجھتے ہیں"

حکام کے اس طرز عمل کا نتیجہ حسب ذیل الفاظ میں بتایا گیا ہے

"۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر

ایسا ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے ۔"

اس موقعہ پر اگر مسلمانان اڑیسہ کی حسب ذیل درخواست بنام کمشنر اڑیسہ درج کردی جائے تو مسلمانوں کی حالت کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی

"بہ حیثیت وفادار رعایا حضور ملکہ معظمہ ہمیں سرکاری ملازمتیں پانے کا یکساں حق ہے ۔ اصل یہ ہے کہ اڑیسہ کے مسلمان اس قدر ہیں دے گئے ہیں کہ اب ان کے ابھرنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی ۔ نسل کے اعتبار سے شریف، پیشہ کے اعتبار سے غریب، سرپرستی سے محروم، ہماری حالت اُن مچھلیوں کی مانند ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں ۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کے قائم مقام ہیں ۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ بلالحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائیگا سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپیہ ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے، ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں ۔"

مذکورہ بالا اقتباسات نے مسلمانوں کی حالت اچھی طرح پیش کردی ہے ۱۸۵۷ء تک حالات اسی طرح جاری رہے لیکن ۱۸۵۷ء کے واقعات نے انگریزوں کو غور کرنے کا موقعہ دیا اُنھوں نے محسوس کیا کہ مسلمان ہماری سختیوں اور مظالم کے باوجود ویسا ہی مسلمان ہے جیسا پہلے تھا چنانچہ لارڈ میو وائسرائے ہند نے لکھا کہ

"تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں اور سرحدیوں کو امداد بھیجتے ہیں جہاں سے ہندوستان کو خطرہ رہتا ہے"

(ہندوستان تاج برطانیہ کے عہد میں از میجر باسو)

مسٹر جیمس او کینلی نے لکھا کہ

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہو سالہا سال سے مسلمانوں کو نظرانداز کیا جا رہا ہے یا انھیں ایسی رعایا سمجھا جاتا ہے جن کی اطاعت بہت مشتبہ ہو اُن کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے ۔ . . . . . ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ غفلت کے بعد ایک عاقلانہ اور فیاضانہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی "

(کلکتہ ریویو بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء)

ایک دوسرے موقعہ پر انہی صاحب نے تحریر فرمایا کہ

"میرے نزدیک مسلمان کاشتکاروں پر وہابیوں کے عقیدہ کا اثر اس وجہ سے ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم سے غفلت کی ہے ۔ ہماری حکومت میں اونچے طبقہ کے لوگوں کے لئے ذرائع معاش کا نہ ہونا ان کے لئے کس قدر مضر ہے جن کی تعلیم کا انتظام ہمارے اسکولوں میں نہایت کمی کے ساتھ ہے ۔ نبارکی سازش کے مقدمہ میں ایک ملزم مسمّی عثمان علی نے بیان کیا کہ تین سال کا عرصہ ہوا کہ میں جستجو میں امین عدالت دیوانی سے ملا تھا اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارا کیا حال ہے ۔ میں نے کہا کہ بہت خراب ہے ۔ اس پر امین صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ تم تو لکھے پڑھے شخص ہو قرآن مجید لیکر دیہات چلے جاؤ اور وعظ کہکر لوگوں کو جہاد پر جانے کی ترغیب دو چنانچہ میں نے یہی کیا اور لوگوں نے مجھے روپیہ دیا ۔ تمام ملک میں اسی قسم کے لوگ پھیلے ہوئے ہیں جو دیہاتیوں کو بھڑکاتے رہتے ہیں ۔ امبیلا کی بغاوت نے ثابت کر دیا ہے کہ بزدل بنگالی (مسلمان) خاص حالات میں افغانوں کی طرح خونخوار ہو کر لڑتے ہیں اس لئے انھیں حقیر نہ سمجھنا چاہئے ۔

(مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر)

حکومت کے نظریہ میں تبدیلی کے وجوہ گویا مسلمانوں کی مجاہدانہ ذہنیت تھی جس کو دفع کرنے کے لئے مسلمانوں کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا مگر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انتہائی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں جس کا حال ڈاکٹر ہنٹر کے حسب ذیل الفاظ سے بخوبی ملتا ہے جو اُنھوں نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تحریر فرمائے ہیں ۔

"ان دونوں مدات (یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم) میں تو ہمارا کچھ خرچ بھی ہوگا لیکن مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں تو ہمارا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا ۔ جو رقم وارن ہیسٹنگز نے مدرسہ کلکتہ کے لئے مقرر کی ہے نیز ہگلی وقف کی کثیر آمدنی اگر مناسب طور پر صرف کی جائے تو کافی ہے ۔ جو روپیہ ہم اب تک ایک انگریزی کالج پر ناجائز طریقہ سے صرف کر رہے تھے اُسے اب ایمانداری کے ساتھ موصی کی وصیت کے مطابق صرف کریں اصل تعلیم بدستور مسلمان اُستاد دیتے رہیں مگر ہر کالج میں ایک عربی داں یوروپین پرنسپل مقرر کیا جائے جو کالج میں بود و باش رکھے اور ماتحتوں کی نگرانی کے ساتھ اپنا وقار قائم رکھ سکے ۔ اس پرنسپل کی تنخواہ ۱۲ سو پونڈ سالانہ تک ہو موجودہ خالص عربی کے شعبہ کو انگریزی اور عربی کا شعبہ کر دیا جائے تاکہ گورنمنٹ ضلع اسکول کا پاس شدہ لڑکا کالج کی اعلیٰ تعلیم کے شعبہ جات سے مستفید ہو سکے ۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ شرع محمدی کی باضابطہ تعلیم دیجائے جو سب پر لازمی ہو ۔ یقیناً شرع محمدی کو تعلیم کا مقصد نہ بنانا چاہئے کیونکہ شرع محمدی سے مراد مسلمان کا مذہب ہے اور مذہب بھی اُس زمانہ کا جبکہ اس کے پیرو تمام دنیا کو اپنی جائز شکارگاہ سمجھتے تھے اور اُنھوں نے زمانہ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرح عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا اُن کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا ۔ سردست بجائے شرع محمدی کی روزانہ قواعد کرنے کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی لٹریچر اور اُردو میں مغربی سائنس کی تعلیم دیجائے ۔

(مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر)

بہرحال، ۷ اگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبوں کے گورنروں کے نام احکام جاری ہوئے اور گورنروں نے اپنے صوبوں کے مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کے سرکلر جاری کئے لیکن یہاں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس امر کی ہدایات بھی تھیں کہ جہاں انگریز انسپکٹروں کی رسائی نہ ہو سکے وہاں مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر نہ کئے جائیں اور شرع محمدی کی تعلیم کو بالکل بند کر دیا جائے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید علیہ الرحمۃ نے مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کا کام شروع کیا سرسید علیہ الرحمۃ ۱۸۶۹ء میں اپنے صاحبزادے ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ انگلستان میں تھے اور وہاں سے بہت کچھ چیزیں دماغ میں محفوظ کر کے لائے تھے ۔ ہندوستان میں غدر کے بعد جو کچھ ہوا اُس سے بھی سرسیدؒ کی طبیعت بہت زیادہ متاثر تھی پھر مسلمانوں کی بے روزگاری کا مسئلہ بھی اُن کے لئے سوہان روح تھا ۔ اِدھر حکومت نے ۱۸۷۱ء میں اپنے رویہ میں تبدیلی کی اُدھر سرسیدؒ کے دماغ میں ایم اے او کالج کے قیام کی تجویز آئی جس کا منشا ہمارے نزدیک بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان بے روزگاری کے مسئلہ سے نجات پا جائیں ۔ انگریزی وضع قطع اور معاشرت و تہذیب اختیار کر کے انگریز حکمرانوں کی نگاہوں میں معزز و مفتخر بن جائیں چنانچہ انھوں نے لکھا تھا کہ

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے ۔ تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب کہلاویں "

(تہذیب الاخلاق ۔ مضامین سرسید جلد دوم)

محولہ بالا کتاب میں ایک اور جگہ سرسیدؒ نے لکھا ہے کہ

"ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یوروپین ہو سب نے زمین پر اُٹھنا بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے ۔ میز و کرسی پر چھُری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں ۔ اُن کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یوروپینوں کا سا ہے ۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہمجولی معلوم ہوتے ہیں اور اُمید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں ۔"

مذکورہ بالا نظریوں کے ساتھ سرسیدؒ نے ۱۸۷۰ء میں دو کمیٹیاں قائم کیں ۔ پہلی کمیٹی نے یہ دریافت کیا کہ مسلمان سرکاری مدارس سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے جس کا جواب یہ ملا کہ سرکاری مدارس مسلمانوں کے حسب حال نہیں ہیں ۔ دوسری کمیٹی جس کا نام خزینۃ البضاعۃ تھا چندہ جمع کرنا شروع کیا جس کی مسلمانوں کی طرف سے مخالفت ہوئی لیکن انگریزوں کی حمایت نے سرسیدؒ کی ہمت بندھائی سب سے پہلے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے ایک ہزار روپیہ دیا پھر نواب کلب علی خاں والی ریاست رام پور نے اور دیگر رئیسوں سے چندہ دلایا ۔ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے نے ۱۸۷۳ء میں اپنی جیب خاص سے دس ہزار روپیہ دئے اور حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی سالانہ مستقل امداد ملنے لگی اور ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول کا قیام عمل میں آ گیا جو بعد میں ایم اے او کالج کے نام سے موسوم ہوا ۔

ہم نے اوپر مسلمانوں کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے اسباب بھی درج کئے جائیں اس لئے ذیل میں سرسیدؒ کی چند تحریریں درج کی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں یا علماء کی مخالفت کے اسباب موجود ہیں ۔

سرسیدؒ نے عربی مدارس کی لغویت کے عنوان سے لکھا کہ

"اس زمانہ میں پرانے طریقہ پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لئے جونپور، علی گڈھ، کانپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کئے ہیں مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں قدیم کتابیں ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی کی تعلیم نہیں کرتیں برخلاف اس کے جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر اور غرور کو خودپسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت

اور ہمدردی نہ رکھنا سکھاتے ہیں"

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ

"خود غرضی اور قومی ہمدردی کے عنوان سے سرسیدؒ نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں پُرانے زمانے کے نیک کاموں کا جو مثل مسجدوں، کنوؤں، پُلوں اور مہمانسراؤں کا مضحکہ اُڑایا اور ثابت کیا کہ وہ سب خود غرضی پر مبنی تھے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ پہلے زمانہ میں مدرسے بنانے کا بھی خیال نہ تھا اکبر کے زمانہ کے ایک مدرسہ کے تذکرہ میں سرسیدؒ نے لکھا "غالباً اُس میں چند اندھے قرآن حفظ کرتے ہوں گے"

سرسیدؒ نے جامع مسجد دہلی کی مرمت اور عربی مدارس کے قیام کی تضحیک کرتے ہوئے لکھا کہ

"جب زیادہ غور کر کے دیکھتے ہیں تو وہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے یہ تمام کام اُس خیالی جوش میں کر رہے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لیجائینگے۔ اور بہشت میں بڑے بڑے درجے پاویں گے۔ تاج ہمارے سر پر ہوگا اور ایک موتی محل جنت میں ملیگا۔ حوریں تصرف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا۔ غلمان بھی نہایت خوبصورت ہمارے تصرف یا خدمت کو ملیں گے باغ ہوگا، میوہ ہوگا۔ نہریں ہوں گی، شراب ہوگی، پئیں گے اور چین کریں گے ...... الخ (تہذیب الاخلاق)

انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی تجویز کے متعلق جس کو علما نے پیش کیا تھا سرسیدؒ نے لکھا کہ

"بڑے بڑے معمم اور متشمل قدوسی عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ و اصول و تفسیر و حدیث و علم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محققانہ تعلیم مذہبی اصول حقہ واقعیہ پر بلا شبہ مانع نقصان عقائد حقہ اسلامیہ کی ہوگی مگر تقصیر معاف ہو یہ اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہو سکتی اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج نہیں کر سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جائیں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بد اعتقادی پھیلے گی" (تہذیب الاخلاق)

لیکن مسلمانوں یا علما کی مخالفت سرسیدؒ کی تحریک کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی جس کے متعدد وجوہ بیان کئے جا سکتے ہیں۔ منجملہ دیگر وجوہ کے مسلمانوں کی عام پریشان روزگاری کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ حکام وقت نے تحریک سرسیدؒ کے ساتھ بہت زیادہ دلچسپی لی اور حکومت کی پوری امداد حاصل رہی۔ ہو سکتا ہے کہ اس ادارہ سے حکام وقت کی دلچسپی کی وجہ یہ ہو کہ حکام کو مسلمان ملازمین کی ضرورت تھی یا وہ اس ادارہ کو مسلمانوں میں سے روح جہاد فنا کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہوں اور اُن کے نزدیک اس طرح وہ نفرت مٹ سکتی ہو جو انگریزوں کے طرز عمل اور علمار کے پروپیگنڈے نے مسلمانوں کے دلوں میں بٹھادی تھی بہر حال ایم اے او کالج انگریز پرنسپل اور انگریز پروفیسروں کے ساتھ دنیا کے سامنے آیا اور اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوا یعنی اس کالج سے بالعموم ایسے طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے جن کے قلوب میں مذہب کے تو نہیں البتہ علما کے خلاف ایک جذبۂ منافرت موجود تھا اور لارڈ میکالے کے نظریہ کے مطابق وہ خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے "انگریز" تھے۔

سرسیدؒ کی تحریک انگریزوں کے نقطۂ نظر سے ہی کامیاب نہیں رہی بلکہ اس تحریک نے مسلمانوں کو بھی جہاں تک معاش کا تعلق ہے بہت نفع پہنچایا اور وہ خلیج جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان حائل تھی اسی تحریک کی بدولت رفتہ رفتہ غائب ہوئی۔ ایم اے او کالج نے نہ صرف یہ کہ بہترین سرکاری عہدیدار پیدا کئے بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں کے لئے بھی نمایاں اور ممتاز ہستیاں وجود میں آئیں۔ مسٹر سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب محمد اسحاق اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جیسی ہستیوں نے ایم اے او کالج کی ترقیوں کو حد کمال تک پہنچا دیا اور وہ نہ صرف یہ کہ برطانوی و ریاستی ہندوستان کے تشنگان علم کے لئے ایک مفید سرچشمہ ثابت ہوا بلکہ اس کی خدمات سے بیرونی ممالک بھی فیضیاب ہوئے۔ اس کے اقامتی نظام نے جو آکسفورڈ اور کیمبرج کے نظام کی اعلیٰ خصوصیات کا حامل ہے جہاں مسلمانوں میں تہذیب مغرب کے اثر و نفوذ کے مواقع مہیا کئے وہاں طلبار کو سوسائٹی میں شرکت، گفتگو کے مستحسن طریقوں کا ماہر اور پابندی قواعد کا خوگر بھی بنا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارباب اختیار نے طلبا کی مذہبی تعلیم اور مذہبی اعمال و عقائد کی نگرانی کے وسائل بھی اختیار کئے لیکن اس طرف ضروری توجہ کبھی نہیں دی گئی اور درسگاہ کا مذہبی شعبہ کبھی نمائشی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڈھ کے طلبا کی مذہبیت پر مغربیت کا اثر غالب رہا۔

یونیورسٹی کی مہم کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا جبکہ سر آغا خاں نے یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم جاری کی۔ حکومت بعض شرائط کی بنا پر یونیورسٹی کا چارٹر دینے کے لئے تیار تھی لیکن ذمہ دار لوگوں نے ان شرائط کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھ کر ٹھکرا دیا لیکن جب ہندو یونیورسٹی بنارس نے ان ہی شرائط پر چارٹر حاصل کر لیا تو ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں نے بھی شرائط قبول کر لیں اور یونیورسٹی چارٹر حاصل ہو گیا جس کے بعد آرٹ اور سائنس کے مختلف شعبوں کی اعلیٰ ڈگریاں یہیں سے دیجانے لگیں

مسلم یونیورسٹی کا سائنس کالج ہندوستان کی بہترین یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہیں ہے اور اسی طرح آرٹس کے مختلف شعبے بھی عملہ اور سامان کے لحاظ سے اعلیٰ ترین مدارج کی تربیت کے ذرائع بہم پہنچاتے ہیں۔ جغرافیہ کا شعبہ ایسا ہے کہ ہندوستان تو کیا دیگر متمدن ممالک میں بھی مشکل ہی سے نظیر مل سکتی ہے یہ شعبہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ زرعی تعلیم کا انتظام بھی اسکول کے مدارج اور انٹرمیڈیٹ کلاس میں موجود ہے۔ انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے نام سے ایک حرفتی درسگاہ بھی قائم ہے۔ جرنلزم کی تعلیم کا انتظام بھی ابتدائی طور پر کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے ملحقہ ادارات ٹریننگ کالج، گرلز کالج اور طبیہ کالج بھی خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ مردانہ اور ورزشی کھیلوں میں علیگڈھ کی شہرت ہمیشہ بالا رہی ہے۔ ہاکی اور کرکٹ کی ٹیموں نے بڑی بڑی بازیاں جیتی ہیں۔ مردانہ ورزشوں کے لئے ایک جمنازیم بھی قائم ہے۔ ایک بوٹ کا کلب اور ایک حوض شناوری بھی ہے مذہبی اعتبار سے ایک شعبۂ دینیات بھی قائم ہے۔ دینیات کی تعلیم یونیورسٹی کے تمام مدارج میں لازمی ہے اور اس کا امتحان پاس کئے بغیر کوئی سند یا ڈگری نہیں دی جاتی۔ اعلیٰ تعلیم دینیات کے لئے بی ٹی ایچ کا ایک درجہ بھی قائم ہے جس میں بی اے یا بی ایس سی پاس کرنے کے بعد طلبا داخل کئے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ شعبہ بہت ہی زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ اور اگر ارباب اختیار نے اس طرف ضروری توجہ کی تو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یقیناً صحیح معنی میں مسلمانوں کے لئے مفید ترین یونیورسٹی بن سکتی ہے۔ آخر میں ہم یونیورسٹی یونین کا تذکرہ بھی کریں گے جس کے صدر اور سکرٹری طلبا ہی میں سے منتخب ہوتے ہیں اور جس میں زندگی کے ضروری مسائل پر آزادانہ بحث کی اجازت ہے۔ یونین یقیناً وہ ادارہ ہے جس میں طلبا نہ صرف تقریر و مباحثہ کا ملکہ حاصل کرتے ہیں بلکہ انھیں آئندہ زندگی میں عملی حصہ لینے کی مشق بھی ہوتی ہے۔ اس ادارہ کی سرگرمیوں میں اگرچہ بعض اوقات یونیورسٹی کے حکام نے بہت ہی ناروا مداخلت کی ہے لیکن اس سے ادارہ کی نفع بخشی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے مسلمانوں کو ایک اہم شکایت یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اب تک اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار نہیں دیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلم یونیورسٹی عوام کے اس اہم اور ضروری مطالبہ کو کب تک پورا کرے گی؟

"دارالعلوم ندوۃ العلماء"

دیوبند کی نیم رہبانیت اور علی گڈھ کی نیچریت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کے مسلمان دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ یہ تقسیم گوارا کی جا سکتی تھی اگر اس تقسیم سے مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور تہذیب کی حفاظت کا یقین ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا حکومت و امارت کا خاتمہ تو ہو ہی چکا تھا اب مسلمانوں کا اتحاد و یک جہتی بھی معرض خطر میں تھی۔ قدیم و جدید کی رقابت نے مسلمانوں کو پراگندہ خیال بنا دیا تھا اور سچ پوچھئے تو قافلۂ اسلام مسیحیت کے قدیم دور اہ پر جو رومہ سے نکلا تھا پڑ گیا تھا ایک طرف ایسے علما پیدا ہو رہے تھے جو دنیا سے عملاً کنارہ کش اور ذہنی و تربیتی لحاظ سے دنیاوی رہنمائی کے لئے روز بروز ناقابل ہوتے جا رہے تھے دوسری طرف ایسے دنیا داروں کا وجود عمل میں آ رہا تھا جو دین کے مصالح و مقاصد، اس کی منشا و روح سے بے بہرہ، غیر ہمدرد اور مستغنی تھے۔ ہوشمند و عاقبت ناشناس مسلمان بڑی بے چینی کے ساتھ ان حالات کو دیکھ رہے تھے۔ آخر اُن کے دلوں میں کسک پیدا ہوئی اور درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں کانپور میں مدرسہ فیض عام کا جلسہ تھا۔ صورت حال کی نزاکت نے سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی اور مخلصانہ غور و فکر کے بعد ندوۃ العلما کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا

"جزئیات و فروعات سے علما کی توجہ ہٹا کر ان کی نظر میں وسعت اور فکر میں بلندی پیدا کی جائے، مدرسوں اور خانقاہوں میں عمل کی حرکت اور زندگی کی روح پھونکی جائے۔ مقاصد میں ہم آہنگی اور فکر و خیال میں یکسانیت پیدا کی جائے نصاب و نظام تعلیم میں تغیر کیا جائے اور عصر حاضرہ کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جائے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ طلبا کو جدید علوم سے بھی روشناس کیا جائے اور ان کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ زمانے کے حالات کو سمجھ سکیں تاکہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کر سکیں اُن کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، وہ ذہن ثاقب اور فکر صائب کے مالک ہوں"۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۳۹)

"آئینۂ حقیقت نما"

ریاست حیدر آباد کے ترقی پسندانہ اقدامات

(ایک حق پسند اور پرستار عدم تشدد کی قلم سے)

ریاست حیدر آباد کے خلاف جو فرقہ وارانہ پروپیگنڈا جاری ہے اُس کی شورش اور ہما ہمی میں اُن مستحسن کوششوں کی ضروری اشاعت نہیں ہو سکی جن میں ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام کی حکومت سرگرم عمل ہے۔ مخالف پریس سالہا سال سے ایک خاص التزام کے ساتھ اخفائے حق و گمراہ بیانی کی خرمستیوں میں اس طرح مصروف ہے کہ اس حقیقت کا اعتراف مشکل کیا جائیگا کہ حیدر آباد کا نظم و نسق مبارک و شریفانہ عزائم کا حامل ہے اور کہ وہ مترقی و جدید لائنوں پر گامزن ہے۔

تاہم بدزبانوں اور نکتہ چینوں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود مذکورہ بالا حقیقت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ نظم و نسق نہ بے عیب ہے اور نہ مکمل ہے لیکن اُس کی نیت یقینی طور پر نیک ہے۔ نیز وہ اپنے طریقوں میں اصلاح اور اپنی فیاضانہ سرگرمیوں میں توسیع کے لئے مضطرب رہتا ہے۔ حکومت حیدر آباد کی انتظامی سرگرمیوں کے متعلق سرکاری تحقیقات کے حسب ذیل متفرق اقتباسات اگرچہ تازہ بہ تازہ نہیں ہیں تاہم ان میں برطانی ہند کی مشتعل اور گھبرائی ہوئی پبلک کے لئے سامان اطمینان و سکون موجود ہے اور انھیں یقین آسکتا ہے کہ نظم و نسق حیدر آباد اتنا قسی القلب رجعت پسند اور ضروریات عامہ سے تغافل برتنے والا نہیں ہے جتنا کہ اُس کے نکتہ چیں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مالیات کا استحکام اور سہل الحصول آزادانہ عطیات ہی سب سے بڑا سبب ہیں کہ قومی تعمیر کے محکموں مثلاً تعلیم اور صحت عامہ، کی سرگرمیوں میں غیر معمولی توسیع نظر آتی ہے۔ روزمرہ کے نظم و نسق میں ایسی بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں جنھوں نے دائرۂ کارکردگی کو وسیع تر بنا دیا ہے، اسی طرح داخلی ترقی کے اداروں مثلاً ریلویز کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ ریل اور روڈ میکانیکل ٹرانسپورٹ کا ارتباط باہمی، سرکاری طور پر براڈ کاسٹنگ اور ہوابازی کا نفاذ، پیشہ ورانہ رجحان پیدا کرنے کے نظریہ کے ساتھ نظام تعلیم کی ازسرنو تنظیم، انتخابی اور ذمہ دار بنیاد پر حیدر آباد میونسپل کارپوریشن کے دستور کا اجراء، ڈسٹرکٹ میونسپلٹیوں کی ازسرنو تنظیم اور دیہات سدھار کے مرکزی بورڈ کا قیام وہ جدید اصلاحات ہیں جو نظم و نسق کی مشنری سے تعلق رکھتی ہیں اور قابل لحاظ ہیں۔ علاوہ ازیں قرض کی لعنت کے خلاف قانون سازی، علاقہ نظام ساگر میں کارخانہ شکر کا قیام، سونا نکالنے کی مہم کے آغاز کا فیصلہ، صنعتی و کاشتکارانہ امداد کے لئے کریڈٹ کی سہولتوں کو مربوط کرنے کے نقطۂ نظر سے بینکنگ کی تحقیقات ہندو شادیوں کی رجسٹری کے رواج کا نفاذ اور شادی بیوگان کے اجازت کے قانون کی منظوری ایسے امور ہیں جن سے ریاست کی موجودہ رفتار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آئینی ترقی

ہز اگزالٹڈ ہائنس نے ایک اسپیشل کمیٹی مقرر کرکے آئینی ترقی کی طرف ایک زبردست قدم اٹھایا ہے۔ اس کمیٹی میں غیر سرکاری ارکان کی اکثریت ہے اور یہ کمیٹی تحقیقات کے بعد اُن طریقوں کی رپورٹ دیگی جو ریاست کے مختلف مفاد اور حکومت کے مابین موثر تعلق پیدا کرنے کے ضامن ہوں گے۔ اعلان کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کو جبری قرار دینے کے لئے قانون جاری کیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ قانون مطابع زیر غور ہے جس سے پریس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ اعلان بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ وہ مقامات کون سے ہیں جہاں اب بھی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں نہیں دی جاتی، ثانوی تعلیم میں مادری زبان کے اجرا کا مسئلہ زیر غور ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کے سکریٹریوں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو ملازمتوں میں بھرتی اور اُن اداروں کے لئے قاعدے مرتب کرے گی جن کے ذریعہ بھرتی یا انتخاب کیا جاتا ہے۔

مالی سسٹم

چونکہ مالیات ہی فی الحقیقت تعمیر و اصلاح کی کنجی ہے اس لئے مختلف سمتوں میں حاصل شدہ ترقی کا اظہار کرنے کے لئے مالی سسٹم کا بیان مفید ہوگا۔ محکمہ سازی مالیات کی اسکیم کے ماتحت جو گذشتہ پندرہ سال سے جاری ہے مختلف محکموں کے مفوضہ حصے سہ سالہ اجاروں کی صورت میں اُن کے سالانہ اخراجات کے اوسط کی بنیاد پر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناقص اور غیر مفید اخراجات کا سال کے آخر پر پتہ چل جاتا ہے جن کو غیر صرف شدہ مد میں درج کرنے کے بجائے متعلقہ محکمے پوری آزادی کے ساتھ خوب اچھی طرح سوچی ہوئی ترقی پسندانہ اسکیموں پر صرف کر سکتے ہیں۔ اگر سہ سالہ مدت کے اختتام پر بچت ہوتی ہے تو اس کا ایک حصہ سیونگ ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا جاتا ہے اور باقی کو تعمیر قومی کی دیگر سرگرمیوں پر صرف کر دیا جاتا ہے۔

محفوظ فنڈ

گذشتہ سالوں کی بچت کے علاوہ مستحکم محفوظ فنڈ قائم کئے گئے ہیں جو متعدد ضروری اور مفید مقاصد کی سرانجام دہی کے لئے مشہور ہیں۔ چنانچہ قحط فنڈ، انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ، عثمانیہ سکہ سازی کا استحکام اور پیپر کرنسی کے محفوظات یہ سب مجموعی حیثیت سے ضروریات خاص کو پورا کرنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قحط فنڈ کو مالیات عامہ سے پندرہ لاکھ سالانہ کی رقم ملتی ہے اور اس کا خزانہ اب ۲ر۲۰۵ لاکھ کا حامل ہے۔ اس فنڈ سے نہ صرف مصیبت زدگان قحط کی امداد کا کام لیا جاتا ہے بلکہ اُن دیہات میں صاف شفاف پانی کے چرخی دار کنوئیں بھی بنوائے جاتے ہیں جہاں قحط یا خشک سالی کے زمانہ میں پانی کی کمی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کنوئیں بنانے والے محکمہ نے اس وقت تک ۲۸ لاکھ روپیہ صرف کرکے رائچور میں پندرہ سو کنوئیں تعمیر کرائے ہیں۔ اسی طرح ۲۰۰ کنوئیں گلبرگہ میں تعمیر کرائے ہیں جہاں ۲۵۰ کنوئیں اور زیر تعمیر ہیں۔

صنعتی راس المال

انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے خزانہ میں اس وقت ۳۹ر۹۶ لاکھ روپیہ موجود ہے۔ اس فنڈ کا روپیہ بڑی بڑی صنعتی مہموں پر صرف کیا جاتا ہے اور اس کے نفع سے قرضوں یا بنیادی چندہ کی صورت میں دوسری چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ اسی سال کے دوران میں کارخانۂ شکر نظام ساگر کے حصوں میں ۷۱½ لاکھ روپیہ لگایا گیا ہے جو خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ علاوہ ازیں نئے تین سالوں میں ایک کروڑ نوے لاکھ روپیہ نئے تعمیری امور کیلئے رکھے گئے ہیں جس میں سے ایک کروڑ سڑکوں کی تعمیر کے لئے ۲۰ لاکھ گلبرگہ کی واٹر ورکس کے لئے، ۵ لاکھ چھوٹے شہروں کی میونسپلٹیوں کے لئے اور ۲۰ لاکھ سونا نکالنے کی مہم کے لئے تجویز ہوا ہے۔ سونے کی قیمت میں اضافہ کے باعث یقینی طور پر اُمید کی جاتی ہے کہ چند قدیم قطعات آراضی کی مدد سے سونا نکالنے کی مہم کا آغاز تجارتی بنیاد پر ہو سکے گا۔ اور اس طرح نہ صرف یہ کہ ریاست کے مالی ذرائع میں ایک اہم اضافہ ہو جائے گا بلکہ رائچور کے باشندوں کے لئے بھی روزگار کا ایک نیا میدان مہیا ہو جائے گا جہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے بہ کثرت وبائے قحط نمودار ہوتی رہتی ہے۔

اگرچہ گذشتہ چند سال کے عرصہ میں ریاست کے کل مالیہ میں تقریباً ایک کروڑ کا اضافہ ہوا ہے لیکن موجودہ سال کے مالی پروگرام کی رقم ایک کروڑ چھپن لاکھ تک پہنچ گئی ہے جس میں ۲۵ لاکھ روپیہ یونیورسٹی اور پولیس کی عمارتوں کے لئے، گیارہ لاکھ روپیہ علاقہ نظام ساگر میں نہری رواج کے لئے، اور ایک کروڑ سے زائد روپیہ سرکاری ریلوے لائنوں میں توسیع کے لئے منظور کیا گیا ہے۔

ریلوے سسٹم

ریلوے سسٹم ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں اتنا وسیع نہیں ہے جتنا کہ ریاست حیدر آباد میں پایا جاتا ہے۔ ریلوے کی کل لمبائی ایک ہزار چھ سو ۴۶ میل ہے جس میں سے صرف ۲۷۱ میل کی مالک حکومت ہند یا پرائیویٹ کمپنیاں ہیں۔ نظام اسٹیٹ ریلوے جس کا انتظام ریاست کا محکمۂ ریلوے کرتا ہے ۱۳۴۷ میل لمبی ہے جس میں سے ۶۸۸ میل بڑی اور ۶۵۹ میل چھوٹی لائن ہے۔ ریاست کا ریلوے سسٹم ریاست کے حدود پر یا اُن کے قریب دوسری لائنوں سے ۵ جنکشنوں پر ملتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ درآمد و برآمد کے لئے بہترین صورتیں مہیا ہو گئی ہیں نیز شمالی و جنوبی ہندوستان اور مشرقی و مغربی سواحل کے مابین براہ راست راستوں کے قطعے بن گئے ہیں معاون اور برانچ لائنوں کا مسئلہ پوری اہمیت کے ساتھ زیر غور ہے چنانچہ جیسے ہی کہ وہ نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی، کی ریلوں کو ہز اگزالٹڈ ہائنس کی حکومت نے اپنے اختیار میں لیا وہ وقار آباد بیدر لائن، کو پورلی ویجناتھ تک وسیع کر دیا گیا اور اس طرح ایک سو دس میل لانبی لائن بچھائی گئی۔ اسی طرح جنگیتال، اورنگ آباد، بھیر، اور عادل آباد کی معاون لائنوں کی پیمائش کی جاچکی ہے۔ ان متعدد اسکیموں میں وہ "مدکھیڑ عادل آباد لائن" (۱۰۰ میل لانبی) بہت جلد بنائے جانے کے لئے زیر غور ہے۔ حکومت نے ریلوے سسٹم پر مارچ سنہ ۱۹۳۸ء تک جو رقم صرف کی ہے اُس کی تعداد ۱۰۵۰۹ لاکھ تک

پہنچتی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو ختم ہونے والے سال میں کل آمدنی مع اخراجات ۲۰۴۵ لاکھ ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس سلسلہ کے لگے ہوئے سرمایہ پر ۶ر۸ فیصدی کے حساب سے نفع ہوا ہے جس کا مقابلہ ۱۹۳۶ء کے ۷ر۷ فیصدی سے کیا جاسکتا ہے۔

ریل اور سڑکوں میں ارتباط باہمی

اس موقعہ پر ریاست کے اس رہنمایانہ اقدام کا تذکرہ بھی غیر مناسب نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ریل اور روڈ میکانیکل ٹرانسپورٹ کو مربوط کردینے کی اسکیم کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سروس کا آغاز ۲۷ بسوں کے بیڑے سے مختصر پیمانہ پر کیا گیا تھا لیکن سروس کی کامیابی اور مزید آسانیوں کے لئے اضلاع کے مطالبات کے نتیجہ میں یوماً فیوماً اضافہ ہوتا رہا۔ حتی کہ مارچ ۱۹۳۸ء کے آخر تک یہ بیڑا ۳۵۸ موٹروں پر مشتمل ہوگیا اور راستہ کی لمبائی ۷۰۱۴ میل تک پہنچ گئی گویا مملکت آصفیہ کی تمام بڑی بڑی سڑکوں کی کل لمبائی کا ۷۵ فیصدی اس کے تحت آگیا۔ مربوط باربرداری کی اس اسکیم نے نجی منافع کو بحیثیت مجموعی مفاد عامہ کے لئے خزانۂ عامہ کی طرف منتقل کردیا۔ مطابقت معیاری نرخ اور ماڈلوں کی بوقلمونیت کو دور کردیا، نقصان رساں مقابلہ کی وبا دور ہوگئی اور مقابلۃً کم شرحوں پر زیادہ باقاعدہ سروسیں مہیا ہوگئیں۔ علاوہ ازیں اس تدبیر نے اُن علاقوں میں جہاں ریل موجود نہیں ہے ریل کے معاون کی حیثیت سے باربرداری اور سڑکوں کی ترقی کی ایک مستقل اسکیم کو یقینی بنادیا ہے۔

فضائی سروس

ایک واحد ادارہ کے ماتحت باربرداری کی تمام صورتوں کے باہمی ارتباط میں ایک مزید ترقی اس وقت ہوگی جب ریاست اپنی ذاتی فضائی سروس جاری کرے گی۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم حیدرآباد میں فضائی مرکز کے قیام اور درسی و ارضی اسٹاف کے تقرر کی صورت میں اُٹھایا جاچکا ہے۔ ضروری مشینوں کی خریداری کے انتظامات کئے جارہے ہیں اور تجارتی ہوابازی میں ترقی کے لئے ایک اور مرکز فضائی کھولنے کی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں۔

معافیات مالیہ

ریلویز کی آمدنیوں کے علاوہ جو ایک تجارتی صیغہ سے متعلق ہیں آمدنی کے دیگر اہم ذرائع مالگذاری، کسٹم، آبکاری اور جنگلات کے ناموں سے موسوم ہیں۔ مالگذاری کا سالانہ مطالبہ مع اخراجات گذشتہ چار سال سے مستقلاً ۳۶۵ لاکھ روپیہ رہا ہے۔ اس عرصہ میں تشخیص شدہ مالگذاری میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ البتہ حکومت نے اوسطاً ۵۰ لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ کی مخصوص بڑی بڑی معافیاں موسمی حالات کی بنا پر یا زرعی پیداوار کے نرخ میں کمی ہوجانے کی وجہ سے دی ہیں۔ اس لئے خالص مطالبہ ۲۹۸ اور ۳۲۲ لاکھ سالانہ کے اندر اندر رہا ہے۔ عام معافیات کے علاوہ سابقہ بقایا کے سلسلہ میں بھی ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام کی سلور جوبلی کے موقعہ پر ۴۰ لاکھ روپیہ کی ایک خاص معافی دی جاچکی ہے

بعض اضلاع میں خشک سالی کی بنا پر ۲۲ر۹ لاکھ کے مالیہ کی وصولیابی کے التوا کا اعلان کیا گیا، آبپاشی، دیہی امور اور سڑکوں کی صورت میں امدادی کام جاری کئے گئے نیز فیمین انشورنس فنڈ سے ۳۷ لاکھ روپیہ کی منظوری بغرض تقسیم عطیات امدادی کی گئی

کاشتکاروں کی امداد

دیہی قرضوں کی وسعت کے متعلق رپورٹ دینے اور مستقل امداد کے طریقے تجویز کرنے کے لئے ایک افسر کو اسپیشل ڈیوٹی پر تعینات کیا گیا تھا۔ اس افسر کی رپورٹ مع اُن مسودہ ہائے قوانین کے جو اراضی رہن کرنے والے بینکوں، بہت زیادہ سود لینے والے ساہوکاروں اور قرضہ چکا دینے کے متعلق ہیں حال ہی میں اشاعت پذیر ہوئی ہے اور زیر غور ہے اسی طرح دو اہم دیگر اقدامات یہ ہیں کہ بعض منتخبہ اضلاع میں ابتدائے کار و تجربہ کے طور پر ضوابط انتقال آراضی کا نفاذ کیا گیا ہے اور واجب العرض کے رواج کو بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔

امتناع منشیات

آبکاری کے جدید سسٹم کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر قسم کی شراب کی دوکانوں کی تعداد جو ۱۹۳۳ء میں ۲۴ ہزار پانسو باون (۲۴۵۵۲) تھی ۱۹۳۷ء میں گھٹ کر گیارہ ہزار ایک سو اٹھائیس (۱۱۱۲۸) رہ گئی۔ لیکن جہاں شراب اور افیون کی خریداری میں معتد بہ کمی واقع ہوئی ہے وہاں آبکاری کی آمدنی جو سال ۱۹۳۲-۳۳ء میں ایک کرور اسّی لاکھ تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ۲ کروڑ سے کچھ زیادہ ہوگئی شرابنوشی کی عادت کو بالکل چھڑا دینے کے لئے ہز اگزالٹڈ ہائنس نے براہ نوازش ۱۹۳۵ء میں ایک ٹمپرنس کمیٹی مقرر فرمائی تھی جو اُس وقت سے تمام مملکت میں مفید پروپگنڈا کر رہی ہے۔ تعلیم عامہ اور انتظامی طریقوں کی محتاط و خوش تدبیر حکمت عملی کے ذریعہ حکومت نے انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ شراب اور دیگر نشہ آور اشیا کے استعمال میں غیر معمولی کمی پیدا کرکے کامیابی حاصل کی ہے۔

زرعی محکمہ کی سرگرمیاں

زرعی محکمہ میں تحقیقاتی اور تجرباتی دونوں پہلوؤں پر خاص توجہ دی جارہی ہے اور کھیتوں میں اصلاح یافتہ بیج اور طریقوں کے نفاذ پر بھی اہمیت کے ساتھ غور کیا جارہا ہے۔ باغبانی سے متعلق ایک آزاد ادارہ قائم کیا گیا ہے اور راجگور اور ورنگل میں سابقہ باغات کے علاوہ تجربات کی خاطر پھل اور سبزی کے باغات اُگائے گئے ہیں ایک تجرباتی فارم ورنگل میں اور ایک مرغی خانہ پربھنی میں جاری کیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیقاتی و تجرباتی صیغوں کو امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کی اسکیمیں منظور کرکے غیر معمولی وسعت دیدی گئی ہے یہ اسکیمیں ارنڈی کی پیداوار، خشک فارمنگ کی تحقیقات اور روئی کی پیداوار کی قیمت سے متعلق ہیں۔ اسی طرح انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی کی اسکیم کو منظور کرلیا گیا ہے جو روئی کی فصل کے سروے اور روئی کے دیہی صرف سے متعلق ہے۔

ضلع نظام آباد میں نیشکر کی اصلاح یافتہ قسموں کی کاشت کافی بڑے پیمانہ پر ہونے لگی ہے حتی کہ مقامی طور پر شکر بنانے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ایک عظیم الشان کارخانہ زیر تعمیر ہے۔ کھیتوں میں بھی بڑی حد تک اصلاحات نظر آتی ہیں کیونکہ حکومت نے اُن تجرباتی تعلیم کے فارموں اور تجرباتی تعلیم کے قطعات کے لئے امدادی رقوم کی منظوری کا سلسلہ جاری کردیا ہے۔ جو کاشتکاروں کی آراضیات پر واقع ہیں۔ اس قسم کے امدادی فارموں کی تعداد ۱۹۳۳ء میں ۴ تھی جو ۱۹۳۷ء میں بڑھ کر ۱۴ ہوگئی۔ اسی طرح تجرباتی تعلیم کے قطعات کی تعداد جو ۱۹۳۳ء میں ۹۰۷ تھی بڑھ کر ۲۲۴۹ ہوگئی۔ ان مظاہروں اور پروپگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکاروں کی وہ آراضی جس پر اصلاح یافتہ پیداوار کی کاشت ہوتی ہے تین سال کے دوران میں ۳۱۳۲۲، ایکڑ سے بڑھ کر ایک لاکھ پندرہ ہزار ۳ سو اڑتالیس (۱۱۵۳۴۸) ایکڑ ہوگئی ہے۔

معدنی ذرائع

حیدرآباد معدنی دولت سے مالامال ہے جس میں کوئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سردست تین کمپنیاں سنگرینی، تاندور اور ساستی میں کوئلہ کی کانوں کا کام کررہی ہیں اور چوتھی کان عنقریب کھولی جانے والی ہے۔ نکاسی ۲۹ لاکھ سے ۴۲ لاکھ ٹن تک بڑھ چکی ہے جس سے ۸½ لاکھ روپیہ بطور رائلٹی (حق شاہی) ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر معدنیات بھی ہیں مثلاً سونا، یاقوت، چونے کا پتھر اور پنسل کا سُرمہ۔ سنگ مرمر کی ایک کمپنی جو ۱۹۳۰ء میں بنی تھی اس وقت ضلع ورنگل میں کام کررہی ہے۔ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ حکومت سونا نکالنے کی مہم کے آغاز کا فیصلہ کرچکی ہے جو چند سال ہوئے اُس وقت کے حالات کے ماتحت غیر نفع بخش ہونے کی وجہ سے ملتوی کردی گئی تھی۔

صنعتی احیا

مملکت کے مختلف حصص میں متعدد چھوٹی اور بڑی صنعتیں پھل پھول رہی ہیں۔ عثمان شاہی ملز واقع ناندیڑ نے ۱۹۲۵ء میں کام شروع کیا تھا اور اب ۲۰۰۰۰ تکلے اور ۴۹۰ کرگھے کام کررہے ہیں مل میں ۲۴۰۰ مزدور برسر روزگار ہیں اور کمپنی کے حصہ دارانہ سرمایہ (بی۔جی) کی رقم ۵۰ لاکھ روپیہ ہے۔ سال ۱۹۳۸ء میں اس نے تقریباً ۵ر۷ ملین پونڈ سوت اور تقریباً ۴ر۹ ملین پونڈ کپڑا تیار کیا جس کے سلسلہ میں ۷۵۰۰ گٹھے ریاستی روئی کے خریدے۔ اعظم جاہی ملز ورنگل کا اجرا ۱۹۳۴ء میں ہوا اور اب اس میں ۱۹۵۰۰ تکلے اور ۴۲۴ کرگھے مصروف عمل ہیں۔ مل مزدوروں کی تعداد تقریباً ۲۴۰۰ ہے اور کمپنی کے حصہ دارانہ سرمایہ (او۔ایس) کی رقم ۱۸ لاکھ ہے۔ سال ۱۹۳۸ء میں اس مل نے تقریباً ۴ر۲ ملین پونڈ سوت اور تقریباً ۱ر۳ ملین پونڈ کپڑا تیار کیا اور حدود مملکت میں پیدا شدہ روئی کے تقریباً ۱۹۸۰۰ گٹھے خریدے۔ ان دونوں ملوں کی نگرانی زیادہ تر حکومت کے ذمہ ہے

شاہ آباد سمنٹ کمپنی کے پاس جدید طرز پر سمنٹ بنانے والی اور بجلی پیدا کرنے والی مشینیں ہیں اور یہاں سے سالانہ ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن پورٹ لینڈ سمنٹ کی نکاسی ہوتی ہے۔ اس کمپنی نے ریاست اور ریاست کے باہر کی تمام مشہور ریلویز اور محکمہ جات امور عامہ کو سمنٹ سپلائی کیا ہے اور حال ہی میں ایسوشی ایٹڈ سمنٹ کمپنیوں میں شریک ہوئی ہے مزید برآں ٹینے۔ روئی اوٹنے، اور پریس کرنے کی ملیں، سگرٹ اور دیاسلائیاں بنانے کے کارخانے، چاول اور تیل نکالنے کی ملیں اور بٹن بنانے کے کارخانے بکثرت موجود ہیں۔ ایک عظیم الشان نیا کارخانہ شکر نظام ساگر کے نہری علاقہ میں بمقام بودھن قائم کیا گیا ہے۔ اس

کارخانہ پر ۳۵ لاکھ روپیہ کا حصہ وارانہ سرمایہ لگا ہوا ہے جس کے زیادہ تر حصے ہزاگزالٹڈ ہائی نس کی حکومت کی ملکیت ہیں۔ گوٹے اور کاغذ کی صنعت کے اجرا کی تجویز بھی تکمیل کے قریب ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ایک ایسے کارخانہ پر جس کی سالانہ نکاسی ۵ یا ۶ ہزار ٹن ہوگی ۵۰ لاکھ سے کم روپیہ صرف میں آئے گا۔ گھریلو صنعتیں بھی بہ کثرت ہیں جن کی اقتصادی و فنی قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت کو بیدری کی برتن سازی ورنگل کی قالین بافی، کریم نگر کے چاندی کے کام، نرمل کی کھلونا سازی، پیٹھان کے سونے کی لیس کے کام اور اورنگ آباد کی ہمرو بافی پر بجا طور پر ناز ہے۔

دیہات سُدھار

دیہات کی عنفوانی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے علاوہ حکومت نے دیہات سُدھار کی ایک عظیم الشان اسکیم بھی مرتب کی ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں ضلع کی تعلقہ انجمنوں میں جو سرکاری و غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ہیں باہمی ربط پیدا کرنے کے لئے ایک مرکزی بورڈ قائم کیا گیا ہے دیہات کے تمام منتخبہ خاندانوں کو حتی الامکان ترغیب دی جائے گی کہ وہ تعاونی اصولوں پر دیہات سُدھار کے کام میں حصہ لیں۔ دیہی اسکول ماسٹر اور دیہی پٹیل دیہی انجمن کے سرداروں کی حیثیت سے کام کریں گے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ان تدابیر سے کاشت کے اصلاح یافتہ طریقوں، تحفظ نسل مویشیان، اور زیادہ نفع بخش گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی میں بڑی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم صحت عامہ اور عام خوشحالی میں ترقی بھی ہوگی۔ دیہات سُدھار کا کام فی الحال علاقہ نظام ساگر کے تقریباً ۸۵ دیہات میں جاری ہوگیا ہے علاوہ ازیں ریاست کے ۱۰۴ تعلقوں کے کسی ایک یا اس سے زیادہ دیہات میں دیہات سدھار کی اسکیم نافذ کردی گئی ہے۔ اقتصادی انحطاط کے تسلسل نے لازمی طور پر کوآپریٹو تحریک کی ترقی کو سست اور محتاط بنادیا ہے۔ تاہم سوسائٹیوں کی تعداد میں بقدر پانسو کے اضافہ ہوا جن کی کل تعداد اس وقت تین ہزار ہے۔ ان میں سے ایک ڈومینین بنک کے نام سے موسوم ہے۔ ۳۹ دوسرے بنک سنٹرل بنک کے ذریعہ چل رہے ہیں، ۲۴۳۵ زرعی سوسائٹیاں اور ۴۷۴ غیر زرعی سوسائٹیاں قائم ہیں ایک ایسے ملک میں جو خصوصیت کے ساتھ زرعی ہے زرعی سوسائٹیوں کے غلبہ کی وجہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ تمام سوسائٹیوں کا چالو سرمایہ ۲۲۵ لاکھ سے بڑھ کر ۲۴۶ لاکھ ہوگیا ہے۔ واجب الادا رقم اس وقت ۱۸۲ لاکھ ہے۔ یہ امر یقیناً مسرت انگیز ہے کہ تحریک خود بردار و خود پرور ہوگئی ہے اور باہم ناموافقتوں کے باوجود اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے

احیائے تعلیم

تعلیم یافتہ طبقہ کی ممکن بے روزگاری کو روکنے اور اُن کو جدید اقتصادی زندگی کی ضروریات کا بہتر طور پر مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لئے احیائے تعلیم کی ایک وسیع اسکیم کا نفاذ عمل میں آیا ہے۔ اس اسکیم کے ماتحت ریاست میں تعلیم کو چار منازل سے منظم کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک کا مقصد جداگانہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد جس کی مدت پانچ سال ہے وہ ضروری عام تعلیم و تربیت ہے جو مستقل خواندگی کو یقینی بنادے گی۔ ثانوی اور پیشہ ورانہ منزل کی مدت چار سال ہوگی جو عام تعلیم کے نقطۂ نظر سے ایک مستغنی نصاب کی حامل ہوگی اور جس سے اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک مناسب بنیاد قائم ہوجائے گی۔ اُن لڑکوں کے ٹریننگ کے لئے بھی عملی رجحان فطری کے ساتھ سہولتیں مہیا کی جائیں گی جو ابتدائی منزل سے آگے جانے کے خواہشمند تو ہوں گے لیکن اُنھیں ادبی مذاق نہ ہوگا۔ اعلیٰ اور فنی منزل ایسے اداروں کے لئے مخصوص ہوگی جن کے نصابوں کی مدتیں مختلف ہوں گی، اور جو طلبا کو یونیورسٹی کلیریکل ٹریننگ، زرعی ٹریننگ اور صنعتی مضامین کی ٹریننگ کے لئے تیار کریں گے۔ آخری منزل یونیورسٹی کی ہوگی جو ہر درمیانی امتحان سے بے نیاز ہوگی۔ ثانوی اور ہائی اسکول کی تعلیم کی نگرانی اور کنٹرول کے لئے ایک تعلیمی بورڈ مقرر کیا جاچکا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب محولہ بالا جبری ابتدائی تعلیم کے رواج کو حدود مملکت میں نافذ کردیا جائے گا۔ آج کل یہ تعلیم آزاد ہے اور طلبا کی مادری زبان میں دی جاتی ہے یعنی اُن کو حالات کے مطابق تلنگو، مرہٹی، کناری یا ہندوستانی پڑھائی جاتی ہے۔ مدارس کی تعداد اور اسی طرح طلبا کی تعداد میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ سال زیر بحث کے دوران میں پبلک اسکولوں کی تعداد (کالجوں کے علاوہ) ۴۷۶۸ سے بڑھ کر ۵۱۳۱ ہوگئی ہے بہ الفاظ دیگر ۴۰۰ نئے اسکول جاری ہوئے ہیں طلبا کی تعداد بھی ۲۹۰۷۶۸ سے بڑھ کر ۳۱۰۸۱۰ ہوگئی ہے اور تعلیمی بجٹ بھی (یونیورسٹی اور کالجوں کے علاوہ) ۹۰ لاکھ تک بڑھ گیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جارہی ہے جس کے لئے اس وقت ۷۶۶ مدارس قائم ہیں جن میں ۵۶ ہزار لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں علاوہ ازیں ایک اول درجہ کا زنانہ کالج بھی موجود ہے جسمانی تعلیم عام اسکولوں میں لازمی قرار دی گئی ہے اور اساتذہ کے لئے جسمانی تعلیم کا ایک کالج بھی قائم کیا گیا ہے۔ جہالت کا استیصال بھی چونکہ تعلیمی پروگرام کا ایک اہم جزو ہے اس لئے حکومت نے شہر اور اضلاع میں متعدد مدارس بالغان کھولے ہیں۔ اچھوت طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بھی حکومت نے قدم اُٹھائے ہیں۔ امتیاز نسل کی تمام پابندیوں کو پبلک اسکولوں سے اُٹھا دیا گیا ہے اور چند خاص مدارس بھی اُن کے لئے جاری ہیں۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم کے دائرے میں عثمانیہ یونیورسٹی نے جو اب سے بیس سال قبل قائم کی گئی تھی ہر اعتبار سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے یونیورسٹی میں جملہ مضامین اعلیٰ ترین درجات تک ہندوستانی زبان کے ذریعہ پڑھائے جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ریاست کی سرکاری زبان ہے بلکہ ہندوستان کی جملہ اقوام کے معاشرتی و ذہنی تبادلۂ خیال کا ایک مشترک ذریعہ ہے۔ انگریزی تمام درجوں میں بطور لازمی زبان کے پڑھائی جاتی ہے۔ یونیورسٹی میں آرٹس، مذہبیات، سائنس، قانون، انجنیرنگ، طب اور معلمی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اول الذکر چار شعبوں کے مضامین اعلیٰ درجات تک یونیورسٹی کالج میں پڑھائے جاتے ہیں اور طب، انجنیرنگ اور معلمی کے لئے جداگانہ کالج ہیں۔ ان کے علاوہ چار انٹرمیڈیٹ کالج اور ایک اول درجہ کا زنانہ کالج بھی ہے۔ موجودہ محکموں کے علاوہ نباتیات، حیوانیات، اور ارضیات کے محکمے بھی کھولے گئے ہیں اور اقتصادیات کا ایک اسکول بھی جاری کیا گیا ہے۔ نان ممبروں کے مفاد کی خاطر کالج کے اوقات کے علاوہ عربی، سنسکرت، جرمن اور فرنچ کی تعلیم کے انتظامات بھی موجود ہیں۔ جہاں تک طلبا اور اساتذہ کا تعلق ہے طبع زاد ریسرچ کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور عامۃ الناس کو لکچروں کی توسیع کے ذریعہ فائدہ پہنچایا جاتا ہے جو روز بروز مقبول عام ہوتے جارہے ہیں۔ یونیورسٹی اور اس کے ملحقہ کالجوں میں طلبا کی تعداد جو ۱۹۳۲ء میں ۱۳۴۶ تھی ۱۹۳۷ء میں بڑھ کر ۱۸۶۸ ہوگئی ہے اور یہ تعداد آخری تعداد ہے کیونکہ اس سے زیادہ داخلے نہیں کئے جاسکتے۔ یونیورسٹی بلا امتیاز مذہب و نسل جملہ اقوام میں مقبول ہے اور اس کی ڈگریاں تمام برطانی ہندوستان اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ حال ہی میں لندن اور کیمبرج نے ریکگنیشن دیا ہے۔ دارالترجمہ نے ۲۹۰ کتابیں طبع کی ہیں جن میں تاریخ سیاسیات، اقتصادیات، فلسفہ، ریاضی، سائنس، انجنیرنگ، قانون اور طب کی معیاری مغربی کتابوں کے ہندوستانی ترجمے بھی شامل ہیں علاوہ ازیں مختلف مضامین کے لئے پچاس ہزار سے زیادہ اصطلاحات بھی وضع کی گئی ہیں۔ بحالات موجودہ یونیورسٹی ایک مٹّا کی عمارتوں میں قائم ہے لیکن بہت جلد اپنی مشہور و معروف عمارت میں منتقل ہوجائے گی جس کی تعمیر پر تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ آرٹس کالج تکمیل کے قریب ہے اور دو مستقل ہاسٹل زیر استعمال ہیں یونیورسٹی کی عمارتیں اپنے اندر ایک عدیم النظیر امتیازی شان رکھتی ہیں کیونکہ ان میں اجنٹا اور ایلورا کے آرٹ کو قطب شاہی طرز کے فن تعمیر میں ملاکر دکن کے ضروری اتحاد کو پیش کردیا گیا ہے۔

براڈکاسٹنگ کا شعبہ

تعلیم کی امداد کے لئے تفریح کی چاشنی دے کر ایک سرکاری براڈکاسٹنگ شعبہ قائم کیا گیا ہے جو سارونگر اور اورنگ آباد میں دو ترسیل پذیر اسٹیشنوں کی تعمیر کے بعد ایک ایسا زبردست ادارہ بن گیا ہے جس کے ذریعہ دیہی اور شہری نشر و اشاعت کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دئے جاسکیں گے اور عام پبلک مطالبہ کا بھی لحاظ کیا جاسکیگا ترسیل پذیری حیدرآباد میں سرکاری اجارہ ہے اور عنقریب ایک ضابطہ نافذ کیا جانے والا ہے جس کی رو سے براڈکاسٹ ریسیوروں پر فیس عائد کی جائے گی۔ توسیعی اسکیم دو مزید اسٹیشنوں کے قیام پر مشتمل ہے جن میں سے ایک گلبرگہ میں اور دوسرا ورنگل میں تعمیر کیا جائے گا۔ حیدرآباد اسٹیشن سے انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں براڈکاسٹ کیا جاتا ہے لیکن ضلع کے اسٹیشن ہندوستانی اور علاقہ کی زبان میں براڈکاسٹ کریں گے۔ محکمۂ اطلاعات نے بھی جہاں تک پریس اور پبلسٹی کا تعلق ہے اپنا دائرۂ عمل بہت وسیع کردیا ہے۔ غلط پروپگنڈے کی جوابدہی اور پبلک کو حقائق سے مطلع رکھنے کے علاوہ یہ ادارہ حکومت اور پریس کے درمیان ایک مفید رشتہ ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ایک قانون مطابع زیر ترتیب ہے جس سے مقامی پریس کی حالت میں کافی اصلاح ہوجائے گی۔ اس وقت ریاست سے ۷۰ اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

صحت عامہ

طبی محکمہ کا بجٹ جو ۲۷ لاکھ کا تھا بڑھا کر ۳۲ لاکھ ۹۵ ہزار پانسو ستّارہ کردیا گیا ہے۔ یہ اضافی امداد اُن توسیعی اسکیموں کو کامیاب بنانے کے لئے کی گئی ہے جو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت ۱۴۰، ایلوپیتھک ہسپتال اور شفاخانے

قائم ہیں۔ علاوہ ازیں مملکت کے پندرہ اضلاع کے دیہات میں پندرہ سفری ڈسپنسریاں طبی امداد پہنچاتی ہیں اور ایک سنیما کار صحت کے متعلق پروپیگنڈا فلموں کو دکھاتی پھرتی ہے۔ صحت عامہ کی جدید اسکیم نے ہیڈکوارٹروں اور تعلقہ قصبوں کی سینٹری حالت اور عام صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے۔ ہیلتھ سروس کے اضافہ نے جواب اُن تمام علاقوں پر بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہے جہاں خطرناک وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے بہت عمدہ نتائج پیدا کئے ہیں اور اب دق کے سینی ٹوریم کی اسکیم بھی سامنے ہے جو عنقریب منصۂ شہود پر آنیوالی ہے

محکمہ امور عامہ کی سرگرمیاں

داخلی سلسلۂ رسل و رسائل میں ترقی کا جہاں تک تعلق ہے سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے ۵۰۰ میل کی نئی سڑکوں کا اضافہ کیا جا چکا ہے اور سڑکوں کی میلوں کی تعداد ۴۳۹۰ کے بجائے ۴۹۰۰ ہو گئی ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ محکمہ امور عامہ نے تمام ملک میں بڑے بڑے ذخیرہ ہائے آب تعمیر کئے ہیں۔ نظام ساگر جو ریاست کے آبپاشیانہ سلسلہ کی ایک بہت ہی اہم شے ہے۔ مقامی انجنیروں کے ہاتھوں تقریباً ۴½ کروڑ روپیہ میں تعمیر ہوا ہے اس کی نہروں کی لمبائی ۹۶½ میل ہے جس سے ۲ لاکھ ۵ ہزار ایکڑ اراضی کو سیراب کیا جاسکتا ہے۔ یہ ذخیرۂ آب ہندوستان میں سب سے بڑا دوسرا تالاب ہے۔

ڈرے نیج سسٹم

(پانی کے نکاس کا انتظام)

ڈرے نیج ورکس پر اس وقت تک ۱۰ لاکھ سے زائد روپیہ صرف آ چکا ہے جو گندے نالے جدید طرز پر بنائے گئے ہیں اُن کی لمبائی تقریباً ۱۲۹ میل ہے۔ یہ سسٹم قطعی طور پر بالکل نیا سسٹم ہے کیونکہ اس کے ذریعہ بارش کا تمام پانی خارج ہو جاتا ہے اور ہندوستان میں مسلمہ طور پر سب سے بڑی زمین دوز اسکیم ہے۔ اس پر ایک کروڑ روپیہ سے زائد اب تک صرف ہو چکا ہے اور مکمل سکیم کا تخمینہ ۱۲۷ لاکھ بتایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ۲۷½ میل کی سڑکیں سمنٹ کنکریٹ سے بنائی گئی ہیں جن پر ۲۰ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے سٹی امپرومنٹ بورڈ گنجان علاقوں کو کشادہ کر کے شہر کو ایک بالکل نئی شکل میں تبدیل کر رہا ہے۔ اور غریب و متوسط الحال لوگوں کے مکانات حفظان صحت کے اصولوں پر تعمیر کرا رہا ہے۔ پارک اور کھیل کے میدان بنائے گئے ہیں، بچوں کی ورزش و تفریح کے لئے جدید وسائل مہیا کئے گئے ہیں۔ آمد و رفت میں بھیڑ بھڑکا سے نجات دینے کے لئے نئی سڑکیں نکالی گئی ہیں اور پرانی سڑکوں کو وسیع اور گرد رو ک بنایا گیا ہے۔ بورڈ نے اپنی فہرست میں پبلک عمارات کو بھی شامل کر لیا ہے اور اس زمانہ میں ایک مرکزی بازار اور ایک گھریلو صنعتوں کی فروخت کا محکمہ قائم کیا ہے

ضلع میونسپلٹیاں

میونسپل اختیارات کے ضابطہ کی منظوری سنہ ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی اور میونسپلٹیوں نے غیر سرکاری اکثریت کے ساتھ سات ضلع شہروں میں کام شروع کیا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں میں زرعی آبادی کی نمائندگی کی اضافہ کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ لوکل فنڈ کی سرگرمیاں خاص طور پر اصلاح یافتہ بازاروں، مذبحوں، سڑکوں، اسکولوں اور کنوؤں کے بنائے جانے سے متعلق ہیں۔ ڈسٹرکٹ واٹر ورکس محکمہ امور عامہ کے

ایک سینیر اسپیشل انجنیر کے ماتحت ہیں۔ گذشتہ پانچ سال کے دوران میں جالنہ، اورنگ آباد، لاتور، رائچور، اور ناندیڑ کے شہروں میں جدید طرز پر پانی سپلائی کرنے کے طریقے رائج کئے گئے ہیں۔ جہاں تک کل سیلف گورنمنٹ کا تعلق ہے حیدرآباد میونسپل ایکٹ کے ذریعہ ایک ترقی آغاز کیا گیا ہے جس کے ماتحت سٹی میونسپلٹی کو میونسپل کارپوریشن بمبئی کی لائنوں پر منظم کیا گیا ہے جس کو منتخبہ اکثریت حاصل ہے اور جس کو نظم و نسق اور ٹیکس عائد کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں پہلی مرتبہ انتخابات سنہ ۱۹۳۴ء میں ہوئے تھے کارپوریشن جدید دستور کے ماتحت تین سال سے زائد عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ میونسپل نظم و نسق کے دائرہ میں اس کی محنتوں کے نتائج، صفائی اور سڑکوں کی روشنی میں اسکی دلچسپی اور پبلک خوشحالی کے لئے اس کی فکرمندی نے تجربہ کو کافی طور پر کامیاب ثابت کر دیا ہے اور مجلس نے بحیثیت مجموعی انتہائی احساس ذمہ داری کے ساتھ کام کیا ہے۔

معاشرتی قانونسازی

ریاست کی مجلس آئین ساز نے جو نامزد اور منتخبہ ارکان پر مشتمل ہے خالص انتظامی نوعیت کے قوانین کے علاوہ معاشرتی سلسلہ کے بھی متعدد قوانین پاس کئے ہیں۔ معاشرتی اعتبار سے اہم اور انسانیت نواز قوانین میں سے جو حال ہی میں پاس کئے گئے ہیں قانون تحفظ اطفال، قانون شادی ہندو بیوگان اور قانون وراثت پارسیان حیدرآباد خصوصی توجہ کے محتاج ہیں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے لیجسلیٹو کونسل کی توسیع کا مسئلہ زیر غور ہے۔ اور ایک اسپیشل کمیٹی سے جس میں غیر سرکاری ارکان کی اکثریت ہے اس سلسلہ میں تجاویز پیش کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔

فوری انصاف

عدل و انصاف کے طریقہ کو بہت زیادہ تیز رفتار بنا دیا گیا ہے عدالت عالیہ جس کو پروانۂ آزادی حاصل ہے کام میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کا مقابلہ کرنے کی اہل ہے اور یہی حال ماتحت عدالتوں کا ہے بنچ اور بار دونوں کے سلسلے میں معیار اہلیت بلند کر دیا گیا ہے۔ مقدمات کے فیصلوں کی تعداد کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں صرف دیوانی مقدمات کی تعداد ۴۴۲۱۰ تھی جن میں سے ۸۰ فیصدی مقدمات اُسی سال فیصل کر دئے گئے۔ علاوہ ازیں ۳۷۶۶۲ فوجداری مقدمات میں سے ۳۵،۳۴ یا ۵۸/۹۶ مقدمات طے کئے گئے۔ جڈیشل اور اگزکیٹو امور کی علیحدگی گذشتہ پندرہ سال سے زائد سے ہو چکی ہے جس نے عوام کے اعتماد میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے۔ پھر اس محکمہ میں حال ہی میں جو اصلاحات عمل میں آئی ہیں اُنھوں نے زیادہ سے زیادہ اہلیت کار اور دیوانی و فوجداری مقدمات کے فوری فیصلوں کے امکانات پیدا کر دئے ہیں۔

"نغمۂ حرّیت"

(از جناب اعجاز صدیقی۔ اکبرآبادی)

انتہا یہ ہے کہ بن آئی ہے ایمانوں پر
بارشیں نور کی ہیں مغربی ایوانوں پر

کچھ بھروسہ نہیں ان قوم کے دیوانوں پر
ایسے بادل ہمیں درکار ہیں آزادی کے

کہیں خاموش نہ آوازِ جرس ہو جائے
جس کے آغاز میں تھا کیف سرانجامِ حیات

دب نہیں سکتی دبائے سے رگِ حرّیت
ہر رگوں میں مری اُس قوم کا خون پُرجوش

کاش کچھ دیر کو یہ شیخ و برہمن مل جائیں
ٹوٹ جاتی ہے یہ زنجیر غلامی صیاد

رحم اے خالقِ اسلام مسلمانوں پر
تیرگی ہے وہی مشرق کے سیہ خانوں پر

کہیں رُک جائیں نہ ہاتھ انکے گریبانوں پر
اُٹھ کہ گلشن سے جو چھا جائیں بیابانوں پر

انحصارِ رہ منزل ہے حُدی خوانوں پر
آئیگا پھر وہی اک دور مسلمانوں پر

ہونگی اب خون کی گلکاریاں دامانوں پر
جس کا اک فرد بھی بھاری تھا کئی انسانوں پر

نصب ہو رایت یک رنگ صنم خانوں پر
آزمایا ہے کئی بار اسے دیوانوں پر

کاش ہو اس مری بکواس کا اعجاز اثر
ہند کے مُردہ و خوابیدہ مسلمانوں پر

قرآنی قصے

افسانوی لباس میں عبرت وبصیرت کا دفتر

ازجناب مولانا عبدالصمد رحمانی

قرآن مجید کا ایک بہت بڑا حصہ قصوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی قصہ تکمیل کے ساتھ ایک جگہ بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ حسب ضرورت مختلف مواقع پر کچھ کچھ بیان کر دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآنی قصوں میں اسرائیلیات کا حصہ کافی شامل ہو گیا عہد اسلام کی ابتدا میں جب یہودی اور نصرانی اسلام لائے تو انھوں نے تمام قصہ طلب آیتوں کی تفسیر میں اُن روایتوں کو شامل کر دیا جو بنی اسرائیل میں مشہور تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سی غیر مستند روایتیں قرآنی قصوں کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیا ہے کہ قرآن کا مطلب قصوں کے بیان کرنے سے محض قصے بیان کرنا نہ تھا بلکہ اُن کی مدد سے عبرت و بصیرت کے دفتر کو ہم پر کھولنا تھا۔ آج ہم میں سے بہت کم ایسے افراد ہوںگے جو آدمؑ، یوسفؑ اور یونسؑ وغیرہ انبیاء کے قصے پڑھ کر یہ معلوم کر سکیں کہ ان سے کیا اخلاقی نتائج اخذ ہوتے ہیں اور ہمیں اپنی زندگی کو سدھارنے میں ان قصوں سے کیا مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے لٹریچر میں "قصص الانبیاء" کی قسم کی کتابیں تو آپ کو بہت مل جائیں گی جن میں اسرائیلیاتی حکایتوں اور غیر مستند حدیثوں کو قرآنی آیتوں کے ساتھ شامل کر کے نہایت دلچسپ قصے پیش کر دیئے گئے ہیں لیکن ایسی کتاب شاید ہی کوئی ملے جس میں صرف آیات قرآنی کی روشنی میں کسی داستان کو سنانے کی سعی کی گئی ہو اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ جس میں نصیحت و سبق آموزی کے اُس اصل مقصد کو واضح کیا گیا ہو جو ان قصوں کی اصل غایت تھی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو میرے خیال میں ہم نہ صرف مسلمانوں کی ذہنیت کو بگڑنے سے بچا سکتے۔ بلکہ دنیائے انسانیت کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے۔ قرآن ایک انقلابی کتاب ہے، اس کا ہر ہر لفظ انقلاب کا داعی ہے، ہر ہر سطر سے انقلاب کی پکار بلند ہوتی ہے لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ہماری سرد مہری و افسردہ دلی نے قرآن کے احکام عبادات کے حصہ کو بے روح سا کر کے رکھ دیا ہے اسی طرح ہم اس کے اُس حصہ کی اصلی روح سے بھی استفادہ نہ کر سکے جس میں قصے اور افسانے بیان کئے گئے تھے اور جن کی مدد سے ہمارے اندر حق و صداقت کی راہ میں زبردست جوش و ولولہ پیدا ہو سکتا تھا۔

ان قصوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ

وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فوادک	پیغمبروں کی جتنی سرگذشت ہم تم سے بیان کرتے ہیں۔ (اس کا مقصد یہ ہے کہ) ہم تمہارے دل کو قوی بنا دیں۔ اور اس کے ذریعہ تمہارے پاس قانون حق اور موعظت پہونچے۔ اور ایمان رکھنے والوں کے لئے تنبیہ ہو۔
وجاءک فی ہذہ الحق وموعظۃ وذکری للمومنین (ہود۔ ع ۱۰)	

(ہود - ۱۰)

یعنی انبیاء کرام کی سرگذشت میں جہاں عام لوگوں کے لئے وعظ و نصیحت کا مواد ہے۔ وہاں ارباب بصیرت کے لئے اس میں تنبیہ بھی ہے۔ نیز قلب سے مایوسیاں دور کرنے کی انقلابی روح بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک چیز سب سے زیادہ اہم اسمیں یہ ہے کہ وہ "قانون حق" جس سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں، اس کو وحی الٰہی نے قصوں اور افسانوں کی زبان میں بیان کیا ہے کیونکہ وہ ایسا قانون انقلاب ہے جس کو گذشتہ قوموں کی تاریخ کی زبان ہی میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

پس قرآن سراسر "دستور الٰہی" اور قانون خداوندی کا مجموعہ ہے، اُسکی نگاہ میں انبیاء کرام کی داستانیں "کہانیاں" نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے ذریعہ انقلاب امم کے اُن پیچ، اور دقیق نکتوں کی جانب رہنمائی کیجاتی ہے، جو سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ قابل توجہ اور لائق فکر ہے۔

اب میں ذیل میں آدم علیہ السلام کی سرگذشت صرف قرآن کی زبان میں آپکے سامنے پیش کرتا ہوں۔

عالم غیب میں فرشتوں سے عالم شہادت کے متعلق یہ اعلان کہ ہم انسان کی پیدائش سوکھے، خمیر اُٹھے والے گارے سے کرینگے

پھر جب ہم اس میں روح پھونک دیں گے تو تم پر لازم ہوگا کہ اس کے آگے سر جھکا دو۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ

جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، تو جب ایسا ہو کہ میں اسے تیار کر دوں اور اس میں روح پھونک دوں، تو تم سب کو چاہیے کہ اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ۔

عالم غیب میں فرشتوں سے عالم شہادت میں خلافت الٰہی کے قیام کا اعلان۔ انسان اور خلافت الٰہی، اور اس کے متعلق فرشتوں کا پس وپیش آدم علیہ السلام کی معنوی تکمیل۔

(اور فرشتوں کا اعتراف عجز)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

(اس حقیقت پر غور کرو) کہ جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا۔ میں زمین پر اپنا ایک جانشین بنانیوالا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو ایسی ہستی کو اپنا جانشین بنائیگا جو زمین میں فساد پھیلائے گی، اور خونریزی کریگی۔ حالانکہ ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی کا اقرار کرتے ہیں اللہ نے کہا کہ میں جس حقیقت کو جانتا ہوں تم اسکو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام حقایق کے نام کی تعلیم دی پھر اللہ نے فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقایق) پیش کئے۔ اور فرمایا۔ کہ اگر تم صداقت پر ہو تو ان حقایق کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا۔ کہ ساری پاکیاں تیرے لئے ہیں۔ ہم کو تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ بیشک تو ہی علیم وحکیم ہے اللہ نے فرمایا۔ کہ اے آدم تم ان فرشتوں کو ان حقایق کے نام بتا دو (جب آدم نے بتا دیے)، تو اللہ نے فرمایا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بلاشبہ تمام آسمان وزمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو میں ہی جانتا ہوں۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جو کچھ تم چھپاتے ہو سے بھی میں جانتا ہوں؟

نوع انسانی کا ظہور اس طرح ہوا کہ پہلے حقیقت انسانی نیست سے ہست ہوئی۔ پھر اس کو صورت نوعیہ ملی۔ پھر آدم کا وجود ہوا۔ سجدۂ آدم کے لئے فرشتوں سے خطاب الٰہی۔ آدم کو سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر شیطان نے حکم الٰہی کے باوجود سجدہ کیا بلکہ تکبر سے ایک تو اپنے ڈھانچہ کی برتری کا دعویٰ کیا اور دوسرے انسانی ڈھانچہ کو اپنے سے کمتر قرار دیا۔ اس پر شیطان کی سزا۔ شیطان کو قانون مہلت کے ماتحت ڈھیل۔ شیطان کو قیامت تک کی مہلت نہ ملی بلکہ وقت معلوم تک کی۔ شیطان کے دعوے کے جواب میں کہا گیا کہ تیرا زور کسی بندہ پر نہیں چلے گا جب تک کہ وہ بندہ خود تیری پیروی نہ کرے۔ شیطان کی پیروی کرنے والوں کے لئے جہنم کی دھمکی

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ۝ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝

(اعراف ۲پ)

پہلے ہم نے تم کو پیدا کیا (یعنی حقیقت انسانی نیست سے ہست ہوئی) پھر تم کو شکل وصورت دی پھر فرشتوں کو حکم دیا (جبکہ آدم کا وجود ہو چکا) کہ آدم کے آگے جھک جاؤ۔ اس پر سب جھک گئے مگر ابلیس جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا۔ جبکہ میں نے حکم دیا۔ کہا میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝

مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ ایسی ہستی کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے پیدا کیا ہے۔ حکم ہوا تو یہاں سے نکل جا۔ تو راندۂ درگاہ ہوا۔ اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہوئی۔ اس نے کہا خداوندا۔ مجھے اس دن تک مہلت دے۔ جب انسان (دوبارہ) اٹھائے جائینگے۔ فرمایا ایک مقررہ وقت تک کے لئے تجھے مہلت دی گئی۔ شیطان نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر (سعادت کی) راہ بند کر دی اسلئے میں انسان کے لئے دنیا میں (زمینوں کو) مزین کروں گا اور ان سب کو (راہ حق سے) گمراہ کروں گا۔ بجز ان لوگوں کے جو ان میں سے تیرے مخلص بندے

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ
(حجر ع ۳ پ ۱۴)

ہو گئے۔ خدا نے فرمایا یہی (خالص بندگی) سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہونچنے والی ہے جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف ان گمراہوں پر تیرا زور چلیگا جو تیری اتباع کرینگے۔ ان سب کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ
(اعراف ع ۲ پ ۸)

ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی اس لئے میں انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے آگے آگے بیٹھوں گا۔ میں سامنے سے پیچھے سے دہنے سے بائیں سے غرضکہ ہر طرف سے آدمی پر حملہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گذار نہ پاوے گا۔ خدا نے فرمایا یہاں سے نکل جا۔ تو ذلیل ہو، ٹھکرایا ہوا۔ انسانوں میں سے جو تیری پیروی کرے گا اسکو بھی میں تیری طرح جہنم میں بھر دوں گا۔

آدمؑ کو بہشتی زندگی کی نوازش۔ اور ایک درخت کے پاس جانے کی ممانعت۔ آدمؑ کی غلطی۔ پھر توبہ۔ اور اس پر رحمت الٰہی۔ آدمؑ کو انسانی سعادت وشقاوت کے متعلق قانون کی ہدایت۔ آدم علیہ السلام کی غلطی بھول سے ہوئی تھی۔ آدمؑ کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جنت سے تم کو نکالے۔ آدمؑ کی جنت کی کیفیت۔ آدمؑ وحوا کے دل میں شیطان کا وسوسہ ڈالنا اور اپنے کو ابدی زندگی . . . . اور لازوال سلطنت کی رہنمائی کے لئے پیش کرنا۔ اس وسوسہ سے شیطان کا مقصد یہ تھا کہ آدمؑ وحوا کی پردہ دری ہو جائے۔ شیطان کے اس وسوسہ کا بیان جس سے آدمؑ غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ آدمؑ وحوا کی پردہ دری اور جنت کے پتوں سے ستر پوشی۔ آدم وحوا کا پہلے جنت میں بہشتی لباس تھا جو شجر ممنوعہ کے پھل کھانے سے اتر گیا۔ آدمؑ وحوا کا اپنی غلطی پر استغفار۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى

اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو۔ اور جہاں سے چاہو با فراغت کھاؤ مگر دیکھو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا (ایسا کرو گے تو) تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔ اور ان کو اس راحت وسکون کی زندگی سے، جس میں وہ تھے نکال لیا پھر ہم نے حکم دیا کہ تم سب اترو۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہیں زمین میں رہنا ہے۔ اور ایک خاص وقت تک کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار کے حکم سے چند کلمات معلوم کرلئے (جو مقبولیت کا سبب بن گئے) پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ بلاشبہ وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنیوالا ہے

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
(بقرہ ع پ ۱)

(توبہ قبول کرنے کے بعد) ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ لیکن یاد رکھو، اگر میری جانب سے تم کو ہدایت پہنچے تو سنت الہی یہ ہوگی کہ جو ہدایت کی پیروی کریگا، اس کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اور جو انکار کریگا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلائیگا، وہ دوزخی ہوگا اور اس میں ہمیشہ رہے گا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ
مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ
نَجِدْ لَهُ عَزْمًا وَإِذْ قُلْنَا
لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ
فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ
فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا
عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ
فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ
فَتَشْقَىٰ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ
فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ
لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ
فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ
قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ
عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ
لَا يَبْلَىٰ (طٰہٰ ع پ)

ہم نے آدم سے پہلے عہد لیا تھا پھر وہ بھول گیا۔ اور ہم نے نافرانی کا قصد اس میں نہیں پایا (سلسلہ عہد و پیماں کا وہ واقعہ یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ "آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے لیکن ابلیس نہ جھکا۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر ہم نے کہدیا تھا کہ اے آدم، یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال کر رہے۔ اور تم شقت میں پڑجاؤ۔ تمہارے لئے جنت میں ایسی زندگی ہے کہ تم اس میں نہ بھوکے رہتے ہو، نہ ننگے۔ نہ تمہارے لئے پیاس ہے نہ دھوپ کی تپش ہے۔ لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا۔ اس نے کہا اے آدم کیا میں تمہاری رہنمائی ابدی زندگی لانے والے درخت اور لازوال سلطنت کی جانب کروں؟

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ
لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ
عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا وَ
قَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ
هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ
تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ
الْخَالِدِينَ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي
لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ فَدَ
لَّاهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا
الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآ
تُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ
عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ
وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ
أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ
وَأَقُلْ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ
لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ قَالَا
رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ
لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ
قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ
فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ
إِلَىٰ حِينٍ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ
وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا
تُخْرَجُونَ (اعراف ع پ)

پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے ستر جو چھپے ہوئے تھے اُن کو کھول دے۔ اور اُس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے اس درخت کے پاس جانے اور اسے کھانے سے جو تمہیں روکا ہے تو صرف اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہوجائے اور ان سے قسمیں کھائیں کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں غرض کہ شیطان نے دھوکہ سے اُن کو اپنی بات پر مائل کرلیا لیکن جیسے ہی انھوں نے اس درخت کا پھل چکھا، ان کے ستر کھل گئے۔ اور (برہنگی کی شرم سے) اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور آدمؑ نے (بھول سے) عہد کے خلاف کیا اور (جنتی زندگی سے) بے راہ ہوگئے۔ اور ان کے پروردگار نے پکارا۔ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا، اور کیا میں نے تم دونوں سے نہیں کہدیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ انھوں نے عرض کیا: "پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو نے ہم پر بخشش نہیں فرائی، اور ہم پر رحم نہ کیا، تو ہم برباد ہوجائیں گے۔" (اس پر خدا نے فرایا) یہاں سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے ایک خاص وقت تک اس سے فائدہ اٹھاؤ تم اسی میں جیوگے۔ اسی میں مروگے پھر (اسی سے مرنے کے بعد) نکالے جاؤگے۔

آدمؑ کے ذریعہ اولاد آدمؑ کو سات حکموں کی ہدایت۔ (۱) جسمانی اور روحانی لباس (یعنی تقوٰی اور پرہیزگاری) کا حکم (۲) اکل میں اعتدال، عبادت میں توجہ اور خداپرستی میں اخلاص کی ہدایت (۳) جو تسلیم و توبہ (یعنی آدمؑ) کی راہ پر رہے گا ہدایت پائیگا۔ اور جو اس سے الگ (یعنی شیطان کی راہ پر) رہیگا وہ گمراہی میں پڑے گا۔ (۴) یہ منشار ایزدی ہے کہ دینی امور میں بھی زینت کو کام میں لاؤ۔ کھاؤ، پیو۔ لیکن اسراف نہ کرو۔ (۵) خدا کے نزدیک۔ ظاہری و باطنی بے حیائیاں اور گناہ کی باتیں اور ناحق کی زیادتی اور شرک حرام ہیں۔ (۶) ہر جماعت کے لئے قانون حیات کا قانون ہے جب یہ قانون پورا ہوجائے گا تو پھر مہلت نہیں ملے گی (۷) انبیار کرام کی آمد کی اطلاع اور اُس کے متعلق حکم۔

يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ
لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَ
رِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ
خَيْرٌ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ يَا بَنِي
آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ
كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ
يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ
هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ
لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ وَإِذَا فَعَلُوا
فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا
عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ

اے اولاد آدمؑ ہم نے تمہارے لئے ایسا لباس مہیا کر دیا جو تمہاری ستر پوشی کرے اور زینت ہو۔ اور پرہیزگاری کا لباس تمام لباسوں سے بہتر ہے۔ یہ اللہ (کے فضل و رحمت) کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اے اولاد آدم شیطان تمہیں اسی طرح سے نہ بہکادے جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا (اور) ان کے لباس اتروا دئے تھے جس کے بعد اُن کے ستر اُن کو نظر آنے لگے۔ یاد رکھو شیطان اور اس کا گروہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اُسے نہیں دیکھتے۔ ہم نے شیاطین کو اُن لوگوں کا ساتھی بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے اور جب یہ بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ اور اللہ نے ہم کو یہ حکم

بِالْفَحْشَاءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ

کیا ہے۔ آپ ان سے کہدیجئے کہ اللہ کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں کرتا ہے۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ آپ کہدیجئے کہ میرے پروردگار نے اعتدال و میانہ روی کا حکم دیا ہے۔ عبادت میں خدا کی طرف توجہ رکھو۔ اور دین کو اس کے لئے خالص کر کے پکارو۔ اس نے جس طرح تم کو پیدا کیا ہے اسی طرح تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ خدا نے ایک فریق کو ہدایت کی، اور دوسرے پر گمراہی ثابت ہوئی ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا رفیق بنالیا۔ اور باوجود اس کے سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اے اولاد آدمؑ ہر عبادت کے موقعہ پر اپنی زینت کیا کرو۔ اور خوب کھاؤ پیو۔ مگر اسراف نہ کرو۔ خدا فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے اے نبی آپ ان سے فرما دیجئے کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں، اور کھانے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟ آپ کہدیجئے کہ یہ نعمتیں دنیاوی زندگی میں مومنوں کے لئے ہیں۔ (پھر) خالص انہیں کے لئے ہیں قیامت میں اس طرح ہم احکام کھول کھول کر جاننے والوں کے لئے بیان کرتے ہیں۔ اے نبی آپ کہدیجئے کہ حرام کیا ہے میرے پروردگار نے صرف بیحیائی کی باتوں کو چاہے وہ کھلی بیحیائی ہو یا چھپی بیحیائی ہو۔ اور حرام کیا ہے گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے کو جس کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔ اور حرام کیا اس بات کو کہ

اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(اعراف، ع ۳ پ ۸)

خدا کی نسبت کوئی ایسی بات کہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی سند نہیں۔ اور قوم کی زندگی کے لئے ایک مقرر کی ہوئی مدت ہے سو جب کسی قوم کی یہ مدت ختم ہو جائے گی تو پھر اس کے نیست و نابود ہونے میں نہ تو ایک گھڑی کم ہو سکتی ہے اور نہ ایک گھڑی زیادہ۔ اے اولاد آدمؑ جب تم ہی میں کوئی پیغمبر تمہارے پاس آئے اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائے تو یاد رکھو کہ جو شخص برائیوں سے بچیگا اور اپنے کو سنوارے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ غمگینی اور جو لوگ میری آیتوں کو جھٹلائینگے اور تکبر کریں گے وہ دوزخی ہونگے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اب ذیل میں اُن نصیحتوں اور ہدایتوں کو مختصراً درج کرتا ہوں جو اس تمام بیان سے اخذ ہوتی ہیں:-

(۱) انسان کی فوقیت اور بڑائی صرف اسلئے ہے کہ خدا نے اُسے علم دیا ہے۔

(۲) خدا کی حمد و ثنا کرنا بہت ضروری ہے۔

(۳) انسان دنیا میں خدا کا جانشین بنا کر بھیجا گیا ہے فرشتے تک اسکے آگے ہاتھ باندھے مجبور ہیں اسلئے اللہ کے سوا دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کی غلام نہ ہو۔

(۴) گناہ کرنا اور پھر بہشتی زندگی کی توقع رکھنا دو ایسی چیزیں ہیں جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں

(۵) خدا کے قانون میں غلطی پر گرفت لازمی ہے۔ اسمیں کسی کے لئے رعایت نہیں۔

(۶) قانون الٰہی میں مہلت اچھوں کیلئے بھی ہے اور بُروں کیلئے بھی۔ (۷) سرکشی اور تکبر بدترین لعنت ہے (۸) اصل و نسب پر فخر کرنا شیطان کا کام ہے (۹) کسی قوم میں جب گمراہی و معصیت حد کو پہونچ جاتی ہے، تو اسمیں بے حسی اور ڈھٹائی آجاتی ہے۔ (۱۰) دنیا سے الگ تھلگ ہو کر کسی گوشہ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا ٹھیک نہیں آدمی کو جدوجہد کرتے رہنا چاہیئے (۱۱) فریب دہی کا سب سے موثر شیطانی نسخہ یہ ہے کہ کسی کو لالچ دلا کر یہ کہا جائے کہ اسطرح نہیں عیش حاصل ہوگا (۱۲) چالاک دشمن خیرخواہ بنکر بربادی کی راہ پر لگاتا ہے اسلئے کسی کے میٹھے لفظوں سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔

روس کا نظام صحت

از جناب ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب شفائی پیلی بھیت

میجر جنرل اسپر اسن سابق ڈائرکٹر جنرل محکمہ صحت (ہندوستان) پچھلے دنوں روس تشریف لے گئے تھے۔ تاکہ سوویٹ روس میں ڈاکٹری تعلیم کی حالت۔ حفظان صحت کے اصول اور دق وسل اور جذام کے متعلق وہاں کے طریقہائے علاج کا مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر موصوف نے واپسی کے بعد اپنے سفر کے تاثرات انڈین میڈیکل گزٹ کلکتہ کے جنوری کے پرچہ میں شائع کرائے ہیں۔ چونکہ یہ مضمون بہت زیادہ دلچسپ اور مفید معلومات سے لبریز ہے اس لئے اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

روس ایک ایسا ملک ہے جو بہت سی باتوں میں ہندوستان سے ملتا جلتا ہے تاہم روس میں بے شمار باتیں ایسی ہیں جو ہندوستان میں نہیں پائی جاتی ہیں پہلی بات جو مجھے روس میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ روس نوجوانوں کا ملک ہے۔ گلیوں میں کوئی شخص بھی ۳۵ برس سے زائد عمر کا مجھے نظر نہیں آیا۔ سوائے چند بوڑھی عورتیں تو نظر آئیں لیکن کوئی بوڑھا آدمی میں نے سوائے شفاخانہ کے کمروں اور دیہاتی رقبوں کے شہر میں نہیں دیکھا۔ میں نے اس کے متعلق تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ ۴۶ فیصدی آبادی ۱۹۱۷ء کے بعد کی پیدائش ہے اور ۶ فیصدی ۶۰ برس یا اس سے زیادہ عمر کے ہیں۔ ممالک متحدہ سوویٹ کی آبادی ۱۷۰ ملین ہے۔ اور ۳ ملین ہر سال اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان اور روس میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ روس میں ہر فرد کو گھر سے باہر کام کے لئے جانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ دو ماہ سے لے کر ۱۸ برس تک کی عمر کے بچے یا تو پرورش گاہ کو یا اسکول کو علی الصباح لے جائے جاتے ہیں اور پھر شام کو گھر واپس لائے جاتے ہیں۔

طبی تعلیم

روس میں دو قسم کے ڈاکٹر پائے جاتے ہیں ایک تو یونیورسٹی کے پاس شدہ ہیں جو کہ دس سال تک اسکول میں تعلیم پاتے ہیں اور پانچ سال طبی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جن کو روسی زبان میں فیلڈشر (Feldsher) کہتے ہیں یہ لوگ سات سال اسکول میں تعلیم پاتے ہیں اور تین سال طبی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں گویا کہ فیلڈشر ہندوستان کے سب اسسٹنٹ سرجن کلاس سے ملتے جلتے ہیں (جو کہ ہندوستان میں چار سال طبی تعلیم حاصل کرتے ہیں) یہ کلاس یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح اس لئے قایم کیا گیا تھا کہ فوجوں کے لئے سرجن مہیا کئے جائیں لیکن یورپ میں یہ کلاس توڑ دیا گیا ہے۔ اب صرف دو قسم کے ڈاکٹر رہ گئے ہیں۔ ایک گریجویٹ۔ دوسرے ڈپلوما یافتہ مگر روس میں گریجویٹ اور فیلڈشر دونوں قسم کے ڈاکٹروں کی تعلیم کا انتظام ہے "فیلڈشر" روس میں فوج اور سول دونوں میں پریکٹس کرتے ہیں۔ جنگ عظیم سے قبل گریجویٹ اور لائسنس یافتہ ڈاکٹروں کا تناسب ۲ اور ۳ کا تھا۔ لیکن اب دونوں کلاس یکساں ترقی کر رہے ہیں۔ اس وقت روس میں ڈاکٹری کالجوں میں ۹۶ ہزار طالب علم ہیں اور ڈاکٹری اسکولوں میں ۴۵ ہزار جنگ عظیم سے قبل روس میں ۲۵ ہزار گریجویٹ ڈاکٹر تھے زیادہ تر جنگ میں مارے گئے یا اس کے بعد زیادہ تر وبائی امراض میں ختم ہو گئے۔ ڈاکٹری کالجوں میں نصف سے زیادہ عورتیں تعلیم پا رہی ہیں۔ لینن گریڈ کے طبی مدارس میں جن میں ۷۵ فیصدی عورتیں ہیں دس ہزار طالب علم طبی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

روس کے تمام ڈاکٹری مدرسوں اور تمام شفاخانوں میں تمام ضروری سامان کافی طور پر مہیا کیا جاتا ہے۔

تمام روس میں ۷۲ مدرسہ ایسے ہیں جن میں انڈر گریجویٹ کو ڈاکٹری تعلیم دی جاتی ہے۔ تمام روس کے طبی مدارس میں ۱۹۳۶ء میں ۲۵ ہزار نئے طالب علم داخل ہوئے۔ روس کے گریجویٹ ڈاکٹر ہمارے یہاں کے ڈاکٹروں سے بلحاظ تعلیم پست ہیں۔ اس وقت روس میں ایک لاکھ ستر ہزار سند یافتہ ڈاکٹر ہیں گویا ۱۰۸۸ آدمیوں کے لئے روس میں ایک ڈاکٹر ہے یہ تناسب روسی حکومت کے لئے اطمینان بخش نہیں ہے اس لئے اس کی یہ کوشش ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے لئے ایک ڈاکٹر مہیا کیا جائے۔ لیکن ہندوستان کی حالت اس کے برعکس ہے۔ ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ ہے اور سند یافتہ ڈاکٹروں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس پر بھی ہندوستان کے اکثر ڈاکٹروں کو روٹی کے حاصل کرنے میں دقتیں پیش آ رہی ہیں روس میں تمام ڈاکٹر حکومت کے ملازم ہیں۔ پرائیوٹ پریکٹس کا طریقہ تقریباً مفقود ہے۔

روس میں قابل ڈاکٹر (یعنی وہ جو ڈاکٹری امتحان میں اول آتے ہیں) ان دور افتادہ دیہات میں بھیجے جاتے ہیں جہاں کی آب و ہوا

خراب ہو اور جہاں ڈاکٹروں کی زیادہ ضرورت ہو۔ ایسے مقامات پر رہنے کے لئے ڈاکٹروں کو زیادہ تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ موٹر دیا جاتا ہے اور دوسری قسم کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اور ان کو طویل چھٹیاں بھی دی جاتی ہیں یہ ڈاکٹر تین چار سال کام کرنے کے بعد اُن کے حسب منشا مقامات پر تبدیل کر دئے جاتے ہیں اور صرف پانچ گھنٹہ روزانہ کام لیا جاتا ہے۔ زمانہ طالب علمی کے تمام اخراجات گورنمنٹ برداشت کرتی ہے اور امتحان پاس کرنے کے بعد ۳۰۰ روبل ماہانہ تنخواہ دیجاتی ہے (ہمارے یہاں کا ایک روپیہ تقریباً تین روبل کے برابر ہوتا ہے۔ یعنی ۳۰۰ روبل تقریباً سنو روپیہ کے برابر ہوتے ہیں) ڈاکٹر کی بیوی کو بھی اتنی ہی تنخواہ دی جاتی ہے اور اس کو کوئی نہ کوئی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی اس کو دوسری جگہ بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ روسی ڈاکٹروں میں ہندوستانی ڈاکٹروں کی طرح صرف شہر ہی میں سکونت اختیار کرنے کی عادت نہیں۔ بلکہ روس کے نوجوان پبلک خدمات کی خاطر دیہات میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

دق وسل

روس کے حالات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دق وسل کو مٹانے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے۔ کہ حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے مکانات تعمیر کرائے جائیں۔ صفائی کا خیال رکھا جائے صحت بخش غذا مہیا کی جائے بلکہ ان باتوں کے ساتھ ساتھ چند اور باتیں بھی ضروری ہیں۔ روس میں انقلاب کے بعد سے حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرنے اور صحت بخش غذا کے انتظام سے نہ صرف دق وسل کے امراض میں کمی ہو گئی ہے بلکہ شرح اموات بھی گھٹ گئی ہے۔ یوکرین میں دق وسل کی وجہ سے شرح اموات ۱۹۳۳ء سے گھٹنا شروع ہوئی ہے۔ حالانکہ حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے مکانوں کی تعمیر کی اسکیم پانچ سال کے بعد شروع کی گئی ہے روس میں غذا کے انتظام کے متعلق مجھے زیادہ معلومات نہیں لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ انقلاب کے بعد سے روسیوں کی غذا کی حالت بہتر ہے شہری آبادی کے اضافہ اور صنعتی کارخانوں کی ترقی کی وجہ سے خیال تو یہ تھا کہ سل ودق کے امراض سے شرح اموات بڑھ جائیگی لیکن اسکے برعکس شرح جنگ کے قبل ماسکو کی آبادی ۱½ ملین تھی اور اب ۳½ ملین ہے

ذیل میں چند اعداد و شمار درج کئے جاتے ہیں جو میں نے روس کے ڈاکٹروں سے حاصل کئے ہیں اور جن سے سل ودق کی اموات میں تخفیف کا پتہ چلتا ہے

دق وسل سے شرح اموات فی دس ہزار

	۱۹۱۳ء	۱۹۳۱ء	۱۹۳۸ء
لینن گرڈ	۲۸/۶	۱۶/۳	۱۲/۰
ماسکو	۲۲/۶	۱۱/۶	۱۰ اور ۱۲ کے درمیان

	۱۹۲۳ء	۱۹۲۶ء	۱۹۳۲ء	۱۹۳۶ء	
خرکو	۱۷/۰	۱۴/۰	۱۳/۳	۱۲/۰	یوکرین کے دو بڑے شہر
اڈیسہ	۲۲/۷	۱۷/۹	۱۶/۲	؟	

دوسرے ممالک سے مقابلہ کرتے ہوئے روس کی شرح اموات اب بھی زیادہ ہے۔ لیکن جس سرعت کے ساتھ کمی ہو رہی ہے وہ حیرت انگیز ہے روسی حکومت نے تیسری مرتبہ پانچ برس کا پروگرام شروع کیا ہے جو کیم جنوری ۱۹۳۹ء سے جاری کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ ہے۔ کہ روس میں دق وسل کے امراض سے شرح اموات کو نصف اور گھٹا دیا جائے روس میں ستائیس ہزار ڈاکٹر صرف دق وسل کے شفاخانوں اور

صحت گاہوں میں کام کرتے ہیں۔ میں نے ماسکو میں دق وسل کے ایک شفاخانہ کو دیکھا۔ اس میں ۲۵ ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔ صرف ماسکو ہی میں دق وسل کے علاج کے لئے ۲۵ شفاخانے موجود ہیں۔ روس کے ڈاکٹروں کی ⅛ تعداد صرف دق وسل کو مٹانے کی تدبیروں میں مصروف ہے۔ اگر ہم روس کی طرح ہندوستان میں بھی۔ یہی اسکیم جاری کریں تو ہمیں نصف لاکھ سے زائد ڈاکٹروں کی ضرورت پیش آئے گی۔

چونکہ روس کے کارخانوں (فیکٹریوں) میں رات دن کام ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے دن اور رات کی علیحدہ علیحدہ صحت گاہیں ہیں شبینہ صحت گاہوں میں بیمار مزدور دوپہر کے بعد اپنے کام سے واپس آتے ہیں غسل کر کے کھانا کھاتے ہیں اور پھر آرام کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے اور دس بجے سو جاتے ہیں۔ دن میں کام کرنے والی صحت گاہوں میں زیادہ تر بچے لائے جاتے ہیں۔ ان بچوں کو صحت گاہوں ہی میں کھانا کھلایا جاتا ہے اور شام کو ۶ بجے ان کو گھر بھیجدیا جاتا ہے۔ بیمار مزدوروں سے ہلکے کام لئے جاتے ہیں اور اُن کی صحت کے لحاظ سے غذائیں مہیا کی جاتی ہیں

میں نے لینن گرڈ میں بچوں کی ایک صحت گاہ دیکھی جہاں مدقوق و مسلول بچوں کی تعلیم، طعام، قیام، کھیل اور علاج کا انتظام تھا۔

روس کے ڈاکٹروں نے اپنی طبی سرگرمیوں کو نہایت تفصیل سے بتلایا اور انتہائی اخلاق سے پیش آئے۔ ترجمان اور رہنما کا کام زیادہ تر ڈاکٹروں کی بیویاں انجام دیتی ہیں۔ انھوں نے میرے سوالات کے جوابات نہایت سنجیدگی سے دئے۔

شرح اموات میں حیرت انگیز کمی صحت بخش مکانوں کی تعمیر اور طبی ہدایات کی نشر و اشاعت کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن روس کے باشندوں کی بہتر غذا کو اس میں سب سے بڑا دخل ہے۔ میری رائے میں یہ اچھی غذا ہی کا سبب ہے کہ اس قدر تھوڑے عرصہ میں اور ایسی سرعت کے ساتھ روسی باشندوں کی صحت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ عوام کی صحت کی نگہداشت کرنا ایک حکومت کا فرض ہے روس میں اس فرض کو جس طرح انجام دیا جاتا ہے اسکی تفصیل کو پڑھنے کے بعد اب آپ ہندوستان کا تصور کیجئے۔ یہاں تو ہم غلاموں کو یہ بھی خبر نہیں کہ ہماری صحت کے بارے میں بھی حکومت کا کوئی فرض ہے۔ کاش وہ دن آئے کہ روس کا یہ افسانہ ہم ہندوستان میں بھی

سحرِ فرنگ

از جناب اختر قادری (بلیاوی) بی اے (آنرز)

—— چودھری صاحب، ایک ہفتے کی سافت طے کر کے شہر سے واپس آئے تھے۔ گاؤں کے بہت سے آدمی ان کی خیریت اور تازہ خبریں دریافت کرنے کے لئے ان کی نشست میں جمع تھے۔ چلم کا دور چل رہا تھا۔ اور پنیل کی ایک خوبصورت سی پتیلی میں لونگ الائچی پیش کی جا رہی تھی۔

بوڑھے چودھری نے سفر کے بخیر و خوبی اختتام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا —"گر بھائیو! خبر بہت بری لایا ہوں" یہ کہہ کر چودھری صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور لوگ دم بخود ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اُنھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "پچھلے مہینے مغلوں کے حملے کی جو افواہ تھی وہ سچ ثابت ہوئی۔ آج آٹھ دن ہوئے کہ امیر افغانستان نے دہلی کی فوج کو پانی پت میں شکست دی۔ شہنشاہ اور شاہزادے خود جنگ میں شریک تھے۔ سب کام آئے۔ راج لُٹ گیا۔ آج اس دیس پر بدیسیوں کا قبضہ ہے" چودھری صاحب غم و غصہ کی شدت کے باعث اور کچھ نہ بول سکے۔ حاضرین پر حسرت و اُداسی چھا گئی۔

—— زبیر —— چودھری صاحب کے اکلوتے جوان بیٹے نے کہا۔ "شاید ہار سپاہیوں کی کمی کی وجہ سے ہوئی؟" —— "نہیں!" چودھری صاحب نے کہا —"شاہی فوج دشمنوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ لڑائی میں کسی نے پیٹھ بھی نہیں دکھائی۔ مگر یہ خونخوار مغلے غضب کے لڑنے والے ہیں۔ ایک لاکھ کے مقابلے میں صرف بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی اُنھوں نے پوری صفیں کی صفیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں"

—— شیر علی —— نے جوش انتقام سے مچلتے ہوئے کہا "شہنشاہ شہید ہوئے شاہی فوج کو شکست ہوئی مگر کیا یہ کروڑوں کی آبادی اتنی اپاہج ہے کہ مٹھی بھر غیر ملکی اس ملک پر حکومت کر لیں گے میرے خیال میں ہندوستانی اتنے بزدل اتنے بے غیرت نہیں"

چودھری صاحب نے شیر علی کے دلیرانہ جذبات سے متاثر ہو کر کہا۔ "بالکل درست کہا تمنے مغلوں کے لئے اس ملک پر حکومت کر لینا آسان بات نہیں۔ مقابلے کی تیاری ہو رہی ہے۔ رانا سنگرام سنگھ نے اعلان جنگ کر دیا ہے۔ سوریہ خاندان کا ایک شاہزادہ بہار سے بہت بڑی فوج لے کر رانا کی مدد کو آچکا ہے۔ اس کے علاوہ دور دور سے ہتھیار بند نوجوان رانا کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں۔ یہ فیصلہ کن لڑائی ہوگی"

ابھی چودھری صاحب نے اپنی باتیں پوری بھی نہ کی تھیں کہ "مہارانی منڈل" کے مہنت جی اس اُمید افزا خبر کو سن کر بول اُٹھے "شہنشاہ نے مہارانی کی سیوا کے لئے جاگیر دی ہے۔ مہارانی اپنے سیوکوں کو بھول نہیں سکتیں وہ دشمنوں سے بدلہ لیں گی۔ مغلے یقیناً ہار جائیں گے۔ ماتا کی اشیرباد چاہیئے —ہے ماتا! ناس کر دے ان ظالموں کا۔ ہم بڑی دھوم سے تیری پوجا کریں گے"

—"ماتا کی دیا ہوگی!" چودھری جی بولے "مگر دیوتا صرف انہی لوگوں کی مدد کرتے ہیں جو اپنی مدد کے لئے آپ بھی تیار ہوں"

اتنے میں اذان کی آواز آئی، شیر علی فوراً روانہ ہو گیا۔ آپ لوگ سامنے والی مسجد کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ وہیں سے اذان کی آواز آئی ہوگی۔ نہیں بلکہ اسی مقبرے کے پاس شیر علی کے والد میر سبحان کا مکان تھا، جہاں میر صاحب برابر اذان کہہ کر نماز پڑھتے تھے گو اس بستی میں ان دو باپ بیٹوں اور شیر علی کی بیوی کے علاوہ کوئی چوتھا مسلمان نہ تھا۔ خیر شیر علی اذان کی آواز سن کر لپکا ہوا گھر پہنچا۔ دونوں باپ بیٹوں نے ایک ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد میر صاحب وظیفہ میں مشغول ہوئے اور شیر علی اندر حویلی میں داخل ہوا۔ میر صاحب کوئی نصف گھنٹے کے بعد اندر آئے تو اُنھوں نے شیر علی کو سپاہیانہ لباس میں پایا۔ قریب ہی اسکی بیوی حسرت سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ میر صاحب یہ سماں دیکھ کر کسی قدر حیرت میں آگئے۔ فوراً ہی شیر علی نے کہا —"شاید حضور کو معلوم نہیں کہ چودھری چچا شہر سے واپس آگئے۔ وہ مغلوں کے حملے۔ اور شہنشاہ کی شکست اور موت کی خبر لائے ہیں۔ رانا سنگرام ملک کو ان دشمنوں سے چھڑانے کے لئے دوبارہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لوگ دور دور سے اُن کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں"

میر صاحب پاس کی چوکی پر کچھ دیر تک سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اُنھوں نے بہو کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے سہارے کھڑی تھیں۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میر صاحب نے افسردہ ہو کر

شیر علی کی طرف دیکھا اور بولے ـــــ "موت لازمی چیز ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ لیکن اس سے بہتر کون سی موت ہو سکتی ہے۔ کہ انسان اپنے ملک اور اپنے چہیتوں کی عزت و آبرو بچانے کے لئے موت سے گلے ملے۔ تم مجھ سے موت کی اجازت چاہتے ہو؟ تمہارے جانے سے میرا گھر سنسان ہو جائے گا۔ تمہاری موت سے میرا گھر ویران۔ میرا خاندان بے نشان ہو جائیگا لیکن ایک بوڑھا اپاہج باپ ملک کے لئے جو کم سے کم قربانی کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اسے بدیسیوں سے نجات دلانے کے لئے اپنی جوان اولاد کو بھینٹ چڑھا دے۔ جاؤ تمہیں خدا کو سونپا۔"

شیر علی باپ اور بیوی کی محبت اور ایثار سے متاثر ہو کر کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے نہایت احترام سے سر جھکا کر رخصتی سلام کیا اور روانہ ہو گیا۔ باہر رنبیر ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا، دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے، وہ فرط مسرت سے لپٹ گئے تھوڑی دیر کے بعد بستی کی پوری آبادی کی دعائے کامرانی کے ساتھ۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان دونوں کی روانگی سے ان کے گھر والوں کے دلوں پر کیا گذری یہ کہنے سننے کی بات نہیں، محسوس کرنے کی بات ہے، اس کے بعد۔ دن۔ ہفتے اور مہینے گذرتے گئے۔ رانا کی ہار کی خبر ملی۔ نئی نئی لڑائیوں۔ اور نئی نئی تیاریوں کا حال معلوم ہوا۔ لیکن ان دونوں جوانوں۔ اور ان جیسے ہزاروں وطن پرستوں کا دنیا نے کوئی حال نہ سنا۔

شیر علی کی بیوی اور میر صاحب نے۔ اپنے چہیتے کو جدا کر کے عبادت سے دل کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ دو برس کے بعد بہو اور سسر دونوں یکے بعد دیگرے سپرد خاک ہوئے! لیکن چودھری صاحب کو اپنی قربانیوں کا صلہ زندگی ہی میں مل گیا۔ شیر شاہ نے جب ہمایوں کو شکست دی تھی وہ زندہ تھے۔ شیر شاہ دہلی جاتے وقت اسی بستی سے گذرا تھا۔ چودھری صاحب کو ہندوستان کی کھوئی ہوئی سلطنت واپس دلانے والے "شیر شاہ" کے درشن نصیب ہوئے۔ اور اسی کے حکم سے ـ میر صاحب۔ اور چودھری صاحب کی قربانیوں کی یادگار قایم رکھنے کے لئے یہ مقبرہ اور وہ سنگت بنائی گئی تھی۔ شیر علی۔ اور رنبیر لڑائی میں کام آئے۔ چودھری صاحب اور میر صاحب کا خاندان مٹ گیا۔

اور معلوم نہیں ہندوستان میں ہندوستانی راج قایم کرانے کے لئے ایسے کتنے خاندان بے نشان ہو گئے ہوں گے۔ لیکن معز سیاحو! نتیجہ تمہیں معلوم ہے۔ مغل اس ملک میں اس وقت تک اطمینان کی سانس نہ لے سکے جب تک وہ مغل رہے ـــــ"

بوڑھا مجاور۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ پھر ہم دونوں کو حسرت و یاس سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مگر اب اس پرانی کہانی میں کسے مزا آئے گا۔ سحر فرنگ نے ملک کا مذاق ہی بدل دیا ہے۔ ہندوستان غلامی کے طوق کو آزادی کا تمغہ سمجھنے لگا ہے ـــــ"

پرکاش نے کہا: "بوڑھے بابا۔ افسوس نہ کرو۔ اب پھر اس دیس کے دن پھرنے والے ہیں ـــ!"

میں نے اپنے ساتھی کی تائید میں کہا۔ "بلاشبہ۔ ہندوستانیوں کو اپنی غلامی کا احساس ہو گیا ہے۔ آزادی اب دور نہیں"

بوڑھا مجاور ہم لوگوں کی باتیں سن کر کسی قدر مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ خوشی اور امید کی نہ تھی۔ اس میں نفرت۔ غیرت۔ اور مایوسی بھری ہوئی تھی۔ اس نے مچل کر کہا:۔

"جس ملک والے۔ زبان۔ قربانی۔ باجہ جیسے معمولی جھگڑوں کو چکا نہیں سکتے۔ ان سے یہ امید رکھنی کہ وہ انسانیت کی سب سے بڑی گتھی یعنی غلامی کے دشوار و پیچیدہ مسئلہ کو حل کر سکیں گے بیوقوفی ہی نہیں پاگل پن ہے ـــــ"

مجاور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس مجاور کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ پرکاش کی نیچی نظریں بھی اسی تلخ حقیقت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ہم لوگوں کو دوسرے "تاریخی مقامات" دیکھنے کے لئے اور جگہ بھی جانا تھا۔ اس لئے مجاور کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گئے

پاکیزہ زبان اور گندہ خیالات

شاعر میں حیا سوزی کی عادت کیسی ؟
اوباشیاں پھیلانے کی فطرت کیسی ؟
پاکیزہ زبان، گندے خیالات یہ کیا ؟
سونے کی رکابی میں غلاظت کیسی ؟

(شیخ امداد حسین۔ اخگر مراد آبادی)

وجدانیات

(از سید محمد محی الدین بجور عظیم آبادی)

فرقت کی اندھیری راتوں میں حسرت کی گھٹائیں امنڈا کیں
بجلی سے مگر امیدوں کی رہ رہ کے فضائیں چمکا کیں
قسمت میں لکھی تھی محرومی، ابھری نہ مری ڈوبی کشتی
تکتا رہا حسرت سے ساحل، ہر چند کہ موجیں تڑپا کیں
بجلی کا چمن میں وہ گرنا، رہ رہ کے دھواں سا کچھ اٹھنا
خاموش تھے نالے بلبل کے، خوں ریز نگاہیں دیکھا کیں
راس آئی چمن کی آب و ہوا کس کو کہ مجھے راس آئے گی
جو پھول کھلے مرجھا کے رہے، کلیاں جو رہیں وہ سہما کیں
معیوب ہے طوفاں سے ڈرنا، جینا ہے تلاطم میں جینا
بیچاری وہ موجیں کیا جانیں جو جھیل میں ہر پل لہرا کیں
اک دل ہے ڈوبا جاتا ہے پہلو میں مرے پھر بھی رنجور
مخمور ہوائیں آیا کیں، ساون کی گھٹائیں برسا کیں

مذہب و تہذیب کی خود مختاری

از مولانا حفظ الرحمٰن ۔ رکن مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند

ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش میں بدقسمتی سے مسلمانوں کے دوسرے معاملات کی طرح سیاسی انتشارِ خیال و عمل بھی اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ ہم "شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا" کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں! لیکن میں اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا کہ دورِ حاضر میں مسلمان کس جماعت کو اپنا سمجھیں اور کس کو رقیب و حریف کی صف میں جگہ دیں۔ کیونکہ ہمارے ذاتی افکار و اغراض نے اس سوال کو اتنا الجھا دیا ہے کہ ایک بدیہی اور روز روشن کی طرح صاف مسئلہ پیچیدہ ترین بن گیا ہے۔ اور اب سیاسی افکار و نتائج کو ٹھنڈے دل و دماغ سے دیکھنے اور سوچنے کی بجائے ہر طرف سے اُن کو طے شدہ پالیسی، اور جماعتی موت و حیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور سوچا جاتا ہے، اور اگر اسی حد تک معاملہ رہتا تو یہی غنیمت تھا، مگر بدبختی کے کارن اس بحث نے جماعتی طریق کار سے ہٹ کر "ذاتیات" کی جگہ لے لی ہے۔ اور مضمون پڑھنے سے پہلے اب یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ مضمون نگار کس جماعت کا "پہلوان" ہے۔ تاہم مختلف جماعتوں کے منصف مزاج افراد اور غیر جانبدار اشخاص کے سامنے ایک ایسی اہم بات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو ہر حالت میں مسلمانوں کے پیش نظر رہنی چاہئے۔

ہم مسلمان ایک ایسے ملک میں آباد ہیں جہاں مختلف قومیں بستی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ملک بحالت موجودہ دارالاسلام نہیں ہے۔ بلکہ مختلف اقوام کا ایسا گہوارہ ہے جہاں غیر اسلامی حکومت ہے۔

اس ملک کے آزاد کرانے کے لئے کوئی بھی طریق کار اختیار کیجئے اور آزادی کا کوئی مفہوم بھی مراد لیجئے لیکن یہ یقینی ہے کہ بظاہر اسباب اس کے "دارالاسلام" ہونے کی توقع نہیں ہے۔ لعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امرا

لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ سوچنا ہے کہ آیا ہم کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے انگریزی راج کو باقی رکھنا اور اس کی حمایت کرنا ہے یا نہیں؟ آیا ہم کسی حال میں اُس آزادی کو نہ آنے دیں گے جس سے قدرتی طور پر اکثریت اپنی تعداد کے اعتبار سے اقلیت یا ثانوی اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ بہرہ ور ہو جائے، یا جس میں اکثریت کو اپنی تنگ نظری، ظلم پسندی کا اقلیت کے مقابلہ میں زیادہ موقعہ میسر آئے۔

ان سوالات پر غور کرنے کے بعد ہم کوئی بھی سیاسی راہ اختیار کریں ہمیں عقل و تجربہ کی بنا پر یہ طے کر لینا پڑتا ہے کہ ان حالات میں ہندوستان کا نظام سیاسی غیر اسلامی ہی ہوگا،

یہ بحث بالکل جدا ہے "کہ پھر کیوں نہ ہم ہندوستان کو دارالاسلام بنا ڈالیں"، اس لئے کہ اسلامی احکام کی روشنی میں یہ بحث خود قابل غور ہے اور میں اس کے لئے ایک مستقل رائے رکھتا ہوں جس کی راہنمائی مجھ کو اور میرے رفقائے کار کو حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ سے حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس وقت اس بحث کو چھوڑیئے اس وقت تو میں جس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب یہ طے شدہ ہے کہ "بظاہر اسباب" کسی بھی مسلم جماعت کا ساتھ دینے کے باوجود آئندہ ہندوستان کا نظام حکومت غیر اسلامی ہی رہنے والا ہے تو "حفاظت اسلام" اور "حفاظت مسلمین" کا طریقہ کیا ہے؟

یہ ایک سوال ہے جس کو میں تمام مسلم جماعتوں کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں نیازمندانہ خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

اگر آزاد ہندوستان یا غلام ہندوستان میں کانگریسی مسلمانوں یا مسلم لیگی مسلمانوں، یا جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے کارکنوں نے ہم کو اسمبلی، اور کونسل کی نشستوں، وزارتوں، ملازمتوں اور دوسرے سیاسی و اقتصادی اداروں، میں کچھ حقوق دلا بھی دیئے، یا اُردو زبان کے لئے کانگریسی ہندوؤں نے اپنا موجودہ رویہ تبدیل کر بھی لیا تو کیا بحیثیت "مسلمان" یہ ہمارے مرض کا صحیح "علاج" ہے؟

میں نے لفظ "مسلمان" اس لئے استعمال کیا کہ پارسی، ہندو، عیسائی سکھ کی طرح ایک "قوم" ہونے کی حیثیت سے تو ایک حد تک ان باتو سے آنسو پونچھ جائیں گے،

اور اگر بیجا حملہ نہ سمجھا جائے تو میں یہ جرات کر کے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اکثر سیاسی لیڈر اس لفظ "مسلمان" کو اسی معنی میں استعمال کرتے بلکہ اس کے مفہوم کو اسی قسم کی ایک "قوم" کے دائرہ میں محدود رکھنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے مطالبات میں کسی جگہ وہ صاف اور صریح مطالبہ نظر نہیں آتا جس سے واقعی اور حقیقی طور پر "مسلمان" کی جماعتی اور حقیقی مذہبی و قومی زندگی کا مداوا ہو سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ مطالبہ کیا ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ مذہبی و تہذیبی خود مختاری کا مطالبہ ہے۔

مگر افسوس کہ ہم اس مطالبہ کو کہیں بھی اُبھرا ہوا نہیں پاتے، بعض مسلم جماعتوں میں تو اس کا ذکر ہی نہیں آتا اور "مذہبی حفاظت" کے تمام بلند بانگ دعووں کے باوجود اس غریب کو کہیں جگہ نہیں دیجاتی،

اور بعض جماعتوں میں اگر ذکر آتا بھی ہے تو اس کی کوئی صاف اور صریح شکل و صورت کا خاکہ اُن کے سامنے موجود نہیں ہے وہ اس کی اہمیت کو تو محسوس کرتے ہیں اور اُس کے حصول کے لئے جد و جہد کا بھی ارادہ کرتے ہیں لیکن جب عملاً کوئی شکل اپنے سامنے نہیں رکھتے تو انگریزی حکومت، یا کانگریس سے وہ کیا چیز منوائیں گے۔ اور کس چیز کو حاصل کریں گے۔

میرا روئے سخن ایمانداری کے ساتھ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف بغیر کسی جنبہ داری کے ہے۔ اور میرا بصیرت کے ساتھ یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہمارے مرض کا صحیح علاج صرف اسی ایک چیز سے ہو سکتا ہے۔ باقی تمام باتیں فروعی اور حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہوتے رہنے والی ہیں۔

البتہ میں جنبہ داری کی نیت سے نہیں بلکہ واقعیت کو سامنے رکھکر یہ ضرور کہوں گا کہ تمام مسلم جماعتوں کے مقابلہ میں صرف جمعیۃ علمائے ہند کے پیش نظر یہ نظریہ شروع سے رہا ہے اور آہستہ آہستہ وہ اس کو

نمایاں کرتی جاتی ہے۔

دو تین سال ہوئے الہ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو کانفرنس ہوئی تھی اُس وقت سے لے کر جمعیت علماء کے اجلاس کے وقت تک وہ اسکی عملی تشکیل کی فکر میں ہے اس سلسلہ میں حضرت مولانا سجاد کا تحریری خاکہ اور ایک سب کمیٹی کا قیام (جو انشاء اللہ جلد ہی اپنا کام شروع کرے گی) اس کا دوسرا قدم ہے۔

میں اس نازک وقت میں تمام مسلم جماعتوں سے یہ گذارش، درخواست اور التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہر قسم کے سیاسی اختلافات کے باوجود جمعیۃ علمائے ہند کے ساتھ اس اہم مسئلہ میں ضرور متفق و متحد ہو جائیں، اور جا ہے ایک دوسرے کو جیسا بھی کچھ سمجھیں، سمجھیں مگر اپنی اپنی جماعتوں میں رہتے ہوئے اس مطالبہ کی پُر زور حمایت کریں۔ میں بار بار اس لجاجت و نیازمندی کے ساتھ تمام مسلم جماعتوں سے اس لئے مخاطب ہوتا ہوں کہ اب سے چند سال پہلے جبکہ مسلمان اس طرح مختلف جماعتوں کے نام سے نبرد آزما نہ تھے۔ بلکہ رجعت پسندوں کے علاوہ قریب قریب تمام قوم پرور افراد ایک جگہ جمع ہو گئے تھے، اور اُن کی ایک بڑی تعداد مولانا آزاد ... کی آواز پر لکھنؤ اور الہ آباد میں سر جوڑ کر بیٹھی تھی تو اُس وقت بھی اس (کلچرل اٹونومی) کا غیر مکمل خاکہ "محکمۂ قضا" کے نام سے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے پیش ہوا تھا مگر پنڈت مدن موہن مالویہ، اور ڈاکٹر مونجے کی جانب سے اُس کی اس قدر شدومد کے ساتھ مخالفت ہوئی کہ خود مسلم لیڈر بھی اسکی حمایت چھوڑ بیٹھے۔ اور انہوں نے "جمعیۃ علماء ہند" کے اس مطالبہ کو نقصان پہنچانے کی زیادہ سے زیادہ تگ و دو کی اور ہندوؤں کی موجودگی میں صاف صاف کہا کہ ہم اس قسم کی "فرسودہ مذہبی باتوں" کو ہرگز نہ ہونے دیں گے اور یہ بھی کہا کہ اس کے ذریعہ علماء اپنے پچھلے اقتدار کو زندہ کرنے کی فکر میں ہیں۔

اگر آج سیاسی اختلافات کی نزاکت حائل نہ ہوتی تو میں ان بزرگوں کے نام بھی ظاہر کر دیتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میں "اسلام" اور "حفاظت اسلام" کے نام پر تمام مسلمانوں، اور مسلم جماعتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ میری اس ضعیف مگر اسلامی درد سے بھری آواز کو فرقہ بندی و گروہ بندی کے جذبہ کی بھینٹ نہ چڑھائیں اور یک آواز ہو کر مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی خود مختاری کے اس مطالبہ کو مضبوط بنائیں تاکہ ہمارا قدم جمعیۃ علماء ہند کے اس اقدام پر جاری ہے اور ہم "کانّہم بنیانٌ مرصوص" بن کر اپنے مقصد کو پا سکیں اور پھر رب العلمین کی اس بشارت کو حاصل کریں۔

الا ان نصر اللہ قریب

(نہ گھبراؤ) بیشک اللہ کی مدد قریب۔

مسلمانوں سے؟

(از جناب امیر احمد سیرتی مظاہری مقیم حال رنگون)

قوم مسلم! تیری اگلی سی وہ شوکت کیا ہوئی؟
وہ ترا اگلا عروج، اور تیری عظمت کیا ہوئی؟
کیا ہوا صدیق اکبرؓ سا وہ ایثار و جہاد؟
حضرت فاروقؓ سی شانِ جلالت کیا ہوئی؟
فقر و فاقہ ذلت و نکبت نے گھیرا کیوں تجھے؟
اسقدر مفلس ہے کیوں عثمانؓ کی دولت کیا ہوئی؟
آج وہ جاہ و جلال حیدری تیرا کہاں؟
اور وہ حسینؓ سی حق کی حمایت کیا ہوئی؟
خالدِ جرار سے جانباز تم میں کیوں نہیں؟
اور ابن العاصؓ کی سی آج سطوت کیا ہوئی؟
عزم و استقلالِ طارقؒ تم سے کیوں مفقود ہے؟
اور محمد ابن قاسمؒ سی شجاعت کیا ہوئی؟
آتی ہے بیت المقدس سے یہ رہ رہ کر صدا
وہ صلاح الدین ایوبیؒ کی جرأت کیا ہوئی؟
جور و استبداد کے سایہ میں کیوں خاموش ہے؟
لے سبق اغیار سے اُف تیری ہمت کیا ہوئی؟
توڑ کر بندِ غلامی قوم مسلم پھینک دے
یہ غلامی پر قناعت! تیری غیرت کیا ہوئی؟
کشت زارِ زندگی میں پھوٹ کیوں بوتی ہو تم؟
تم میں وہ اپنے سلف کی سی اخوت کیا ہوئی
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کو بھولے ہوئے کیوں ہو امیر
ہمت عالی تمہاری اور صداقت کیا ہوئی؟

جوانی

(از جناب بسمل سعیدی ہاشمی)

جب رنگ طبیعت کا بدلتی ہے جوانی
انسان کی رگ رگ میں مچلتی ہے جوانی

جس راہگزر سے بھی نکلتی ہے جوانی
ہر نقش کف پا سے ابلتی ہے جوانی

جذبات میں جس وقت مچلتی ہے جوانی
بہلائے سے پھر کوئی بہلتی ہے جوانی

دل میں ابھی ہوتی ہے محبت نہ تمنا
رہ رہ کے مگر دل کو مسلتی ہے جوانی

رُخ اپنا بدل لیتا ہے اُس سمت زمانہ
جس سمت کو رُخ اپنا بدلتی ہے جوانی

خود حُسن بھی رہ جاتا ہے منہ اپنا سا لیکر
غازہ کوئی اِس طرح کا ملتی ہے جوانی

جذبات کا اللہ رے طبیعت میں تلاطم
ہر سانس کے ہمراہ اُبلتی ہے جوانی

قدرت کے قوانین بدل دیتی ہے قسمت
قسمت کے نوشتوں کو بدلتی ہے جوانی

ہوتی تو ہے کچھ آگ محبت کی دلوں میں
پنکھا مگر اس آگ پہ جھلتی ہے جوانی

اپنا ہی مزاج اپنے ہی بس کا نہیں ہتا
اِس طرح طبیعت کو بدلتی ہے جوانی

ہے عقل ہی دلسوز، علی الرغمِ محبت
اور عقل ہی کمبخت سے جلتی ہے جوانی

مذہب کا مرّوج نہیں رہتا کوئی قانون
جب حُسن کے آغوش میں پلتی ہے جوانی

مُنہ دیکھتی رہتی ہے لڑکپن کی شرارت
جب لیکر اک انگڑائی سنبھلتی ہے جوانی

مل جائے اگر اِس کو محبت کا سہارا
بے جان لئے پھر کوئی ٹلتی ہے جوانی

ہر گام دلِ عرش دہلتا ہے دھمک سے
جب فرشِ نزاکت پہ مچلتی ہے جوانی

حلقوں سے مشائخ کی نکل آتی ہیں آنکھیں
جب سامنے سے ہوکے نکلتی ہے جوانی

جس طرح کہ پھٹتا ہے پہاڑ آگ کا کوئی
ایک ایک بُنِ مُو سے اُبلتی ہے جوانی

بااینہمہ، اک روز وہ آتا ہے کہ بسمل
دن بھی نہیں ڈھلتا ہے کہ ڈھلتی ہے جوانی

بغض و حسد

میں امنِ دل و جاں کا شکاری تو نہیں
دشمن سے عداوت مجھے پیاری تو نہیں
کیوں بغض و حسد مجکو ڈسیں لے اخگر
سینہ مرا سانپوں کی پٹاری تو نہیں

(شیخ امداد حسین ۔ اخگر مراد آبادی)

خوفناک دنیا

(از جناب سید محمد علیشاہ سبزواری۔ آرہ۔ بہار)

ذیل کے دلچسپ و معلومات افزا مقالہ میں مقالہ نگار نے افریقہ کے پُرخطر جنگلوں کے چند بد حالات بیان کئے ہیں۔ اس موضوع پر آپ نے "خوفناک دنیا" کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ چونکہ یہ مضمون افریقہ کے متعلق ایک قسم کی عینی شہادت ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہے ——— ایڈیٹر

براعظم افریقہ کے وحشتناک جنگل خونخوار درندوں اور وحشی انسانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کوئی گھنا جنگل ان سے خالی نہیں۔ ہر قسم کے درندے ہاتھی۔ گینڈے۔ شیر۔ ببر۔ چیتے۔ ہیپوپوٹامس۔ گوریلا (بن مانس) بھینسے اژدہا وغیرہ وغیرہ بے شمار ہیں۔ لیکن ان سب میں انسان نما درندے سب سے زیادہ خطرناک ہیں درندوں سے کسی نہ کسی طرح جان بچائی جا سکتی ہے مگر ان وحشیوں سے جان بچانا ناممکن ہے۔ وہ شیروں اور ہاتھیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اُن انسانی درندوں کی شکلیں نہایت خوفناک ہیں۔ سیاہ فام، قوی ہیکل اور بالکل ننگے۔ افریقہ کے دور دراز گھنے جنگلوں میں وہ رہتے ہیں اُن کی زندگیاں ہمیشہ درندوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں ہر قسم کے جانوروں کو وہ اپنے نیزوں اور تیروں سے شکار کرتے ہیں اور چیر پھاڑ کر اپنے تیز دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔

افریقہ کے جنگل ہزاروں لاکھوں مربع میل کے رقبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سے بلند پہاڑ ہیں جن کی بلند چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ان پہاڑوں میں بے شمار دلفریب اور خوشنما مناظر اور آبشاریں ہیں۔ تند اور تیز رو دریا ہیں۔ جن کے کناروں پر خطرناک دلدلیں ہیں۔ یہ مقامات ایسے ہیں جہاں آجتک کسی انسان کا قدم نہیں گیا۔ جنگلی جانور بھی عجیب و غریب قسم کے یہاں پائے جاتے ہیں جو دنیا کے دوسرے حصوں میں نہیں ہیں جن میں سب سے زیادہ کلیمون قابل ذکر ہے۔ یہ خوفناک درندہ تقریباً پندرہ فیٹ تک لمبا ہوتا ہے اور تین فیٹ کے قریب اونچا۔ منہ اُس کا بہت لمبا اور تیز لمبے دانت بھیڑیئے کی طرح ہوتے ہیں۔ تقریباً دس فیٹ لمبی گچھے دار دم اور رنگ گہرا سرخ ہوتا ہے۔ یہ عجیب قسم کا جانور نہایت خطرناک ہوتا ہے ہاتھی اور شیر ببر بھی اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اس کی بو پلتے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں گوریلا بن مانس بھی بہت خطرناک درندہ ہے۔ اُس کا قد چھ فیٹ تک اونچا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ افریقہ کے ان جنگلوں میں پرندوں کی بے حساب قسمیں ہیں۔ گنی فاؤل مرغیاں جنگل میں بکثرت ہیں اور چھوٹے بڑے قسم کے سانپوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں

ایسے پُرخطر جنگلوں میں انسانوں کی آبادی بھی ہے اس میں شک نہیں کہ اُن کی شکل صورت ضرور انسانوں کی سی ہے لیکن درحقیقت وہ انسان نہیں۔ بلکہ خونخوار درندے ہیں۔ یہ گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں اور اپنی حدود سے باہر نہیں جاتے۔ ان کو دنیا میں اپنے سوا دوسرے بسنے والوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ ان کی ضروریات زندگی بہت محدود ہیں۔ کپڑے کی اُن کو ضرورت نہیں۔ خوراک کے لئے اُن کے گرد و پیش جنگلی جانوروں کی کمی نہیں جنگلی پھل اُن کو بہت ملتے ہیں۔ درختوں کی جڑیں بھی کھاتے ہیں کئی کے بھٹے۔ شکر قند۔ اور جنگلی کیلے اُن کو خود رو مل جاتے ہیں۔ یہ اپنی جھونپڑیاں گھاس اور پتوں سے بنا لیتے ہیں ان میں ہر خاندان اور کنبے کے لوگ الگ الگ جنگلوں میں دُور تک آباد ہیں۔ ان انسانوں کے متعلق سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کھانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اپنی خوراک کے لئے وہ دوسرے گروہ کے لوگوں کو پکڑ لاتے ہیں اور پھر اُن کا گوشت بڑے مزے لے لیکر کھاتے ہیں۔ یہ اُن کی بہترین غذا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اکثر وحشی اپنے بیماروں اور مُردوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ مرد بالکل ننگے رہتے ہیں۔ عورتیں ستر پوشی کے لئے ذرا سا چمڑہ پیٹ لیتی ہیں۔ ہر خاندان میں جو عورت یا مرد عمر میں بڑا ہوتا ہے وہ سردار مانا جاتا ہے سب اُس کی تعظیم کرتے ہیں۔

لیکن افریقہ کی تمام جنگلی قومیں آدم خور نہیں ہیں۔ وہاں جنگلوں میں لاتعداد قومیں آباد ہیں جن میں آدم خور وہی ہیں جو انتہائی دور جنگلوں میں رہتی ہیں۔ اور جن کو انسان کے بجائے حیوان کہنا زیادہ موزوں ہے۔

ان آدم خور انسان نما حیوانوں کے علاوہ افریقہ کی دوسری قوموں میں ایک خاص آئین ہے ہر ایک اپنے سردار کے ماتحت ہے۔ بیاہ شادی میں سب لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ناچ گانے کے جلسے رچائے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی توہم پرستانہ رسومات سے بھرپور ہے۔ البتہ اُن کے کام نہایت سادہ ہیں۔ مذہب کے نام سے وہ لوگ واقف نہیں ہیں اور نہ وہ اِس سے واقفیت رکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی مہذب قومیں بھی آباد ہیں یا دنیا کس قدر وسیع ہے۔ وہ اپنے اِس محدود خطہ کو ہی دنیا تصور کرتے ہیں۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ دنیا ہمیشہ ترقی کرتی رہی۔ قوموں میں انقلاب رونما ہوئے۔ اُن کی زندگیاں بدل گئیں۔ مگر ان جنگلی قوموں کی حالت دو ہزار برس قبل جو اُن کی حالت تھی آج بھی بالکل وہی ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ البتہ جو جنگلی قومیں افریقہ کے مشرقی اور مغربی ساحلوں کے قریب آباد ہیں اُن کی حالت روبہ اصلاح ہے اُن میں اکثر تبدیلیاں ہوئیں۔ عیسائی تبلیغی مشن کی کوشش اُن میں کامیاب رہی۔ اُن میں انسانیت پیدا ہوئی۔ وہ لباس کے عادی ہوئے۔ کچھ کام کاج کرنا بھی سیکھا۔ مگر نہائی دور دراز جنگلوں میں رہنے والے وحشی لوگوں کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہے چالیس برس قبل جبکہ مشرقی افریقہ میں یوگنڈا ریلوے تیار ہو رہی تھی اُس زمانہ میں وہاں شیروں ہاتھیوں اور اکثر جنگلی لوگوں نے سینکڑوں ہندوستانی خاصکر پنجابیوں کا نقصان کیا۔

عام طور پر دنیا کے لوگ اُن جنگلی قوموں کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ وہ دنیا کے بسنے والوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ اُن کی دنیا ہی دوسری ہے۔ لوگوں کو اُن کے حالات سے واقفیت کیونکر ہو۔ جبکہ اُن کی رہائش دور دراز جنگلوں میں ہے۔ وہاں تک کسی مہذب انسان کا گذر نہیں ہے اور اگر کسی نے وہاں پہنچنے کی کوشش کی بھی تو وہ زندہ واپس نہ آیا۔ اکثر یورپ کے لوگوں نے غباروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ صحرائے اعظم کے بے پناہ جنگلوں میں سفر کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکے ۱۸۶۱ء میں فرینڈراک نامی ایک انگریز نے اپنے دو دوستوں کے ہمراہ ایک بڑے غبارے کے ذریعہ پرواز کی۔ اور بہت مشکلات کے بعد افریقہ کے انتہائی دور دراز جنگلوں میں پہنچ گیا۔ مدت تک وہ اور اُس کے ساتھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے رہے۔ وحشیوں اور درندوں سے بچتے ہوئے وہاں کے حیرت انگیز حالات دریافت کرتے رہے۔ بے شمار عجائبات۔ نباتات اور معدنیات کے خزانے ڈھونڈھ نکالے۔ سونے، ہیرے اور زمرد کی کانیں معلوم کیں۔ لیکن ان بے بہا دولت کے خزانوں سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکے۔ ہر آن و ہر لحظہ اُن کے سامنے جان کے خطرے کا سوال تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی دلیری اور ہمت بے حد قابل داد ہے۔ مگر اس قسم کا کام خودکشی ہے، دیدہ دانستہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالدینا ہے۔ اُن پُرخطر جنگلوں میں جہاں بے حساب آفتوں کا سامنا ہے کسی انسان کا وہاں سے زندہ سلامت پہنچ آنا ناممکن ہے۔ آخر فرینڈراک اور اُس کے ساتھیوں کا بھی یہی حشر ہوا وہاں اُن کی بسر اوقات زیادہ تر جنگلی پھلوں پر تھی۔ ایک روز وہ بلند پہاڑ کے ایک پوشیدہ مقام پر شکار کا گوشت آگ پر بھون رہے تھے۔ وہاں سے دھواں نکلتا ہوا دیکھ کر جنگلی لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت فرینڈراک کا ایک ساتھی پانی کی تلاش میں جاچکا تھا۔ وہ تو بچ گیا مگر باقی دو جنگلیوں کے ہاتھوں جان سے مارے گئے۔ جنگلی ان دونوں کو کھا گئے۔ تیسرا ساتھی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ کئی برسوں کے بعد وہ واپس وطن پہنچا۔

ایک اندھیری رات میں جبکہ چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا، آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے، کچھ کچھ بوندیں بھی پڑ رہی تھیں، گاہے گاہے آسمان پر بجلی چمک جاتی تھی، رات کے ۸ یا ۹ بجے کا وقت تھا، ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ———

—— اس ہولناک وقت میں ایک پہاڑی کے قریب ندی کے کنارے چند جھونپڑیوں کے سامنے میدان میں بڑی بڑی لکڑیوں کا ڈھیر جل رہا ہے۔ اُس کے گرد دیوہیکل انسانوں کا مجمع ہے۔ مردوں کے درمیان عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ ان کا پورا خاندان جمع ہے۔ جنگل میں ان کا شور و ہنگامہ دور تک سنائی دیتا ہے خوشی میں وہ لوگ آگ کے گرد ناچتے اور کودتے ہیں۔ کسی بڑے جشن کی تیاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ کس قدر آزاد اور بے فکر ہیں۔ اس اندھیری رات میں آگ کی روشنی دور تک پھیل رہی ہے۔ ایک طرف کچھ فاصلے پر بہت سے بڑے بڑے درخت کھڑے ہیں۔ آگ کی روشنی میں وہ درخت صاف نظر آرہے ہیں۔ وہاں نظر پہنچتے ہی ایک دردناک نظارہ پیش نظر ہوجاتا ہے ان درختوں کی شاخوں سے بہت سے انسان بندھے ہوئے لٹک رہے ہیں جن کو یہ جنگلی آج ہی اپنی خوراک کے لئے پکڑ کر لائے ہیں اور اُن کو آگ پر بھون کر کھانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ بدنصیب لوگ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ان ہی کی پگڑیوں سے ان کو جکڑ کر درختوں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ بے بس کل چھ آدمی ہیں جن میں دو سکھ نوجوان۔ ایک ہندو اور تین مسلمان ہیں۔ ان تین مسلمانوں میں ایک ۱۸ برس کا نوجوان لڑکا ہے آخر یہ لوگ اس دور دراز جنگل میں کیسے پہنچے! مستری امام الدین ضلع جھنگ پنجاب کا رہنے والا تھا۔ ذات کا لوہار تھا۔ آدمی دلیر اور جسم کا مضبوط و تندرست تھا لاہور سے بھرتی ہوکر بمبئی سے جہاز کے ذریعہ ممباسہ (شرقی افریقہ) اور وہاں سے نیروبی پہنچا۔ اُس کا بیٹا سردار محمد بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ معاہدہ کے تین سال اس نے نیروبی ریلوے ورکشاپ میں پورے کئے۔ باپ اور بیٹا ملکر ۷۰ یا ۸۰ روپیہ ماہوار کما لیتے تھے۔ کچھ دن کیلئے کچھ روپیہ گھر بھیجتے رہے اور باقی روپیہ اپنے ساتھ وطن لے جانے کے لئے جمع کرتے رہے۔ راشن ان کو سرکار سے ملتا تھا۔ دو سال خیریت اور کامیابی سے گذر گئے۔ تیسرے سال بُری صحبت میں پھنس کر امام الدین کو جوا کھیلنے کی لت لگ گئی۔ آدمی بہت بھلا اور نیک تھا مگر جب کسی کے دن خراب آتے ہیں تو اُس کے سامان پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو کچھ روپیہ اُس نے جمع کئے تھے وہ سب چند دن کے اندر جوئے کی نذر ہوگئے۔ ہر مہینہ جو کچھ وہ کماتا جوئے کی نذر کردیتا۔ تین سال پورے ہوگئے کارخانہ سے اُس کو چھٹی مل گئی۔ اب وہ نہایت پریشان تھا۔ وہ پردیس میں تھا۔ وطن واپس جانے کے لئے بے چین تھا۔ مگر وطن جائے کیسے روپیہ پاس نہیں۔ جو کچھ تھا وہ برباد کرچکا تھا۔ روپیہ کے بغیر وہ کوئی دوسرا کام بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب کرے تو کیا کرے۔ ہر طرح مجبور و لاچار تھا۔

نیروبی میں پنجابیوں کی کثرت تھی اور ہر شخص کے پاس روپیہ تھا۔ وہاں چند جوئے کے اڈے قایم ہوگئے۔ ایک پنجابی مستری نے چند ہی روز

میں پانچ ہزار روپیہ جوئے میں جیت لئے۔ یہی لالچ امام الدین اور بہت سے لوگوں کی بربادی کا باعث ہوا۔ صرف امام الدین ہی تنہا اس پریشانی میں مبتلا نہیں تھا بلکہ بہت سے اس کے ہموطن جوئے کی بدولت اپنا سرمایہ کھو کر حیران اور پریشان تھے۔ یہ سب کے سب آوارہ گرد اور بیکار پھر رہے تھے۔ آخر وہ اس زندگی سے تنگ آ گئے۔ سب نے ملکر یہ مشورہ کیا کہ ہاتھی دانت کی تلاش میں جنگلوں کا سفر کیا جائے۔ دو چار مہینہ سفر میں گذار کر وہاں سے ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر کامیاب ہو گئے تو واپس وطن پہنچ جائیں گے۔ اگر جنگلوں میں مارے گئے تو اس تکلیف کی زندگی سے رہائی مل جائے گی۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو جنگلوں میں سے ہزارہا روپیہ کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ تجربہ کار لوگوں نے ان کو اس ارادہ سے منع کیا اور تمام خطرات سے اُن کو آگاہ کیا مگر وہ اپنی دُھن سے باز نہ آئے ـــــ وہ شروع زمانہ تھا۔ اُس زمانہ میں جنگلوں پر زیادہ پابندیاں نہیں تھیں۔ دور دراز کے جنگلوں سے ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگ جیسی قیمتی اشیا اکثر ملجاتی تھیں۔ بہت لوگوں نے اپنی زندگی کو خطروں میں ڈال کر فائدے حاصل کئے۔

جب امام الدین اور اس کے ساتھی سفر میں جانے کا فیصلہ کر چکے تو اُن کے پاس جو سامان تھا اُنھوں نے فروخت کر ڈالا۔ اور اُس روپیہ سے جنگل کے سفر کی تیاری شروع کی۔ ضروری سامان خریدا گیا۔

امام الدین کو شکار کا شوق تھا۔ ٹوپی دار ایک نالی بندوق اُس کے پاس موجود تھی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح کارتوسی ایک نالی بندوق بھی خرید لی۔ ان کی پارٹی میں ایک سکھ نوجوان لابھ سنگھ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ وہ ہسپتال میں کمپونڈر رہ چکا تھا۔ بندوق وہ بھی چلا لیتا تھا۔ کچھ دوائیں بھی ساتھ لے لیں۔ ہلکے بستر لے لئے۔ کھانے کا سامان جس قدر وہ لیجا سکے ساتھ لیا۔ نیروبی سے کوروبنگ (دیو گنڈا کی طرف) ریل میں سفر کیا گیا۔

وہاں سے اُنھوں نے دوسرے دن شمال مغرب کی طرف رخ کیا اور کوہ الگن کی جانب پیدل روانہ ہو گئے۔ امام الدین اور اُس کے بیٹے کے علاوہ اس پارٹی میں تین مسلمان اور تھے۔ ایک ہندو۔ اور تین سکھ تھے۔

یہ سب نو آدمی تھے آپس میں ان کا یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جو کچھ جنگلوں میں سے ملے گا۔ اُس کی قیمت وصول ہونے پر سب میں برابر کا حصہ تقسیم کیا جائے گا۔

دن کو وہ پیدل سفر کرتے اور رات کسی محفوظ جگہ یا درختوں پر گذارتے پہاڑ، دریا، ندی، نالے اور دشوار گذار راستوں کو طے کرتے ہوئے یہ سب چلے جا رہے تھے۔ خوراک کے لئے ہرن یا دیگر جانوروں کا شکار آسانی سے کر لیتے۔ ایک ہفتہ سفر کے بعد شام کے وقت یہ ایک بستی کے قریب پہنچے یہ بستی عیسائی جنگلیوں کی آبادی تھی۔ یہ جنگلی اس پارٹی کے ساتھ دوستانہ پیش آئے۔ اِس پارٹی نے بستی کے باہر ایک جگہ درختوں کے نیچے ڈیرہ ڈال دیا۔ ہرن کا شکار کیا گیا۔ جنگلیوں کا مجمع دیر تک اُن کے گرد جمع رہا یہ نئے لوگ اُن کے لئے تماشا تھے۔ ان کی شکلیں، اِنکا لباس اور ان کی پگڑیوں کو وہ حیرت سے دیکھتے تھے اِن کے لئے یہ ایک عجیب منظر تھا۔

کئی روز متواتر پیدل سفر کی وجہ سے یہ سب بہت تھک گئے تھے۔ دو روز اُن کا قیام وہاں رہا۔ دوسرے دن بعد دوپہر اُنھوں نے لنگوٹ باندھ کر ورزش اور کُشتی کے اکھاڑے جما دیئے۔ جنگلی عورتوں، مردوں اور بچوں کا ہجوم وہاں جمع تھا، اُنکی کشتی کو دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوتے رہے۔ آخر میں اُن جنگلیوں نے بھی اپنے کرتب دکھائے۔ جو بالکل جناشک کے سے تھے۔ تیسرے روز صبح ہی یہ پارٹی وہاں سے اپنی منزل پر روانہ ہو گئی۔ یہاں ہاتھی دانت وغیرہ میسر نہ ہوئے۔ ہاتھی اور گینڈوں کے جنگل یہاں سے دُور تھے۔ البتہ شیر ببر، چیتے، ہرن وغیرہ اِن جنگلوں میں بکثرت تھے۔

یہ سفر کرتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ دو ہفتہ کے بعد الگن پہاڑ کے دشوار گذار راستوں اور گھاٹیوں سے گذرتے ہوئے جھیل کیوگا کے شمالی حصوں کے قریب کے گھنے جنگلوں میں پہنچ گئے۔ اب اُن کے لئے ہر طرح مصیبت کا سامنا تھا۔ اُن کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اس قدر لمبا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔ ان کے سامنے قدم قدم پر خطرے تھے۔ جنگل میں درندوں کی کثرت تھی اور وحشی لوگوں کا خوف تھا۔ بڑی مشکل ان کے لئے یہ بھی کہ ایسے پُر خطر جنگلوں میں اُن کے ہمراہ کوئی رہبر نہیں تھا جو ان پیچیدہ جنگلوں سے واقف ہوتا۔ مقامی لوگوں کی امداد اُن کو حاصل نہ تھی۔ پھاڑ کھانے والے جانوروں کے شکار کا اُن کو تجربہ نہ تھا۔ اس لئے جنگل میں اُن کی زندگی محفوظ نہیں تھی۔ نیزے اُن سب کے پاس تھے دو ہلکی بندوقیں بھی ساتھ تھیں۔ مگر ان خوفناک درندوں کے لئے یہ ہتھیار کافی نہ تھے۔ اِس لئے خطرے کے وقت یہ لوگ بجائے مقابلہ کے درختوں کی طرف دوڑتے تھے اکثر ایسا ہوا کہ درندوں کے حملوں سے یہ بال بال بچے۔ تین چار خطرناک حادثات ان کے ساتھ پیش آئے مگر یہ خوش قسمتی سے سلامت بچتے رہے۔

اِس گھنے جنگل میں پہونچ کر یہ بھٹک گئے۔ راستے اُن کے سامنے سے گُم ہو گئے۔ صحیح راستہ اُن کو نہیں ملتا تھا۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہفتوں گذر گئے۔ یہ کہیں سے کہیں جنگلوں میں پہنچ گئے۔ اب اُن کو واپسی کا راستہ بھی نہیں ملتا تھا۔ اِسی طرح بھٹکتے پھرتے کچھ مدت کے بعد یہ جھیل البرٹ کے شمال کے ایک وسیع جنگل سے گذرتے ہوئے شمالی بلجین کانگو کے گھنے جنگل میں داخل ہوئے یہ سائیں سائیں کرنے والے وحشتناک جنگل سینکڑوں میل تک چلے گئے ہیں۔ اور آخر صحرائے اعظم سے مل گئے ہیں۔ ان جنگلوں میں ہاتھیوں اور گینڈوں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ کئی بار اُن کے حملوں سے بچے۔ درختوں پر چڑھ کر جان بچائی۔ اِس جنگل میں ان کے کھانے کا کوئی سامان نہیں تھا کئی کئی روز کے فاقے گذرنے لگے۔ خوف کے مارے درختوں پر چھپے رہتے۔ کوئی ایسی جگہ ان کو نہیں ملتی تھی جہاں یہ شکار کرتے یا اطمینان سے بیٹھ کر کھانا پکاتے

عجیب مصیبت میں گرفتار تھے۔ مردہ ہاتھیوں کے دانت اور گینڈوں کے سینگ بے شمار جنگلوں میں پڑے ہوئے اُن کو ملے مگر ان وزنی چیزوں کو یہ اپنے ساتھ کب تک لئے لئے پھرتے۔ مجبوراً سب جنگل میں چھوڑ دیئے گئے اب اُن کے سامنے خوف اور زندگی کا سوال تھا۔ اب ان کی ساری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح جنگلوں سے زندہ سلامت نکل جائیں۔ واپسی کے راستے تلاش کرتے پھرتے مگر وہ نہ ملتے۔ دن بھر اسی کوشش میں گذارتے لیکن کامیابی نہ ہوتی۔ وہ سخت پریشان اور زندگی سے بیزار ہو گئے۔

ایک روز یہ جنگل سے باہر کسی قدر کھلی جگہ میں پہنچے۔ بھوک سے سب نڈھال تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ ایک ندی کے قریب پہنچ کر ڈیرا ڈال دیا۔ خوراک کے لئے کوئی بڑا جانور ہرن وغیرہ سامنے نہیں تھا۔ چند پرندوں کا شکار کیا گیا۔ لکڑیاں جمع کیں۔ آگ جلا کر شکار کا گوشت بھون کر اُسے کھایا۔ بہت دنوں کے بعد آج ان کو کچھ کھانا نصیب ہوا لیکن کھانا کھا کر پھر اپنی مصیبت اور قسمت کی گردش پر آہیں بھرنے لگے۔

شام کے پانچ بجے کے قریب، پاس ہی کے جنگل میں ان کو وحشی لوگوں کے چیخنے اور شور و ہنگامہ کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آج ان کو اس جنگل میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُنھوں نے وحشیوں کی خوفناک آوازیں سنیں سنتے ہی ان کے دلوں پر ہیبت چھا گئی۔ یہ خوفزدہ ہو کر اُس طرف دیکھنے لگے چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ایک زخمی گورخر (جنگلی گھوڑا) اُن کے قریب سے بھاگتا ہوا نکلا۔ پانچ منٹ نہیں گذرے تھے کہ چار دیوہیکل جنگلی انسان اپنے نیزے تانے اِن کے سروں پر پہنچ گئے۔ امام الدین اور لابھ سنگھ کے پاس بندوقیں تھیں۔ باقی سب کے پاس نیزے تھے۔ تعداد میں یہ جنگلیوں سے دوگنے تھے۔ مگر اُن کی ڈراؤنی شکلیں دیکھتے ہی یہ بدحواس ہو گئے۔ سب لوگ مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے تو ہو گئے، فائر بھی ہوئے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ جنگلی زخمی ہوئے یا نہیں۔ مگر اُن کے نیزوں سے یہ سب زخمی ہو گئے۔ اِدھر اُدھر جان بچانے کے لئے بھاگے۔ زخمی تو تھے ہی اس لئے دور نہ جا سکے۔ قریب جا کر چھپ گئے وہ خونخوار جنگلی ان میں کے دو آدمیوں کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لے بھاگے

جب ان کے حواس ذرا درست ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ پارٹی کے دو آدمی غائب ہیں۔ یعنی لابھ سنگھ اور امام الدین کا ایک رشتہ دار۔ اب ان کی حالت بہت خراب تھی۔ یہ خوف سے تھرا رہے تھے۔ ان کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ بہت روئے چلائے مگر کیا کر سکتے تھے گم ہو جانے والوں کی تلاش اِن کے بس کی بات نہ تھی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ سب زخموں کی وجہ سے نڈھال تھے۔ اب یہ سات آدمی باقی رہ گئے تھے۔ رات بسر کرنے کے لئے یہ فوراً تمام درختوں پر چڑھ گئے۔ کچھ حصہ رات گذرتے ہی جنگل میں شیروں اور درندوں کا شور ہر طرف شروع ہو گیا۔ رات بھر یہ مصیبت کے مارے درختوں پر بیٹھے جاگتے رہے صبح ہوئی نیچے اُترے، ندی کے کنارے بیٹھ کر زخموں کو صاف کیا اور پھر کپڑے سے اُنہیں باندھ لیا۔ ان میں ایک شخص رام چند درزی زیادہ زخمی تھا۔ اُس کی کمر میں گہرا زخم تھا۔ باقی لوگوں کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ خاصکر امام الدین خفیف زخمی تھا۔ اب یہ حیران تھے کہ کیا کریں۔ کدھر جائیں۔ ان کو اپنے دونوں دوستوں کے غائب ہو جانے کا بہت صدمہ تھا۔ یہ چاہتے تھے کہ ان کو کسی طرح جنگلیوں کی قید سے رہائی دلائیں۔ آخر یہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور جنگلیوں کے پاؤں کے نشان لیتے ہوئے روانہ ہوئے۔ اُن کو یہ اُمید تھی کہ شاید ان کے ساتھیوں کا کہیں پتہ نشان مل سکے۔ اور اُن کو واپس لانے کی کوئی تدبیر کارگر ہو سکے۔ چنانچہ یہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اور زیادہ زخمی آدمی کو سہارا دیتے بڑھتے جا رہے تھے

لیکن یہ ان کو خبر نہ تھی کہ رات جو دو آدمی غائب ہو گئے تھے، مردم خوروں نے اُن کو رات ہی ختم کر دیا تھا۔ انسان کا گوشت اُن کے لئے بڑی نعمت ہے۔ زخمی گورخر کے بھاگ جانے کی اُنھوں نے ذرا بھی پروا نہ کی جبکہ اُن کو کھانے کے لئے دو انسان مل گئے۔ جانوروں کا شکار تو اُن کو ہر روز میسر ہے گر انسان اُن کو کبھی اتفاق سے ملتے ہیں۔ جب کبھی اُن کو انسان جیسی نعمت مل جاتی ہے تو اُن کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ خوشی میں ناچتے کودتے اور جشن مناتے ہیں۔ دو آدمی تو وہ رات کھا چکے تھے۔ باقیوں کے لئے بھی اُن کو پورا اطمینان تھا کہ صبح ہوتے ہی پکڑ لائیں گے۔ چنانچہ اُن کی تلاش میں صبح ہی پندرہ بیس جنگلی اپنے ہتھیار لے کر روانہ ہو گئے۔ پہلے یہ سب اُس مقام پر پہونچے، جہاں گذشتہ شام دو آدمی گرفتار کئے گئے تھے۔

وہاں اُن کو نہ پا کر اُن کے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے اُن کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ یہ مصیبت زدہ آگے جا رہے تھے اور اُن کے تعاقب میں اُن کے شکاری ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ درمیان میں تقریباً تین میل کا فاصلہ تھا۔ ان غریبوں کا بچاؤ اب ناممکن تھا۔ اُن بے بسوں کے سامنے پہاڑی کی بلندی آ گئی۔ وہ اپنے زخمی کو سہارا دیتے ہوئے بلندی پر آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ اوپر میدان میں پہونچ کر دیکھا کہ نیچے اُترنے کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور کوئی دوسرا راستہ سامنے نہیں ہے۔ دو میدان میں جنگلیوں کی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دھوپ تیز ہو چکی تھی تھوڑا آرام لینے کے لئے یہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے لگے اپنی بیکسی و بے بسی کا احساس کر کے رونے لگے۔ اب ان کی حالت نہایت قابل رحم تھی۔ تھوڑی دیر اسی حال میں ان کو یہاں گذری۔ آخر یہ پھر اُٹھے اور دوسری طرف راستہ کی تلاش شروع کی تاکہ جلد جنگلیوں کی بستی سے دُور نکل جائیں۔

چند ہی قدم چلے ہونگے کہ یکایک جنگل میں شور ہنگامہ سنائی دیا۔ سنتے ہی ان کے حواس جاتے رہے۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ ایک سکتے کا عالم اِن پر طاری ہو گیا۔ وحشی ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ یہ خوف سے بھاگے۔ رام چند زیادہ زخمی تھا وہ نہ بھاگ سکا۔ وہیں بیٹھ گیا۔ اِن درندوں سے بھاگ کر یہ کہاں جا سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب گرفتار ہو گئے۔ روتے تھے اور چلاتے تھے۔ امام الدین ان وحشیوں کو دیکھتے ہی تیس فیٹ کی بلندی سے نیچے ندی میں کود گیا۔ بہاؤ کی طرف تیرتا ہوا دور نکل گیا۔ ایک جنگلی اِس کو پکڑنے کے لئے کودا۔ آدھ میل کے فاصلہ پر امام الدین خشکی پر کھڑا ہو گیا۔ جنگلی تیزی سے ندی میں تیرتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اور اپنا نیزہ تان کر اس کی طرف پھینکا۔ امام الدین نے بندوق ہاتھ سے نہیں چھوڑی تھی۔ اِس نے بندوق میں گولی کا کارتوس لگا کر جنگلی کے دماغ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی لگتے ہی جنگلی پانی میں اُلٹ گیا اور ندی میں بہتا ہوا چلا گیا۔ امام الدین کی جان بچ گئی۔ یہ ایک قریب کے اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ دن بھر چھپا بیٹھا رہا۔ بھوک میں درخت کے پتے کھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دیکھا کہ دو جنگلیوں کا ٹولہ

اس کے ساتھیوں کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہا ہے اس کا جوان بیٹا سردار محمد بھی اُن میں تھا دن بھر درخت پر بیٹھا اپنی مصیبت پر روتا رہا۔ جب رات ہوئی اور اندھیرا چھا گیا تو یہ درخت سے اترا اور چھپتا چھپاتا جنگلیوں کی بستی کی طرف روانہ ہوا۔ دُور سے جھونپڑیوں کے درمیان آگ کا ڈھیر جلتا ہوا اس کو دکھائی دیا جب یہ قریب پہنچا تو وہاں کا قیامت خیز نظارہ دیکھ اس کی روح فنا ہو گئی۔ یہ چلا چلا کر رونے لگا۔ دور سے اِس نے دیکھا کہ گھاس پھونس کی بہت سی جھونپڑیوں کے درمیان میدان میں لکڑیوں کا ڈھیر جل رہا ہے۔ اور جنگلی مرد عورت بچے سب بھوتوں کی طرح آگ کے گرد ناچ کود رہے ہیں۔ قریب کے درختوں میں پانچ اِس کے ساتھی اور ایک اِس کا لخت جگر بیٹا ان ہی کی پگڑیوں سے بندھے ہوئے لٹک رہے ہیں۔ آہ! یہ نظارہ کس قدر لرزہ خیز تھا!! اِن بیکسوں کے لئے یہ مصیبت کی گھڑی تھی۔ ہزاروں اُمیدیں لے کر یہ اپنے گھروں سے پردیس میں نکلے تھے۔ وہاں اِن کے والدین، بیوی بچے ان کے انتظار میں ہونگے مگر یہاں یہ اب صرف چند لمحوں کے مہمان تھے۔ اِن کی موت قریب تھی یہ ان درندوں کے جنگل میں پھنس چکے تھے۔ اب ان کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ اِن کی مصیبت پر اِس وقت آسمان بھی آنسو بہا رہا تھا۔ کچھ کچھ بوندیں پڑ رہی تھیں۔

امام الدین خوف سے لرز رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب آگ کا ڈھیر خوب روشن ہو گیا تو ایک جھونپڑی کے اندر سے ایک بدصورت ڈائن (بوڑھی عورت) نمودار ہوئی۔ سب لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ زور زور سے چلائی۔ اور کچھ بولتی رہی۔ فوراً بعد بہت سے جنگلی اپنے شکار کی طرف لپکے۔ اور سب کو درختوں سے کھول کر اُس ڈائن کے سامنے لا کر زمین پر ڈال دیا۔ قیدیوں نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ اُن کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ جنگلیوں نے ایک آدمی کو اُن میں سے اُٹھایا۔ اُس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اور اُس کو آگ پر بھوننا شروع کر دیا اور باقی سب جنگلی آگ کے گرد خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔

اُف! کیا دلخراش نظارہ تھا۔ امام الدین اِس کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا چلاتا ہوا وہاں سے بھاگا۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اِن چھ بدنصیبوں کا حشر یکے بعد دیگرے یہی ہوا۔ مردم خور سب کو بھون کر کھا گئے امام الدین چھ ماہ تک ان جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا رہا۔ زندگی باقی تھی۔ وہ ہزاروں مصیبتوں کا مقابلہ کرتا ہوا آخر سمندر کے کنارے ایک بستی مالینڈی میں پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے جو ممباسہ سے شمال پر واقع ہے وہاں سے وہ کسی کی مدد سے ممباسہ اور وہاں سے زنجبار پہنچا۔

جب میں اپنے جنگلات کے کامیاب سفر سے واپس نیروبی پہنچا، اور وہاں سے ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگ اپنے ساتھ لے کر اگست ۱۹۳۸ء میں ممباسہ ہوتا ہوا زنجبار آیا تو اُس وقت امام الدین کو وہاں پہنچے ہوئے ایک ماہ گذر چکا تھا۔ اور وہاں بیکار اور تنگ حال تھا۔ وہ ایک روز وہاں مجھ سے ملا۔ اور مذکورہ بالا دردناک واقعات روکر اُس نے مجھے سنائے

جنون و حکمت

از جناب تاباں نقوی امروہوی

یہ صہبائے محبت بھی بلا کی تیز ہے ساقی
کہ ہر جُرعہ سمندِ شوق کو مہمیز ہے ساقی

زمانہ کیوں مجھے آئینِ مذہب سے ڈراتا ہے
مرے ساغر میں حسنِ گُل تجلی ریز ہے ساقی

مجھے دھوکہ نہ دے کونین کی رنگینیاں دے کر
کہ دردِ جامِ اُلفت دولتِ پرویز ہے ساقی

مرے اشکوں میں پنہاں ہیں معانی لفظ ہستی کے
مری آہوں کی رو عقل و خرد سے تیز ہے ساقی

مرے رونے کو تو کمزوریِ فطرت سمجھتا ہے
یہ عنوانِ فسانہ ہی الم انگیز ہے ساقی

دلِ پُرسوز کی منزل فرشتوں سے بھی ہے بالا
نہو گر سوز انساں میں تو وہ چنگیز ہے ساقی

مجھے دھوکہ نہ دے اس بیخودی میں عشرتِ نو کا
کہ ساغر کا تصور ہی نشاط انگیز ہے ساقی

یہاں آغاز کر دار و رسن سے قصۂ ہستی
کہ اس محفل میں پھیکی دانشِ تبریز ہے ساقی

تمدن کا تقاضہ عقل کافی ہے زمانہ کو
جنوں کا فیصلہ خود عقل ابھی نوخیز ہے ساقی

سیاست چاہتی ہے اسطرف ہستی پہ چھا جانا
جنوں کے ضبط کا ساغر اُدھر لبریز ہے ساقی

زمانہ میں کبھی اک فرد ہی چنگیز ہوتا تھا
مگر اس دور کا ہر حکمراں چنگیز ہے ساقی

کہیں دامن کشاں مذہب ہے احساسِ محبت سے
کہیں خارِ معیشت پیر میں آویز ہے ساقی

بہت امکاں ہے اس شیشہ کے گر کر ٹوٹ جانیکا
تصنّع سے یہ پیمانہ ترا لبریز ہے ساقی

لٹا دے ابر کی صورت سے کُل سرمایۂ مینا
تمدن کو ابھی تک عشق سے پرہیز ہے ساقی

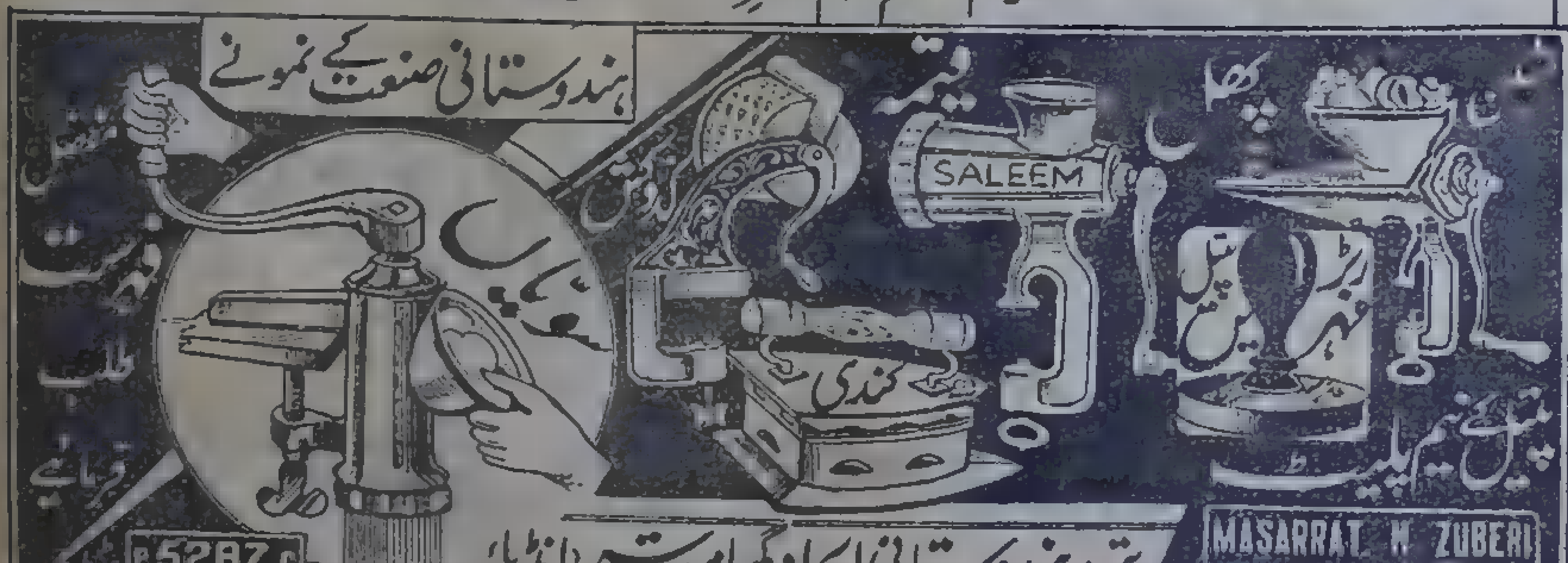
یہ ممکن ہے کبھی یہ خرمنِ ہستی سلگ اُٹھے
کوئی دن اور اگر ساغر شرر ریز ہے ساقی

انہیں محفوظ رکھ چن چن کے رکھ گنجِ معانی ہیں
مری چشمِ تماشا آج گوہر ریز ہے ساقی

زمانہ کچھ کہے تکمیلِ غم لیکن یقینی ہے
مے کہنہ سے جامِ نو ابھی لبریز ہے ساقی

فسانہ اہلِ دل کیواسطے ہے تلخ اتنا ہی
اس افسانہ کا عنواں جتنا دلآویز ہے ساقی

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد



اقبال اور اس کا پیام

(از جی، آر، قیس شیخپوری)

شیخ محمد اقبال شمالی پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سیالکوٹ میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ ایک مختصر سی بستی ہے، جو ہندوستان کی وسعت میں ایک نقطہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن فطرت کا کھیل بھی عجیب ہے، کہ اس چھوٹے سے شہر سے ایک ایسی عظیم الشان ہستی اٹھی۔ جس کے آوازۂ شہرت اور غلغلۂ نمود کی ہنگامہ کوشیوں کے لئے ہندوستان کیا دنیا کی فضا تنگ ہو گئی۔

اقبال کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا، جو اپنی مذہبیت کے لئے بہت مشہور تھا۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ کشمیر کے برہمنوں سے ملتا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف اس پر ناز کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

خاندانی تقدس و مذہب پرستی کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ ابتدا سے آپ نے جس فضا اور ماحول میں آنکھ کھولی ہر طرف مذہبی چرچا دیکھا، چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ آخر دم تک آپ ایک صوفی صافی منش اور برگزیدہ مسلم کی طرح اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا رہے۔ اور اپنی شاعری سے سب سے زیادہ اسلام کے اصولوں کی اشاعت کرتے رہے۔

شیخ محمد اقبال نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی کے ایک بزرگ میر سید حسن کے مکتب میں حاصل کی۔ سید صاحب نہایت بیدار مغز، بزرگ تھے۔ آپ کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس بچہ کے دل و دماغ میں وہ طوفان پرورش پا رہا ہے، جو ایک دن ساری دنیا کو تہ و بالا کر دے گا۔ چنانچہ آپ کی توجہ اور بچوں سے زیادہ اقبال کی طرف مبذول رہتی۔ آپ اُس جوہر قابل کو جسے فطرت نے آپ کی گود میں ڈالا تھا، پوری تن دہی کے ساتھ جلا دینے لگے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال نے اُس زمانہ میں کچھ اشعار کہے تھے جنہیں مولوی صاحب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اُس دن سے برابر اُن کی ہمت افزائی کرتے رہے۔

اقبال اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لاہور کے کالج میں داخل ہو گئے دماغ علم کی روشنی سے منور ہوتا گیا آنکھوں میں نور بصیرت پیدا ہوتا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں سب سے پہلی جو نظم آپ نے لاہور کے ایک مشاعرہ میں پڑھی وہ "ہمالہ" کے عنوان سے تھی۔ اس سے قبل لاہور کا ادبی طبقہ اقبال کی شاعری اور فطرت سے قطعی ناواقف تھا۔ یہ نظم ندرت خیال اور اسلوب بیان کے لحاظ سے کچھ ایسی نئی سی چیز تھی کہ حاضرین جلسہ اُسے سُن کر پھڑک اُٹھے

اُن لوگوں کے کانوں نے پہلی مرتبہ ایک ایسی نظم سنی جو وطنیت کے جذبات سے مملو اور الفاظ کی شان و شوکت سے مرصع تھی۔ اب تک ہندوستان کے شعرا کا سرمایہ جو کچھ تھا وہ گل و بلبل، شمع و پروانہ، حسن و عشق، اور لیلیٰ مجنون تک محدود تھا۔ زلف دراز کی پیچ در پیچ راہوں، اور کاکل شکیں کے خم اندر خم حلقوں سے یہ قافلہ ابھی نہیں نکلا تھا۔ حالانکہ موجودہ دور انقلاب میں عشقیہ غزلوں کی ضرورت نہیں تھی، جو اندر اتن کے پہل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جنہیں پڑھ پڑھ کے بچوں کے اخلاق خراب ہو گئے، جوانوں کی زندگیاں تباہ ہو گئیں اور اُمرا کی خوابگاہیں اُجڑ گئیں۔ زمانہ بدل گیا، حکومتیں بدل گئیں۔ انسان اور اُن کے مذاق بدل گئے۔ دنیا نے اس قدر ترقی کی کہ شمع پر پروانے بھی کم آنے لگے۔ اقبال نے سب سے پہلے اس قومی ضرورت کا احساس کیا۔

اس میں شک نہیں، اکبر الہ آبادی اور حالی جیسے نامور شعرا اُس زمانہ میں موجود تھے۔ جنہوں نے اقبال سے قبل ہی قوم کو اُس کے عروج و زوال کی کہانی سُنانی شروع کر دی تھی۔ اقبال کا تخیل اُن شاعروں کی آواز سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ مگر اقبال کی راہ بالکل الگ تھی۔ حالی نے اُردو ادب میں جس صنف کی داغ بیل ڈالی تھی، اقبال نے مغربی ادب کے امتزاج سے اُسے چمکایا۔ وہ جس منزل کی طرف جا رہے تھے وہ مسلمانانِ ہند کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس راہ میں "عزم و یقین" کی شمع روشن تھی۔ یہاں ساحل کی سبکسارانہ زندگی نہ تھی۔ بلکہ دریائے متلاطم میں کودنے اور موجوں سے لڑنے کا پیغام دیا جا رہا تھا۔

غرض اقبال نے "ہمالہ" پر نظم لکھنے کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا

شیخ عبد القادر بار ایٹ لا اُس زمانہ میں "مخزن" نامی ایک بلند پایہ رسالہ نکالتے تھے۔ اقبال کی نظمیں خاص طور سے اُسمیں شائع ہونے لگیں اور اس طرح اقبال دھیرے دھیرے بلندیوں کی طرف چڑھنے لگے

اقبال کی نظموں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو یورپ کی سیاحت سے قبل اُنھوں نے قلم بند کی تھیں۔ دوسری وہ جو یورپ سے واپس آنے پر لکھی گئیں۔

قبل سیاحت یورپ، جو نظمیں اُن کی زبانِ قلم سے نکلی تھیں وہ اگر بہ نظر غور دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر وطنیت کے جذبات سے پُر ہیں۔ یہاں وطنیت سے میری مراد وہی تقسیم ہے جو یورپ کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے ہندوستان کو جس حال میں دیکھا اُس کا تقاضا یہی تھا کہ "دستو بندیاں بندگی" کو ترک کر کے آہ و فغاں کی آواز بلند کی جائے۔ یہ آواز اتنی دردناک اور اتنی موثر تھی کہ تمام کان جو اس سے قبل "حدیثِ مطرب و مے" کی طرف متوجہ تھے، دفعۃً اِس طرف مائل ہو گئے۔ اقبال نے فصلِ بہار کا مرثیہ شروع کیا، تاکہ نرگس کی آنکھیں اِسے سُن کر گریاں ہو جائیں۔

اُس زمانہ کی مشہور نظم "نیا شوالہ" ہے۔ یہ نظم جذبۂ وطن پرستی سے اس قدر پُر ہے کہ اس کا ایک ایک شعر تیر و نشتر بن کر دل میں اُترتا ہے شاعر اور وطن کی محبت کے جذبے سے اِس قدر متاثر ہوا کہ وہ کہہ اٹھا:

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

دوسری نظم جو اس سلسلہ کی ایک نہایت اچھی کڑی ہے وہ "تصویرِ درد" ہے یہ نظم اول سے آخر تک درد وطن کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس نظم میں بھی قومیت و وطنیت کی وہی تڑپ موجود ہے جس کا تقاضا ہے کہ ہندوستان کی گردن سے غلامی کا جوا اتارنے کے لئے مسلمان متحد ہو کر آگے بڑھیں۔ اقبال کی دعوت، آزادی وطن کی دعوت تھی "تصویرِ درد" میں لکھتے ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

اُس کے بعد اقبال مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے۔ اقبال نے یورپ جا کر جرمن اور انگریز شعراء سے کافی طور پر استفادہ کیا۔ اقبال اپنی علمی استعداد کے اعتبار سے انگریز شاعر گولڈ اسمتھ اور ندرت فکر کے اعتبار سے گوئٹے کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ یورپ کی دنیا اقبال کی نگاہوں کے لئے ایک عجیب دنیا تھی۔ ہر ذرہ تہذیب حاضر کی تجلی سے آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ سائنس کی ایجادات کی کرشمہ سازیوں نے انسانی تخیل کی حدیں توڑ دی تھیں۔ سب سے زیادہ جس چیز کو اقبال نے حیرت سے دیکھا وہ اُس کا موجودہ جذبۂ وطن پرستی، اور قوم پرستی تھا۔ یورپ کی نیشلزم نے ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کی آبادی میں سینکڑوں آہنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ ایک ایک حلقہ جغرافیائی تقسیم کی بنا پر الگ الگ بن گیا تھا جو قوم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو صرف جغرافیائی حد بندی کی بنا پر اپنا دشمن اور حریف سمجھتی تھی۔ یہ جذبہ جس قدر قوی اور شدید ہوتا جا رہا تھا اُسی قدر انسانیت لرز رہی تھی۔ تباہی اور بربادی سر پر کھیل رہی تھی۔ اِس جذبہ کا نتیجہ ہم نے جنگ عظیم کی شکل میں دیکھا۔ چونکہ اقبال کے تخیل کی پرورش مذہبی فضا میں ہوئی تھی، اور وہ بہت حد تک مذہبی آدمی تھے اس لئے اُن کے واسطے یہ ناقابل برداشت تھا کہ ایک ہی مسیح کے ماننے والے ایک دوسرے کو بھیڑ بکری کی طرح صرف اِس لئے ذبح کرنے کو تیار بیٹھے ہیں کہ ایک بدقسمتی سے جس حصہ میں آباد ہے اُس کا نام مورخ نے فرانس رکھ دیا ہے اور دوسرا جس گوشہ زمین پر سانس لے رہا ہے اُسے کتابوں میں جرمنی لکھا جاتا ہے۔

اقبال کے ذہن پر ان تاثرات نے بہت گہرے نقوش قایم کر دیئے جو ساری زندگی نہ مٹ سکے۔ حقیقت میں اقبال کی شاعرانہ زندگی میں سب سے بڑا انقلاب یہی جذبہ تھا۔ وطنیت اور قومیت کا تخیل اقبال کی چشم تصور کے سامنے وہ منظر کھینچ دیتا تھا، جہاں بھائی بھائی ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ انسانی خون کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ آدم کی اولاد بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کو چیرتی پھاڑتی ہے۔ چنانچہ اقبال کا سب سے بڑا مشن وطنیت اور قومیت کے خلاف ایک زبردست جہاد کرنا تھا۔ اُنھوں نے اپنے تخیل کی وسعت اور ذہن رسا کی نیرنگیوں کو جس میں طرح طرح کی اداکاریاں تھیں، اِس ایک مقصد کے لئے وقف کر دیا۔ اور طرح طرح سے وطنیت اور قومیت کے خلاف آواز بلند کی۔ آپ نے ایسے پُر آشوب وقت میں اپنے جانفزا ترنم اور نغموں سے قوم کے خون کو گرمایا۔ آپ نے دیکھا کہ یورپ کی سیاست کا پیدا کیا ہوا یہ "فتنہ" دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک دن قیامت بن کر قبائے انسانی کو چاک چاک کر دے۔ ایشیا کے اندر اس کی تخم ریزی شروع ہو چکی ہے اور موجودہ سیاسی کشمکش اور اقتصادی تباہی اسکی آبپاشی کر رہی ہے۔ ہندوستان کے اندر ہندو اور مسلمان دونوں بستے ہیں۔ اور دونوں افلاس و غلامی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ مصائب اور ادبار مسلمانوں کے ذہن سے اخوت و برادری کے بلند ترین خیالات کو فنا کر دینا چاہتا ہے۔ اور اُن کے دلوں میں بھی وہی مہلک زہر دھیرے دھیرے سرایت کرتا جاتا ہے جسے یورپ کی وطنیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے اس خطرہ کو پورے طور سے محسوس کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ تم جسے منزل سمجھ کر آگے بڑھنا چاہتے ہو وہ حقیقت میں وادی ہلاکت ہے۔ جو تمہاری نگاہ کو دعوت آسودگی دے رہی ہے وہ درحقیقت جلوۂ سراب اور نمود غبار سے زیادہ نہیں ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام ہمیشہ ایک مرکزیت سے وابستہ ہے۔ اسلام نے دینی اور دنیوی دونوں پہلوؤں کو ایک مرکز سے باندھ دیا ہے۔ ہمارا دینی مرکز قبلہ ہے ———— یا اسے اقبال کی زبان میں "حجاز" کہئے جہاں سب سے پہلے اسلام کا چشمہ اُبلا جس سے دنیا کی تشنہ کامی دور ہوئی۔ دنیوی مرکزیت کا تعلق خلیفہ سے ہے۔ کرۂ ارضی کے بعید ترین گوشوں میں بسنے والے مسلمان بھی پانچ وقت روزانہ اسی مرکزیت کے تخیل کو تازہ کرتے ہیں مسلمان جہاں بھی، اور دنیا کے جس خطہ میں بھی آباد ہو اُسے چاہئے کہ ہمیشہ اپنا دامن اسی رشتہ سے باندھے رہے جو اسلام کا مرکز ہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے اگر اِس مرکزیت کو تباہ و برباد کر دیا، اور جغرافیائی حدود کو وطن بنا کر یورپ کی قومیت کے جذبات کی پرورش کرنے لگے تو پھر اُن کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس طرح وہ ضرور وہ ایک نہ ایک دن دنیا سے مٹ جائیں گے لیکن اس کے برخلاف اگر اُنھوں نے اپنا رُخ ہمیشہ ایک مرکز اور قبلہ کی طرف رکھا اور جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد رہ کر بلند اسلامی مقاصد کی تکمیل کرتے رہے تو پھر اُنہیں کوئی نہیں مٹا سکتا۔

اِس جذبہ کے متعلق اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ اتنا بے شمار ہے کہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد ہی یہ تھا فیل کا مشہور ترانہ اسی جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو دوسرے اور نمایاں عناصر جو ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کریں گے، وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) عقل و خرد کی گمراہی اور دل کی صحیح رہبری۔
(۲) خودی کی تعلیم
(۳) عزم و یقین کی جولانی۔

یورپ کی تعلیمات اور سیر و سیاحت کا دوسرا اثر جس نے اقبال کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا وہ یہ تھا کہ انسانیت کی نجات اور دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون، عقل و خرد کی کرشمہ سازیوں سے نہیں مل سکتا۔ یورپ کی عقلِ رسا نے فطرت کی طاقتوں کے اوپر سے پردے اٹھا دیئے ہیں، ہوا کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ اور اپنا تخت اس کے کاندھوں پر رکھ کر انسان فضا میں پرواز کرتا پھر رہا ہے، سمندر کی پہنائیوں کے اندر اٹھنے والی طوفان بدوش موجوں کو اپنے اقتدار میں کر لیا ہے۔ اور انسانی عزم اُس کے منہ میں لگام لگا کر اسکی پیٹھ پر سوار ہے۔ اور جہاں چاہتا ہے دوڑاتا پھرتا ہے سائنس کی ترقی نے انسانوں کی قوت اور تخیل کو آسمان سے زیادہ بلند کر دیا ہے۔ اور انسان دھیرے دھیرے زندگی کے بلند مینار کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ مگر اقبال اس پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور سوال کرتے ہیں کہ یہ سب ترقیاں کس لئے ہیں، انسان کس منزل کی طرف جا رہا ہے، انسان کے عروج و ارتقا کا اصل مقصد کیا ہے؟

اقبال کہتے ہیں کہ عقل و خرد کی بلند پروازیاں ہمیں صحیح منزل پر نہیں لے جا سکتیں۔ پھر انسان کی اصل منزل کیا ہے؟ انسان کی اصل منزل یہ ہے کہ وہ دنیا کا کھویا ہوا امن و سکون تلاش کرے۔ دنیا میں محبت و اخوت و انسانیت کے جذبات کو عام کرے۔ اور فتنہ و فساد اور قتل و غارتگری کو دور کر کے انسان کو ایک ایسا مرہم دے جس کے لئے وہ تڑپ رہی ہے۔ اب اقبال کا سوال ہے کہ کیا واقعی سائنس کی ترقیاں اور یورپ کی موجودہ تہذیب کی جادوگری آدم کی اولاد کو اُس کا سکون اور امن دے سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ عقل و خرد نے تباہی اور بربادی کے کتنے دروازے کھول دیئے ہیں۔ انسانی عقل کی کرشمہ سازی نے کیسی کیسی ہولناک گیس ایجاد کی ہے کیسے کیسے خوفناک آلاتِ حرب و قتال بنائے ہیں جن کی ایک گردش دنیا کو خاک و خون میں ملا سکتی ہے!! اِس عقل و خرد کے ناجائز استعمال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا ایک ہولناک تباہی کو دعوت دے رہی ہے جس سے آدم کی اولاد لرز رہی ہے۔ موجودہ تہذیب کے جاہ و جلال کا تختِ بلند انسانی خون کے سیلاب پر بچھایا گیا ہے۔ جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہیں فسانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے باک بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

چنانچہ اقبال نے بتایا کہ ہم ایک غلط راستہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ہماری منزل عقل و خرد کی شمع کی روشنی میں طے نہیں ہو سکتی۔ انسانیت کا دکھ کبھی بھی یہ نہ تھا کہ وہ ہوا میں پرواز کرنا نہیں جانتی۔ انسان دنیا میں اِس کے لئے کبھی بھی نہیں تڑپا کہ وہ فضا میں چمکنے والی بجلی کو اپنی شمعوں کی

پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے برخلاف انسان ہمیشہ ایک ناؤ دریم کھینچا اور ہمیشہ ایک ہی مرہم کے لئے تڑپا۔ وہ صرف امن وسکون چاہتا ہے۔ وہ محبت اور اخوت کی تلاش میں ہے۔ انسان اُس وقت بھی خوش تھا جب پہاڑ کے نیچے ایک سایہ دار درخت میں اپنی کٹیا بنا کر رہتا تھا۔ انسان اُس زمانہ میں بھی مسرت کی زندگی گذارتا تھا جبکہ وہ ستاروں کی گردش کا راز سمجھنے سے قاصر تھا۔ اصلی انسان کی منزل مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ صرف یہ دریافت کرے کہ آفتاب گردش کرتا ہے یا زمین۔

اِس نظریہ کو سامنے رکھ کر اقبال نے ہمیشہ یورپ کے اصحاب عقل و خرد کا تمسخر اُڑایا اور اُنھیں بتایا کہ تم غلط راستہ پر جا رہے ہو۔ یورپ کی موجودہ تہذیب کو آپ نے "کارگہِ شیشہ گراں" بتایا ہے عقل کی کرشمہ سازی نے تیار کیا ہے۔ اور جو ایک ٹھوکر میں پاش پاش ہو سکتا ہے۔

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
انداز جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

دل کا پیام کیا ہے ———————— ؟

دل کا پیام وہی پرانا پیام امن وسکون اور دعوت راحت ومحبت ہے، جسے ابراہیم نے سنایا، جسے گلیل کی گلیوں میں پھرنے والا زیتوں کی شاخ ہاتھ میں لے کر لوگوں کو بتا آرہا، جسے موسیٰ نے پتھر کی بارش میں انسانوں کو بتایا۔ انسانوں کی اصل منزل یہی ہے۔ پیام مشرق میں ایک پوری نظم اقبال نے مذکورہ بالا خیالات کے ماتحت لکھی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ　　　عقل تا بال کشود ست گرفتار تر است

اے بادِ صبا میرا یہ پیام یورپ کے عقلمندوں کو پہنچا دے کہ جب سے عقل نے پر پُرزے نکالے ہیں، وہ اور زیادہ گرفتار ہو گئی ہے۔

برق را ایں بجگر می زند آں رام کند　　　عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

عقل تو بجلی کا صرف مقابلہ کرتی ہے مگر عشق یعنی ایمان کی پختگی تو بجلی کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عقل کے مقابلہ میں عشق زیادہ طاقتور ہے۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری　　　عجب این ست کہ بیمار تو بیمار تر است

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تیرے پاس مُردوں کو جلانے کے لئے عیسیٰ کا معجزہ ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس کے باوجود تیرا بیمار روز بروز زیادہ بیمار ہوتا جاتا ہے؟

دانش اندوختۂ، دل ز کف انداختۂ

بات یہ ہے کہ تو نے عقل کو لے لیا اور دل (یعنی ایمان) کو ہاتھ سے دیدیا

آہ آں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ

آہ کہ تو نے سب سے زیادہ قیمتی چیز ہی کھو دی!!

حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست　　　سیلیٔ عشق ومحبت بہ دبستانش نیست

حکمت وفلسفہ کی باتیں تو شیطان کی آنت کی طرح بے پایاں ہیں عشق و محبت کا یہاں نام نہیں۔

بیشتر راہِ دل مردم بیدار زند　　　فتنۂ نیست کہ در چشم سخندانش نیست

یہ حکمت وفلسفہ جیتے جاگتے آدمیوں کو راستہ سے بھٹکا دیتا ہے کوئی فتنہ ایسا نہ ہوگا جو اس کی زنبیل میں نہ ہو۔

چارہ این ست کہ از عشق کشادے طلبیم

اس کا علاج یہی ہے کہ ہم عشق (ایمان) سے اپنا دل کشادہ کریں

پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

عشق ہی کے سامنے سجدہ کریں اور اُسی سے اپنی مراد مانگیں

عقل چوں پائے دریں راہِ خم اندر خم زد　　　شعلہ در آب دوانید و جہاں برہم زد

جب سے یہاں عقل کا پاؤں آیا۔ اُسنے پانی میں آگ لگائی اور ساری جہاں کو درہم برہم کیا

کیمیا سازیٔ او ریگ رواں را زر کرد　　　بر دلِ سوختہ اکسیر محبت کم زد

اس کی کیمیا سازی نے ریگستان کے ریت کو تو ضرور سونا بنا دیا لیکن جلے ہوئے دل کے لئے محبت کا کوئی اکسیر آج تک نہ بنایا۔

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم　　　رہزنے بود کمیں کردہ رہِ آدم زد

افسوس ہے ہمارے بھولے پن پر کہ اس فلسفۂ حکمت کے دھوکے میں آگئے جو ڈاکو کی طرح ہماری گھات میں بیٹھا اور ہمیں لوٹ لے گیا۔

ہنرش خاک بر آورد ز تہذیب فرنگ　　　باز آں خاک بچشم و بسرِ مریم زد

اس کے ہنر نے تہذیب یورپ سے خاک بنائی اور پھر اس خاک کو مریم (یعنی روحانیت) کے سر پر ڈالدی۔

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم
وقت آگیا کہ ہم ایک نیا دستور بنالیں
لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم
اپنے دل سے پرانے خیالات نکال کر ایک نئی چیز کی بنا ڈالیں

اِس بلند پایہ نظم میں علامہ اقبال نے دانایانِ فرنگ کو یہی پیام دیا ہے کہ تم عقل کی شمع ہاتھ میں لے کر انسانیت کی منزل پر پہونچنا چاہتے ہو لیکن تمہارا قدم گمراہی کی طرف جا رہا ہے۔ اور آخر کار تم خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا کاٹ دوگے

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

موجودہ ہلاکت وبربادی جس کی دعوت انسانیت کو دی جارہی ہے اس کا حل اقبال کے نزدیک صرف یہ ہے کہ انسان "دل" کے پیام کو سنے۔ اور "دل" کی روشنی میں اپنی منزل تلاش کرے۔ یہی ایک صورت نجات کی ہے دوسری کوئی اور راہ نہیں۔

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم　　　پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

انسان کا دل اچھی طرح جانتا ہے کہ سیدھی راہ کیا ہے۔ لیکن کج بحثی اسے فریب دے کر گمراہ کر دیتی ہے۔

اقبال نے دوسرا موضوع جس پر نہایت جوش وخروش سے لکھا وہ خودی ہے، خودی کی تعلیم وہ ساری زندگی مسلمانوں کو دیتے رہے۔ اور طرح طرح کے ولولہ انگیز انداز میں خودی کے پہلوؤں کو نمایاں کرتے رہے۔ خودی سے اُن کی مراد اپنی ہستی اور اپنے وجود کا احساس ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا ہے۔ اپنے اندر انسانی ارادہ، انسانی دل، اور انسانی زندگی کی ولولہ خیزیاں اور حوصلہ آگریزیاں پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی جس کو اِس امر کا احساس ہو جائے کہ ہم ایک لازوال طاقت ہیں، جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

آپ نے خودی پر دو مشہور کتابیں لکھی ہیں۔ ایک "اسرارِ خودی" دوسری "رموزِ بے خودی" دونوں کتابوں میں تعلیمات خودی کے دریا بہا دیئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان قوم ایک محکوم قوم ہے۔ اور محکوم قومیں سب سے پہلے خودی کی دولت سے محروم ہو جاتی ہیں۔

اُن کے دل ودماغ پر بے حسی اور خوف وہراس کی مہر لگ جاتی ہے۔ نہ تو وہ ارادہ رکھتے ہیں، اور نہ حوصلہ۔ وہ دماغ رکھتے ہیں لیکن سوچتے نہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن کچھ دیکھتے نہیں۔ ایک بلند عزائم رکھنے والا آزاد انسان اپنے ارادہ پر غلام انسانوں کی ایک بھیڑ کو چوپایوں کی طرح ہانکتا ہے۔ جس طرف چاہتا ہے اُنہیں لے جاتا ہے اور یہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتے

رہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے اندر خودی کا احساس ختم ہوگیا ہے جو پکار کر کہتا ہے۔

”اے آزاد انسان ہم بھی تیری طرح ایک انسان ہیں۔ ہمارے پہلو میں بھی ایک انسانی دل عزم و حوصلہ کے ساتھ دھڑک رہا ہے“۔ اقبال نے مریض کی نبض ٹٹولی اور اُس کے لئے صحیح نسخہ تلاش کرلیا۔ آپ فرماتے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اسی کے تحت میں اُن کی تیسری تعلیم آجاتی ہے۔ جسے وہ شاعرانہ الفاظ میں ”عزم و یقین“ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ جو دعوت عزیمت و بیداری اور پیام عروج و ارتقا دیا وہ یہی کہ تم سب سے پہلے اپنے اندر اس جوہر بلند کو پیدا کرو جسے عزم، حوصلہ، اور یقین کہتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ جب تک غلام قوموں کے اندر عزم و یقین نہ پیدا ہوجائے اُس وقت تک وہ غلامی کی بندشوں سے نہیں چھوٹ سکتی۔ یہ عزم و یقین ہی کی تلوار ہے جو جکڑ بندگی اور غلامی کی آہنی زنجیروں کو پاش پاش کردیتی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

آپ نے فرمایا کہ دنیا میں مسلمانوں کا عروج جس پر آج تک مورخ کو تعجب و حیرانی ہے اس کا راز یہی جذبہ ہے جسے عزم و یقین کہتے ہیں۔ اسی عزم و حوصلہ نے عرب کے مٹھی بھر انسانوں کے ارادوں میں ایسے شہپر لگادیئے تھے کہ ان کی پرواز کی بلندی پر ماہ و انجم رشک کرتے تھے۔ یہی عزم تھا جس نے مسلمانوں کو بحیرۂ عرب کے طوفانوں میں کُدا دیا۔ جس نے یورپ کے کلیساؤں پر پرچم اسلامی کو لہرایا۔ اور جس نے کوہ ہمالہ کی بلندیوں کو اُن کے قدموں کے سامنے سرنگوں کردیا۔ غلامی سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ ”شک و خوف“ کو انسان دور کردے اور عزم و یقین کی بھٹی اپنے دل میں سلگائے۔

گرما دو غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

میر صادق[1]

(از محمود خاں محمود (مصنف تاریخ سلطنت خداداد میسور، بنگلور)

ہندوستان کی تاریخ کے وہ مشہور ہیرو جن کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ان میں سے ایک ہیرو یعنی صادق کے متعلق ذیل میں شاعر نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں ——— ایڈیٹر

یہ زمینِ قبرِ صادق کس قدر ہے سوزناک شعلۂ آتش سے بڑھ کر گرم تر ہے اسکی خاک
مجھکو حیرت تھی کہ اس پر اسقدر کیوں ہے عتاب روحِ صادق سے ملا محمود یہ مجھ کو جواب

اس کا اندیشہ ہی کیا۔ گر قبر ہے آتش فشاں مجھ کو غداری نے بخشی ہے حیاتِ جاوداں
کارگاہِ دہر میں ابلیس کا مظہر ہوں میں جس نے دی تعلیمِ غداری، وہ پیغمبر ہوں میں
نور کی دنیا میں آخر نار بھی تو چاہیئے جس جگہ گل ہوں وہیں کچھ خار بھی تو چاہیئے
میر فخرالدیں[2]، معین الدین یا لنگڑا غلام (لنگڑا اعلام علی) میرے ہی اجزائے ترکیبی کے ہیں یہ چند نام
کابلی ملا ہے (ملا شور بازار) یا ہو وہ مکہ کا شریف (شریف حسین) کب ہے میدانِ سیاست میں کوئی میرا حریف
مجھکو قسمت نے دیا اُس سلطنت پر اقتدار جس پہ تھا اسلامیانِ ہند کا دار و مدار
میں نے اُس سلطانِ آزادی سے غداری جو کی ہل گئی بنیاد اس سے ملتِ اسلام کی
ناز تھا اسلامیوں کو جس پہ وہ جوہر گیا سرزمینِ ہند سے آئینِ پیغمبر گیا

میرے قبضہ میں سیاست کی ہے تیغِ بے نیام مجھکو لینا ہے ابھی اسلامیوں سے انتقام
جسکو کہتے ہیں قیامت! آنے والی تو نہیں اس سے بڑھ کر اور آفت! آنے والی تو نہیں
بھائی سے بھائی مسلمانوں میں بیگانہ ہوا ناز ہے ان کو کہ یہ اک کارِ مردانہ ہوا
مال و دولت پہ ہے منعم کو بہت فخر و غرور اور فقیروں کو نہیں کچھ بھی فقیری کا شعور
بھائی کی بھائی ترقی دیکھ سکتا ہے کہاں اس قدر رشک و حسد ہے الحفیظ والاماں!

گو بظاہر کر رہے ہیں مجھ سے نفرت خاص و عام
ہیں مگر باطن میں وہ میرے ہی آئیں کے غلام

ہاں! یہی اک خوف ہے میں ہوں اسی سے ناامید پھر کہیں بیدار ہوجائے نہ سلطانِ شہید
کارگاہِ دہر میں بگڑے گا میرا سب نظام زادۂ توحید کا پھر سخت ہوگا انتقام

شعلۂ نارِ جہنم سے کہاں ڈرتا ہوں میں
پھر نہ ہو بیدار وہ (سلطان ٹیپو شہید) اس خوف سے مرتا ہوں میں

---

[1] میر صادق۔ سلطنت خداداد کا مشہور غدار وزیر جس کا نام جنوبی ہند میں ضرب المثل بن گیا ہے۔
[2] میر فخرالدین۔ میر معین الدین اور لنگڑا غلام۔ یہ تمام سلطنت خداداد کے غدار اُمرا تھے۔

آزاد ذہنیت

(از جناب عبدالحفیظ دیوبندی)

دنیا میں غیر معمولی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنکے دماغ آثار قدیمہ یا پُرانی چیزوں کے عجائب خانہ کی مانند ہوتے ہیں، جن کے اندر عقل و دانش کے جواہر ریزوں میں بیشمار وہم پرستیوں، لغو و لایعنی روایتوں، اور فرسودہ عقیدوں کی عجیب و غریب آمیزش سی پائی جاتی ہے، جنہیں جدید خیالات کے قبول کرنے کی قطعی گنجایش نہیں ہوتی اور جن میں کثافت و غلاظت اور گرد و غبار کا اس قدر انبار جمع ہوتا ہے کہ آفتاب عقل کی ضو فشانی ان کو جلا دینے سے قطعاً معذور رہتی ہے۔

ایک وسیع الخیال آدمی تعلیم یافتہ طبقہ میں مشکل ہی سے نظر آئے گا وکیلوں، ڈاکٹروں، انجنیروں، اور پروفیسروں کی جماعتوں میں مشکل ہی سے کوئی ایسا ہوگا جس کو اخلاق، مذہب، فنون لطیفہ یا زندگی کے اہم ترین مسائل کے جدید نظریوں کے ساتھ دلچسپی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی نئے خیال کو ان لوگوں کے آستانہ دماغ تک پہونچانا ایک امر محال ہے۔ اُن کے دماغ کا نہانخانہ کسی بیرونی مداخلت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو صحیح معنی میں تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے اپنے مخصوص پیشہ میں خواہ کیسی ہی اعلیٰ قابلیت و مہارت رکھتے ہوں، لیکن وہ تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے کسی طرح مستحق نہیں۔

موجودہ تعلیم دماغ کو کھولنے والی نہیں بلکہ برعکس اس کے ہمارے ملک کے موجودہ طرز تعلیم کے اعتبار سے یہ تعلیم دماغ کو کُند کرنے والی ہے۔ بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے اُس کا آزاد اور وسعت پذیر دماغ بتدریج ایک تنگ و تاریک ردی خانہ میں تبدیل ہوتا جاتا ہے جس میں ایک ایسی ناکارہ تعلیم کا انبار جمع ہوتا رہتا ہے جسے اُس کے والدین پسند کرتے ہیں، اس کے استاد دیتے ہیں، اُس کی کتابیں بتلاتی ہیں یا اُس کے ممتحن چاہتے ہیں —— بس یہی اُسکی انتہا ہے۔ اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو اس قسم کی تعلیم محض سیاہی چوس کاغذ کی طرح علم کو چوس لینے کا ایک طریقہ ہے اور بس۔ اس میں غور و فکر کا شائبہ بھی شامل نہیں۔ اپنے اجزائے دماغی کو نشو و نما دینا، کسی آزادانہ رائے کو استعمال کرنا، اپنے دل سے کوئی نئی بات پیدا کرنا، ایسی چیزیں ہیں جو طالب علموں میں تو کیا ہو سکتی ہیں خود استادوں میں ناپید ہیں۔ ہمارے استاد ان چیزوں کو صرف دبانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ زہریلے جانور کی طرح ہمیں اُن سے ڈراتے ہیں۔ وہ طالب علم کے دماغ کو انہی آلائشوں سے بھر دینا چاہتے ہیں جن سے خود اُن کے دماغ لاعلاج طور پر بھر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم کے حامی صرف یہ بتلاتے ہیں کہ تعلیم سے . . . . . ذریعہ رزق کیسے پیدا کی جا سکتی ہے لیکن یہ تعلیم کا کس قدر ذلیل مقصد ہے!!

ان نوجوانوں کی اصلاح کے لئے جس کو اس قسم کی تعلیم نے ناکارہ کر دیا ہے سب سے پہلے دماغ کی جلائی کی ضرورت ہے وہ وہم پرستیوں اور احمقانہ ڈھکوسلوں کا جو میل کچیل اُن کے ذہن و دماغ میں بیٹھ چکا ہے اُسکو آفتاب عقل کی ضیا پاشی کے ذریعہ سے دور کرنا چاہتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیونکہ اس میں بہت سی چیزوں کی تردید کرنا پڑتی ہے۔ سالہا سال کی تسلیم شدہ باتوں کو چاہے وہ کتنی ہی احمقانہ کیوں نہ ہوں، ترک کرنے کے لئے بڑی فہم و ذکا کی ضرورت ہو

لیکن موجودہ تعلیم نے ہمارے اجزائے دماغی کی فطری طاقت کو پہلے ہی سے زائل کر رکھا ہے، ہماری قوت فکر کو نمایاں طور پر کمزور کر دیا ہے جب اس نااہلیت پر متوسط انسان کی فطری دماغی کاہلی کا اور اضافہ کر لیا جائے تب تو کہنا ہی کیا ہے۔ غور و فکر کے لئے وقت اور محنت درکار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کتنے آدمی ایسے ہیں جو با وجود موقعہ ملنے کے اس پر آمادہ ہو جائینگے

اس کے علاوہ انسان کی فکری زندگی اُس کے جذبات و احساسات کے ساتھ ایسی مخلوط و مربوط ہو جاتی ہے کہ امتداد زمانہ سے اس کے دماغ میں محبوب خیالات و نظریات اور عزیز اعتقادات و تعصبات کا ایک عجیب و غریب مواد جمع ہو جاتا ہے کیونکہ جوں جوں اسکی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے، رائج الوقت اعتقادات و خیالات اس کے جذبات و احساسات کے ساتھ اس طرح پیوست ہوتے جاتے ہیں اور پرواز تخیل اُن کو ایسے مستند مسلّمات کی صورت میں پیش کرتا جاتا ہے کہ پھر اس کے لئے اُن کے خلاف تصور کرنا بھی محال ہو جاتا ہے۔ کم و بیش اس قسم کے تاثرات ہم کو ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ و جماعت کے افراد میں نظر آتے ہیں۔ ایک صوفی منش، ایک انسانیت پرست، ایک اعتدال پسند، ایک دلدادۂ وطنیت ایک حامیٔ عریانیت، ایک گرویدۂ نباتات اور ایک فدائے ملوکیت —— سب اپنے اپنے رائج الوقت "ڈھکوسلوں" پر غیر متزلزل اعتقاد و یقین رکھتے ہیں۔

اور پھر انسان کم و بیش اپنے آبائی مذہب و ملت کا تو یہی رضا و رغبت کے ساتھ شکار رہتا ہے گویا عقل و فہم کی یورش سے بچنے کے لئے وہ ایک مضبوط قلعہ میں محفوظ ہے۔ نہ صرف جہلا پر بلکہ نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں پر بھی مذہبی روایات اپنا مستحکم اثر ڈالتی ہیں، لیکن طرفہ ماجرا یہ ہے کہ اُن کا اثر انسان کے اطوار و کردار پر اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا اُس کے تخیل و تفکر پر ہوتا ہے۔ باوجود عذاب دوزخ کے انسان قبیح و مبتذل زندگی بسر کرنے کی جراءت کر سکتا ہے لیکن مذہبی اصول کے مسلّمات اور ناقدانہ نظر ڈالنے کی جراءت نہیں کر سکتا۔ وہ مذہب کے تمام ناشعفانہ اور غیر معقول قواعد و ضوابط کی پابندی کے لئے تیار رہتا ہے کیونکہ "ذات باہر" کر دیئے جانے کا خوف فوری حقیقی اور یقینی ہے، لیکن نار جہنم، یا فرشتہ عذاب دور ہونے کی وجہ سے اُس کو خوفزدہ کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔

عوام الناس کی غیر معمولی اکثریت اپنی ملت و جماعت کے رسم و رواج کی کورانہ تقلید پر بغیر کسی غور و تامل کے آمادہ رہتی ہے اور ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مذہب اور فرقہ پرستی میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا کروڑہا کی تعداد میں اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے مجہول عصبیت اور غیر معقول جنون کو مذہب کا نام دے کر اپنا شعار زندگی بنا رکھا ہے جسکے باعث اُن کے دماغ ایسے تنگ و تاریک ہو گئے ہیں کہ آفتاب عقل کی تمام شعاعیں اُن کو روشن کرنے سے معذور رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری بہترین امیدیں محض نوجوانوں کے ساتھ وابستہ ہیں، تاہم یہ بات خالی از منفعت نہیں کہ لوگوں کی عصبیت کو

آشکارا کیا جائے تاکہ نوجوانوں کو اس کا صحیح طور پر اندازہ ہوجائے کہ جو لوگ مخزن عقل و دانش اور معدن علم و فضل تصور کئے جاتے ہیں وہ ان صفات سے کس قدر بے بہرہ ہیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، کیونکہ غیر معقول انسان کو معقول انسان بنانے میں تعمیر و تخریب کے دونوں طریقے استعمال کرنے پڑیں گے۔ یعنی جو کچھ محنت و جانفشانی کے ساتھ حاصل کیا جاچکا ہے اسے پہلے سے زیادہ رنج و تکلیف کے ساتھ زائل و محو کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جاکر تدریس و تحصیل کا سلسلہ ازسرنو شروع کیا جائے گا۔ اس امر کی تکمیل کے لئے فہم و ادراک اور ہمت و انصاف سب سے پہلی ضروریات ہیں۔ فہم و ادراک کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ غلطی کو غلطی تسلیم کیا جاسکے انصاف کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ غلط چیزوں کی قطعی تردید کی جاسکے اور ہمت کی اس لئے ضرورت ہے تاکہ حق بات معلوم کرلینے کے بعد بغیر کسی خوف کے بلا پس و پیش، اس پر عمل کیا جاسکے۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو اس آخری منزل پر پہنچتے ہیں، کیونکہ جس وقت عقل و شعور کے فیصل شدہ احکام پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو سوسائٹی کے خوف سے بڑے بڑے منہ چھپا جاتے ہیں، یہانتک کہ محض ایک لایعنی فعل سے احتراز کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات ایسے مضحکہ خیز نظارے دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان اس بات کا یقین رکھتے ہوئے بھی کہ گنگا اشنان ایک مہمل سی بات ہے، موقع پر ڈبکی لگانے سے پرہیز نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ایک روشن خیال مسلم نوجوان قبر پرستی کو ایک لغو حرکت سمجھتے ہوئے بھی پیروں کے مزار پر آنے دو آنے کی شیرینی چڑھانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ علی ہذا القیاس ایک لامذہب عیسائی انسان بھی اپنی بیوی کے جذبات کی خاطر اتوار کو کلیسا میں جاکر ضرور حاضری دے آتا ہے۔

ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ذہنی آزادی ایک ایسا حادثہ ہے جس سے شاذ و نادر ہی انسان دوچار ہوتے ہیں۔ کوئی شخص جس کا ذہن آزاد نہ ہو معقول انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ معقول انسان یعنی ایک "آزاد ذہن انسان" میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے وہ عوام الناس سے تمیز کیا جاسکتا ہے۔ ضد اور پاسداری سے پاک ہوتا ہے، وہ اپنی گفتار میں تصنع سے مبرا اور کردار میں ریاکاری سے منزہ ہوتا ہے۔ وہ نہ تو کسی مخالف رائے سے برافروختہ ہوتا ہے اور نہ کسی لایعنی فعل سے آزردہ ہوتا ہے۔ وہ تعصب و ہٹ دھرمی کے علاوہ ہر ایک چیز کو برداشت کرسکتا ہے۔ اگر نئے خیالات صحیح ہیں تو وہ انہیں لبیک کہنے کے لئے تیار رہتا ہے اور اگر پرانے خیالات غلط ہیں تو انہیں مسترد کرنے کے واسطے آمادہ رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکی فکری زندگی ہر قسم کی کثافت و آلائش سے پاک و صاف رہتی ہے۔ اسکی سرشت ہی میں ایسا خمیر شامل ہوتا ہے۔ اس کا بشاش چہرہ، خندہ زن پیشانی اور مسرور آنکھیں، اس کے معقول انسان ہونے کی علامات ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے ایک غیر معقول اور متعصب انسان کے چہرے سے ہی اسکی اندرونی ابتری اور روکھاپن ہویدا ہوتا ہے۔ دنیا کی یہ کیسی افسوسناک بدنصیبی ہے کہ اسمیں بیوقوفوں اور تنگدلوں کی اکثریت ہے۔ اگر دنیا میں دوچار آزاد ذہن بھی نہ ہوتے تو دنیا کی بدنصیبی کی انتہا ہوجاتی۔ دنیائے مستقبل کو بہتر و معقول تر بنانے کی امیدیں انہی دوچار آزاد ذہن لوگوں کی ساعی جمیلہ کے ساتھ وابستہ ہیں جو عقل و انصاف کی دودھاری تلوار سے مخالفت کے اس طوفان خیز سمندر میں عصبیت و جہالت کا مقابلہ کررہے ہیں +

(ترجمہ)

سلطان محمد تغلق

تاریخی شواہد کی روشنی میں

از جناب بدرالوحید صاحب رضوی امروہوی

سلطان محمد تغلق ہندوستان کے اُن مسلمان بادشاہوں میں سے ایک ہے جو جانبدار اور متعصب مورخین کے ظلم و ستم کے سب سے زیادہ تختہ مشق بنے ہیں انگریز مورخین کا تو کہنا ہی کیا ہے وہ جب ہندوستان کے راجاؤں یا مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھتے ہیں تو ان کا مقصد سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ ان کے طرز حکومت وغیرہ کے متعلق ایسی باتیں لکھی جائیں جن کو پڑھ کر ہندوستانیوں کے دلوں سے ان کی قدر و عزت محو ہوجائے اور وہ برٹش حکومت کی لعنتوں کو بھی اپنے لئے رحمت و برکت سمجھنے لگیں لیکن تعجب تو یہ ہے کہ خود ہمارے بعض ہندوستانی مورخین نے بھی انگریزوں کی اتباع میں یا اپنے فرقہ وارانہ جذبات کے ماتحت سلاطین ہند اور بالخصوص سلطان محمد تغلق کے متعلق ایسی باتیں لکھی ہیں اور ان پر ایسے ایسے اعتراضات کئے ہیں جن کا واقعہ اور حقیقت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں ہے آج کی صحبت میں میں اسی قسم کے بعض اعتراضات کا جو سلطان محمد تغلق کے متعلق جان بوجھ کر کئے جاتے ہیں تاریخی شواہد کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

سلطان محمد تغلق پر مورخین کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ قوت تمیز سے بالکل محروم تھا۔ وہ اس کے ثبوت میں (۱) پایہ تخت کی تبدیلی (۲) چین پر حملہ آوری (۳) اور سکہ کی تبدیلی کو بطور سند پیش کرتے ہیں اس اعتراض کا تفصیلی جواب تو میں بعد میں عرض کروں گا لیکن اس بات پر میں اپنی حیرت ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک طرف تو یہ مورخین اس قسم کی چیزیں کہتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ

"محمد تغلق جس کا اصل نام جوناخاں تھا جب باپ کے انتقال کے بعد تخت پر بیٹھا تو وہ اتنا بڑا عالم تھا کہ بڑے بڑے علما اس کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے۔ علم ادب۔ علم نجوم اور علم ریاضی میں اسے کمال حاصل تھا علم طب میں کافی مہارت تھی بڑا بہادر تھا اور مذہب کا پابند۔ اپنی رعایا کے آرام کے لئے وہ بہت سی تدابیر سوچا کرتا تھا۔"

اور مسٹر بی این مہتہ جیسا مورخ کھلے دل سے یہ اعتراف کرتا ہے کہ "وہ مذہب کے اصولوں کو پورے طور سے مانتا تھا اور شراب نہیں پیتا تھا وہ مذہبی کام بھی خوب کرتا تھا اس نے شفاخانے اور خیرات خانے بنوائے وہ اپنی سخاوت کے لئے مشہور تھا لڑائی میں بہادری کی وجہ سے اس کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔" لیکن باایں ہمہ دوسری طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ "یہ سب اوصاف فضول تھے۔ کیونکہ اسکی قوت امتیازی اتنی بگڑی ہوئی تھی


نقشهٔ مدوجزر فتوحات اسلام
خوارزم
پنجاب
هندوستان
سند
مکران
الجزایر
بحر اسود
یمن
بحر هند
صحرای اعظم
مصر
حبش
بربر
سودان

کہ لوگ اُسے دیوانہ کہنے لگے تھے" وہ مطلق شرم و دریغ محسوس نہیں کرتے حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کوئی "دیوانہ" اُن اوصاف سے متصف نہیں ہوسکتا اور خود ان مورخین نے اپنی کتابوں میں ایسے واقعات نقل کئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی قوت تمیزی غیر معمولی تھی۔ مثال کے طور پر میں مورخین کا یہ قول پیش کرتا ہوں۔

"چنانچہ ابن بطوطہ مشہور افریقی سیاح اور مورخ جس کا شمار دنیائے اعظم ترین عالموں میں کیا جاتا ہے جب اس کے دربار میں پہنچا تو اس کی دادرس اور مردم شناس نظر نے فوراً اُسے منتخب کر لیا اور قاضی بنا یا پھر سفیر چین بنا کر روانہ کیا۔"

(ہسٹری آف انڈیا جیترویدی صفحہ ۱۸۱ ہسٹری ایشوری پرشاد صفحہ ۲۱۲ ہسٹری بی۔ این۔ مہتہ صفحہ ۲۰۴ وغیرہ وغیرہ)

کیا یہ انتخاب جس کی موزونیت پر واقعات گواہ ہیں اس کی قوت تمیز اور احساس کی ایک بین دلیل نہیں ہے؟

اب ہم مذکورہ بالا تینوں اعتراضوں یعنی (۱) پائے تخت کی تبدیلی۔ (۲) ملک چین پر حملہ آوری اور (۳) سکہ کی تبدیلی۔ کو لیتے ہیں۔

(۱) پائے تخت کی تبدیلی:۔ اس پر اعتراض میرے نزدیک سراسر حماقت ہے حالات جب مقتضی ہوتے ہیں تو پایہ تختوں میں تبدیلیاں ہر زمانہ میں ہوتی ہیں۔ خود اس زمانہ میں انگریزوں نے پہلے کلکتہ کو دار السلطنت قرار دیا تھا لیکن پھر چند در چند مصالح کی بنا پر انہیں دہلی کو پایہ تخت بنانا پڑا اور اس سلسلہ میں ان کو بہت زیادہ مصارف سے گرانبار ہونا پڑا۔ اس طرح سلطان محمد تغلق کی سلطنت جب شمالی ہند سے جنوبی علاقہ تک پھیل گئی اور ادھر مشرق میں بنگال وغیرہ حدود سلطنت میں آگئے تو اس نے انتظام و انصرام کے ماتحت نیز رعایا کی سہولت کی خاطر دار الخلافت تبدیل کر کے وسط حکومت کیا قرار دینا مناسب خیال کیا! اس کا یہ اقدام یقیناً ایک مبارک و مستحسن اقدام تھا۔ اس کو دیوانگی یا جنون سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہسٹری موٹو سنگھ میں ہے۔

"اس کی سلطنت کی حدود شمال میں پنجاب تک اور پورب میں بنگال تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دکن بھی اس کی سلطنت میں شامل تھا اس نے خیال کیا کہ پایہ تخت دلی اسکی سلطنت کے بالکل وسط میں نہیں ہے وہاں سے دکن کے دور دراز ملکوں کا انتظام اچھے طریقے سے نہیں ہوسکتا۔"

"البتہ اس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ سرکاری ملازمین اپنے اعزہ و اقارب سے علیحدہ ہو کر بددل ہو جائیں گے اور کام میں خلل واقع ہوگا حکم دیا تھا کہ تمام دلی کے باشندے دیوگری چلیں اس میں رعایا ہی کی فلاح و بہبودی منظور تھی۔ لیکن رعایا نے اس کا اُلٹا نتیجہ نکالا۔ اور بہت پریشانی کا اظہار کیا۔ جب اُس نے رعایا کو خوش حال نہ پایا تو از راہ ہمدردی پھر واپسی کا حکم دے دیا اور تمام آمد و رفت کے اخراجات خزانہ سے دلوائے جس کے باعث خزانہ میں معقول کمی واقع ہوگئی۔ اگر صرف دفاتر ہی بھیجا تو اسقدر طوالت کا سبب نہ ہوتا ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ "راستہ میں مسافروں کے واسطے ہر قسم کے آرام کا انتظام کر دیا تھا۔"

تعجب ہے کہ آجکل تمام سرکاری دفاتر نئی دہلی سے ہر سال شملہ جاتے اور آتے ہیں جس کی وجہ سے لاکھوں روپیہ سالانہ صرف کرایہ آمد و رفت وغیرہ میں برباد ہوتے ہیں لیکن اس پر کسی کو بھی انگشت نمائی کی جرأت نہیں ہوتی۔

(۲) حملہ چین:۔ دوسری چیز جسے سلطان تغلق کی دیوانگی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے وہ حملہ چین ہے۔

اول تو مورخین اس کا شدت سے انکار کرتے ہیں کہ تغلق نے فتح چین کا ارادہ کیا تھا چنانچہ ایشوری پرشاد صاحب لکھتے ہیں کہ سرداروں کی خواہش ظاہر کرنے کے باوجود محمد تغلق نے چین پر حملہ کرنا تو درکنار اُدھر کا رُخ بھی نہیں کیا۔

"خراسانی سرداروں نے بادشاہ کو اپنے ملک پر چڑھائی کرنے کی رغبت دلائی لیکن کئی وجوہ سے بادشاہ اس مقصد کو پورا نہ کرسکا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ تغلق نے چین پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ غلط ہے اس نے کبھی چین پر چڑھائی کا قصد نہیں کیا۔ ہمالیہ کی طرف ایک زبردست کُمراں تھا اسی پر اس نے حملہ کیا تھا۔ شاہی افواج نے راجہ کو شکست دے کر دہلی کے ماتحت ہونے پر مجبور کیا۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے شاہی فوج کو سخت تکلیف ہوئی اور پہاڑی فوج نے شاہی لشکر کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔

(ہسٹری ایشوری پرشاد صفحہ ۱۱۲)

اور اگر بفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محمد تغلق نے چین پر حملہ کیا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس پر ناراضگی کا اظہار کیوں کرتے ہیں؟ اور اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ دنیا کے تمام اولو العزم اشخاص نے اس قسم کی "دیوانگی" کا ثبوت پیش کیا ہے ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے مدبرین اور ماہرین سائنس شہرت و ناموری اور ترقی و کامیابی کے خیالی تصور اور ایک ایسے موہوم پوائنٹ ایورسٹ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر سال سینکڑوں جانیں ایک اقدام لاحاصل کی خاطر لقمہ اجل ہو جاتی ہیں اور اس کے باوجود بھی آج سمجھدار دنیا عاقل اور بہادر کے القاب کے ساتھ یاد کرتی ہے!!

(۳) سکہ کی تبدیلی:۔ ہمارے کرم فرما معترضین سکوں کی تبدیلی پر بھی بہت چراغ پا نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو اس نے کوئی بھی اقدام ایسا نہیں کیا جو خلاف عقل یا خلاف مصلحت ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس وقت رعایا کے اندر ان باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اور انکی نظریں اس کے فوائد تک نہیں پہنچ سکیں۔

پائے تخت کے تبادلہ اور قحط سالی کے باعث جب خزانہ میں کمی واقع ہوگئی اور اطراف سے شورش کی اطلاعات آئیں تو اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے رعایا کو قحط کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے اور خزانہ کی کمی پورا کرنے کے لئے تانبے اور پیتل کے سکے جاری کئے جنکی قیمت سابقہ سکوں کی قیمت کے برابر ہی رکھی۔

ہر حکومت کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی ساکھ قایم رکھنے اور خزانہ کو خالی ہونے سے بچانے کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرتی ہے کہ اگر کوئی کمی ہوگئی ہو تو وہ جاتی رہے۔ چنانچہ آج ہمارے سامنے گورنمنٹ برطانیہ کی زندہ نظیر موجود ہے کہ جب ۱۹۱۶ء میں جنگ عظیم میں اس کے خزانہ میں کمی آگئی تو اس نے کاغذ کے سکے جاری کر دئے۔ یہ وہی چیز ہے جسے محمد تغلق نے تانبے اور پیتل کے سکوں کی صورت میں رکھا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ محمد تغلق کے زمانہ میں بھی چین وغیرہ میں کاغذ کے سکے جاری تھے۔ جن کی قیمت چاندی اور سونے کے سکوں کے برابر تھی جیسا کہ ایشوری پرشاد صاحب اپنی ہسٹری آف میڈیول انڈیا میں لکھتے ہیں۔

ہاں! اس وقت ٹکسال کا انتظام ٹھیک نہ تھا جس سے اُسے سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ مسٹر بی۔ این مہتہ لکھتے ہیں۔

"رعایا نے اصلی چاندی کے روپیہ بند کر دیئے جعلی سکوں سے محصول چکایا جانے لگا۔ سلطنت کی طرف سے ٹکسال کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ خزانہ اور بھی خالی ہوگیا۔ اور تانبے کے سکوں سے بھرنے لگا۔ باہر کی تجارت بھی بند ہوگئی کیونکہ خزانہ کا یقین نہ رہا۔ باہر کے لوگ تانبے کے سکے نہیں لیتے تھے۔ آخر بادشاہ نے یہ سکے بند کر دئے۔" (صفحہ ۲۰۰)

عبارت کے ہر ہر لفظ سے مؤلف کا مافی الضمیر ظاہر ہو رہا ہے اس عبارت میں متعدد مغالطے موجود ہیں۔ (۱) تجارت کا بند ہو جانا۔ (۲) خزانہ کا خالی پڑ جانا۔ حالانکہ کسی دوسری معتبر تاریخ میں تجارت وغیرہ بند ہونے کے متعلق کوئی تذکرہ موجود نہیں۔

اسی طرح کہیں بھی مسٹر مہتہ نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ محمد تغلق نے خود اپنے حکم سے تمام پیتل اور تانبے کے سکوں کے بدلے خزانہ سے چاندی اور سونے کے سکے دلوائے حالانکہ واقعہ یہی ہے ورنہ وہ چاہتا تو بغیر تبادلہ کئے صرف منسوخی کا حکم دے سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا وہ کیسی حالت میں گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ اسکی رعایا تنگدستی اور تکلیف کی حالت میں گذر کرے۔ اسی لئے وہ یوں بھی ہمیشہ قحط سالی وغیرہ کے زمانہ میں خزانہ سے روپیہ تقسیم کراتا تھا۔ جو اس کی انتہائی رعایا پروری و غریب نوازی کی روشن دلیل ہے۔

ٹکسال کے انتظام کے خراب ہونے کے متعلق بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ "کیوں اس نے ٹکسال کا انتظام ٹھیک نہیں کیا جو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا" لیکن یہ اعتراض اس وقت زیادہ قابل وقعت نہیں معلوم ہوتا جبکہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ٹکسال کا انتظام کوئی چنداں قابل اطمینان نہیں۔ صدہا ایسے نشانات سکوں میں بنا دئے گئے ہیں کہ کسی طرح سے انکی نقل محال ہے لیکن اس قدر احتیاط کے باوجود بھی سیکڑوں ہزاروں جعلی سکے آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں۔

اب مسٹر ایشوری پرشاد کی بھی عبارت جو اسی واقعہ پر مشتمل ہے ملاحظہ فرمایئے

"اب ہر شخص کو اپنے گھر سکہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ہزاروں سکے بنا لئے تب اس نے غصہ سے نیا سکہ منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ لوگوں کو سرکاری خزانہ سے نئے سکوں کے بدلے چاندی اور سونے کے سکے دیدئے جائیں" (ہسٹری ایشوری پرشاد صفحہ ۱۱۵)

اس عبارت اور مسٹر بی۔ این مہتہ کی مندرجہ بالا عبارت میں کتنا فرق ہے؟ ایک انصاف پسند طبیعت اچھی طرح اس کا اندازہ لگا سکتی ہے اور ان تمام واقعات کو اُن کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھ کر خود پتہ چلا سکتی ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے اور جانبدار مورخین کے قلم نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے!!!

حورِ حرم

(از جناب بسمل سعیدی ہاشمی)

شریکِ راحت و غم اے مری رفیقِ حیات
بہار ہے یہ جہاں نازشِ بہار ہے تو
یہ حُسن سادہ، یہ معصوم ادائیاں تیری
مذاقِ عشق کو تقدیس ہے تری تسلیم
ہمیشہ فرض ادائے نیاز ہے تجھپر
سما گئی ہے کچھ اس طرح میری ہستی میں
بغیر میرے تجھے تو بھی خود عزیز نہیں
مری نگاہ سے وابستہ ہے نگاہ تری
مجھی سے تجھ کو محبت مجھی سے شکوہ ہے
ہمیشہ میری ہی چتون کو دیکھتے رہنا
مرے ہی واسطے خودبیں و خودنما ہونا
لحاظ، دلشکنی، دلدہی کا رکھتی ہے
اگرچہ پاسِ خوشی بھی نہیں ہے کم تجھکو
تو ناخوشی میں بھی رہتی ہے میری خاطر خوش
شریکِ دل ہے مری حالتِ تباہ میں ہے
جو کوئی بات گراں بھی تجھے گذرتی ہے
تڑپ کے سینے سے کیوں دل نکل نہیں آتا
یہ تیری محنتِ پیہم یہ تیری صبح و شام
ترے نصیب کے دن ہیں کچھ ایسے دنیا میں
یہ سرد آہ تری جس سے تو سلگتی ہے
مری زمین مرے آسمان کی ملکہ!
ترا وجود ہو اور بارِ خاطرِ ہستی
صد آفریں تجھے، یہ تیری فطرتِ عالی
تو بے نیاز ہے، ہرچند بے نیاز نہیں
یہ کر رہی ہیں اگرچہ ڈگر ڈگر آنکھیں
خیال بھی تو کسی کا نہیں ترے دل میں
اگرچہ سِلکِ گہر بھی ہو کوئی نخوت خو
مقابلہ نہیں کرتی تو اپنی حالت سے
ہزار غم سے تنفّس ہے سرد و نرم رواں

مری حیات کے مقصد کی جان ہے تری ذات
کہ حُسنِ صنعتِ خالق کی شاہکار ہے تو
نہاں ہیں تجھ سے بھی خود دلربائیاں تیری
ادا ادا تری کوثر، نگہ نگہ تسنیم
اگرچہ حُسن و محبت کو ناز ہے تجھپر
کہ اپنے آپ کو رکھا نہ اپنی ہستی میں
کہ جیسے میرے بغیر آپ کوئی چیز نہیں
مجھی میں واہ تری اور مجھی میں آہ تری
مجھی سے دین ہے تیرا مجھی سے دنیا ہے
مری نظر کی اجازت کے بعد کچھ کہنا
مجھی کو صِرف میسّر ہے آئینہ ہونا
خیال میری خوشی ناخوشی کا رکھتی ہے
مگر خوشی سے سوا ہے لحاظِ غم تجھکو
ہزار غم بھی ہوں دل پر مگر بظاہر خوش
نگاہ میں ہے تبسّم ترنم آہ میں ہے
تو کس خوشی سے طبیعت پہ جبر کرتی ہے
کہ دم پہ بن کے بھی تیوری پہ بل نہیں آتا
مرا خیال ہے، بچّوں کی فکر، گھر کا کام
خوشی ہنوز تری قسمت کی جیسے دُنیا میں
اس آہ کی دلِ قدرت پہ چوٹ لگتی ہے
مری حدود میں میرے جہان کی ملکہ!
ترے پسینے میں ہے غرق فاطرِ ہستی
زہے یہ ضبط، زہے تیری ہمّتِ عالی
ترا نیاز کسی کا بھی رہن ناز نہیں
کسی کے سامنے جُھکتی نہیں مگر آنکھیں
نہیں ہے تیرے سوا جیسے کوئی محفل میں
مجال کیا کہ اُسے آنکھ اُٹھا کے دیکھے تو
غرض نہیں تجھے اہلِ جہاں کی ثروت سے
تری رگوں میں ہے غیرت کا خونِ گرم رواں

یہ کہہ رہا ہے ترا اشکِ دیدۂ غمناک
ہلائے دیتی ہیں تاروں کو آسمانوں کے
مے نشاط ترے ساغرِ سفال میں ہے
کرے نہ کیوں تری ہستی پہ حسنِ فطرت ناز
یہ سادگی کو ترے حسن کی ہے اندازہ
مٹے نہ فطرتِ بے لوث کے تری جوہر
تو اور قدیم روایات اور وفاداری
جہاں میں جس سے ہے رنگیں مزاجیٔ نسواں
ہزار جہل سے بدتر ہے چاک دامانی
بنائیں جن کو سلیقہ شعاریاں پُرفن
اُٹھے حجابِ فریب اب جو دیدہ و دل سے
خجل بھی، خوش بھی ہوں تجھسے یہ بات کہکر میں
خرابیوں کو بھی میری نباہنے والی
مرے چلن مجھے پہنچا ئیں جس مصیبت پر
گذر گئے ہیں مگر دل پہ داغ ہیں ابتک
کہاں ہے میری ہوسکاریوں کا وہ عالم
پھرا نظر میں طلسمِ خیالِ رنگا رنگ
فتورِ عقل کو میں جب سرور سمجھا تھا
تری وفاؤں کے سجدوں سے ہوگئے میں بیزار
نہ آئی لینے تری یاد بھی جہاں مجھکو
وہ قلب و روح کا دوزخ، نگاہ کی جنت
دلِ خراب تھا، عصیاں گرِ جوانی تھی
مگر ہنوز ترا حاصلِ دعا میں تھا
دعائیں تو 'بدر لاشریک'، مانگتی تھی
اُن آنسوؤں کی دعاؤں کا تیری ہے یہ اثر
اگرچہ آئینۂ خوب و زشت ہے دنیا
ملالِ رشک، نہ اندیشۂ جدائی ہے
مصیبتوں میں ہے راحت ہماری جنت میں
اُجاڑنے سے یہ جنت کہیں اُجڑتی ہے

کہ تاجِ شاہی کے موتی کی آبرو پر خاک
یہ چار پیسے کے آویزے تیرے کانوں کے
خوش اپنے حال میں ناخوش بھی اپنے حال میں ہے
کہ بے نیاز تکلّف ہے تیرا ہر انداز
کہ حُسن کا ہے فقط سادگی ہی اک غازہ
اثر نہیں کوئی تیرے ضمیرِ باطن پر
جب یہ بدعلم نہ تہذیبِ نو کی عیّاری
وہ لاکھ علم ترے جہلِ سادہ پر قرباں
ہزار علم سے بہتر ہے پاک دامانی
مبارک ان کے سلیقوں سے تیرا اکھڑ پن
حقیقتوں کا ہوا انکشاف باطل سے
سمجھ سکا ہوں تجھے تجھ سے دور رہکر میں
برائیوں کو بھی میری سراہنے والی
اُسے بھی کرتی ہے محمول اپنی قسمت پر
وہ دن جو لعنتِ قلب و دماغ ہیں ابتک ہے
نظر ہوئی جو ترے حسنِ سادہ سے برہم
ہوا اسیرِ فریبِ جمالِ رنگا رنگ
ہر ایک لعبتِ لعنت کو حور سمجھا تھا
ہوس کی ٹھوکریں کھاتا پھرا سرِ بازار
دلِ خراب نے پہنچا دیا کہاں مجھکو
وہ بوئے فحش کے بھپکے، گناہ کی جنت
مرا شباب تھا، قربان گہِ جوانی تھی
خدا کے سامنے سجدوں کا مدعا میں تھا
خدا سے میری محبت کی بھیک مانگتی تھی
وہی ہوں میں وہی تو اور وہی ہمارا گھر
مگر ہمارے لئے اب بہشت ہے دُنیا
ہم اب وہاں ہیں جہاں عشق کی خدائی ہے
ہر ایک غم ہے مسرت ہماری جنت میں
مصیبتوں سے 'محبت' میں جان پڑتی ہے

دنیائے اسلام کی چند اہم ضرورتیں

از جناب حاجی سید اعظم صاحب (اندھرا)

اسلامی دنیا کے حالات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم کر کے ذہنہا افسوس اور صدمہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کو خیر اُمت ہونے کا شرف حاصل ہے اور ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی وہ مقدس کتاب موجود ہے جس کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے دین و دنیا دونوں کی ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن ان کا حال دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بے انتہا پست ہے۔ کچھ اسلامی ممالک تو ایسے ہیں جو ابھی تک غیروں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جو بظاہر آزاد ہیں ان کا حال بھی اس درجہ سقیم ہے کہ وہ اپنی بے شمار ضروریات کے لئے غیر اقوام کے محتاج ہیں اور ان کی امداد و تعاون کے بغیر وہ بالکل بے بس ولاچار ہیں مسلمانوں کی اس پستی و انحطاط کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا جواب میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید علوم و فنون جدید ایجادات و اختراعات جدید اصول تجارت اور سب سے بڑھ کر اسلامی اتحاد کی ضروریات کی طرف سے بالکل بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں تو میدان ترقی میں تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہیں لیکن مسلمانوں کی حالت روز بروز پست سے پست تر ہوتی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی اس پستی اور انحطاط کا علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان زمانہ کی روش کو سمجھ کر اس کے مطابق قدم اٹھانے کی سعی کریں، جدید علوم و فنون سیکھیں جدید طریقوں سے صنعت و تجارت کریں، ترقی کے ہر میدان میں کود پڑنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن یہ تدبیریں بھی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا ایک ایسا رشتہ قایم ہو جائے جو ناقابل شکست ہو۔ اس کے بغیر ان کی ترقی کی کوئی کوشش کبھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ مسلمان جہاں بھی ہیں بہرحال انفرادی طور پر ترقی کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں لیکن نظام کے فقدان اور مسلمانوں کے موجودہ انتشار و پراگندگی کی بنا پر ان کی کوششیں خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتی ہیں ضرورت ہے کہ اسلامی عالمگیر اتحاد کے ڈھانچے میں نئی روح ڈالی جائے اور "وامرهم شوری بينهم" کے بموجب عالم اسلام کے علماء و عقلاء کی ایک ایسی مجلس قایم ہو جو باہمی تبادلہ خیالات کے بعد مسلمانوں کی ترقی و عروج کے اسباب و وسائل کا فیصلہ کر سکے اور اس کو جامہ عمل پہنا سکے۔ اسی ضرورت کے لئے اسلام میں خلافت کا نظام قائم تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ باقی نہیں رہ سکا۔ بہرحال میں ذیل میں ان چند باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کا مسلمانوں کی ترقی و عروج سے بہت گہرا تعلق ہے۔

علوم و فنون کی مرکزی درسگاہ

جدید علوم و فنون کی تعلیم کی اس زمانہ میں جس قدر ضرورت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے یوں تو ہر ملک میں مذہبی علوم کے لئے درسگاہیں موجود ہیں لیکن اسلامی ممالک میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں جدید علوم و فنون کی بہترین تعلیم حاصل کی جا سکے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپین ممالک کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے جو گوناگوں لحاظ سے ہمارے لئے بے انتہا تباہ کن ہے۔ سب سے پہلے تو ہر ملک میں ان جدید علوم و فنون کی تعلیم کا جس حد تک انتظام ہو سکتا ہے ہونا چاہئے لیکن ان علوم سے پوری طرح مستفید ہونے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ عالم اسلام میں کوئی مرکزی درسگاہ قایم کی جائے جہاں ان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام ہو اور جس کے بعد ہم یورپین درسگاہوں کی تعلیم سے بالکل بے نیاز ہو جائیں میرے خیال میں یہ مرکزی درسگاہ حجاز میں قائم ہونی چاہئے جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہونے اور دوسرے بہت سے وجوہ کی بنا پر بہت زیادہ موزوں مقام ہے ابتداء میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صرف چو بیس کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی اگر اسلامی ممالک تیار ہو جائیں تو یہ کام چنداں دشوار نہیں ہے۔

حجاز میں ریلوے کی ضرورت

حجاز میں اس قسم کی مرکزی درسگاہ کے قیام میں بلاشبہ اس وقت مختلف قسم کی دقتیں اور مشکلات پیش آئینگی جن میں سب سے زیادہ اہم آمد و رفت کے ذرائع کی قلت ہے لیکن میرا خیال ہے یہ دقتیں تھوڑے سے سرمایہ اور تھوڑی سی توجہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ حجاز میں سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں دنیائے اسلام کے چندہ سے حمیدیہ حجاز ریلوے قائم ہوئی تھی جس نے مدینہ طیبہ کو دمشق سے ملا دیا تھا یہ ریلوے گذشتہ جنگ عظیم میں برباد ہو چکی ہے ضرورت ہے اس کی پھر سے مرمت کیجائے۔ اگرچہ بحالات موجودہ مدینہ سے کربلا اور جدہ اور مکہ کرمہ سے بحرین و یمن وغیرہ کے درمیان ریلوے لائن کے قیام میں بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت پیش آئے گی لیکن اگر

فی الحال مدینہ طیبہ، مکہ اور جدہ کے درمیان ریلوے لائن قایم کی جائے تو اس کے لئے دس کروڑ سے زائد روپیہ کی ضرورت ہوگی اور تعمیر کے بعد ہی سے اتنی آمدنی وصول ہونے لگے گی کہ اس کا نصف حصہ دارالعلوم پر صرف کیا جا سکے گا اور نصف کے صرف سے تھوڑے دنوں کے اندر دوسری ریلوے لائنیں قایم کر کے حجاز کو دیگر اسلامی ممالک سے ملحق کیا جا سکے گا۔ دمشق سے معان تک ریلوے لائن قایم ہی ہو چکی ہے جہاں سے مدینہ طیبہ صرف ۵۰۴ میل کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے اور چونکہ درمیان میں پہلے کے اسٹیشن وغیرہ موجود ہیں جو تھوڑے سے صرفہ سے کارآمد بنائے جا سکتے ہیں اس لئے مدینہ طیبہ کے دمشق کے ساتھ الحاق میں زیادہ صرف نہیں پڑے گا۔ غرض یہ ہے کہ حجاز کی آمد و رفت میں جو دقتیں حائل ہیں ان پر بہت آسانی سے قابو پایا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی تھوڑی سی ہمت سے اسلامی ممالک کا حجاز کے ساتھ اس طرح اتصال ہو سکتا ہے کہ ان کے لئے نہ صرف مرکزی علوم و فنون کی درسگاہ سے فائدہ اُٹھانا آسان ہو جائے گا بلکہ اس کی بنا پر اور دیگر قسم کے بیشمار فوائد حاصل ہو سکیں گے۔

بحری سفر کی مشکلات

حجاز کی مرکزی درسگاہ کے فوائد کو تمام دنیائے اسلام تک عام کرنے کے لئے ہمیں بحری سفر کی مشکلات کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ چونکہ اکثر جہازراں کمپنیاں غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہیں اس لئے اس وقت حجاز پہونچنے میں بے انتہا مشکلات اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے خود مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان مشکلات کا ازالہ اس طرح ممکن ہے کہ اس سے مسلمانوں کو بے انتہا فائدہ بھی پہونچ سکتا ہے۔ اس وقت تک صرف حج کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد مسلمان جہازوں کے ذریعہ حجاز پہونچتے ہیں جس سے تقریباً دس لاکھ روپیہ ہر سال غیر اسلامی جہازراں کمپنیوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے ۱۹۲۸ء میں جب میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوا تھا حاجیوں کی تعداد نقشہ ذیل کے مطابق تھی۔

جاوا سماٹرا	۷۰۰۰۰
مصر و سوڈان	۳۰۰۰۰
ہندوستان	۳۰۰۰۰
افریقہ اور روس وغیرہ	۲۰۰۰۰
	ایک لاکھ پچاس ہزار

اور اگر جدید طریقوں کے تیز رفتار جہاز فراہم کئے جائیں اور حاجیوں کی راحت و آسایش کا پورا پورا سامان کیا جائے تو یقیناً دنیائے اسلام کی موجودہ مردم شماری کا لحاظ کرتے ہوئے پانچ لاکھ حاجی سمندروں کی راہ سے ہر سال حجاز کا سفر کر سکتے ہیں جس سے حاجیوں کی آمد و رفت کے کرایہ کے ڈھائی کروڑ اور تجارتی مال کی آمدنی سے ڈھائی کروڑ جملہ پانچ کروڑ روپیہ سالانہ منافع ہو سکتا ہے اگر اعلیٰ پیمانہ پر جہازراں کمپنی قایم کی جائے تو دس کروڑ روپیہ اس کے لئے کافی ہو سکتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کل سرمایہ پر سالانہ پچاس فیصدی منافع یعنی پانچ کروڑ روپیہ حاصل ہوا کرے گا۔ ممکن ہے آپ کو یہ اندازہ غلط معلوم ہوتا ہو اس لئے آپ کی تسکین کے لئے میں رحمانی حجاز کی آمد و خرچ کا ذیل میں نقشہ پیش کرتا ہوں اس سے میرے تخمینہ کی صحت آپ پر منکشف ہو جائے گی اور اگر مضمون کے زیادہ طویل ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں دوسرے ذرائع سے بھی آپ کی تشفی کرنے کی کوشش کرتا۔

رحمانی جہاز کا وزن ۵۲۹۱ ٹن ہے جو پانچ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا ہے اس میں درجہ اول کے بیس درجہ دوم کے بیس اور عرشہ کے سولہ سو ایک جملہ ۱۶۵۱ حاجی سفر کرتے ہیں اس کے کراچی سے جدہ تک ایک بار کی آمد و رفت کی آمدنی و خرچ حاجیوں کے مقررہ شدہ کرایہ کے مطابق حسب ذیل ہے۔

آمدنی

درجہ اول کے مسافر ۳۰۔ فی کس کرایہ آمد و رفت	۶۰۲ روپیہ	کل	۱۸۰۶۰
درجہ دوم کے مسافر ۲۰	۴۲۷	کل	۸۵۴۰
عرشہ کے مسافر ۱۶۰۱	۱۷۲	کل	۲۷۵۲۰۰
کل آمدنی			۳۰۱۸۰۰

اخراجات

درجہ اول و دوم کے ۵۰ مسافرین کا خرچہ خوراک بیس دن کے لئے بحساب ڈھائی روپیہ یومیہ ۲۵۰۰

درجہ عرشہ کے ۱۶۰۱ مسافرین کے خرچ خوراک بحساب ایک روپیہ یومیہ بیس دن کے لئے ۳۲۰۰۰

بندرگاہ جدہ و کامران کے ٹیکس فی حاجی ۲۸ روپیہ کے حساب سے ۴۶۲۰۰

میزان ۸۰۷۰۰

اس حساب کے بموجب ایک بار کے سفر میں دو لاکھ اکیس ہزار ایک سو آمدنی ہوتی ہے اور تین بار کے سفر کے بعد یہ آمدنی ۶۶۳۳۰۰ تک پہونچ جاتی ہے۔

آپ اس رقم میں سے دوسرے اخراجات مثلاً کوئلہ تیل ملازمین کی تنخواہیں

پورٹ ٹیکس وغیرہ وغیرہ ماہانہ تیس ہزار روپیہ کے حساب سے چھ ماہ کے لئے ۱۸۰۰۰۰ روپیہ اور دفتری اخراجات اور کمیشن وغیرہ قسم کے اخراجات کے لئے ۲۳۳۰۰۰ روپیہ رکھ لیں جب بھی صرف ایک جہاز کے ذریعہ چار لاکھ پچاس ہزار روپیہ آمدنی ہوتی ہے ٹرنر موریسن کمپنی کے سات جہاز ہیں جن کی قیمت تیس لاکھ روپیہ سے زائد نہیں ہوگی لیکن یہ کمپنی موسم حج میں تیس لاکھ روپیہ حاجیوں سے وصول کرلیا کرتی ہے یہی حال . . دوسری کمپنیوں کا ہے۔

اب اگر مسلمانوں کی طرف سے جہاز ران کمپنی قایم کی جائے تو بحری سفر کی مشکلات بھی دور ہو جائے گی اور یہ خطیر رقم جو ہر سال غیروں کی جیبوں میں چلی جایا کرتی ہے وہ اپنوں ہی کی جیبوں میں رہے گی۔

اور مرکزی علوم وفنون کی درسگاہ۔ حجاز ریلوے لائن اور جہاز ران کمپنی قایم کرنے کے متعلق جو تجویز پیش کی گئی ہے اس کا تعلق تمام دنیائے اسلام سے ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانا مسلمانوں کے لئے مفید اور ان پر فرض ہے لیکن اس کے علاوہ ہر ملک کے مسلمانوں کو اپنی اقتصادی حالت کو درست کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہئے اس کے لئے سب سے زیادہ ضرورت معقول سرمایہ فراہم کرنے کی ہے معقول سرمایہ کے اکٹھا نہ ہونے کی وجہ سے آج مسلمان صنعت تجارت وغیرہ میں دوسری قوموں سے بہت زیادہ پیچھے ہیں اگر مسلمانوں کے درمیان امدادی سرمایہ سے امپیریل بنک قائم کئے جائیں جو غریبوں اور ضرورتمندوں کو بلا سود رقم دے سکیں تو مسلمان بڑی بڑی کاروبار شروع کرکے فروغ حاصل کرسکتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ ارباب خیر میری گذارشات پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔

مولانا محمد علی مرحوم کا پیغام اہل ملت کے نام

(از جناب دردمند اعظم گڈھی)

ہم تو وطن کو چھوڑ کے جنت میں جا بسے — اب اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے
کس طرح ہو یقین کہ ملت کی آنکھ پھر — مرنے کے بعد میرے کوئی رہنما بسے
واحسرتا کہ مظہر صدق وصفا کے بعد — چشم وطن میں پیکر کبر وریا بسے

دھوکا نہ کھائیں اہل وطن میرے نام سے
اس دور کے "مجاہد" عالی مقام سے

ہند میں اب نہیں اک ندکش بھی باقی — کون پُرشور کرے اب مرے میخانے کو
دیکھکر ظرف قدح خوار عطا کر ساقی — بادۂ ناب سے رنگیں مرے پیمانے کو
درس آئین جنوں جاکے کوئی سمجھادے — بادۂ رہبری قوم کے متوالے کو

گام زن دررہ لیلائے وطن چوں باشی
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مٹ گیا بعد مرے قوم سے آئین جہاد — کیوں نہ اونچا ہو زمانہ میں سر استبداد
للہ الحمد پس از عمر دعاہائے سحر — کاسہ لیسان حکومت کی بر آئی ہے مراد
عہد حاضر کا مجاہد ہے دعا خواہ ترا — تاج برطانیہ! تو زندہ و پائندہ باد
لیگ کے طنطنۂ جنگ و صف آرائی پر — اور کیا چیز ہے جز ماتم و آہ و فریاد
شورش شیون و ماتم سے کہیں ہوتی ہے — کوئی ملت ستم و جور و جفا سے آزاد
آہ جب اجمل و انصاری و جوہر نہ رہے — شیر قالیں سے ہوا بیشۂ ملت آباد

ہوس اوج میں اڑنے لگا ہر ذرہ پست
ہر تنک ظرف بنا ساقی صہبائے الست

شادی

از جناب فکر حیدری سلطانپوری

ذیل کی نظم میں شادی کے موضوع پر ایک خاص نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ شاعرانہ جذبات کی دنیا محسوس واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی مگر پھر بھی ذیل میں شاعر کی زبان جس طرح گویا ہوئی ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ واضح رہے کہ شاعر واعظ نہیں ہوتا۔ دل کی اندرونی کیفیات کا ترجمان ہونے کے سوا اس کی اور کوئی ذمہ داری نہیں اور اس لئے شاعر کے کسی قول کو واعظ و ناصح کے قول کی طرح تنقید و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھنا شاعری کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ (ایڈیٹر)

آہ اے عہدِ طرب! تجھ کو سلامِ آخری — جا رہا ہے تُو تو سنتا جا پیامِ آخری
ایک محرم سے نہ تجھکو کج ادائی چاہئے — ایک شاعر سے نہ تجھکو بیوفائی چاہئے
تو کہاں جاتا ہے ظالم! مجھکو تنہا چھوڑ کر — سنگِ غفلت سے مری مینائے دل کو توڑ کر
قلب کی بیچینیاں۔ اور روح کی بیماریاں — جاگ اٹھیں اک ایک کرکے ساری فتنہ کاریاں

اب کہاں میرے لئے وہ صبح و شامِ زندگی
زہرِ غم پینا پڑے گا اب بنامِ زندگی

اب کہاں بزمِ احبا۔ اب کہاں بزمِ نشاط — اب یونہی سا رہ گیا خوابِ خیالِ انبساط
اب کہاں لطفِ فراغت۔ اب کہاں کیفِ سکونِ دل — اب تو ہر رگ میں بجائے خوں ہے دردِ اندرِ دل
اب مری ہستی کو مر جانے کی بیماری ہوئی — اب اولوالعزمی پہ مرگِ ناگہاں طاری ہوئی
اب ہے سوزِ غیر فانی اب ہے دردِ لازوال — اب کہاں ذوقِ تصور۔ اب کہاں شوقِ وصال
اب تو دل پر بارشیں ہیں زہرِ کی زہر آب کی — اب کہاں راتوں کی بیداری میں لذت خواب کی
اب تو سب کچھ خاک ہے جل جل کے مانندِ سپند — اب وہ ہمت۔ نہ وہ دل میں خیالاتِ بلند
اب خیالوں میں نہ شوخی ہے۔ نہ فکروں میں جمال — ازدواجی زندگی ہے حسنِ ہستی کا زوال
ہائے وہ عہدِ تجرد کی نشاط افزائیاں — ہائے وہ دورِ تخیل کی خیال آرائیاں
ہائے اب باقی نہیں ہے کیفِ آہِ بے اثر — ہائے وہ عزمِ گراں تابِ و توانِ فکر و نظر
ہائے وہ جذبات کی لہریں۔ وہ جوشِ واردات — وہ "غرورِ نامرادی" "نازِ احساسِ حیات"
ہائے وہ ہر ہر نظر میں اک نیا طوفانِ حسن — ہائے وہ ہر ہر نفس میں اک نیا ارمانِ حسن
ہائے وہ راتوں کے سناٹے میں شغلِ آہ، آہ — ہائے وہ دل کی تڑپ وہ اضطراباتِ نگاہ
ہائے وہ دورِ مسرت۔ وہ زمانِ خرمی — ہائے وہ ڈوبی ہوئی نغموں میں روحِ زندگی

ہائے تنہائی کا وہ عہدِ گرامی ہائے ہائے — ہائے وہ تاروں سے پہروں ہمکلامی ہائے ہائے
ہائے وہ صحرا کی خلوت اُف وہ لطفِ انجمن — ہائے وہ شغلِ سخن۔ فکرِ سخن۔ ذوقِ سخن

اب تو ہیں آٹھوں پہر مدہوشیاں غم کیشیاں
اب کہاں وہ "شاہدِ اُردو" سے ہم آغوشیاں

آہ تجھسے کیا کہوں ہمدم! ہیں رازِ ازدواج — زندگی کا نوحۂ پنہاں بسازِ ازدواج
جان سے عاجز ہوں میں زیرِ گرانجانی ہوں میں — ہند زندانِ غلامی اور زندانی ہوں میں
مجھکو پہلے ہی کہاں حاصل تھی معراجِ حیات — آہ یہ شادی ہے یا بوجھل سی زنجیرِ ممات
ہائے کیا چھایا ہوا افسونِ غفلت مجھ پہ ہے — مادرِ ہندوستاں کا بارِ خدمت مجھپہ ہے
شوکتِ اسلام کا اُف چاک پیراہن ہے آج — امتِ مرحوم کا اُجڑا ہوا گلشن ہے آج
جل رہا ہے دامنِ دینِ پیمبر ہائے ہائے — بند ہے اب نعرۂ اللہ اکبر ہائے ہائے
سطوتِ کبریٰ ملی جاتی ہے خاک و خون میں — ایک ہلچل ہے بپا قفقاز میں رنگون میں
کیوں زمیں پھٹتی نہیں۔ کیوں آسماں ہلتا نہیں — مسلموں کو لقمۂ نانِ جویں ملتا نہیں
بتکدے آباد میخانوں میں شورِ ہاؤ ہو — ہر طرف مینا صراحی۔ ہر طرف جام و سبو
مسلمِ بیچارہ مجبور و تباہ و خستہ دل — صدمہ ہائے نو بنو سے ناتوان و مضمحل
جب یہ عالم ہے تو اے ہمدم! بتا بہرِ خدا — ہند کے مسلم کو کیا ایسے میں شادی ہے روا
ازدواج اچھا ہے لیکن اہلِ عزت کیلئے — ورنہ یہ تو ہے جلا طوقِ ملامت کیلئے

یہ جہاں موزوں نہیں افتادہ داموں کیلئے
شادیاں جائز نہیں ہندی غلاموں کیلئے

قیمتوں میں انتہائی تخفیف

رباعیات حکیم عمر خیام

مطبوعہ شرکت کاویانی برلن - یہ مجموعہ رباعیات جرمن کے مشہور مستشرق ڈاکٹر فریڈرک روزن نے قدیم نسخوں کی مدد سے تحقیق کرکے مرتب کیا ہے - یوں تو رباعیات خیام کے بہت سے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ مجموعہ تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے - مولف نے اس کی ترتیب میں طہران جرمن اور انگلستان کے کتب خانوں کے قدیم ترین اور بعض قلمی نسخوں سے استناد کیا ہے حاشیے پر ہر رباعی کے اخذ کا حوالہ دیا ہے - آخر میں چند قلمی نسخوں کے عکسی نمونے بھی دئے ہیں - طباعت نہایت صاف اور روشن ٹائپ، قیمت پہلے ؏ تھی اب ۱۲؍

گلستان سعدی شیراز

یہ نسخہ بھی شرکت محدودہ آفتاب برلن نے شائع کیا ہے - مولف نسخہ محمد عبدالشکور صاحب مدیر رسالہ آفتاب برلن کے سامنے ترتیب وقت گلستان کے متعدد نسخے تھے - اختلافات واغلاط کی تحقیق کے بعد یہ نسخہ شائع کیا ہے جسے مستند و صحیح ترین نسخہ کہا جا سکتا ہے - خود اس نسخہ میں چند چھاپے کی غلطیاں رہ گئی ہیں جن کے متعلق ایک غلط نامہ آخر میں دے دیا گیا ہے - طباعت نہایت صاف اور روشن ٹائپ، قیمت پہلے ؏ تھی اب ۸؍

دستور عشاق

فتاحی نیشاپوری ایک ایرانی شاعر کی نیم مجازی اور نیم حقیقی عشقیہ مثنوی ہے اور مطبع آفتاب برلن سے شائع ہوئی - مصنف پورا قادر الکلام شاعر ہے جس نے اپنی ادبیت اور شعریت کا ایک قابل داد ہفت خواں کارنامہ دستور عشاق کی شکل میں پیش کیا ہے - اس میں شہزادہ دل اور شہزادہ حُسن کی داستان معاشق ہے - طباعت نہایت روشن اور صاف ٹائپ، قیمت پہلے چار روپیہ تھی اب ؏

فردوس الحکمت

یہ کتاب فن طب پر عربی زبان میں ابن الحسن بن زین الطبری نے متوکل علی اللہ کے زمانہ میں تصنیف کی - پوری کتاب سات حصوں میں منقسم ہے جس میں تیس مقالے اور تین سو ساٹھ باب ہیں - اس کتاب کو پڑھ کر بقراط - جالینوس - دیقرادوس - ارسطاطیس - بطلیموس ایمنواطیس اور افلاطون وغیرہ کے دقیق طبی مسائل بآسانی ذہن نشین ہو جاتے ہیں - طباعت نہایت روشن اور صاف ٹائپ، قیمت پہلے چودہ روپیہ ۱۴؍ روپیہ تھی اب آٹھ روپیہ ہے -

بدائع سعدی

یہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس کو کاویانی پریس نے نہایت اہتمام سے نمبروار کی اوزان دے کر شائع کیا ہے - شیخ سعدی کی غزلیات کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے - کاغذ طباعت عمدہ ٹائٹل پیج خوبصورت قیمت پہلے للعہ تھی اب ۸؍

بدائع سعدی کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جس کی قیمت پہلے صہ تھی اب دو روپیہ آٹھ آنے ہے ؏

وجہ دین

عقائد فرقہ اسماعیہ پر حکیم ناصر خسرو کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے جس میں اس فرقہ کے عقائد پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے قیمت پہلے للعہ تھی اب ؏ ہے -

لڑکوں اور لڑکیوں، تعلیم یافتہ مرد اور عورتوں کی تفریح اور دلچسپی کے لئے ایک تعلیمی چیز

تعلیمی تاش

اس تاش کی ایجاد نے تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے - ہر ایک کلاس کے طالب علم اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ وکیل بیرسٹر کالجوں کے پروفیسر، اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر سب ہی اس تاش سے کھیل سکتے ہیں - یہ تاش اس طرح پر تیار کیا گیا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کے ساتھ اور استاد اپنے شاگرد کے ساتھ کھیل سکتا ہے - اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ قابلیت بڑھتی ہے - کھیل کا کھیل ہے اور تعلیم کی تعلیم - بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے اس کو پسند فرمایا ہے - اس کے ذریعہ سے بچوں کو تعلیم بھی دی جا سکتی ہے - کوئی گھر کوئی کلب اور کوئی اسکول اس تاش سے خالی نہ رہنا چاہئے - کھیلنے کے قواعد کتاب ہر ایک بکس کے ہمراہ مفت دی جاتی ہے - قیمت فی بکس بڑا سائز اردو انگریزی ملا ہوا بارہ آنے ۱۲؍ ہندی بارہ آنے ۱۲؍ اور چھوٹے سائز اردو چھ آنے (۶؍) انگریزی سات آنے ۷؍

منتخب لطائف

یہ آٹھویں صدی کے مشہور ہجو گو اور ظریف شاعر خواجہ عبید زاکانی کے لطیفوں اور چٹکلوں کا مختصر مجموعہ ہے جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا قیمت پہلے ۱۲؍ تھی اب ۸ ہے -

ہندوستانی

جو تقریریں آل انڈیا ریڈیو نے ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء سے ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء تک نشر کرائی تھیں مکتبہ جامعہ نے ۲۶ فروری ۱۹۳۹ء کی صبح کو انھیں بیک وقت اپنے تینوں دفاتر دہلی، لاہور اور لکھنؤ سے شائع کرایا -

ڈاکٹر تاراچند - مولوی عبدالحق - بابو راجندر پرشاد - ڈاکٹر ذاکر حسین - اچاریہ نریندر دیو - مسٹر آصف علی - نے وقت کے اہم ترین مسئلہ کا حل جس طرح پیش کیا ہے آپ کو صرف اس کتاب سے معلوم ہوگا کتاب اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع کی گئی ہے

قیمت اردو ایڈیشن ۔۔؍

قیمت ہندی ایڈیشن ۔۔؍

جوہر اقبال

علامہ اقبال کی زندہ جاوید اور ہمہ گیر شخصیت پر ہندوستان کے چوٹی کے ارباب علم و فضل ڈاکٹر ذاکر حسین - ڈاکٹر عابد حسین مولوی عبدالحق - سید سلیمان ندوی - مہاتما گاندھی - سر سرود سر اکبر حیدری پروفیسر محمد مجیب - پروفیسر رشید احمد صدیقی غلام السیدین کے مضامین و بیانات - قیمت مجلد ۔۔؍

مضامین محمد علی

مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب - مولانا کی سیاسی، مذہبی، ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلاویز مرقع جس میں انکی شخصیت وطن و ملت کے مسائل اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کی گئی ہے - یہ مولانا کی خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ ضخامت ۔۔۔ صفحات قیمت مجلد ؏

نوٹ: ہندوستانی، جوہر اقبال اور مضامین محمد علی کا محصول ڈاک ۱۵؍ ہے - جو حضرات رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی بھیجیں گے انکے ساتھ نصف محصول ڈاک کی رعایت ہوگی یعنی منی آرڈر ۱۵؍ کے بجائے ۸؍ کا کیجیے

مکتبہ جامعہ

۱- قرول باغ نئی دہلی
۲- جامع مسجد دہلی
۳- امین آباد لکھنؤ
۴- لوہاری دروازہ لاہور

انسانی کامیابی کا راز

از علامہ جرجی زیدان

طبعیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ فطرت کے تمام قویٰ، جاذبیت حرارت روشنی، مقناطیسیت، کہربائیت، مادہ کی ایک ہی مخفی قوت کی مختلف شکلیں ہیں جو دباؤ، رگڑ یا مقاومت وغیرہ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر تم لوہے کا ایک ایسا ٹکڑا لے لو جو اپنی طبعی حالت میں ہو تو تم دیکھو گے کہ اس میں نہ روشنی ہے نہ حرارت، نہ کہربائیت۔ ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے اس کے اندر یہ چیزیں سرے سے پائی ہی نہیں جاتیں، لیکن اگر تم کسی وزنی چیز سے اسے پیٹنا شروع کر دو یا سوہان کے ذریعہ اسے رگڑنے لگو تو تھوڑی ہی دیر بعد اس میں گرمی آنے لگے گی اور جس قدر اسے رگڑتے جاؤ گے اس کی گرمی بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ وہ بالکل گرم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس حد تک گرم ہو جائے کہ چمک اٹھے۔

اسی طرح اگر تم فولاد پر پتھر مارو تو ان کے درمیان سے ایک چمکیلا شرارہ نکلے گا جس سے آگ روشن کی جا سکتی ہے۔

گذشتہ زمانہ میں جب دیا سلائی کا وجود نہیں تھا لوگ پتھر یا لکڑی کے دو ٹکڑوں کو باہم رگڑ کر آگ جلا لیا کرتے تھے۔ اب بھی آگ جلانے کا وہی قدیم طریقہ رائج ہے البتہ اب چونکہ دیا سلائی کی تیلیوں کے سرے پر فاسفورس کا کچھ حصہ ہوتا ہے جو سریع الاشتعال چیز ہے اس لئے زیادہ رگڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اگر تم کہربا، یا شمع احمر یا شیشہ کا ایک ٹکڑا لے کر اسے کسی کپڑے سے خوب گھسو تو وہ گرم ہو جائیگا اور جب تم کسی چیز کا کوئی ٹکڑا اس کے قریب لیجاؤ گے تو اسے وہ اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اور اگر بہت زیادہ گھسو گے تو اس سے بجلی پیدا ہو جائے گی اور بجلی عموماً رگڑ ہی سے پیدا کی جاتی ہے۔

اوپر جو مثالیں پیش کی گئی ہیں انھیں پڑھ کر تم ضرور اس نتیجہ پر پہونچو گے کہ مادہ کے اندر جو قوتیں مستور ہیں ان کا ظہور دباؤ اور تصادم کے ذریعہ ہوتا ہے جس کے بعد ہم ان سے قسم قسم کے کام لیتے ہیں اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ قوتیں ہمیشہ مخفی اور بیکار پڑی رہیں اور ہم ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

یہی حال ہماری اخلاقی قوتوں کے ظہور کا بھی ہے۔ انسان کے اندر ہمت اقدام اور ذہانت و خطابت کے جوہر موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک مقابلہ اور تصادم کی صورت نہیں پیدا ہوتی ان پر پردہ پڑا رہتا ہے جب انسان کی راہ میں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں اور ان سے اسے ٹکرانا پڑتا ہے تو اس وقت اس کی اندرونی قوتیں اجاگر ہوتی ہیں اور اس سے حیرت انگیز کارنامے ظاہر ہوتے ہیں۔ اجتماع انسانی کی ترقی و عروج پر جن ہستیوں کا گہرا اثر پڑتا ہے وہ وہی ہوتی ہیں جنھیں زیادہ سختیوں اور مقاومتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر تم مشاہیر کے حالات زندگی اور قوموں اور جماعتوں کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمھیں ہمارے اس دعوے کی بہت سی دلیلیں مل جائے گی لیکن اس کی نمایاں دلیلیں مذاہب کی تاریخ میں ملیں گی۔ ادیان و مذاہب کے بانیوں اور پیرووں کو دینی تعلیمات و خیالات کی نشر و اشاعت میں جن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہی حقیقت میں ان کے جوش و ولولہ کو ابھارنے والی اور صبر و استقلال پر انھیں آمادہ کرنے والی تھیں۔

اگر انھیں موانع و مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑا ہوتا اور تبلیغ و اشاعت کے لئے بالکل آزاد ہوتے تو جو کامیابی ان کو حاصل ہوئی اس کا دسواں حصہ بھی حاصل نہ ہوتی حضرت مسیح کے حواریوں نے بسلسلۂ تبلیغ جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اسی راہ میں ان میں سے اکثر جس بیدردی سے قتل ہوئے ہیں اس کی تفصیلات تم سے مخفی نہیں ہیں۔

یہی حال قوموں کی جد و جہد آزادی کا بھی ہے۔ عموماً قہر و جبر آزادی کا سب سے بڑا داعی ہوتا ہے۔ امریکہ والے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اس وقت اٹھے جب وہ انگریزوں کے ظلم و ستم سے عاجز آگئے۔ انگریزوں نے جتنا انھیں دبایا ان کی پوشیدہ قوتیں اسی قدر ابھریں یہانتک کہ وہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور ان کی غلامی سے آزاد ہو کر ہی دم لیا۔ اسی پر دوسرے واقعات کو قیاس کر لو۔ مشاہیر عالم میں بہت سے ایسے گذرے ہیں جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں نہایت گمنام اور پست حیثیت تھے لیکن جب انھیں مقابلہ اور سختی سے دوچار ہونا پڑا تو ان کی مخفی قوتیں ابھر آئیں اور وہ سیادت، و حکومت کے بلند مراتب تک پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنی جماعتیں بنائیں۔ بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد رکھی اور زبردست قوت و اقتدار کے مالک بن بیٹھے ہم سمجھتے ہیں کہ جس وقت محمد علی پاشا مرحوم عثمانی سپاہ کے ساتھ باب عالی کے حکم سے فرانسیسیوں کو مصر سے خارج کرنے کے لئے آئے تھے، اس وقت ان کے خیال میں بھی یہ بات نہیں رہی ہوگی کہ وہ یہاں ایک زبردست حکومت کی بنیاد رکھیں گے اور ان کے بعد ان کا خاندان یہاں صدیوں حکومت کرے گا۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جس وقت وہ فوج کے معمولی مرتبہ سے ترقی کرکے چار ہزار البانی سپاہ کے جنرل مقرر ہوئے ہوں گے، انھوں نے اسی کو اپنی انتہائی خوش قسمتی کی معراج سمجھا ہوگا۔ اگر حالات بدستور رہتے اور انھیں کسی مقاومت سے دوچار ہونا نہ پڑا ہوتا تو وہ یا تو مدت العمر اسی مرتبہ پر باقی رہتے یا شاید اس سے کچھ اونچے ہو جاتے، لیکن بخت و تقدیر نے ایسے اسباب فراہم کر دئے کہ ان کی مخفی قوتیں منظر عام پر آگئیں اور انھوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو انھیں حاصل کرنا تھا سب سے پہلی چیز جس نے انھیں حصول سیادت پر آمادہ کیا وہ، وہ سختی ہے جو اس زمانہ کے والی مصر "خسرو پاشا" کی طرف سے پہونچی تھی۔ یعنی کہ خسرو نے جو فرانسیسیوں کے خروج کے بعد مصر کے پہلے والی مقرر ہوئے تھے، مالک پر سختیاں کیں جس سے مجبور ہو کر وہ صعید میں پناہ گزیں ہو گئے۔ خسرو انھیں نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لئے اس نے ان پر فوج کشی کی، اور محمد علی کو بھی حکم دیا کہ اپنے البانی سپاہیوں کو لے کر کمک کے لئے پہونچیں۔ لیکن محمد علی نے تعمیل حکم میں تاخیر کی اس لئے حملہ ناکام رہا اور فوج شکست کھا کر واپس آگئی۔ شکست خوردہ فوج کے جنرل نے اپنی شکست کی تمام ذمہ داری محمد علی کے سر ڈالدی اور خسرو کو یہ باور کرادیا کہ اگر محمد علی وقت پر پہونچ جاتے تو اسے ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا خسرو پہلے ہی سے محمد علی سے کھٹکتا تھا۔ اس شکایت کے بعد خفیہ طور پر اس کو قتل کرا دینا چاہا چنانچہ اس نے بعض اہم معاملات پر گفتگو کرنے کے بہانے سے آدھی رات کو محمد علی کو قلعہ میں بلا بھیجا محمد علی کو اس کے ارادہ کا علم ہو گیا

اس لئے وہ خود اس سے انتقام لینے کی تیاری کرنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ مالک کی مدد کے بغیر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے ان سے خفیہ طور پر سازباز کرنی شروع کر دی اور انھیں اپنی مدد پر آمادہ کر لیا یہانتک کہ وہ خسرو اور اس کے قایم مقام کو ولایت سے محروم کرکے خود اس کا مالک بن بیٹھا جیسا کہ معلوم ہے۔

مشہور مصلح لوتھر کے حالات زندگی سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ سولہویں صدی کے اوائل میں اس شخص نے یورپ میں اصلاح و تجدید کی دعوت بڑے زور شور کے ساتھ بلند کی۔ اگر پوپ لیوں دہم نے اس پر قسم قسم کی سختیاں نہ کی ہوتیں اور اسے آزمائش و ابتلا میں نہ ڈالا ہوتا تو وہ صدیوں کے بعد بھی وہ کامیابی نہ حاصل کر سکتا جو چند سال میں اسے حاصل ہو گئی۔ انہی سختیوں نے کیتھولک فرقہ کے ماننے والوں کو اپنی جماعت کی بقا و تحفظ کے لئے جد و جہد پر آمادہ کر دیا اور انھوں نے بہت سی جمعیتیں قایم کر لیں جو کیتھولک کنیسہ کی تقویت کا باعث ہوئیں ان میں سب سے اہم جمعیۃ "الیسوعین" تھی۔

ہمارے لئے ان تمام سے زیادہ واضح مثال محمد احمد سوڈانی کے ظہور و دعوائے مہدیت کی ہے جس کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں اور جس کا مرکز ہم سے بہت قریب تھا۔ اس شخص کی سوانح عمری کے مطالعہ سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کی راہ میں موانع و مشکلات پہاڑ بن کر حائل نہ ہوتیں تو وہ اپنی زندگی میں وہ شہرت و اقتدار نہ حاصل کر سکتا جو اس نے حاصل کی۔ اگر مصری حکومت اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتی اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتی تو اسے نہ تو سوڈان فتح کرنے کا حوصلہ ہوتا اور نہ وہ مصر و شام اور عراق کو نظر اٹھا کر دیکھتا بلکہ غالبًا وہ سنوسی (بلاد غرب) اور شیخ مرغنی (سوڈان) وغیرہ کی طرح اپنی جماعت کا شیخ بن کر رہ جاتا۔ اس شخص کے ظہور کے ابتدائی حالات کو بنظر تدقیق دیکھو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شروع شروع میں صرف عبادت گذاری اور زہد و تقوی سے غرض رکھتا تھا۔ دعوائے مہدیت کا اسے کوئی خیال نہ تھا، لیکن شیخ محمد شریف کی سختیوں نے رفتہ رفتہ اسے اس منزل تک پہونچا دیا۔ محمد احمد جس وقت جوان ہوا ہے، عبادت و زہد کا بہت زیادہ شوق رکھتا تھا، چنانچہ متعدد مشائخ کے حلقہ درس میں داخل ہو کر ان سے اس نے کسب فیض کیا۔ اخیر میں طریقہ سلیمانیہ کے شیخ، محمد شریف کے حلقہ میں شریک ہو گیا اور دن رات عبادت و ذکر میں مشغول رہنے لگا کچھ دنوں کے بعد جیسا کہ اس طریقہ میں دستور تھا وہ خود صاحب حلقہ بنا دیا گیا۔ اور شیخ کی اجازت سے خرطوم کے اس پار جزیرہ ابا میں مقیم ہو کر رشد و ہدایت میں مشغول ہو گیا۔ اور اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے تھوڑی ہی عرصہ میں بہت سے مرید بنا لئے۔ ایک مرتبہ اس کے ایک مرید نے بیٹے کی ختنہ کی تقریب میں دعوت کا اہتمام کیا اور بہت سے لوگوں کو مدعو کیا۔ اس زمانہ میں اس قسم کے موقعوں پر عام طور سے رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے گناہ بخش دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس جشن کے موقع پر رقص و غنا کا بھی انتظام ہوا۔ محمد احمد کو یہ بات پسند نہیں آئی اور نہایت سختی کے ساتھ انھیں اس سے روکنا چاہا۔ مریدین نے عذر کیا کہ خود شیخ طریقہ (محمد شریف) اس کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن محمد احمد نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا شیخ طریقہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ شریعت جس چیز کو ناجائز قرار دیتی ہے، اسے وہ جائز کہیں۔ ان کا یہ جملہ کسی طرح محمد شریف کے کانوں تک پہونچ گیا وہ سن کر بہت افروختہ ہوئے اور محمد احمد کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ محمد احمد نے

حکم کی تعمیل کی اور نہایت عاجزی اور ذلت کے ساتھ حاضر ہو کر، فقہا و مشائخ کے ایک بڑے مجمع کے سامنے معافی طلب کی لیکن محمد شریف اسے معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوا اور نہایت سختی کے ساتھ ڈانٹا پھٹکارا اور اس کا نام بھی سلسلہ سے خارج کر دیا گیا۔ محمد احمد کو اس کا بہت افسوس ہوا اور وہ نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ واپس چلا گیا لیکن اسے کسی طرح اطمینان نصیب نہیں ہوا اس لئے دوبارہ شیخ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ سر پر خاک ڈالے ہوئے تھا اور بطور علامت تذلیل گردن میں دوشاخہ لکڑی پڑی ہوئی تھی۔ اس پر بھی شیخ کو رحم نہیں آیا اور بہت زیادہ غضب و سختی کے ساتھ پیش آیا۔ اور ہر طرح اس کی تذلیل کی۔ اب جو محمد احمد اس کے دربار سے نکلا تو غصہ اور احساس عجز سے اس کا بُرا حال تھا اس نے اسی وقت ٹھان لیا کہ جس طرح بھی ہو محمد شریف سے اس اہانت و تحقیر کا بدلہ ضرور لے گا اور اس کے لئے تدبیریں سوچنے لگا ایک اور شیخ طریقہ تھے جن سے اور شیخ شریف سے کچھ ان بن تھی انھوں نے محمد احمد کو اپنے حلقہ میں شریک کر لینا قبول کر لیا محمد احمد انتقام کے لئے بے تاب تھا۔ نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی ہمدردی پر لوگوں کو آمادہ کرتا رہا یہاں تک کہ تھوڑے عرصہ میں اتنی بڑی جماعت طیار کر لی کہ شیخ شریف کو خوف لاحق ہونے لگا۔ چنانچہ اُنھوں نے احمد کے پاس اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ اسے کسی طرح راضی کر لیں اور اسے معاف کر دینے کا بھی وعدہ کیا۔ مگر محمد احمد کسی طرح راضی نہیں ہوا اُدھر سے جس قدر منانے کی کوشش کی گئی، اس کا انکار بڑھتا گیا۔ جب وہ دوسری مرتبہ محمد شریف کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو اس نے اسکے "دنقلاوی الاصل" ہونے پر شرم دلائی تھی۔ اب جب محمد شریف اس کی خوشامدیں کرنے لگا تو اس نے نہایت استہزا کے ساتھ کہلا بھیجا کہ "مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے جیسے دنقلاوی کے لئے آپ اس طرح نیچے اُتر آئیں" اس کا یہ جواب تمام سوڈان میں مشہور ہو گیا۔ اور یہی اس کی شہرت کی ابتدا تھی اس کے بعد اس کی دعوت کا جو حال ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

پچھلی سطروں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اگر محمد شریف کی سختیاں نہ ہوتیں تو وہ جس حال میں تھا پڑا رہتا اور ہرگز جماعتیں بنانے اور جدوجہد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اسی پر ان تمام واقعات کو قیاس کر لو جو ہر روز ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہم خود اپنے اندر بھی دیکھتے رہیں اور اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کا حال بھی جانتے ہیں کہ جس قدر سختیاں بڑھتی ہیں، ہمارے اندر ان کے مقابلہ کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور ہم زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتے جاتے ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات خاص طور پر بیان کر دینی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے اندر دباؤ۔ مقاومت اور رگڑ برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتیں مثلاً شیشہ کہ اگر کسی وزنی چیز سے اسے دباؤ تو حرارت ظاہر ہونے سے پہلے ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح پھٹکری کو اگر گھسنے یا رگڑنے لگو تو ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ یہی حال انسان کا بھی ہے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر ذرا سختی پڑتی ہے یا کسی دشواری سے انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے، ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسان کی راہ میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں اور جو عوارض اسے پیش آتے ہیں، ان کے دفع و مقابلہ میں لوگوں کا حال جُدا جُدا ہوتا ہے۔ جب ان کا واسطہ کسی ایسے شخص سے پڑتا ہے جس کے اندر قوت و طاقت کا خزانہ چھپا ہوا ہوتا ہے تو یہ مشکلات و مصائب اس کے ظہور کا سبب بن جاتی ہیں۔ وہ انھیں برداشت کر کے اور نئے جوش و ولولہ کو کام میں لا کر عزت و شہرت کے بلند مراتب تک پہونچ جاتا ہے۔ اور جب کسی کمزور کو لاحق ہوتی ہیں تو اسے اور زیادہ ضعیف بناتی ہیں یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے بڑے بڑے کام شروع کئے اور اہم امور اپنے ہاتھ میں لئے لیکن جب صعوبتیں سدراہ ہوئیں ہمت ہار کے بیٹھ رہے اس لئے ذلیل و ناکام ہوئے۔ تعایشی کو دیکھو جو سوڈان مہدیت کے تخت و تاج کا مالک تھا چونکہ وہ اپنے اندر زیادہ صلاحیت نہیں رکھتا تھا علاوہ وہ مصری حکومت کے ایک حملہ کے مقابلہ کی بھی تاب نہ لا سکا اور اس کی حکومت کی عمارت دم بھر میں منہدم ہو گئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مشکلات و مصائب لوگوں کی قوت و ضعف کے امتحان کی کسوٹی ہیں جس طرح پتھر رگڑنے سے گرم ہو جاتا ہے اور پھٹکری ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اسی طرح جب کسی طاقتور کو دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ اسکی اضافہ قوت کی باعث بنجاتی ہیں اور جب کسی کمزور آدمی کو لاحق ہو جاتی ہیں تو اسکے ضعف کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اللہ کے خلق میں ہزار حکمتیں ہیں جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں۔

(ترجمہ)

رباعیات

از جناب عبدالرحمٰن طارق بی اے

(۱)

جہاں کو نعرۂ حق سے ہلا دے — لحد میں سوتے مُردوں کو جگا دے
زمانہ گر ترا یاور نہیں ہے — ستارے توڑ دے گردوں جلا دے

(۲)

خودی سے میں بہشتِ جاوداں ہوں — خودی سے قدسیوں کا ہمزباں ہوں
حیات و موت کی عقدہ کشا ہوں — خطِ لوح و قلم کا رازداں ہوں

(۳)

فروغِ یک نفس آدم نہیں ہے — سراپا جستجو ہے، غم نہیں ہے
خودی کے ضبط میں جو لمحہ گذرے — حیاتِ جاوداں سے کم نہیں ہے

(۴)

خودی سے دل ترا محکم نہیں ہے — حیاتِ عشق سے ہمدم نہیں ہے
تجھے گر غیر روندیں بھی عجب کیا — تو اپنی ذات کا محرم نہیں ہے

(۵)

نشانِ سجدہ ہے تیری جبیں میں — صنم پنہاں ہیں لیکن آستیں میں
کبھی مسجد کبھی شوقِ کلیسا — یہ دوروئی کہاں جائز ہے دیں میں؟

(۶)

زمینِ شعر میں روحِ سعید پیدا کر — مٹا قدیم کو رنگِ جدید پیدا کر
خودی کے ضبط سے اعجازِ خودنما ہو جا — گلا کے موم کو جسمِ حدید پیدا کر

(۷)

خلیل سا کوئی قاہر ندیم پیدا کر — یقینِ محکم و قلبِ سلیم پیدا کر
خدا کا نور ہے مضطر تری نگہ کے لئے — خودی کے طور پہ شوقِ کلیم پیدا کر

اُردو ٹائپ

از جناب سید مرتضیٰ قادری - اسلامیہ عربیہ کالج کرنال

کسی زبان میں ٹائپ کی ضرورت اور اسکی سہولتوں سے کون انکار کرسکتا ہے؟ حق تو یہ ہے کہ ٹائپ زبان کے حق میں بمنزل روح کے ہے۔ جس زبان میں ٹائپ موجود ہے اُس زبان کی ضخیم سے ضخیم کتاب بھی صرف ٹائپ کی وجہ سے چند داموں میں مل جاتی ہے۔ آج اسی کی بدولت انگلستان میں ایک اخبار صرف ایک روز میں تین تین، چار چار اڈیشن سو دو سو نہیں، لاکھوں کی تعداد میں بآسانی شائع کرسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ آج تک ہماری زبان ان فوائد سے محروم نظر آتی ہے اور آج بھی جبکہ اُردو زبان اور اردو پریس روزمرہ کی مشکلات سے تنگ آکر چیخ رہا ہے، ہمارے بزرگ اسکی طرف پوری توجہ نہیں کرتے۔

اُردو ٹائپ کے سوال پر بحث کرتے ہوئے بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اس زبان سے ہم آواز حروف کو نکال کر اُس آواز کا صرف ایک ایک حرف رکھ لیا جائے مثلاً ث۔ س۔ ص کی بجائے محض س لکھا جائے ذ۔ ض اور ظ کے بجائے فقط ز لکھا کریں، ع اور الف کی جگہ فقط الف اور ت اور ط کی جگہ فقط ت اور ق اور خ کی جگہ محض خ ہی استعمال کیا کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو حروف تہجی بہت کم ہو جائیں، اور ایک حد تک نوآموزوں کے لئے آسانی بھی ہو جائے گی، مگر اُردو ادب پر اس طرح جو کاری ضرب لگے گی اور جو مشکلات پیش آئیں گی، ان کے بیان کی حاجت نہیں۔ اس لئے اس قسم کی عمل جراحی کا خیال تو ہم کو اپنے دل سے بالکل نکال ہی دینا چاہئے۔ البتہ یہ بات ضرور قابل غور و لائق عمل ہے کہ اُردو میں انگریزی کی طرح دو قسم کے رسم الخط جاری کئے جائیں۔ ایک تو چھپنے کے لئے اور دوسرا روزمرہ کی خط و کتابت وغیرہ کے لئے۔ جو رسم الخط چھپنے کے لئے ہو وہ اخبارات اور رسائل کے لئے خاص ہو اور اس کا ہر حرف جدا جدا لکھا جائے۔

جیسا کہ۔ اردو، ورق، روز، رزم اور زرد وغیرہ میں آج بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن جو رسم الخط روزمرہ کی خط و کتابت کے لئے ہو وہ بالکل وہی ہو جسے ہم آج کل استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کسی اصلاح و تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

بہر حال اگر اُردو کے وہ ہمدرد جنکو خدا نے علم، عقل اور وجاہت و دولت دی ہے وہ اگر اسطرف توجہ کریں تو پھر اُردو ٹائپ کا سوال کوئی مشکل سوال نہیں رہتا۔ اگر ہم ذراسی بھی کوشش کریں تو چند سال میں لوگ دو رسم الخطوں کا عادی بنا سکتے ہیں۔

مجھے یقین نہیں آتا کہ اُردو میں دو رسم الخط کے رواج کو کوئی شخص مشکل یا اَن ہونی بات خیال کرتا ہو، کیونکہ ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ انگریزی زبان میں ایک چھوڑ چار رسم الخط رائج ہیں۔ لکھنے کے دو، چھاپے کے دو۔ پھر بھی اس کو سیکھنے میں کوئی دقت نہیں۔ اور یہاں اُردو میں تو صرف دو ہی رسم الخط جاری ہونگے۔

جب اس مسئلہ کی معقولیت کا یقین ہو جائے تو ہمارے لئے اس کے امکانات اور عملی طریقوں پر غور کرنا رہ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک خاکہ پیش کروں گا۔ لیکن اس کی حیثیت صرف ایک اشارہ کی سی ہوگی۔

بہی خواہانِ اُردو کو چاہئے کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔ ذیل کے چند حروف ایسے ہیں جن کی شکل ٹائپ میں بدل جائے گی۔

ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ س ش ص ض ع غ ف ق ک گ ل ن ء اور ی (معروف) باقی حروف اپنی صورت پر قایم رہیں گے یعنے ا د ذ ر ڑ ز ط ظ م و ہ ے

چھاپے کے رسم الخط کا نمونہ یہ ہوگا:۔

م ی ن (مینہ) ا پ ن ی (اپنے) ز ب ا ن (زبان) ک ے (کی) ب ہ ی خ و ا ہ (بہی خواہ) ح ض ر ا ت (حضرات) س ے (سے) گ ذ ا ر ش (گذارش) ک ر ت ا (کرتا) ہ و ں (ہوں) ک ہ (کہ) و ہ ا پ ن ی (اپنی) ز ب ا ن (زبان) ک ی (کی) ت ر ق ی (ترقی) ک ے (کے) د ی ت ے (دیتے) ح ت ی ا ل ا م ک ا ن (حتی الامکان) ک و ش ش (کوشش) ک ر ی ن (کریں)

اس قسم کی عبارت میں حسب ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا

(۱) عین اور ہمزہ میں امتیاز کرنے کے لئے عین اس طرح ع اور ہمزہ اس طرح (ء) لکھا جائیگا

(۲) ساکن حروف گرا دئے جائیں گے یا ان حروف پر کوئی خاص علامت لگائی جائے گی۔

(۳) مشدد حروف کو مکرر لکھا جائے گا۔

(۴) الف مقصورہ۔ الف ممدودہ۔ دو زبر والا الف اور واو معدولہ مستقل حروف ہوں گے۔ مثلاً آ، آ (آ) م ر ت ض ی (مرتضیٰ) ب ہ ت (بہت) خ و ش (خوش) ہ م (ہم) ف و ر اً (فوراً) ز ک و ۃ (زکوٰۃ) ا د ا ک ر (اداکر)

گو اول اول ہمیں اس قسم کی عبارت کا پڑھنا بہت دشوار معلوم ہوگا، مگر رفتہ رفتہ یہ دشواری محسوس نہ ہوگی۔

مجھے اس وقت اس مسئلہ پر مفصل بحث کرنا منظور نہیں صرف اپنے بزرگوں کے خیالات کو اس طرف متوجہ کرنا میرا مقصود ہے۔ اگر یہ کام بڑے ہاتھوں میں آجائے تو ممکن ہے بہت جلد پریس کی شکایات رفع اور مشکلات حل ہو جائیں۔

ســ م ن ز ہ گ و ی م ک ہ ا ی ن م ک ن آ ن ک ن
م ح ا ح ت ب ی ن و ک ا ر آ ح ا ں - ک ن

سوراج

کانگرس کا ہے اشارہ کہ لیا اب سوراج
لیگ کہتی ہے ادھر آؤ رکھو سر پر تاج
ہے اگر ہندو و مسلم کی یہی رسہ کشی
سر پہ دونوں کے گرا دکھا ہے قصر معراج

(علامہ فرقت بجنوری)

سرزمین ہند کا گمنام زمخشری

(از جناب مولانا محمد عمر نعانی۔ شملہ)

آج سے ٹھیک ۳۳ سال قبل علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم القرآن اور جمہرۃ البلاغۃ پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"عام قیاس یہ ہے۔ کہ صاحب کمال کسی صورت میں گمنام نہیں رہ سکتا۔ تجربہ اور تاریخ بھی اسکی شہادت دیتے آئے ہیں۔ لیکن کوئی کلیہ مستثنیٰ سے خالی نہیں۔ مولوی حمید الدین جن کی ایک عجیب وغریب تصنیف کا ہم اس وقت ذکر کرنا چاہتے ہیں اس استثناء کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ مولوی صاحب موصوف نے پہلے قدیم طریقہ کے موافق تعلیم پائی۔ یعنی درس نظامیہ کے مطابق فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر مولنا فیض الحسن صاحب شارح حماسہ سے جو میرے بھی استاد ہیں۔ ادب کی تکمیل کی۔ اس کے بعد انگریزی شروع کی۔ اور مدرسۃ العلوم (علیگڈھ) میں رہ کر بی اے کی سند حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں سر سید مرحوم کے حکم سے انھوں نے سیرت نبوی صلعم کے متعلق دو کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیں۔ جو مدرسۃ العلوم کے نصاب دینیات میں شامل ہیں۔ اور چھپکر شائع ہوچکی ہیں۔ مدرسہ سے نکل کر کراچی کے مدرسۃ الاسلام میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور اب تک اسی عہدہ پر ہیں۔ ان کا فارسی دیوان چھپ کر شائع ہوچکا ہے۔ لارڈ کرزن جب سواحل عرب کی مہم پر گئے تھے۔ اور سرداران عرب کے سامنے عربی زبان میں لارڈ کرزن کی طرف سے جو تقریر پڑھی گئی تھی وہ انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک قسم کا واقعہ بھی انسان کی شہرت کے لئے کافی ہوسکتا ہے لیکن مولوی صاحب اب بھی گم نام ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہے اور اگر وہ اس خواہش میں ہمیشہ کامیاب رہیں تو ہمارا کوئی حرج نہیں۔ لیکن ان کی جس تصنیف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم ان کی خواہش کی پیروی نہیں کرسکتے یہ تصنیف (خصوصًا اس زمانہ میں) اسلامی جماعت کے لئے اسی قدر مفید اور ضروری ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جان کے لئے آبِ زلال۔

افسوس ہے کہ مصنف نے یہ کتاب عربی زبان میں لکھی ہے اور اس لئے عام لوگ اس سے متمتع نہیں ہوسکتے۔ ہم نے ان سے بارہا کہا کہ اس زمانہ میں جو کچھ لکھنا چاہئے ملکی زبان میں لکھنا چاہئے۔ . . . . لیکن ان کی قدامت پرستی، اُردو کی طرف ان کو مائل نہیں ہونے دیتی"

علامہ فراہیؒ نے جن کو خدا نے قرآن فہمی میں ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا سا ملکہ عطا فرمایا تھا، قرآن پر ایک مہتم بالشان ذخیرہ اپنی جگر کاویوں سے فراہم کیا تھا لیکن افسوس ہے۔ کہ علوم اسلامیہ سے بے اعتنائی کہئے یا زبان عربی سے بے اتفاقی کہ یہ ذخیرہ اب تک اُردو میں منتقل نہیں ہوسکا۔

آپ کو عربی زبان میں جو مہارت تھی اسکی وجہ سے آپ نے جو کچھ لکھا صرف عربی ہی میں لکھا لیکن چونکہ ہمارے عوام تو کیا خواص بھی اب اس زبان سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں اس لئے ہم میں سے بہت کم ہیں جو علامہ موصوف کے نام سے بھی واقف ہوں۔ میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مولانا کی تمام تصنیفات (جن میں سے بہت سی شائع بھی . . . . ہوچکی ہیں) اُردو کا جامہ پہن لیں تو قرآن فہمی کی بہت سی دشوار گزار راہیں طے ہوجائیں اور آج ہر اس "روشن خیال" شخص کو جو اُردو انگریزی کی چند کتابیں جمع کرلینے کے بعد ترجمان اسلام کی حیثیت میں کوس لمن الملک بجانے کا خوگر ہوچکا ہے، حقائق ومعارف قرآنیہ کی راہ میں بیراہ روی کی جرأت نہ ہو۔

ذیل میں علامہ فراہی کی ان معرکۃ الآرا تصنیفوں کے نام لکھتا ہوں جو کلام ربانی پر دنیا کی بہترین تصانیف ہیں لیکن افسوس کہ یہ اب تک شائع ہوکر عوام کی آنکھوں کو جلا نہ بخش سکیں۔

(۱) بقیہ تفسیر سورمن القرآن (۲) جمہرۃ البلاغۃ (۳) فلسفہ البلاغۃ (۴) سلیقۃ العروض۔ (۵) دلائل الی النحو جدید والمعانی والعروض والبلاغۃ (۶) ملکوت اللہ (۷) الرائع فی اصول الشرائع (۸) اسالیب القرآن۔ (۹) احکام الاصول باحکام الرسول۔ (۱۰) القائد الی عیون العقائد (۱۱) کتاب العقل وما فوق العقل۔ (۱۲) الاکلیل فی شرح الانجیل (۱۳) اسباب النزول ای نزول القرآن (۱۴) تاریخ القرآن (۱۵) اوصاف القرآن (۱۶) فقہ القرآن۔ (۱۷) حجج القرآن (۱۸) کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ والمنسوخ (۱۹) رسالہ اصلاح الناس۔ (۲۰) کتاب اصول التاویل (۲۱) مفردات القرآن یعنی تحقیق معانی کلمات القرآن بالقرآن۔ (۲۲) دلائل النظام (۲۳) الازمان والادیان (۲۴) کتاب الحکمۃ (۲۵) القسطاس فی علوم جدیدہ (۲۶) دیوان العربی۔

ذہین وذکی طبیعتیں جو "خط کا مضمون بھانپ لیتی ہیں لفافہ دیکھ کر" ان ناموں کو دیکھنے کے بعد ہی علامہ فراہیؒ کے ذہن ثاقب ورائے صائب کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکیں اگر یہ کتابیں یورپ میں مدون ہوئی ہوتیں تو اب تک ان کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہوتے۔

اگرچہ اس کام کو کرنے کے لئے ایک وسیع ادارہ کی ضرورت تھی مگر ہماری بدمذاقی وکور ذوقی نے آج تک ہمیں اس کا موقعہ نہ دیا کہ ان اہم قلمی مسودوں کو ترتیب دے کر ان کو عربی اور اُردو میں شائع کراسکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) کے ارباب کار نے اس طرف کافی توجہ کی ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی جیسے فاضل بزرگ کے قلم سے اس وقت تک علامہ مرحوم کی تصانیف کے بعض حصے زیور طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں لیکن اگر ملک وقوم نے اس ادارہ کی طرف سے یونہی بے اعتنائی وبے توجہی برتی جیسی آجکل برتی جارہی ہے تو پھر اتنے اہم کام کا انجام پانا مشکل نظر آتا ہے۔ ہماری حالت تو آجکل یہ ہوگئی ہے کہ ہم اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا کثیر حصہ رنگ رلیوں، لہو ولعب اور بیجا تفریحات میں تو بڑی خوشی سے اُڑا دیتے ہیں لیکن قومی وملی کاموں کے لئے ہماری جیبیں ہمیشہ خالی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادارہ اب تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکا ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی مالی زبوں حالی اسے اس قابل بھی نہ چھوڑے کہ اس وقت اس کی بدولت سال میں جو چند کتابیں ہمیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں وہ بھی نہ مل سکیں۔

علامہ حمید الدین فراہی کی ہستی اُن ہستیوں میں سے تھی جن پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ آپ کو بجا طور پر ابن قیم اور زمخشری کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کتنی حیرت انگیز ہے یہ بات کہ ہم انکی تصانیف سے بے خبر ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں ہمیشہ شہرت کو نفرت کی۔ اس لئے جو کچھ لکھا اسے چھپوانے کی کوشش کبھی نہ کی۔ یہی سبب ہے

کہ آپ کے کتب خانہ میں آپ کی تصنیفات کے جواہر پارے غیر مطبوعہ شکل میں پڑے ہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ یہ عربی میں بھی شائع ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ان کا ترجمہ اردو میں ہونا ہے۔ مدرستہ الاصلاح سرائے میر سے زیادہ بہتر اس کام کے لئے اور کون موزوں ہو سکتا ہے کہ اسے علامہ مرحوم کے شاگردان رشید چلا رہے ہیں اور اُن ہی کی یادگار میں یہ قایم ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے ارباب ہمت اس کی طرف متوجہ ہوں کہ اُن کی ذراسی توجہ سے ایک ایسا خزینہ لازوال برآمد ہو سکتا ہے جو اُمت بد حال کی موجودہ بدحالیوں میں تریاق واکسیر کا کام دے گا۔

مصر پر ایک سرسری نظر

(باقی مضمون صفحہ ۹۰)

چنانچہ مصر کی آمدنی جس حد تک مساعدت کر سکتی ہے مصر اپنی دفاعی طاقت بڑھانے میں پوری طرح مصروف ہے اس کی فوجی تیاریوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۲۶ء میں فوج کے سلسلہ کے اخراجات کل ۲۲۰۰۰۰۰ پونڈ تھے لیکن اس سال آیندہ پانچ سالوں کے لئے جو فوجی بجٹ تیار ہوا ہے وہ تقریباً ۴۸ ملین پونڈ پر مشتمل ہے اور حسب ذیل طریقوں سے صرف کیا جانے والا ہے

(۱) بیس ملین پونڈ جنگی سروسامان خریدنے اور فوج کے لئے چھاؤنیاں وغیرہ تیار کرنے پر صرف کیے جائیں گے۔

(۲) سات ملین کے صرفہ سے جنگی ہوائی جہازوں کی تعداد پانچ سو تک پہونچائی جائے گی، اور مصر زیریں اور بالائی حصوں میں ہوائی اسٹیشن قائم کیے جائیں گے

(۳) فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے اور اس کو جدید سامان جنگ سے مسلح کرنے کے لئے ۱۲ ملین پونڈ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس رقم کے صرفہ سے مصر میں فوج کی تعداد پچاس ہزار تک پہونچ جائے گی جو جدید اسلحہ جنگ سے مسلح ہوگی (احتیاطی فوج جو ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہوگی اس کے علاوہ ہے)

(۴) سات لاکھ پونڈ تین جنگی کارخانے قائم کرنے پر صرف کیے جائیں گے جن میں سے ایک چھوٹے چھوٹے اسلحہ تیار کرے گا دوسرا ہوائی جہاز بنائے گا اور تیسرا ذخائر کے لئے مخصوص ہوگا

(۵) ۱۰۲۳۰۰۰ پونڈ بحری بیڑہ کو مستحکم بنانے کے لئے رکھے گئے ہیں۔

(۶) بقیہ رقم بری بحری اور ہوائی فوج کے عام مصارف کیلئے ہے

مصر کی مشکلات

تفصیلات بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ مصر اپنے مستقبل کے خطرات سے غافل نہیں ہے اور جہاں تک اس کے بس میں ہے وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے مستقبل کے خطرات سے اپنے کو محفوظ بنا لیا ہے یا جس رفتار سے اس کی فوجی تیاریاں جاری ہیں اس کے لحاظ سے وہ مستقبل قریب میں اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کا اہل ہو جائے گا مصر کو سب سے زیادہ خطرہ اٹلی سے ہے اور اٹلی کی فوجی طاقت اتنی زبردست ہے کہ مصر اگر اپنی تیاریوں کی موجودہ رفتار جاری بھی رکھ سکے تو ایک

عرصہ کے بعد بھی اس کے معمولی حملہ کی تاب نہ لا سکے گا۔ بلاشبہ مصر کا برطانیہ کے ساتھ یہ معاہدہ ہے کہ مشکل کے وقت یہ دونوں ایک دوسرے کی امداد کریں گے اور اس وقت تک برطانیہ مصر کے ساتھ اپنی دوستی کا دم بھی بھر رہا ہے لیکن برطانیہ کے وعدوں اور معاہدوں کا اعتبار ہی کیا؟ حالات بدلنے میں دیر نہیں لگتی اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہو سکتی کہ آیندہ کے بدلے ہوئے حالات میں برطانیہ کے مفاد مصر کی دوستی کے ساتھ اسی طرح وابستہ رہیں گے کہ وہ جنگ یا حملہ کی صورت میں اس کے کچھ کام آ سکے۔ اس وقت بھی اس نے مصر کے ساتھ معاونت کا معاہدہ کچھ اس لئے نہیں کیا ہے کہ اسے مصر سے کوئی بے غرض عشق ہے۔ برطانیہ کو اس سے کیا واسطہ اس نے تو صرف اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ بحالات موجودہ اس کے گوناگوں مصالح مصر کے ساتھ وابستہ ہیں جو بغیر اس کے پورے نہیں ہو سکتے کہ مصر کو اپنی امداد کی امید دلا کر اس کی بیش بہا امدادیں (جو جنگی نقطۂ نظر سے اس کے لئے بے انتہا اہم ہیں) حاصل کرے اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے یہی مصالح ہیں جو مصر کی تمام بدقسمتیوں کا باعث ہیں حتی کہ معاہدہ استقلال کے بعد مصر کو اپنی حفاظت اور اپنی آزادی برقرار رکھنے میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ بھی انہیں مصالح کی پیدا کردہ ہیں۔ برطانیہ نے مصر کے ساتھ معاہدہ تو یہ ثابت کرنے کے لئے کیا تھا کہ وہ مصریوں کو آزاد کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے اپنے مخصوص مصالح کو پورا کرنے کے لئے اس معاہدہ کے ذریعہ ان کو بہت سی ایسی باتوں کا پابند بنا دیا ہے جو نہ صرف یہ کہ آزادی اور خودمختاری کے منافی ہیں بلکہ ان کی وجہ سے مصر کے ہاتھ پاؤں اس طرح بندھ گئے ہیں کہ غیروں کے حملوں سے اپنی حفاظت کرنا تو درکنار خود برطانیہ کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کرنا اس کے لئے دشوار ہو گیا ہے اور مصریوں نے ان پابندیوں کو معاہدہ کے وقت خوشی خوشی اس لئے قبول کر لیا ہے کہ اس وقت تخیلی عروس آزادی سے ہم کنار ہونے کے شوق میں انہیں یہ خبر ہی نہیں تھی کہ یہ پابندیاں جو بظاہر خوشنما یا بے ضرر معلوم ہو رہی ہیں آیندہ ان کے لئے کس قسم کے تباہ کن نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوں گی مثال کے طور پر ہم فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر کا مسئلہ پیش کرتے ہیں معاہدہ سنہ ۳۶ء کی رو سے یہ طے ہوا تھا کہ برطانیہ کی فوجیں مصر کے مرکزی مقامات قاہرہ اور اسکندریہ وغیرہ سے نہر سویز کے علاقہ میں منتقل کر دی جائیں گی جہاں ان کی سکونت وغیرہ کے لئے حکومت مصر اپنے خرچ سے "معقول حدود" کے اندر آرام دہ قسم کی چھاؤنیاں اور بارکیں تیار کرائے گی (مصارف کا ایک چوتھائی حصہ حکومت مصر تعمیر کے بعد حکومت برطانیہ سے وصول کرے گی) اور جب مصری فوجیں اس قابل ہو جائیں گی کہ وہ برطانیہ کی امداد کی محتاج نہ رہیں تو برطانوی فوجیں یہاں سے بھی نکال دی جائیں گی"۔ یہ شرائط بظاہر مصر کے لئے کچھ زیادہ نقصان دہ نہیں معلوم ہوتیں۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ حکومت برطانیہ اپنے تمام مصالح کو خیرباد کہکر اپنی فوجیں یکبارگی مصر سے واپس بلا لے بلکہ اس کے برعکس اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مصر اور برطانیہ کی فوجیں ملا کر ایک کر دی جائیں یا برطانوی فوجوں کو قاہرہ اور اسکندریہ میں نہیں تو ان کے قرب کے مقامات میں رہنے کی اجازت دی جائے ظاہر ہے یہ دونوں باتیں مصریوں کے لئے قابل قبول نہیں تھیں اس لئے ان کے مقابلہ میں انھوں نے یہ زیادہ بہتر اور مفید خیال کیا ... کہ برطانوی فوجیں مرکزی مقامات سے دور نہر سویز کے علاقہ میں آباد کر دی جائیں اور اس میں بھی انھوں نے کچھ ہرج نہیں خیال کیا کہ برطانوی فوجوں کے لئے حکومت مصر اپنے صرفہ سے سویز کے علاقہ میں چھاؤنیاں اور بارکیں تیار کرا دے کیونکہ اس وقت چھاؤنیوں کی تعمیر کے لئے مصر کے مصارف کا تخمینہ ۵ ملین پونڈ سے زیادہ نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ اس رقم کے مقابلہ میں وہ فوائد زیادہ اہم اور قابل لحاظ تھے جو مرکزی مقامات سے برطانوی فوجوں کی علیحدگی سے پہنچنے والے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ یہ بارکیں اور چھاؤنیاں بہرحال [illegible] مصر ہی کے قبضہ میں آنے والی ہیں۔ مگر اب جبکہ معاہدہ [illegible] مصری یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ برطانیہ نے ان [illegible] زبان میں جو مہارت [illegible] کے لئے ان کے غیر انجام بیں [illegible] لیکن [illegible] فائدہ اٹھایا ہے اور اس معاہدہ کے ذریعہ انھوں نے اپنے کو ایسی قیود کا پابند بنا لیا ہے جو سیاسی، اقتصادی اور جنگی تینوں لحاظ سے مصر کے لئے بے حد تباہ کن ہیں۔ معاہدہ پر دستخط کرتے وقت مصریوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مصر کو سویز علاقہ میں جو چھاؤنیاں تعمیر کرانی ہوں گی ان پر اس کو اتنی کثیر رقم صرف کرنا پڑ جائے گی کہ وہ ایک مدت مدید تک اپنے دفاعی پروگرام کو زیر عمل لانے سے معذور ہو جائیگا اور اس طرح برطانیہ کو یہ موقع حاصل ہو جائے گا کہ وہ مصر کی "حفاظت" کے لئے پوری شان و شوکت کے ساتھ وہاں موجود رہے۔ معاہدہ کی رو سے چھاؤنیاں برطانیہ کی حسب خواہش تیار ہونی ہیں اور چونکہ معاہدہ میں نہ عمارتوں کی کوئی حد مقرر ہے اور نہ مصارف کی، صرف ان کے "معقول حدود" کے اندر ہونے کی تصریح پائی جاتی ہے اس لئے اس وسعت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت برطانیہ نے تعمیرات کے لئے ایک ایسا خاکہ پیش کر دیا ہے جس کی تکمیل کے لئے تعمیری کمیٹی کے تخمینہ کے مطابق ۲۱ ملین پونڈ کی ضرورت ہے۔ اتنے مصارف کا تخمینہ سن کر اہل مصر کے ہوش اڑ گئے ہیں اور اب ان کو اچھی طرح نظر آنے لگا ہے کہ تعمیرات اور مصارف نیز سویز کے علاقہ میں برطانوی فوج کی مدت سکونت کی حدیں مقرر نہ کر کے انھوں نے سخت دھوکا کھایا ہے اور اپنی اس غلطی کی وجہ سے انھوں نے برطانیہ کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ جبل طارق کی طرح علاقہ سویز میں بھی اپنی شہنشاہیت کی حفاظت کے لئے ایک زبردست فوجی مرکز قائم کرے اور وہ بھی اس طرح کہ گویہ مرکز خود مصر کے لئے سب سے زیادہ ضرر رساں ہو لیکن اس کی تعمیر و تکمیل اسی کے ہاتھوں اور اسی کے مصارف سے عمل میں آئے[1]۔

معاہدہ کے ان خوفناک متصور نتائج نے مصریوں کو بری طرح پریشان کر رکھا ہے چنانچہ اس وقت مصر میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہی فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ سمجھا جا رہا ہے اور اسی کو حل کرنے میں اس وقت مصر کے مفکرین اور اہل الرائے ..... مصروف ہیں لیکن تاحال کوئی حل ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے مصریوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس کا خیال یہ ہے کہ سویز کے علاقہ میں چھاؤنیاں تعمیر ہی نہ کرائی جائیں اور جو رقم ان پر صرف کی جانے والی ہے وہ مصری فوج کو طاقتور بنانے پر صرف کی جائے اس جماعت کا کہنا یہ ہے کہ اگر قاہرہ اور اسکندریہ سے فوجیں سویز کے علاقہ میں منتقل بھی کر دی گئیں تو اس سے مصر کو کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ جو خطرات یا نقصانات برطانوی فوج کے قاہرہ اور اسکندریہ میں رہنے سے ہو سکتے ہیں وہ اس کے سویز علاقہ میں منتقل ہونے کے بعد بھی بدستور باقی رہیں گے البتہ چھاؤنیوں کی تعمیر کے بعد حکومت برطانیہ کو سویز کے علاقہ میں اپنا زبردست فوجی مرکز قائم کرنے کا موقع مل جائے گا اور چونکہ تعمیر کے گرانقدر مصارف کی وجہ سے مصر اپنے دفاعی وسائل کے استحکام کے لئے ایک عرصہ تک کوئی خاص کام نہیں کر سکے گا اس لئے برطانیہ کی فوجیں بدستور مصر میں موجود رہ کر اس کی آزادی و خودمختاری کو صدمہ پہونچاتی رہیں گی پھر کیوں نہ چھاؤنیوں کی تعمیر پر جو کثیر رقم صرف کی جانے والی ہے وہ مصر کی فوجی قوت میں اضافہ کرنے پر صرف کی جائے تاکہ تھوڑے عرصہ کے اندر مصر خود اپنی حفاظت کا اہل بن جائے جو مصر سے برطانوی فوج کے اخراج کی حقیقی شرط ہے اور جس کے بعد انگریزوں کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی فوجیں شرائط معاہدہ کی روح کے مطابق مصر سے واپس بلا لے رہا معاہدہ کی پابندی کا سوال تو یہ جماعت اس کا جواب

[1] اس معاہدہ کی رو سے چھاؤنیوں کی تعمیر کے مصارف تعمیر کے وقت تمامتر مصر کو برداشت کرنے ہیں ان کا ایک چوتھائی حصہ وہ حکومت مصر سے اسوقت وصول کریگا جب چھاؤنیاں تیار ہو جائیں گی۔

یہ دیتی ہے کہ مصر نے سویز علاقہ میں چھاؤنیاں تعمیر کرنے کی ذمہ داری خود اپنی مرضی سے قبول کی تھی اور اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانی فوجیں مصر کے مرکزی مقامات سے الگ کر دی جائیں۔ پس اگر اب وہ اپنی مصلحت اسی میں دیکھتا ہے کہ برطانوی فوجیں سویز کے علاقہ میں منتقل نہ کی جائیں تو برطانیہ کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

اس خیال کی حامی مصری پارٹیوں میں نوجوان مصر پارٹی ہے اور افراد میں سب سے بڑی شخصیت صدقی پاشا سابق وزیر اعظم مصر کی ہے چنانچہ آپ نے گذشتہ دنوں مصری پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے چھاؤنیوں کی تعمیر کی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی تھی جس پر لندن ٹائمز وغیرہ میں ایک عرصہ تک بڑی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اس کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت پائی جاتی ہے جو اگرچہ پہلی جماعت کے خیالات سے بہت حد تک متفق ہے لیکن اس کے نزدیک یہ بات مصر کے وقار کے خلاف ہے کہ معاہدہ کے ذریعہ جو بات طے ہو چکی ہے اس کی فریق مخالف کی مرضی کے بغیر خلاف ورزی کی جائے اور یہی رائے محمد محمود پاشا موجودہ وزیر اعظم مصر کی بھی ہے چنانچہ صدقی پاشا کی مذکورہ بالا تقریر کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ "جب تک معاہدہ میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے اس کی . . . امانت واخلاص کے ساتھ پابندی حکومت پر فرض ہے"، لیکن ظاہر ہے کہ وقار کے تحفظ کے ساتھ ان مشکلات کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالنا ضروری ہے جو چھاؤنیوں کے کثیر مصارف کی بنا پر پیش آنے والی ہیں اسی لئے محمود پاشا نے گذشتہ سال موسم گرما میں لندن کا سفر اختیار کیا اور گفت وشنید کے بعد حکومت برطانیہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ چھاؤنیوں کی تعمیر کے اخراجات کا چوتھائی کے بجائے نصف حصہ برداشت کرے چنانچہ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ میں ترمیم کی گئی اور اس مطلب کی ایک دفعہ دیگر ترمیموں کے ساتھ بڑھا دی گئی۔

یہ ترمیم بظاہر مصر کے لئے مفید تھی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ برطانیہ تعمیری اخراجات میں چوتھائی کے بجائے نصف کا شریک ہو گیا لیکن حقیقۃً اس سے مصر کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچا اس لئے کہ برطانیہ نے اس اضافہ کی قیمت، معاہدہ میں دوسری ترمیموں سے وصول کر لی ترمیم سے ایک فائدہ تو اسے یہی پہونچا ہے کہ معاہدہ ۱۹۳۶ء میں تبدیلی کا دروازہ کھل گیا حالانکہ اس معاہدہ میں اس ڈر سے کہ فریق قوی مصر کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی ترمیم نہ کر سکے جو مصر کے لئے مضر ہو؛ اہل مصر کے اصرار سے یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ دس سال کے اندر معاہدہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ بعض ترمیموں سے برطانیہ کو نئی سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں جو مصر کے لئے بے انتہا مضر ہیں مثلاً فوجیوں اور فوجی ملازمین کو یہ اجازت مل گئی ہے کہ وہ سویز کے علاقہ میں دوکانیں ہوٹلیں اور مکانات وغیرہ قائم کر سکیں اور مخصوص علاقوں میں ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کر سکیں اور اس سے زیادہ تباہ کن بات یہ ہے کہ ترمیم شدہ معاہدہ میں بعض نئے مدات مصارف کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو اصل معاہدہ میں موجود نہیں تھیں اور جو کروڑوں روپیہ کی طالب ہیں مثلاً ترمیمی معاہدہ میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ

(۱) سلسلہ رسل ورسائل جن کا تذکرہ نفقرہ ۱۲ میں ہے (۲) ریلوے اسٹیشن (۳) ہوائی قوت اور (۴) صحت گاہوں اور تفریح گاہوں وغیرہ (جو علاقہ سویز میں رہنے والوں کے لئے ضروری ہونگی)، کے مصارف میں حکومت برطانیہ شریک نہیں ہوگی گویا دکھانے کو تو حکومت برطانیہ نے چھاؤنیوں کی تعمیری اخراجات میں نصف کی شریک ہو کر مصر پر بہت بڑا احسان کیا ہے لیکن حقیقۃً اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ بار سے گرانبار بنا دیا ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ترمیم کے ذریعہ خود چھاؤنیوں کے تعمیری مصارف میں اس کی نصف کی شرکت بھی مصر کے لیے کچھ نفع بخش ثابت نہیں ہوئی اس لئے کہ ترمیم سے پہلے تو مصر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ تعمیری کمیٹی نے جو ۱۲ ملین پونڈ کا تخمینہ پیش کیا ہے اس میں ثالثی بورڈ[1] کے ذریعہ معقول

[1] معاہدہ کی رو سے ایک کمیٹی مقرر ہوئی ہے جس کا کام یہ ہے کہ اختلافی مسائل کا تصفیہ کرے اس میں تین ممبر ہیں جنمیں سے ایک مصری ہے دوسرا برطانیہ کا اور تیسرا غیر جانبدار رہے اور دونوں کا معتمد علیہ ہے۔

تخفیف کرائے یا دوسرے ذرائع ودلائل سے کام لے کر حکومت برطانیہ ہی کو مجبور کرے کہ ابتدا میں خود اس نے ملین کا جو تخمینہ پیش کیا تھا اسی کو تھوڑے بہت اضافہ کے ساتھ برقرار رکھے لیکن اب ترمیم شدہ معاہدہ کی رو سے مصر تعمیری کمیٹی کا پیش کردہ تخمینہ ہی منظور کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اس لیے کہ اس میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ

"آج جس معاہدہ پر دستخط ثبت ہو رہے ہیں اس کے احکام میں ان تخمینوں کی رعایت کی گئی ہے جسے مصری نمائندوں نے اپنے دس مئی ۱۹۳۸ء کے اجتماع میں پیش کیا تھا"

اور یہ تخمینے وہی ۱۲ ملین پونڈ کے ہیں گویا اب یہ تخمینے معاہدہ کے جزو بن چکے ہیں "پر لطف بات یہ ہے کہ اتنی واضح تصریح کے بعد بھی محمود پاشا اپنے ذہن میں یہ خیال لے کر لندن سے واپس آئے ہیں کہ اب بھی مصر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تعمیری کمیٹی کے تخمینہ

کو ثالثی بورڈ میں پیش کرکے اسمیں تخفیف کرائے چنانچہ لندن سے واپسی پر انھوں نے نامہ نگار الاہرام کو حسب ذیل بیان دیا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ قامت برطانیہ کے خاکے کی تکمیل کے لئے تعمیری کمیٹی نے مصارف کا جو اندازہ لگایا ہے وہ ابتدائی نوعیت رکھتا ہے اور ایک کمیٹی ثالثی بورڈ کے نام سے موجود ہے جو اس مسئلہ پر غور کرے گی کہ آیا یہ خاکے اور تخمینے لازمی ہیں یا ان میں ترمیم کی گنجائش ہے" (الاہرام ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء)

مذکورہ بالا تفصیلات پڑھنے سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ معاہدہ میں [1] ترمیم کے بعد بھی چھاؤنیوں کی تعمیر کی مشکلات دور نہیں ہوئیں، بلکہ اس کی بجائے اور نئی نئی مشکلات پیدا ہو گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ حکومت برطانیہ نے مصر کو بہت سے معاملات میں آزادی دیدی ہے لیکن جہاں تک فوجی مسائل کا تعلق ہے وہ تمام تر برطانیہ کے رحم وکرم پر ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ صورت حال کب تک باقی رہے گی جب تک برطانیہ کے جنگی مفاد مصر کے ساتھ وابستہ ہیں اس وقت تک تو بظاہر اس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے یوں اہل مصر کوئی معجزہ کر دکھائیں تو اس کی بات اور ہے

مذہبی ترقیاں

آزادی کے بعد مصر میں جو نیا دور شروع ہوا ہے وہ مذہبی ترقیوں کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ اہم اور خوش آیند ہے مشرقی ممالک میں مصر ہی وہ ملک ہے جو یورپین تہذیب و تمدن سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوا چنانچہ ایک عرصہ تک مصریوں پر مغرب اپنی جملہ لعنتوں کے ساتھ پوری طرح مسلط رہا اور اس اثنا میں اگرچہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات مٹ نہیں سکے لیکن وہ مدہم ضرور پڑ گئے مگر یہ دور "ظلمت" بہت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکا ایک طرف تو تجربات سے مغرب کے پول ان پر خود بخود کھلتے گئے اور دوسری طرف جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور سید رشید رضا مرحوم کے روحانی تصرفات اور انقلابی دعوت رشد و ہدایت نے اپنا اثر دکھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مصری ہزار دن راستوں سے بھٹکتے ہوئے اور ہر ایک کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے بالآخر اسی صراط مستقیم پر آ گئے جسے انھوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر چھوڑا تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے ان کی یہ گمرہی بھی بے سود نہیں رہی اپنا قدیم جادہ چھوڑ کر جب انھوں نے مغرب کا راستہ اختیار کیا تو وہ تمام عیوب و نقائص درمیان ہی میں چھوٹ گئیں جو پہلے سے ان کو چمٹی ہوئی تھیں اور جب وہ آخر میں اس کی طرف پھر واپس آئے ہیں تو وہ اپنے ساتھ راستہ میں پڑی ہوئی اچھی چیزوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ لے کر آئے ہیں۔ اب مصر میں ترکی کی سی انتہاپسندی پائی جاتی ہے اور نہ ہندوستان جیسا جمود اس نے دونوں کو چھوڑ کر وسط کی راہ اختیار کر لی ہے اور اسی پر وہ استقلال کے ساتھ گامزن ہے ایک طرف وہاں مذہب کا اتنا شدید جذبہ پایا جاتا ہے کہ جامعہ فواد اول میں ایک انگریزی ناول داخل کیا جاتا ہے جس میں آنحضرت صلعم کی شان میں کچھ ناروا و نازیبا کلمات ہوتے ہیں تو اس پر نہ صرف یہ کہ یونیورسٹی کے طلبہ زبردست ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں بلکہ پورے ملک میں ایک جوش و اضطراب پھیل جاتا ہے، اور بالآخر پرنسپل جامعہ ڈاکٹر طہٰ حسین اپنی آزاد خیالی کے باوجود نہ صرف اس کے اخراج پر بلکہ ابتداءً اخراج میں لیت و لعل کرنے کے نتیجہ کے طور پر خود استعفا دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں، اور استاذ احمد حسین ایک سلسلہ مقالات لکھتے ہیں جس میں وہ نوجوان مصر پارٹی کے ممبران کو علانیہ شراب کی دکانیں برباد کر دینے کا جوش دلاتے ہیں اور نتیجتاً کچھ دکانیں برباد بھی کر دیجاتی ہیں ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے لیکن وہ اپنی صفائی میں صرف یہ کہتے ہیں کہ مذہب نے شراب کو ناجائز قرار دیا ہے اور وہ اپنے مذہبی جذبات سے ایسا کرنے پر مجبور ہیں اور اس صفائی پر وہ چھوڑ دیئے جاتے ہیں، اور دوسری طرف وہاں اس درجہ روشن خیالی بھی پائی جاتی ہے کہ آج ہندوستان میں جن چیزوں کو کفر و اسلام کا معیار سمجھا جا رہا ہے ان کی وہاں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے مصر کی روشن خیالی کا اندازہ وہاں کے ایک اسلامی اخبار الدستور کے حسب ذیل جملوں سے ہو سکتا ہے جو اس نے مصر میں احیاء خلافت کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے ایک شذرہ کے آخر میں لکھی تھی۔

اسلام پاپائیت اور پاپاؤں کے ڈکٹیٹروں کا دشمن ہے، اور ہم نے بہت سی قوموں کو دیکھا ہے کہ انھوں نے اسلام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے یہاں خانقاہیں قائم کیں اور اپنے لئے مشائخ اور سلسلے کھڑے کئے جس کا نتیجہ تعلیم میں رکاوٹ آزادی پر پابندی اور افکار کی جکڑ بندی کی شکل میں نمودار ہوا۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہا جانے لگا کہ مسجدوں میں ٹیلیفون کا استعمال، کفر و زندقہ ہے کیونکہ یہ شیطان کا کام ہے علم جغرافیہ پڑھنا حرام ہے کیونکہ وہ نوجوانوں کو زمین کی کرویت کا عقیدہ سکھاتا ہے حالانکہ ان کے افترار کے مطابق قرآن کی روسے زمین سطح ہے۔ علم تشریح پڑھنا کفر ہے۔ کیونکہ اس سے اسرار خلق میں دخل دینا لازم آتا ہے نیز اس سے نشوء ارتقاء کے مذہب کی تبلیغ ہوتی ہے اس قسم کی اور بہت سی باتیں کہی گئیں جس کا لوگوں کی بصیرتوں پر بہت ہی خراب اثر پڑا متعلمین کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے، اور مذہب کا اقتدار بہت ہی کم ہو گیا کیونکہ لوگ جب اسلام کے نام سے "مذہبی پاپاؤں" کی زبانی ایسی باتیں سنتے ہیں جو ٹھوس، اور مستحکم معلومات کے منافی ہوتی ہیں تو ان پر حیرت طاری ہو جاتی ہے وہ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور قدیم باتوں کے خلاف بغاوت کر بیٹھتے ہیں حالانکہ اگر وہ "پاپائیت" زندہ نہ کر دی جاتی جس کے خلاف اسلام نے اعلان جنگ کیا تھا اور جسے بالکل ختم کر کے چھوڑا تھا تو ان باتوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہ آتی (الدستور بحوالہ الاہرام مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۳۹ء)

پھر مذہب کے اثر و اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مصریوں کے اسلامی ممالک کے ساتھ سیاسی تعلقات بھی خوشگوار و مستحکم ہوتے جا رہے ہیں اور وطنیت کی جو آندھیاں پہلے چلا کرتی تھیں وہ تمام تر غائب ہو چکی ہیں جس کا سب سے بڑا اور تازہ ثبوت قضیہ فلسطین ہے مصر میں عربی ممالک کے نمایندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں وزیر اعظم مصر نے جو تقریر کی تھی اور اس کے بعد مصر اب تک فلسطین کے مسئلہ کے ساتھ جو دلچسپی لے رہا ہے اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی ممالک کے سلسلہ میں اب تک جو بے اعتنائی برتتا رہا ہے اسکی اب وہ تلافی کرنا چاہتا ہے فلسطین کے علاوہ حجاز عراق اور شام کے معاملات میں بھی وہ گہری دلچسپی لے رہا ہے اور اسکی یہ دلچسپی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ یہ گمان کرنے لگے ہیں کہ شاہ فاروق کو خلیفہ بنانے کی تیاریاں ہیں حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے ممکن ہے مصر میں کوئی جماعت ایسی ہو جو یہ خواب شیریں دیکھ رہی ہو لیکن جہاں تک ملک کے مفکرین اور اہل الرائے کا تعلق ہے وہ بحالات موجودہ خلافت کا نام سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں گنجائش نہیں ہے ورنہ اس کے ثبوت میں ہم احیاء خلافت کے متعلق مصر کے مشاہیر اور خاص خاص اخبارات کے بیانات اور تبصروں کے اقتباسات نقل کرتے بہرحال اسلامی ممالک کے ساتھ مصر کی دلچسپی خدانخواستہ کوئی سیاسی نہیں ہے بلکہ اس دینی اور مذہبی تحریک کا قدرتی نتیجہ ہے جو اس وقت مصر میں زور شور کیساتھ شروع ہو چکی ہے اور جو روز

[1] ترمیم شدہ معاہدہ مصری پارلیمنٹ میں ابھی تک تصدیق کے لئے پیش نہیں ہوا ہے غالباً پہلے برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری حاصل کی جائے گی اور اس کے بعد مصری پارلیمنٹ میں برائے تصدیق پیش ہوگا۔

"چند تعلیمی ادارے"

(صفحہ ۹۴ کا باقی مضمون)

اُن کی فراست دنیا کے رجحانات کی صحیح اندازہ داں ہو؛ تاکہ وہ ہر رنگ میں اسلام کی خدمت کر سکیں، اُنکی سیرت میں پختگی، مذہب میں استقامت اور علم میں گہرائی ہو تاکہ عقل ونقل اور دین وسیاست کی کشمکش میں ایمان ویقین کی متاع کو تباہی وبربادی سے بچالیں اور نت نئی راہوں سے دین ومذہب پر جو حملے ہو رہے ہیں اُنھیں دفع کر سکیں"

(نظام ونصب العین دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ)

ان مقاصد کے ساتھ انجمن نے اپنے مقاصد وتبلیغ کی اشاعت کی اور بالآخر ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلما کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا جس کے نصاب تعلیم کو قدیم وجدید علوم کے امتزاج کی ایک کوشش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عربی زبان کے ساتھ انگریزی بھی لازمی طور پر ہر طالب علم کو پڑھنی پڑتی ہے۔ جغرافیہ، حساب، جامیٹری، اور تاریخ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تاکہ طالب علم کو میٹرک کا امتحان دینے میں بھی کوئی دشواری نہ ہو۔ معاشیات اور سیاسیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ معاشیات کی تعلیم میں اصول اور نظریات کے ساتھ ہندوستان کے معاشی حالات بھی بیان کئے جاتے ہیں اسلام کا معاشی نظام بھی طلبا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ سیاسیات کی تعلیم میں نظریات کی تشریح کے بعد برطانی ہند کی سیاسی تاریخ سے بحث کی جاتی ہے۔ قومی مطالبات اور جدید اصلاحات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ سیاسیات کے سلسلہ میں دیگر ممالک کے معاشی نظام سیاسی تغیرات اور آئین وحکومت سے متعلق ضروری امور بھی بتلائے جاتے ہیں اور اسلامی نظام حکومت کا خاکہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ عربی زبان کے سلسلہ میں طالب علم کو صرف کتاب فہمی ہی کا عادی نہیں بنایا جاتا بلکہ لکھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور ڈائرکٹ میتھڈ سے عربی زبان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ایک میونیم قائم کیا گیا ہے چوتھی جماعت تک قرآن مجید کا سادہ تشریحی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے جس کے بعد قرآن مجید کی تعلیم علمی انداز میں ہوتی ہے۔ حدیث کی تعلیم بھی ابتدائی جماعتوں سے شروع ہوتی ہے پھر مشکوٰۃ شریف اور صحاح کی دوسری کتابوں کا درس ہوتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ جدیدہ کی تعلیم کا مستقل انتظام تو نہیں ہے البتہ مہینہ میں چار مرتبہ مشہور مسائل پر لکچر کا انتظام کیا گیا ہے طلباء کے استفادہ کے لئے کتب خانہ، دار الاخبار اور ورزش کا بھی انتظام ہے۔ طلبہ کی ایک انجمن "الاصلاح" بھی قائم ہے جس کے ماتحت علمی وادبی مشاغل انجام پاتے ہیں۔ باہر کے طلبا کے لئے دار الاقامہ کا انتظام بھی ہے۔ طلبہ سے قیام وتعلیم کی فیس نہیں لی جاتی۔ البتہ طعام کی فیس ضرور لی جاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلما میں طلبا کی تعداد مقابلۃً کم رہتی ہے۔ یہ دار العلوم بھی دار العلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی کی طرح بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ چنانچہ نیپال، برما، جاوا، سماترا ملایا اور ترکستان کے طلبا آج کل بھی زیر تعلیم ہیں۔

لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود ایک سب سے بڑا نقص بھی ہے اور وہ یہ کہ دار العلوم ندوۃ العلما نے مسلمانوں کی بے روزگاری کے لئے کوئی حل نہیں پیش کیا۔ فارغ التحصیل طلباء یا تو دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کر کے سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے مجبور ہیں یا پھر تصنیف وتالیف اور تبلیغ واشاعت کے لئے وقف ہو جاتے ہیں۔ موخر الذکر امور یقیناً پسندیدہ ہیں اور اس سلسلہ میں ندویوں کی خدمات بھی بے انتہا مفید ثابت ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں لیکن موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے مناسب حال ادارہ وہی ہو سکتا ہے جو طلبا کو مذہب وحکمت اور سیاست ومعیشت کے علاوہ صنعت وحرفت کا اگر ماہر نہیں تو شناسا ضرور بنا سکے۔ ایک قوم کو مبلغوں اور واعظوں، مصنفوں اور مولفوں کی ضرورت ایک محدود تعداد ہی میں ہو سکتی ہے اس لئے ارباب اختیار کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہندوستانی مسلمانوں کی وہ محبوب درسگاہ ہے جس سے مسلمانوں کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں اور جس کی بنیاد ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڈھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن علیہ الرحمۃ کے متبرک ہاتھوں سے ڈالی گئی اور جس کا مقصد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دیگی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن وتہذیب کی مفید خدمت کرے گی . . . . . . جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشہ کو رکھ کر اُن کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق اُن بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ علم محض روزی کی خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھلانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سب کچھ ہی آجاتا ہے وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر وقیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ اُن کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقہ سے روزی کما سکیں مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا، اُجرت کو خدمات کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے یعنی سوسائٹی میں اپنے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو کہ اُس کی اور اُس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

جامعہ کی ابتدائی زندگی کے متعلق اس موقعہ پر غالباً صرف یہ کہدینا کافی ہوگا کہ چند خیموں اور ڈیروں میں مسلمانوں کی اس مفید یونیورسٹی کا افتتاح ہوا، سب سے پہلے امیر جو جولائی ۱۹۲۵ء میں جامعہ کو دہلی لے آئے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور شیخ الجامعہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ حکیم صاحب موصوف کے انتقال کے بعد جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم امیر جامعہ منتخب ہوئے۔ روز اول ہی سے جامعہ کے مقاصد سے مسلمانوں نے دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر جامعہ کی خدمات اور کامیابیوں نے عوام و خواص سب کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ آج جامعہ ہندوستان کی ایک عظیم الشان آزاد یونیورسٹی ہے جس کا شہرہ غیر ممالک تک پہنچ چکا ہے اور جس کے فارغ التحصیل طلبا زندگی کے تقریباً ہر ایک شعبہ میں ممتاز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جامعہ کو سرکاری اعانت اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت اور حکومت کے اثر سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ مزید معلومات کے لئے حسب ذیل حالات غالباً کافی ہوں گے۔

جامعہ میں فی الحال لڑکیوں کے لئے کوئی مدرسہ نہیں ہے لڑکوں کے لئے حسب ذیل مدرسے ہیں :-

ابتدائی مدرسے ہیں، ایک مقیم طلبہ کے لئے دوسرا غیر مقیم طلبہ کے لئے ایک مدرسہ ثانوی ہے اور ایک کالج ہے۔ مدرسہ ثانوی میں ثانوی اول سے ثانوی چہارم تک چار درجے ہیں اور کالج میں ثانوی پنجم ششم اور درجہ ہائے خاص (سندی بی اے) شامل ہیں۔ اس سال استادوں کا مدرسہ واردھا اسکیم کے اصولوں کے مطابق اُستاد تیار کرنے کی غرض سے جاری کیا گیا ہے۔ تمام تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی ہے لیکن جو طلبہ اُردو نہیں جانتے اُن کو دوسری زبانوں میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تاآنکہ وہ اُردو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ مدت تعلیم ۱۴ سال ہے یعنی منزل ابتدائی کے چھ سال، منزل ثانوی کے چھ سال اور سندی (بی اے) کے دو سال، گویا الف بے سے لیکر بی اے تک کے لئے۔ سند امتیازی کے لئے ایک سال مزید اور اُستادوں کے مدرسہ کے لئے صرف ساڑھے دس مہینہ صرف ہوتے ہیں۔ منزل ابتدائی میں پروجکٹ میتھڈ (منصوبی طریقہ) اور منزل ثانوی کے ابتدائی چار سال (جماعت جونیر) تک انفرادی تعلیم رائج کی جا رہی ہے۔ منزل ابتدائی میں اسلامیات (دینیات اور عربی) اُردو، حساب، انگریزی، معلومات عامہ، ڈرائنگ اور کنڈرگارٹن یا دستکاری کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ کنڈرگارٹن کی تعلیم ایک جرمن خاتون کے سپرد ہے منزل ثانوی کے پہلے چار سال میں حرفہ (نجاری۔ جلد سازی،

کاغذ سازی) کے علاوہ چھ مضمون یعنی اسلامیات، اُردو (مع فارسی وہندی)، ریاضی، انگریزی، تاریخ وجغرافیہ، سائنس یا ڈرائنگ یا پشتو پڑھائی جاتی ہے۔ منزل ثانوی کے آخر دو سال اور سندی (بی اے) کے دو سالوں میں اسلامیات، اُردو، انگریزی، تاریخ معاشیات اور سیاسیات یعنی چھ مضامین ہیں۔ سند امتیازی میں اسلامیات زبان وادب عربی، زبان وادب انگریزی۔ معاشیات وتاریخ میں میں سے کوئی ایک سبق لیا جاسکتا ہے۔ حرفہ میں فی الحال مٹی کے آسان نمونے بنانا۔ جلد سازی، کاغذ سازی، باغبانی، نجاری شامل ہیں۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ متعلم کتابت، کمپونڈری، لیتھو اور ٹائپ کا کام سیکھنا چاہے تو اس کے لئے بھی انتظام ہے۔ دار الاقامہ میں پانچوں وقت کی نماز اساتذہ کی معیت اور نگرانی میں نہایت پابندی سے ادا کی جاتی ہے۔ چھوٹے بچوں کے علاوہ باقی سب کو رمضان کے روزے رکھنا لازمی ہیں۔ کلام مجید کی تلاوت بھی نہایت باقاعدگی سے کرائی جاتی ہے۔ جامعہ میں زیادہ تر کھدر کا لباس رائج ہے لیکن دوسرے کپڑے بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں مگر ریشمی کپڑے کی اجازت نہیں ہے۔

علاوہ ازیں طبی امداد، دار المطالعہ، کتب خانہ وغیرہ کا بھی معقول انتظام ہے۔ طلبہ میں تحریر وتقریر کا مادہ پیدا کرنے اور اُن کی اس قوت میں نشوونما کے لئے مختلف انجمنیں قائم ہیں۔ بچوں کو لین دین سکھانے اور بنکنگ کاروبار سے آشنا کرنے کے لئے ابتدائی درجوں کے دونوں مدرسوں میں ایک ایک بنک اور دوکان قائم ہے جن کا کل کاروبار بچوں کے ہاتھ میں ہے۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا اور جملہ شعبوں کی ضروریات مہیا کرنے اور بڑے طلبہ کو اعلیٰ پیمانہ پر کاروبار چلانا سکھانے کے لئے امداد باہمی کے اصول پر دونوں جگہ ایک اتحادی دوکان قائم ہے جو اساتذہ، طلبا، اور متعلقین جامعہ کے مشترک سرمایہ سے چلتی ہے۔

صبح کی نماز کے بعد کھلے میدان میں ورزش اور شام کے مختلف کھیلوں میں طلبا کی شرکت لازمی ہے۔ جسمانی ورزشوں کے سالانہ مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ تفریحی جلسوں اور ایک کونسرٹ کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ مکتبہ جامعہ کا تذکرہ بھی اس موقعہ پر ضروری ہے جس نے اُردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا اور مختلف علوم وفنون کی مفید کتابیں خوش سلیقگی کے ساتھ شائع کی ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہیں ظاہر ہے کہ جو ادارہ متذکرۃ الصدر مقاصد اور حالات کے ساتھ قابل لوگوں کی نگرانی میں خدمات انجام دے رہا ہو اس سے بڑی سے بڑی توقعات قائم کی جاسکتی ہیں اور بلاشبہ اُس سے قوم وملک کو عظیم الشان فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اس ادارہ کی طرف متوجہ ہوں اور اُن تمام ضروریات کو پورا کر کے اپنا فرض ادا کریں جو فی زمانہ اس محبوب درسگاہ کو لاحق ہیں۔ مثال کے طور پر جامعہ کی عمارت غیر مکمل ہے اور اُس کے لئے امداد کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اس موقعہ پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جامعہ کی آمدنی کا ذریعہ طلبا کی فیس کے علاوہ زیادہ تر غریب مسلمانوں کے چندوں پر ہے۔

کیا پڑھنا چاہیئے؟

(ایک لائبریرین کے قلم سے)

عرصہ ہوا کہ "فہرست" کے نام سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی جو اب اول تو پرانی ہو چکی ہے اور اس میں نئی کتابیں شامل نہیں ہیں دوسرے اس کا طریقہ بھی قابل ترمیم واصلاح ہے اب اُردو لٹریچر میں معتدبہ مفید اضافہ ہو چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ کوئی ایسی جدید فہرست مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جس میں مفید وقابل مطالعہ کتابوں کو ضروری تعارف کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہو تاکہ اُردو لٹریچر میں بہترین اضافہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور پڑھنے والوں کو انتخاب کی اُلجھنوں سے علیحدہ رہ کر ضروری کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ بھی نصیب ہو جاتا۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ مصروفیات زیادہ ہیں اور قومی مذاق کو ایک خاص سانچہ میں بھی ڈھالنا مقصود ہے اور جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر زبان کے لٹریچر میں اچھی اور بری۔ مفید اور مضر ہر قسم کی کتابیں ہوتی ہیں تو کسی ایسی فہرست کا مرتب ہونا جس میں اُردو کی بہترین کتابوں کی سفارش کی گئی ہو انتہائی ضروری ہے۔ ظاہر ہے یہ کام بہت مشکل اور کسی ایک شخص کے بس کا نہیں ہے بلکہ اس قومی وملکی خدمت کو کوئی ایسا ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے جس کے ماتحت ہر علم وفن کے ماہرین کام کرنے کے لئے تیار رہ سکتے ہوں کیونکہ یہ فہرست ہر اعتبار سے مکمل اور اس میں ہر قسم کی اچھی اچھی کتابیں ماہرین کی سفارشات کے ساتھ جداجدا ابواب کی صورت میں جمع ہونی چاہئیں تاکہ ہر مزاج ومذاق کا شخص اپنی ضروریات کے مطابق بہ آسانی کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ اگر کوئی ادارہ اس کے لئے تیار یا قائم نہ ہو سکے جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف علوم وفنون پر علیحدہ علیحدہ فہرستیں مرتب کی جائیں اور یہ کام وہ صاحبان ذوق بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں جن کو کسی خاص علم وفن سے شغف ہے۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے جو غالباً سب سے زیادہ آسان ہے کہ لٹریری مذاق رکھنے والے حضرات اپنی اپنی پسند کی کتابوں کے نام اُن کتابوں کی خصوصیات کے ساتھ دفتر مدینہ میں ارسال فرما دیں تاکہ وہاں فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جائے مجھے اُمید ہے کہ ادارہ مدینہ کو اس خدمت کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا اور مدینہ پریس بھی اس فہرست کی طباعت واشاعت سے گریز نہ کرے گا۔

ذیل میں چند اُن متفرق کتابوں کے نام جو میرے نزدیک آر دو داں طبقہ کے مطالعہ میں ضرور آنی چاہئیں۔ ضروری تعارف کے ساتھ شائع

کئے جاتے ہیں تاکہ فہرست کی ترتیب صورت کے متعلق صحیح اندازہ ہو جائے اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ذیل کی فہرست میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ہر قسم کی کتابیں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں اور نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ذیل کی فہرست ہر قسم کی ترمیم و تنسیخ سے بالاتر ہے اور یہ تو بہرحال ظاہر ہی ہے کہ یہ مکمل نہیں ہے۔

مطبوعات دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی ۔ جلد ۔ مصنفہ علامہ شبلی و مولانا سید سلیمان ندوی ضخامت حصہ اول ۷۹۱ صفحے قیمت للعہ ، ضخامت حصہ دوم ۴۳۸ صفحے قیمت ۱ء ، ضخامت حصہ سوم ۹۴ ، صفحے قیمت عہ ، قیمت حصہ چہارم ۹۰۰ صفحے قیمت عہ ۔ ضخامت حصہ پنجم ۴۳۷ صفحے قیمت صہ ، ضخامت حصہ ششم ۶۱۲ صفحے قیمت قسم اول صہ قسم دوم للعہ ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ، غزوات اور اخلاق و عادات کے متعلق بہت سے رطب و یابس واقعات تاریخ و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن اس کتاب میں اس قسم کی تمام روایتوں کو نظر انداز کر کے صرف وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو قرآن اور احادیث میں مذکور ہیں ، تاریخ و سیر سے بھی وہی واقعات لے گئے ہیں جن کی صحت و روایت کمزور مشکوک ہے

الفاروق ۔ مصنفہ مولانا شبلیؒ ۔ ضخامت ۳۱۲ صفحے قیمت سے ،

حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی اور طرز حکومت ، صحابہؓ کی فتوحات طریقۂ حکومت ، حضرت عمرؓ کی سیاست ، اخلاق ، زہد ، عدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر اس کتاب کے مطالعہ سے آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کس طرز کی حکومت کا قائل ہے۔

الغزالی ۔ مصنفہ مولانا شبلیؒ ۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے قیمت عسم

امام غزالیؒ کی سوانح عمری ۔ اُن کا فلسفہ اور علم کلام ، اخلاق و تصوف ان کے مجددانہ کارنامے ، خیالات اور اُن کی تحقیقات کے مطالعہ کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے

مضامین عالمگیرؒ ۔ ضخامت ۱۴۴ صفحے ۔ قیمت عہ۸

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر متعصب لوگوں کی طرف سے جو الزامات اختراع کئے گئے ہیں اس کتاب میں مورخانہ تحقیق و تنقید کے ساتھ اُن کے مدلل و مسکت جوابات دئے گئے ہیں۔

مبادی علم انسانی ۔ ترجمہ مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی ضخامت ۱۳۶ صفحے ۔ قیمت عہ،

برکلے کی مشہور کتاب "پرنسپلز آف ہیومن نالج" کا ترجمہ جس میں حواس انسانی پر بحث کر کے مادیت کا ابطال کیا گیا ہے

فلسفۂ جذبات ۔ مصنفہ مولانا عبد الماجد دریابادی ضخامت ۲۴۰ صفحے قیمت مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ ۸ع

اس کتاب میں تمام اہم جذبات انسانی کے فلسفیانہ علل و اسباب ۔ ان کے موثرات و محرکات اور عواقب و نتائج سے بحث کی گئی ہے۔

الجہاد فی الاسلام مصنفہ مولوی ابو الاعلیٰ مودودی ضخامت ۴۹۲ صفحے ۔ قیمت سے ،

اس کتاب میں اسلامی قوانین صلح و جنگ کی تفصیل کے ساتھ دیگر مذاہب اور موجودہ یوروپین قوانین جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

روح الاجتماع ترجمہ مولوی محمد یونس مرحوم فرنگی محلی ضخامت ۲۲۲ صفحات قیمت عہ۸

یہ کتاب موسیو لیبان کی کتاب "جماعتہائے انسانی کے اصول نفسیہ" کا اردو ترجمہ ہے جس میں انسانی جماعت کے اخلاق ، پبلک رہنماؤں کی خصوصیات ، اور جماعتوں کے بننے بگڑنے کے قوانین نفسی بیان کئے گئے ہیں

مقالہ روسو ترجمہ صاحبزادہ ظفر حسین خاں صاحب ضخامت ۱۵ صفحے قیمت ۶ ،

اس کتاب میں فرانس کے مشہور قلمی انقلابی ہیرو روسو نے علوم و فنون کے فسادی اثرات و نتائج کی تنقید کی ہے ۔ یہ کتاب انقلاب فرانس کا مواد بہم پہنچانیوالی کتابوں میں سے ایک نہایت اہم کتاب ہے

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں مصنفہ مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم۔

اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور اُن کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال درج ہے۔

تیمور ترجمہ مسٹر عنایت اللہ بی اے ضخامت ۴۴۴ صفحے قیمت ۳ ،

ہیرلڈ لیمب کی مشہور کتاب کا ترجمہ جس سے تیمور لنگ کے مفصل سوانح حیات معلوم ہوتے ہیں۔

زندگی ۔ مصنفہ چودھری افضل حق صاحب ضخامت ۴۰۴ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنہ عہ۱۲

اس کتاب میں انسان کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو بڑی خوبی کے ساتھ قصوں اور حکایتوں سے واضح کیا گیا ہے۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو

تاریخ تمدن ضخامت جلد اول ۸۰۰ صفحے قیمت عسم ، ضخامت جلد دوم ۲۳۲ صفحے قیمت ۲ع ،

مسٹر ٹامس بکلس کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ جس میں فلسفیانہ غور و فکر سے تمدن کی تاریخ مرتب کی گئی ہے اور اس کے اسباب و علل کی تحقیق کی گئی ہے۔

طبقات الارض ضخامت ۲۷۲ صفحے قیمت ۲ع ،

علم طبقات الارض پر اُردو میں غالباً یہی ایک کتاب موجود ہے

تاریخ اخلاق یوروپ ضخامت ۳۱۱ صفحے قیمت ۸ع ،

لیکی کی "مارل ہسٹری آف یوروپ" کا ترجمہ جس میں فلسفۂ اخلاق پر ضمنی مباحث کے علاوہ یورپ کی تدریجی رفتار ترقی کی تشریح ہے

ترکوں کی اسلامی خدمات ضخامت ۱۳۵ صفحات قیمت عہ۸

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بداپسٹ یونیورسٹی نے جامعہ عثمانیہ میں تین لکچر دئے تھے یہ انھیں لکچروں کا مجموعہ ہے۔

علم المعیشت ضخامت ۷۶۸ صفحات قیمت ۵ ،

پولیٹکل اکونومی پر اُردو میں سب سے پہلی اور مکمل و مفصل کتاب ہے

مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی

صحیفۂ چین از اسد علی انوری فریدآبادی قیمت عہ۸

اس کتاب میں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

معاہدۂ عمرانی از ژاں ژاک روسو مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب قیمت مجلد دو روپیہ ۲ع ،

یہ کتاب فلسفۂ سیاست کی وہ اہم کتاب ہے جس میں سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھائے گئے ہیں

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ ۔ قیمت مجلد دو حصے للعہ ،

یہ کتاب ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ کی ایک بہترین کتاب ہے

تلاش حق ۔ گاندھی جی کی آپ بیتی کا اُردو ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ۸

جمال الدین افغانیؒ مصنفہ سید حسن برنی قیمت ۴ ،

اس کتاب میں سید صاحب کے حالات زندگی اور ہندوستان ، ایران ، ٹرکی ، مصر اور فرانس میں انکے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مالیات عامہ قیمت ۸ ،

ہندوستان کے موجودہ اقتصادی حالات پر مالیات عامہ نے جو کچھ اثر کیا اس کا بیان اور ہندوستان کے موجودہ افلاس پر ایک دردناک تبصرہ کیا گیا ہے۔

کسان ۔ مصنفہ چودھری مختار سنگھ مترجمہ مولوی محمود علی خاں صاحب جامعی ۲۷۵ صفحات قیمت مجلد عہ ،

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا ۔ دیہی نظام کی کیا صورت تھی ۔ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے محتاج بنایا گیا اور اب کس طرح اس کو پھر خوشحال بنایا جا سکتا ہے۔

(نوٹ) ضرورت ہے کہ فہرست مرتب کرتے وقت کتاب کا نام مصنف یا مولف یا مترجم کے نام کے ساتھ کتاب کا حجم اسکی قیمت اور پریس کا نام بھی ضرور دیا جائے ۔ اور کسی فہرست میں یہ التزام نہیں ہے اس کا مطلق خیال نہ کیا جائے۔

"دیہات کی ایک صبح"

(انتو خامہ ساغر چشتی اُوجینی)

مسرتوں کا پیام لیکر نقاب رُوئے سحر اُٹھا ہے
ہر ایک ذرّہ لباس نو میں عروس فطرت بنا ہوا ہے

پیام کچھ اس طرح دیا ہے ــــــــ نمود نورِ سحر نے بڑھ کر
کہ کائنات جہاں کے سر سے ــــــــ اُٹھائی ظلمات شب نے چادر
قمر کا منہ فق اُداس انجم ــــــــ عجب ہے بزم فلک کا منظر
ہوئے روانہ یوں چاند تارے ــــــــ کہ جیسے واماندہ کوئی رہبر

کسی ستارے کا زرد رُخ ہے کوئی ابھی جھلملا رہا ہے
کوئی ردائے سیاہ لیکر قمر کے پہلو میں جا رہا ہے
کوئی سحر کی حسین صورت کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے

(۲)

نسیم نے جگنوؤں کے رُخ سے ــــــــ اُلٹ دیا ہے نقاب رنگیں
ہے سبز کھیتوں میں کیف مستی ــــــــ برس رہی ہے شراب رنگیں
ہر ایک پودا لچک لچک کر ــــــــ بنا ہوا ہے شباب رنگیں
سحر کی بیداریوں کے رُخ پر ــــــــ نثار ہوتا ہے خواب رنگیں

سحاب نور سحر فضا میں نفیر قسمت بجا رہا ہے
تھکے ہوئے اک غریب انساں کو جھونپڑی سے اُٹھا رہا ہے
وہ گویا خاص اپنے رنگ میں یوں ترانۂ غم سنا رہا ہے

(۳)

کہ جلد اُٹھ جا اے سونے والے ــــــــ ترے مقدر میں کب ہے سونا
ازل سے تجھ کو غریب دیکھا ــــــــ جفاکشی کا ملا ہے حصّہ
یہ ہل "یہ بیل" سنبھال اپنے ــــــــ ہیں زندگی کا تری سہارا
یہ پھونس کا اک شکستہ چھپر ــــــــ ترا "محل" ہے تری ہے "دنیا"

تو ایک چادر میں آہ جاڑوں کی سرد راتوں کو کاٹتا ہے
مگر تری زندگی کا منظر بہار رنگیں بنا ہوا ہے
کہ صبح کو تو پہاڑیوں پر سنہری کرنوں سے کھیلتا ہے

(۴)

ترے تبسم پہ ہو رہی ہے ــــــــ ضیائے خورشید محو حیرت
تجھے تحیر سے دیکھتی ہے ــــــــ خوشی میں آکر نگاہِ فطرت
سحر کی رنگیں لطافتیں بھی ــــــــ قبول کرتی ہیں تیری دعوت
نوازتا ہے کرم سے اپنے ــــــــ تری غریبی کو دست قدرت

تری سحر کی مسرتوں میں کرم کا پلّا جھکا ہوا ہے
مشقتوں کا جفاکشی کا تجھے یہ اچھا ثمر ملا ہے
اگر ہے دنیا خلاف تجھ سے تو تیرا حافظ صدا خدا ہے

(۵)

حسین دیہاتیوں کو دیکھو ــــــــ کنوئیں پہ جمگھٹ ہے کچھ انوکھا
پھٹے پرانے لباس میں بھی ــــــــ ہے حسن کی دل کشی کا نقشہ
یہ ساری عصمت کی دیویاں ہیں ــــــــ جنھیں نہیں خود خیال اپنا
کسی کے کاندھے پہ رسیاں ہیں ــــــــ کسی کے سر پر رکھا ہے کلسا

چلی ہیں گھر کو خوشی خوشی سب شباب رُخ پر مچل رہا ہے
کسی کے منہ پر پڑا ہے آنچل کسی کا چہرا کھلا ہوا ہے
دیہات کی یہ سحر بھی ساغرؔ عجیب لطف کیف زا ہے

"نغمۂ کہسار"

(از جناب میر اُفق کاظمی امروہوی)

اگر نہیں کششِ عشقِ باطنی، کیا ہے؟ ــــــــ مری رگوں میں یہ بجلی سی دوڑتی کیا ہے
سُلگ رہا ہو نہ دل گرمیٔ محبت سے ــــــــ بھری ہوئی مرے سینہ میں آگ سی کیا ہے
اِک اضطراب مسلسل اک التہاب دوام ــــــــ یہ زندگی ہے تو انجامِ زندگی کیا ہے؟
مجھے نہیں غمِ افسردگیٔ غنچۂ دل ــــــــ کہ جانتا ہوں مآل شگفتی کیا ہے

اُفقؔ سنیگا کوئی کیا کسی سے کیا کہیے
کہ شوق کیا ہے مرا، آرزو مری کیا ہے؟

(۲)

مری صدا مرا نغمہ مری حُدی کیا ہے؟ ــــــــ یہی کہ تجھ کو ہو معلوم آدمی کیا ہے
جنونِ مذہب ایماں ہے روح کی تسکین! ــــــــ فسونِ فلسفہ و فکر فلسفی کیا ہے؟
ترا عمل تری تقدیر کا ہے آئینہ ــــــــ اس آئنے میں تری آنکھ دیکھتی کیا ہے؟
یہ لفظ و رنگ کا پیکر وہ روحِ معنی و بو ــــــــ کمال مغربی و وصف مشرقی کیا ہے

مری نگاہ میں روز اک جہانِ نو ہے اُفقؔ
مری نظر میں جہانِ گزشتنی کیا ہے

(۳)

مآلِ شورشِ پیہم جز ابتری کیا ہے؟ ــــــــ وطن کے نام سے یہ جنگ زرگری کیا ہے؟
غلامِ نفس کے دل میں خیالِ آزادی ــــــــ فسونگری یہ نہیں تو فسونگری کیا ہے؟
نظامِ عام پہ اک شخص منفرد حاوی! ــــــــ اگر یہ بُت شکنی ہے تو بُت گری کیا ہے؟
جو بات مُنہ سے نکل جائے وہ رہے ہو کر! ــــــــ جو خودسری یہ نہیں ہے تو خودسری کیا ہے؟
خدا پرست نہیں خود پرست ہے لیڈر ــــــــ وگرنہ مقصد الفاظ پروری کیا ہے؟
کبھی عمل کی مکافات سے نہ ہو غافل ــــــــ خبر بھی ہے کہ مآل ستمگری کیا ہے؟
نہ لے خدا کے لئے نام قوم اے لیڈر ــــــــ میں جانتا ہوں تری قوم پروری کیا ہے؟
بدلتی رہتی ہے ہر دم ہوا زمانے کی ــــــــ یہ لیڈری میں تجھے زعمِ سروری کیا ہے؟
یہ سوئے دورِ جہالت ہے رجعتِ ہندی ــــــــ تو پھر یہ شورِ ترقی و برتری کیا ہے؟
مجھے فریب نہ دے واعظ فسانہ طراز ــــــــ مجھے خبر ہے یہ افسانہ گستری کیا ہے؟

سخن وہ کیا نہیں تاثیر جس سخن میں اُفقؔ
جو شاعری نہ ہو جزوِ پیمبری کیا ہے؟

"مدینہ بک ایجنسی کی قابلِ قدر کتابیں"

"احکامِ حج"

اُردو میں اگرچہ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں اور سفرنامے لکھے گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ احکامِ حج سے بہتر جامع اور مختصر کتاب آجتک کوئی نہیں لکھی گئی، گھر سے روانہ ہو کر واپسی تک یہ کتاب آپ کی بہترین رہنما ثابت ہوگی۔ تمام امور و ضروریات کو مع ہدایات سفر مسائل حج اور زیارت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ وقت پر ہر بات کو بآسانی معلوم کر لیا جائے۔ کتاب کے آخر میں حج کے اصطلاحی الفاظ اور مقامات حج کی تشریح کی گئی ہے اور ضروری الفاظ کا مطلب بتایا گیا ہے تاکہ حجاز میں آپ کو کوئی دقت نہ ہو ضخامت تقریباً ۰۰ صفحات ہے اور چھوٹی تقطیع۔ قیمت قسم اول عمدہ کاغذ مجلد ۱۲ر۔ غیر مجلد عہ قسم دوم مجلد ۸ر۔ غیر مجلد عہ،

الفاروق مولانا شبلی کی تصانیف میں یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے اس میں حضرت عمر فاروق کی زندگی کے حالات لکھے گئے ہیں پھر اُن لڑائیوں کی تفصیل درج کی گئی ہے جو آپ کے عہد خلافت میں ہوئیں یا جن میں آپ شریک ہوئے ہیں سب سے اہم چیز جو اس کتاب میں ہے وہ اسلامی قانون حکومت کے محکمہ جات کا تقرر و تعین ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں صفحات ۷۰۰ متوسط تقطیع قیمت عہ

المامون مامون الرشید کی مفصل سوانح عمری اور اُن کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی وجہ سے مامون الرشید کا عہد عموماً شاہان عالم کے عہد کے بہ لحاظ علمیت ممتاز تسلیم کیا گیا ہے۔ آخر میں مولانا کا رسالہ الجزیہ بھی شامل ہے۔ بڑی تقطیع صفحات ۲۲۲ قیمت عہ،

آدابِ معاشرت مسلمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیسا برتاؤ ہونا چاہئے۔ بڑوں کی خدمت میں کس قسم کی گفتگو کرنی چاہئے۔ چھوٹوں سے کیا طریق برتا جائے۔ مہمان کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے کھانے پینے میں کن باتوں کی احتیاط کی جائے۔ غرضکہ معاشرت یعنی زندگی گذارنے کے تمام طریقے اس کے دیکھنے سے حاصل ہو جاتے ہیں قیمت ۳ر

احکامِ موتیٰ تجہیز و تکفین موتیٰ کے مسائل اس کتاب میں نہایت جامعیت اور وضاحت سے لکھے گئے ہیں قیمت ۵ر

آغازِ اسلام آنحضرت صلعم کی مختصر اور مستند سوانح عمری جس کو مولانا شبلی نے عورتوں اور بچوں کے لئے لکھا تھا ۶ر

اعمالِ قرآنی حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی مقبول عام کتاب جس کو مکمل کر کے مدینہ پریس نے خاص اہتمام سے چھاپا ہے۔ قرآن و حدیث اور بزرگوں کے اعمال مجربہ کا قابل دید ذخیرہ۔ قیمت ۱۲ر

اورنگزیب عالمگیر مولانا شبلی کی مشہور کتاب جس کو مدینہ پریس نے خاص اہتمام سے چھاپا ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنے (۸ر)

الطیبات اس میں عورتوں کی روزمرہ کی خانگی زندگی اسلامی احکام کے مطابق بتلائی ہے۔ قیمت مجلد ۹ر

تمیز الکلام جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان مذاہب اربعہ کے موافق اور ذبح و شکار کے مذہبی مسائل۔ چھوٹی تقطیع سفید کاغذ ۲۸ صفحہ قیمت ۲ر

بہشتی زیور اس کتاب کے دس حصے ہیں جن کو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے صرف عورتوں کے لئے لکھا ہے قیمت فی حصہ ۳ر۔ گیارھواں حصہ بہشتی گوہر مردوں کے لئے قیمت ۴ر۔ قیمت مکمل گیارہ حصہ صرف دو روپیہ ۲ ؏،

تاریخ بیت اللہ شریف مکہ معظمہ کی قابل دید تاریخ۔ اس موضوع پر اس سے بہتر اور جامع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی قیمت صرف ۶ر

تذکرہ حضرت زبیرؓ مشہور صحابی حضرت زبیر ابن العوامؓ کی سوانحعمری قیمت دو آنے (۲ر)

جزاء الاعمال دنیا و آخرت میں انسانوں کو ان کے اعمال کی جزاء و سزا ملتی ہے یا نہیں اس رسالہ میں اس پر دلپذیر بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳ر

جڑ مار ہندو مذہب کی تردید میں از غازی محمود دھرمپال قیمت ایک آنہ (۱ر)

رعایتی اعلان

آخر ماہ ربیع الاوّل تک جو آرڈر سپرد ڈاک کئے جائیں گے ان کو ایک روپیہ کی کتابیں بارہ آنہ میں دیجائینگی۔ ایک روپیہ سے کم کی فرمائش پر رعایت نہ ہوگی محصولڈاک و خرچ پیکنگ اسکے علاوہ ہوگا۔ ناظرین مدینہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں۔
(منیجر)

حیاتِ حافظ یعنی حافظ شیرازی کی سوانح عمری جس میں آپ کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ متوسط تقطیع قیمت ۶ر

حیاتِ سعدی اس کتاب میں شیخ سعدی کی زندگی کے حالات درج ہیں اور آپ کی تصانیف اور شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ متوسط تقطیع قیمت صرف ۶ر

خلقِ عظیم سرکار دو عالمؐ کے خصائل حمیدہ، حلیۂ مبارک، رفتار و گفتار، قیام و طعام، دعاؤں اور عبادات کا مرقع ہے یہ کتاب حضور کی کل مشغولیتوں کا مستند مجموعہ ہے۔ عورتوں، بچوں اور عام مسلمانوں کے لئے مفید کتاب ہے۔ قیمت ۴ر

خون کے آنسو اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش ان کے لئے تباہ کن ہوگی اگر وہ اس تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کو فوراً اپنی روش بدل دینی چاہئے اور ان تدابیر پر عمل کرنا چاہئے جو ان کی فلاح و بہبود کی ضامن ہیں اس کتاب میں ان تدابیر پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت صرف ۴ر

خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی مستند و معتبر سوانح عمری۔ قیمت ۸ر

خیر الکلام اس کتاب میں حب نبوی کے سرمایہ دار مسلمانوں کے لئے روحانی تسکین اور باطنی تسلی کا ایک پر کیف جام پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب امام الائمہ علامہ شمس الدین ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف جلاء الافہام کا سادہ و سلیس اُردو ترجمہ ہے جس میں علامہ موصوف نے ارباب ایمان و اصحاب یقین کے لئے درود شریف کی فضیلت کو نہایت دلنشین پیرایہ میں تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ صفحات ۲۵۶ تقطیع ۲۲×۱۸ قیمت ۱۲ر

دروس التاریخ شام کے ایک مشہور مورخ نے بچوں کے لئے یہ تاریخ اسلامی عربی میں لکھی تھی ہندوستان میں اس کا اُردو ترجمہ اکثر بچوں کی تعلیم میں داخل ہے۔
کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور غزوات کا بیان ہے۔ دوسرے میں خلافت راشدہ کی مجمل مگر جامع تاریخ ہے۔ حصہ سوم میں خلفائے بنی اُمیہ کے حالات و فتوحات کا ذکر ہے۔ چوتھے میں بنو عباس کے کارنامے ہیں۔ پانچویں میں اندلس و مراکش کی مکمل تاریخ ہے۔ قیمت حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۵ر حصہ سوم ۶ر حصہ چہارم ۱۲ر حصہ پنجم عصہ، مکمل ۶؏

رسالہ عقیقہ احکام عقیقہ اس رسالہ میں نہایت خوبی سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت دو آنہ (۲ر)

سفرنامہ اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی اسیری کے حالات جن کو حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ قلمبند فرمایا ہے۔ قیمت دس آنہ (۱۰ر)

سیر الاحناف کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانان ہند حضرت امام اعظم اور اُن کے بلند پایہ شاگردوں کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں یہ کتاب اسی اہم مقصد کو پیش نظر رکھ کر تیار کرائی ہے اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ان کے مشہور تلامذہ کے ضروری حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر)

سوانح مولانا روم حضرت مولانا روم کے سوانح حیات ان کے علمی و عملی کارنامے، پاکبازانہ زندگی، تلاش حق اور مولانا شمس الدین تبریزی کی بیعت، مثنوی کی تصنیف، مثنوی کا اندازِ بیان، اور اس پر مکمل و مفصل ریویو مع نمونہ کلام، اخلاق و تصوف کی جان ہے بے نظیر چیز ہے۔ قیمت ۱۲ر

صفائی معاملات خرید و فروخت، سود بدنی، چاندی سونے کا مبادلہ، وکالت، صلح، امانت، ہبہ کرایہ، کھیتی باڑی کے مستند شرعی مسائل۔ قیمت ۳ر

عقل و ایمان سادہ اور عام فہم زبان میں حقانیت اسلام کا اعلان ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹری طبی اور عقلی تحقیقات کی رو سے اسلامی اصول و عقائد کی صداقت کا بہترین مرقع ہے اس کے مطالعہ سے غیر مسلم تک صداقت اسلام کے قائل ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ منیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور (یوپی)

عورت اور قرآن مستورات کی اخلاقی، مذہبی، تمدنی، معاشی تاریخی زندگی کے متعلق قرآن حکیم کی تمام آیات واحکام اس کتاب میں درج ہیں مسلمان بہنیں قرآن شریف کی ان آیات کو پڑھ کر دیکھیں اور غور کریں کہ خداوند کریم نے ان کے متعلق کیا کیا ہدایات فرمائی ہیں ان پر مردوں کے حقوق کیا ہیں۔ قیمت ۶ر

فلاح الدارین مولانا عبدالماجد بدایونی کی مشہور کتاب ہے جس میں مستقل ابواب کے ماتحت احادیث اور اُن کا ترجمہ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب عام مسلمان اور خواتین کے لئے مشعل ہدایت ہے قیمت ۴ر

فروع الایمان اس کتاب میں مولانا اشرف علی صاحب نے ایمان کے ۔ ۷ شعبوں کا بیان کیا ہے جن کا ذکر احادیث وقرآن میں آیا ہے۔ قیمت ۴ر

فضائل الشہور والصیام
اوراد اللیالی والایام

سال کے بارہ مہینوں کی فضیلت اور ان میں مخصوص رات اور دن میں پڑھنے کے اوراد و وظائف خصوصاً جمعہ اور رمضان المبارک کے فضائل یہ کتاب نہایت مستند ہے اور ہر مسلمان کے پاس رہنی ضروری ہے قیمت ۵ر

کلیات نظم شبلی مولانا شبلی مرحوم کی اُردو نظموں کا قابل دید مجموعہ۔ قیمت ۵ر

مسدس حالی مولانا حالی کا مشہور مسدس مدوجزر اسلام جس کو مدینہ پریس نے خاص اہتمام سے چھاپا ہے۔ ۸ر

مدینۃ العلم اخبار مدینہ کے دوسالانہ رسول نمبروں کے مضامین کا قابل دید مجموعہ۔ بہترین بیان ولادت اور دلآویز نظمیں عمر

نماز اس کتاب میں نماز کے تمام ارکان وشرائط کو مختصر الفاظ میں نہایت خوبی سے بتایا گیا ہے۔ پھر نماز پڑھنے کی ترکیب اس قدر سادہ زبان میں لکھی ہے کہ معمولی اُردو پڑھنے والا بھی خود پڑھ کر بہت جلد نماز سیکھ جاتا ہے۔ قیمت ۴ر

وید اور سوامی دیانند کلام مجید اور وید کے متعلق قابل دید بحث حق و باطل کا اہم فیصلہ۔ قیمت ۶ر

ہندوستانی جاسوس مصطفیٰ صغیر ہندوستانی جاسوس کا واقعہ جو غازی مصطفےٰ کمال پاشا کو قتل کرکے ترکی حکومت کو برباد کرنے گیا تھا۔ بالآخر خود مارا گیا۔ ۴ر

ابوذر غفاریؓ یہ وجد آفریں کتاب شیدائے رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ کی داستان عشق نبوی کا ایک بیش بہا اور حسین و جمیل مرقع ہے۔ قیمت صرف عہ

آئینہ حقیقت نما (حصہ اول) (مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی) یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ پر سے ان تمام سیاہ پردوں کو اٹھادیتی ہے جو نہایت چالاکی سے ہندو مسلم نا اتفاقی پیدا کرنے کے لئے نام نہاد مستند اول درسی تاریخوں میں ڈال دئے ہیں۔ بلکہ ہندوستان کے ہر شخص کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ قیمت ۶ر

الصالحات اس کتاب میں حضرت حلیمہ سعدیہؓ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ ان چار نیک بیبیوں کے صحیح اور معتبر حالات آسان عبارت میں بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر

اربعین چالیس آیتوں اور ۲۵۰ حدیثوں سے اسلامی تہذیب احکام کی تعلیم دی گئی ہے۔ قیمت ۶ر

احقاق حق گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری موسومہ تلاش حق جن لوگوں نے مطالعہ کی ہے وہ اس کتاب کو بھی ضرور ملاحظہ کریں۔ یہ کتاب گاندھی جی کی زندگی پر ایک محققانہ وعالمانہ ریویو ہے قیمت فی جلد ۵ر

ایضاح الادلہ مصنفہ سیدنا حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے دریائے علم کا بیش بہا موتی ہے رفع یدین، آمین بالجہر، قرارت، خلف الامام، مسائل قضا، نکاح محارم حکومت اسلامیہ کی حقیقت، مسئلہ قلتین وغیرہ وغیرہ غرض جملہ اختلافی مسائل کے لئے قول فیصل ہے۔ صفحہ ۴ سائز ۲۶×۲۰ قیمت دو روپے۔

العقل والنقل اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوسکتا اور اگر کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہونے کی وجہ سے ایسا پیش آئے تو اس وقت اس کا فیصلہ کس طرح ہونا چاہئے۔ قیمت ۱۰ر

بزرگوں کی دنیا اس کتاب کی حقیقت نام سے ظاہر ہے اس کے مطالعہ سے انسان محو حیرت ہوکر رہ جاتا ہے ۸ر

تاریخ المصاحف قرآن عزیز کے تاریخی احوال وکیفیات مصنفہ مولانا محمد عبدالشکور صاحب مرزاپوری ۲ر

تفسیر سورۂ حجرات سورۂ حجرات کے فوائد علیحدہ بصورت رسالہ شائع کرنے سے یہ مقصد ہے کہ مسلمان اپنے نزاعات واختلافات قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ قیمت ۲ر

تعلیم الاسلام یہ رسالہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کے لئے لکھا ہے اس کے چار حصہ ہیں قیمت قاعدہ ۱ر حصہ اول ۱ر حصہ دوم ۲ر حصہ سوم ۴ر حصہ چہارم ۵ر مکمل ۱۳ر

حج بیت اللہ یہ رسالہ حقیقت حج کو ذہن نشین کرنے کے علاوہ ترغیب حج کے لئے خصوصی چیز ہے۔ قیمت ۳ر

حجۃ الاسلام مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب مورخ تاریخ اسلام کی بہترین کتاب ہے۔ قیمت عصہ

خزینہ معلومات اس کتاب میں انسانی ضروریات کی تمام باتیں درج کردی ہیں مثلاً ڈاکخانہ، ریلوے، جہاز ہوائی جہاز، تجارت، طب وغیرہ کے تمام قواعد ومسائل اور بیرونی ممالک کی تمام ضروری باتیں اس میں ہیں ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے صفحات ۵۰۰ سے زائد۔ قیمت عہ

زواجر ہندی مذہبی مسائل کی مستند اور عام فہم کتاب ہے روزمرہ کے مسائل بڑی آسانی سے حل ہوجاتے ہیں قیمت ۳ر

سیر اندلس طارق اعظم اور سپہ سالار موسیٰ بن نصیر کے حالات اور اندلس کے ۸۰۰ سالہ اسلامی حکومت کے عروج و زوال کے واقعات سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ قیمت ۹ر

سوانح حیات مشہور اہل قلم کی سوانح عمریاں اور ان کی خصوصیات کمالات پر ایک نظر۔ قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ۔ منیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور (یو۔پی)

سیرۃ النعمان حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کے حالات اور فن فقہ پر تفصیلی ریویو ہے جس میں مدوین فقہ کے تاریخی حالات کے ساتھ وہ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے فقہ حنفی کو اور آئمہ کے فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔ خاتمہ پر امام صاحب کے نامور اور ممتاز شاگردوں کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ قیمت ۱۴ر

علمائے سلف اس میں علمائے سلف کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے قیمت عصہ

فصل الخطاب یہ کتاب مشہور مورخ اسلام مولانا محمد اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کی تازہ تصنیف ہے جو عنایت اللہ خاں مشرقی اور فتنہ خاکساری کی تردید میں ہے جس میں قرآن و احادیث کی روشنی میں اطاعت امیر کی بابت مکمل فیصلہ بتایا گیا ہے قیمت ۱۲ر

مقدمہ تاریخ ہند قدیم (جلد اول) یہ کتاب بہت زیادہ ضروری اور اہم بنیادی مسائل پر مشتمل ہے اور اس کے اندر ساری دنیا کی اقوام وممالک و مذاہب تمدن وعلوم کا ایسا خلاصہ آگیا ہے جو ہزارہا کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی انسان کو میسر نہیں ہوسکتا تھا۔ قیمت عمہ

لا الٰہ الا اللہ یہ شرک وبدعت کے زہر کا بہترین تریاق اور کتاب سنت کی طرف متوجہ کردینے کے لئے بہترین محرک ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ اس موجودہ زمانہ کی حالت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور شرکیہ اعمال وعقائد کا نہایت مدلل طور پر ازالہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۵ر

معجزہ قرآن مجید قرآن مجید کے لفظاً اور معناً کلام الٰہی اور معجزہ ہونے کا ناقابل تردید واقعات اور دلائل سے کامل ثبوت یعنی اعجاز قرآن مجید کو واضح کرنے والی اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جس میں فاضل مصنف نے مختلف ابواب میں کلام مجید کی بے نظیر فصاحت وبلاغت اور اس کی لاثانی تعلیم وہدایت پر نہایت دلآویز طریقہ سے بحث کرکے کلام پاک کا اعجاز ثابت کیا ہے۔ قیمت عمہ

نظام سلطنت مصنفہ مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ اس کتاب میں مذہب وتمدن اخلاق ومعاشرت اور قوانین سلطنت پر محققانہ ومنصفانہ بحث کی گئی ہے اور قدیم نظامات وقوانین جو تمام روئے زمین اور اقوام عالم میں مروج ہے یکجا فراہم کردئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے ہر شخص کی بصیرت و دانائی میں اضافہ اور نسل انسان کی کامرانی ومقصد وری کا راستہ سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے ضروری ہے بلکہ ہر سمجھدار اور ذوق سلیم رکھنے والے شخص کو بھی اس کتاب کے بے بہا گوہر سے دامن بھر لینا لازم ہے۔ قیمت فی جلد ۶ر

اشاعت اسلام مکمل (دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا) اسلام کی حقانیت وصداقت کا صحیح مرقع اسلام کی للہیت وروحانیت کے نتیجے مناظر معاندین اسلام کے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات اسلامی فتوحات وترقیات کا اصلی راز صفحات ۵۰۰ قیمت قسم اول ۳ر قسم دوم ۶ر

اسرار الطہارہ وضو کا فلسفہ بول وبراز قوم وقہقہہ وغیرہ کے ناقض وضو ہونے کا فلسفہ اور اس کے عقلی دلائل محققانہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳ر

مفید الوارثین ۸ر احسن المواعظ ۸ر افضل المواعظ ۱۲ر

الانتباہات المفیدہ جب سے مغربی بعوث ہندوستانیوں کے سر پر سوار ہوا ان کو خدا کی خدائی نبی کی نبوت۔ جنت دوزخ۔ صراط میزان۔ جن ملائک۔ اور شیطان مسئلہ تقدیر غرض یہ کہ اسلام کی ہر بات کے لئے عقلی دلائل کے محتاج ہیں اس کے بغیر تمام احکام شرعی سے منکر ہیں۔ ایسے لوگوں کے عقائد کی گمراہی کو دور کرنے کے لئے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے تمام سوالات کا جواب فلسفہ سائنس اور منطق کی رو سے تحریر فرمایا ہے۔ قیمت ۹؍

اغلاط العوام اس رسالہ میں وہ مسائل بیان کئے گئے ہیں جو عوام میں غلط مشہور ہو گئے ہیں اور جن کی کوئی اصل شرعی نہیں ہیں قیمت ۱؍

البدائع المفیدہ اس کتاب میں آلات جدیدہ مثل لاؤڈ اسپیکر۔ ریڈیو۔ فلم رنج۔ فوٹو۔ فونوگراف روزہ میں انجکشن۔ تار ٹیلیفون۔ وائرلیس وغیرہ کے شرعی احکام مفصل تبصرہ ہے قیمت ۹؍

بلاغ مبین کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں دین کی نشر و اشاعت اور کلمہ حق کے اعلا حقیقی کا صحیح طریقہ بتلایا ہے۔ دوسرے حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرامین مقدسہ کو جمع کیا گیا ہے جو آپ نے دنیا کے مختلف بادشاہوں کے نام روانہ فرمائے تھے اور ان سے متعلق تاریخی و حدیثی حالات کو بیان کیا گیا ہے تیسرے حصہ میں تبلیغ کا مفہوم۔ جہاد کی حقیقت۔ اس کے اصول و اسباب۔ قتل مرتد تکفیر اہل قبلہ جزیہ کی تعریف۔ اسلام اور اس کا نظام۔ اسلام کا دوسرے مذہب پر تفوق و امتیاز صفحات ۳۰۰ قیمت عہ؍

پیغام محمدی اس کتاب میں پرزور شہادتوں اور روشن دلیلوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات عیسوی تعلیمات سے بدرجہا اعلیٰ اور عمدہ ہیں اور تثلیث و کفارہ وغرض یہ کہ اس کتاب سے بہتر عیسائیوں کے رد میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی صفحات ۳۲۵ قیمت ایک روپیہ (عہ)

تفسیر آیت سادات مصنفہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند جس میں آپ نے سادات کی انوکھی و دقائق بد تغیر اور انساب و قبائل کا باہمی امتیاز و تفاضل عجیب پیرایہ میں بیان فرمایا ہے قیمت ۳؍

تاریخ القرآن اس کتاب میں قرآن کریم کی تدوین و ترتیب کے مفصل حالات و واقعات اور جناب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مقدس میں مرتب اور جمع ہو جانے اور کاغذ کے پائے جانے اور مروج ہونے کا ناقابل انکار ثبوت صحیح روایات اور تاریخی واقعات سے دیا گیا ہے۔ قیمت عہ

جمال القرآن کلاں اس رسالہ میں قرآن شریف صحیح پڑھنے کے طریقے حروف کے مخارج اور صفات صلیہ وغیرہ کا بیان ہے۔ بچوں کو یہ کتاب ضرور پڑھانی چاہئے۔ تاکہ وہ قرآن شریف قواعد کے مطابق پڑھ سکیں قیمت ۳؍

حیٰوۃ المسلمین حضرت علامہ تھانوی کی ایک تصنیف جس میں پچیس عنوانات کے ماتحت مسلمانوں کی دینی و مذہبی اور تمام ضروریات دینی پر قرآن و حدیث کے بتلائے ہوئے نسخے کیمیا تمام امراض اور انکا علاج اور ہدایات نبوی کو نہایت دلنشین پیرایہ میں جمع کیا ہے۔ اکرم المواعظ عہ الشہاب الثاقب ۸؍ الہامی کتاب عہ

حزب البحر مترجم یہ دعا تمام دینی و دنیوی حاجات کے واسطے نہایت ہی مجرب اور اکسیر ہے۔ حل مشکلات شفائے مریض۔ محبت و ادائے قرضہ دافع فقر و فاقہ کے لئے بہت مفید ہے قیمت ۲؍

زواجر ہندی یہ کتاب محدث ابن حجر ہیتمی کی زواجر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں ۱۰۵ باب ہیں جنہیں احادیث کے ذریعہ سے گناہوں سے بچنے اور نیک کاموں کے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے عورتوں۔ بچوں۔ اور مردوں کے لئے بہت ہی کارآمد اور مفید ہے قیمت ۲؍

سیرت خاتم الانبیاء اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام و کمال سوانح عمری مختصر طور پر بیان کردی گئی ہیں اور تمام واقعات و غزوات وغیرہ کا تذکرہ بہترین عبارت میں کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بچوں اور لڑکیوں کو ضرور پڑھانی چاہئے قیمت ۱؍

سلمان فارسی اس رسالہ میں حضرت سلمان فارسیؓ کے حالات ان کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور ان کے ساتھ محبت کا تذکرہ ہے قیمت ۲؍

شہید اعظم حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی الہامی زبان میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے مکمل واقعات و حوادث اہل بیت کے مصائب مستند تاریخی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ قیمت ۴؍

شکوہ ہند شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی معرکۃ الآرا نظم قیمت ۲؍

شکوہ و جواب شکوہ مع نظمیں و ترانہ۔ از علامہ اقبال مرحوم قیمت ۵؍

شفاء العلیل شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مشہور کتاب۔ القول الجمیل کا اردو ترجمہ جس میں بیعت و طریقہ تعلیم مرید۔ اشغال قادریہ چشتیہ۔ نقشبندیہ وغیرہ کا طریقہ اور خاندانی اعمال مجربہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ قیمت ۶؍

عورت کا جوہر مصنفہ شیخ حبیب اللہ صاحب بہترین، اخلاقی، اصلاحی ناول ہے جس میں حسن و محبت کے عجیب و غریب نقشے پیش کئے گئے ہیں قیمت ۳؍

فرہنگ عامرہ چار ہزار عربی فارسی ترکی لغات کا بالتلفظ مخزن ہے ہر لفظ کا تلفظ اور اس کے معنی بتلائے گئے ہیں یہ فرہنگ اپنی طرز کی نرالی ہے اس سے پہلے لغت کی کتابوں میں تلفظ نہیں بتلایا جاتا ہے جس سے طلبہ صحیح لفظ نہیں پڑھ سکتے غرض ہر طالب علم کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے قیمت مجلد دو روپیہ (عہ)

قصیدہ بردہ ابو عبد اللہ شرف الدین محمد بن حماد البوصیری نے یہ قصیدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں لکھا ہے اس کا پڑھنا دافع آفات و بلیات محافظ رنج و غم ہے۔ قیمت ۳؍

کیا ہندوستان دار الحرب ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ کا معرکۃ الآرا رسالہ ہے مع ترجمہ و شرح اردو قیمت ۳؍

کریم اللغات کلاں معتبر و مستند لغات کا مجموعہ ہے جس کے صدہا اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور جو لغت کی مشہور و مستند کتابوں سے لکھی گئی ہے آخر میں کتاب عظیم اللغات بھی شامل کردی گئی ہے صفحات ۳۰۰ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ۔ منیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور (یو۔پی)

گائے اور اس کی تاریخی عظمت مصنفہ مولانا اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی مذاہب کی تحقیق و تبلیغ کا شوق رکھنے والوں، ملکی و سیاسی معاملات میں دلچسپی لینے والوں، اور علم تاریخ کا شوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا قیمت ۴؍

مقالات شبلی علامہ شبلی نعمانی کے علمی تاریخی معرکۃ الآرا مضامین کا نادر مجموعہ قیمت عہ

مقصود حیات مصنف نے دلائل و براہین سے بتلایا ہے کہ انسان کی پیدائش اس کی زندگی و موت کی اصل غرض و غایت کیا ہے شادی بیاہ اولاد کی پرورش تعلیم و تربیت ہی پر خاندان قبیلے قوم و ملک کی فلاح و بہبود منحصر ہے ہر انسان کو اس کا مطالعہ لازمی ہے قیمت ۹؍

مخزن ادب اس کتاب کا اصل منشا یہ ہے کہ طالب علم اردو زبان سے اچھی طرح واقف ہو جائے اور اس میں کمال حاصل کر سکے اسی وجہ سے اس میں انشا پردازی کے طریقے بتلائے گئے ہیں اور مشہور انشا پردازوں اور ادیبوں کے مکتوبات نثریں و نظمیں قصاید و رباعیات بھی دی گئی ہیں خط شکستہ رقعیں، اور دیگر مروجہ علامتیں بھی بتلائی گئی ہیں آخر میں جلیل القدر ہستیوں کی سیرت اور دیگر نیک شعاری ثابت قدمی، اور ان کے اوج کمال پر پہونچنے کے اسباب کا بھی تذکرہ ہے صفحات ۲۸۰ قیمت عہ

وید اور اسکی قدامت مصنفہ مولانا اکبر شاہ خانصاحب مرحوم نجیب آبادی مبلغین اسلام اور منصف مزاج ہندو اور آریوں کو وید کی تعلیمات اور آریوں کے دعاوی قدامت وید پر ایک علمی و تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے قیمت ۲؍

بے نظیر مناجات مقبول مصنفہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس میں حدیث کی منتخب دعائیں ہمیشہ پڑھنے کے لئے جمع کی گئی ہیں یہ کتاب دین و دنیا کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ حزب البحر، اسمائے بدریین۔ آداب دعا و سبع احزاب مثنوی۔ مجموعہ شجرات چشتیہ ۵ رسالوں کا اضافہ کیا گیا ہے صفحات ۳۷۰ قیمت مجلد سنہری عہ

مسلمانان اندلس ملک ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ کا لب لباب اور وہاں کے مسلمانوں کی بربادی و جلاوطنی کا حسرتناک مرقع جس کے مطالعہ سے ہندوستان کے مسلمان نا اتفاقی کے بد نتائج پر غور کرنے کے بعد بہت کچھ عبرت و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ قیمت ۳؍

میراث المسلمین اس کتاب میں فرائض و میراث کے متعلق نہایت ضروری اور کارآمد مسائل قرآن مجید کی آیتوں اور حدیث و فقہ کی معتبر کتابوں سے نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں قیمت ۳؍

نواب امیر خان روہیلکھنڈ کے قابل فخر و فرد نواب امیر خان بانی ریاست ٹونک کے اولوالعزم کارنامے اور ان کی سوانح حیات جس کے مطالعہ سے قوم کے تمام طلب اور ریاست نوجوانوں میں جوش عمل اور مشکلات کے مقابلہ میں ہمت نہ ہارنے کی صفت محمودہ پیدا ہو سکے گی قیمت ۵؍

حیات حافظ رحمت خاں عہ، طب نبوی ۶؍ طب روحانی عہ

کوک شاستر

اس میں خاص کوکہ پنڈت سابق وزیراعظم مہاراجہ کشمیر کے ذاتی مجربات اور ٹوٹکے معہ سوانحعمری کے درج ہیں
یہ دو سو صفحہ اور ۹۶ ہفت رنگی تصویروں سے آراستہ ہے جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے اسقدر مقبول
ہے کہ برابر چھپتی ہے اور فروخت ہوجاتی ہے اسمیں پدمنی۔ چترنی ہستنی۔ سنکھنی چاروں عورتوں اور چاروں قسم کے مرد
ششک۔ مرگ۔ اشو۔ برکھبہ کے علاوہ اور ہر قسم کے مرد اور عورتوں کی رنگین تصویریں درج ہیں
علاوہ اس کے زنانی مردانی بیماریوں کا علاج نیک و بد عورت کی پہچان حسب مرضی اولاد نرینہ پیدا کرنا عورت
کو عمر بھر خوبصورت تندرست جوان بنائے رکھنا۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ گیارہ آنہ (۱۱/۱) محصولڈاک ۵/
فیس منی آرڈر ۲/ کل دو روپے دو آنے (۲/۲) دو کتاب منگانے پر محصول معاف
ملنے کا پتہ۔ درباری خضاب مدنی لودہیانہ

لٹسری زنانہ و مردانہ چادریں

یہ بھی خالص ٹسر اصلی ریشم کی بالکل سفید رنگ کی بنی ہوئی نہایت خوبصورت خوشنما اور مضبوط پائیدار چادریں خاص تحفہ ہیں قیمت دو روپے محصولڈاک ۹/ تین کے خریدار سے محصول معاف۔

ریشمی رومال

۲۲″ × ۲۲″ نہایت اعلیٰ قسم رنگ پختہ قیمت فی درجن دو روپے محصول ۸/
چھ درجن قیمت بارہ روپے محصول معاف
بارہ درجن چوبیس روپے محصول معاف ریلوے اسٹیشن کا نام تحریر کریں۔

۴ آنہ بوسکی

بازار میں بوسکی ہر گز بھی مل سکتی ہے لیکن بیوقوفوں کے لئے دانشمند اصحاب ایک مرتبہ آزمائش کے طور پر ہم سے ۶ گز والی بوسکی منگوا کر دیکھیں اگر دیکھنے والوں کی آنکھیں نہ کھل جائیں تو ہمارا ذمہ کوئی شخص روپیہ سوا روپیہ سے کم خیال نہ کرے گا۔ قمیص جمپر کے لئے نہایت نفیس شریفانہ کپڑا ہے خوشی کے موقعہ پر عورتیں بچے تو خاصکر خوشی میں پھولے نہیں سماتے سادہ دھاریدار ہر قسم کا موجود ہے ۹ گز سے کم ارسال نہ ہوگا محصولڈاک ۹ گز پر ۸/ ۱۸ گز پر ۱۲/ (عرض ۲۷ انچ)

ریشمی ململ

۴½ آنہ گز | 4½/ PER YARD

یہ ریشمی ململ نہایت ہی عمدہ اور ملائم ہے قمیص اور جمپر کے لئے نہایت ہی دیرپا اور مضبوط ہے دیکھنے میں بیحد خوبصورت شاندار دھلانے کے بعد رنگ اور کپڑا ویسے کا ویسا خوشنما صاف اور ستھرا نکلے گا۔ دیکھنے میں کوئی شخص ایک روپیہ گز سے کم کا خیال نہیں کرے گا۔ عرض ۲۷ انچ ہے پورا تھان ۱۸ گز۔
نوٹ:۔ ایک تھان یعنی ۱۸ گز سے کم ارسال نہ ہوگا محصولڈاک و پیکنگ خرچ گیارہ آنہ
(ضرور آزمائش کریں)

کپڑا سینے کی دستی مشین



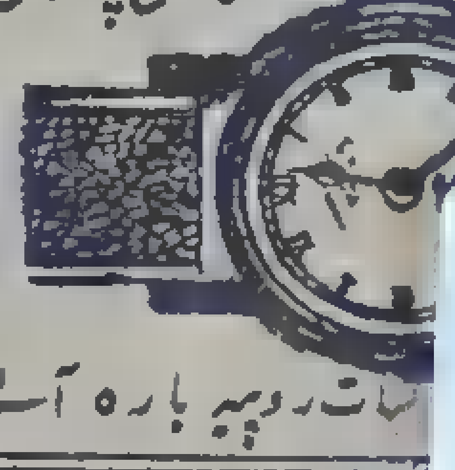
یہ کپڑا سینے کی مشین مختصر ماڈل کی نہایت مضبوط اور خوبصورت تیار کی گئی ہے قیمت میں نہایت سستی اور اچھی ہے قیمت صرف ساڑھے سات روپے آٹھ آنے ۸/۷ محصولڈاک ایک روپیہ بذمہ خریدار ہوگا۔

آزاربند

عورت مرد سب استعمال کر سکتے ہیں قیمت ۸/ دو روپے نصف درجن سے کم ارسال نہ ہوگا محصول ۸/

اس گھڑی کا ڈائل گول کیس بیضوی ہے سیکنڈ کی سوئی موجود اور وقت درست ... لاثانی ...

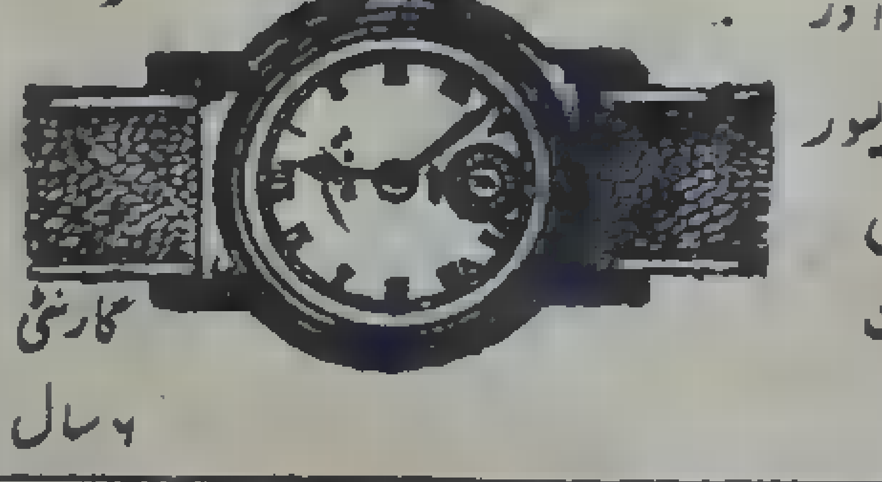
نمبر ۱۱۷
گارنٹی چھ سال



... سات روپیہ بارہ آنے

یہ ہشت پہلو رسٹ واچ رنگین ڈائل کی خوبصورت اور پائیدار ہے اس کی پیور چال اور ریڈیم ڈائل قابل تعریف ہے قیمت آٹھ روپے ۱۲ آنے

نمبر ۱۱۳

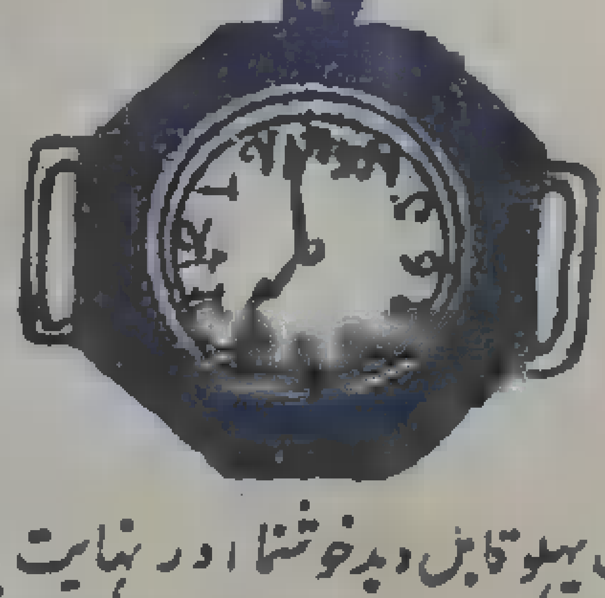


گارنٹی ۶ سال

پلنگ پوش

یہ پلنگ پوش دیکھنے میں خوبصورت چلنے میں مضبوط دیرپا بناوٹ کے لحاظ سے شاندار امیرانہ تحفہ ہے اس کے چاروں طرف کناروں پر نہایت عمدہ اور خوبصورت بیل بوٹے چھپے ہوئے ہیں سفید و رنگین جس قسم کا درکار ہو طلب کریں ناپ ۲½ × ۳ گز قیمت دو روپے محصولڈاک ۱۱/
(تین کے خریداروں سے محصول معاف)

نمبر ۱۳۲ گارنٹی ۶ سال
قیمت ۹ روپیہ



ہشت پہلو قابل دید خوشنما اور نہایت پائیدار

ٹیبل کلاتھ

۱½ × ۱½ گز جس پر نفیس بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں قیمت عہ/ محصولڈاک ایک سے تین تک ۸/

ضرورت ہے

ہر قصبہ گاؤں تحصیل و شہروں میں کپڑا فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کی ضرورت ہے دو آنے کے ٹکٹ آنے پر شرائط و نمونہ جات طلب کریں۔
پتہ:۔ آر۔ ایس دیوان اینڈ سنز لودہیانہ

کشیدہ کاڑھنے کی اصلی مشین

ہماری کشیدہ کاڑھنے کی اصلی مشین دور دور تک مشہور ہو چکی ہے کیونکہ یہ اصلی بنی ہوئی ہے اس مشین سے کپڑوں پر ہر قسم کی ادنیٰ گلکاری خوبصورت جانور انگریزی اردو ہندی گورمکھی حروف وغیرہ اون یا ریشم سے ایسے صاف کاڑھے جا سکتے ہیں کہ ہاتھ سے کاڑھنے ممکن نہیں خوبی یہ کہ اتنی جلدی کام کرتی ہے کہ اس کے ایک گھنٹے کا کام ہاتھ کا کاریگر ہفتہ بھر میں تیار نہیں کر سکتا۔ شریف بہو بیٹیوں اور بچیوں کے لئے ایک دلچسپ اور کارآمد چیز ہے وہ اس سے تکیوں کے غلاف بچوں کی ٹوپیاں۔ کرسی کی گدیاں میز پوش مخملی سلیپر وغیرہ کا بیوں پر اعلیٰ درجہ کے پھول پتے بیل بوٹے نہایت دلچسپی سے بنا لیتی ہیں۔ قیمت ان تمام خوبیوں کے باوجود تین روپے آٹھ آنے محصولڈاک ۸/
نوٹ:۔ کبھی دو مشین منگوانے والوں کو محصولڈاک معاف کر دیا جاتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ آر۔ ایس دیوان اینڈ سنز بی لودہیانہ پنجاب

ترجمہ و حواشی کے متعلق علمائے کرام کی گرامی قدر رائیں

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی رائے

مکرمی و محترمی جناب مولانا محمد مجید حسن صاحب دام مجدہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
قرآن مجید مترجمہ بترجمہ سیدی و مولائی حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز ومحشی بفوائد تفسیریہ مولانا افضل المفسرین مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی رضی اللہ عنہم پہنچ کر موجب امتنان ہوا۔ حضرت مترجم طاب اللہ ثراہ کے ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ فوائد تفسیریہ کے متعلق اس قدر عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ معارف قرآنیہ کو اردو زبان میں اس خوبی، خوشنمائی، شگفتگی، متانت، سلاست، فصاحت، بلاغت کے ساتھ منصۂ شہود پر لانا حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ہی کا حصہ تھا۔ آپ کی سعی مقبول ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل و کرم نے مولانا موصوف کے قلم حقیقت رقم سے معارف و حکم قرآنیہ کا یہ بیش بہا ذخیرہ اہل ہند کے لئے مہیا فرا دیا۔ میں خلوص دل سے آپ کو اور حضرت مولانا کو اس دینی خدمت کی انجام دہی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ تقطیع مناسب، خط موزوں، وضع تحریر خوشنما اور دلپسند ہے۔

جزاکم اللہ وشکر مساعیکم ونفع المسلمین بہ نفعا کثیرا۔ آمین

فقیر: محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ۔ دہلی

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی جانشین حضرت شیخ الہند کی رائے

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے علامۂ زماں، محقق دوراں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی زید مجدہم کو دنیائے اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا ہے مولانائے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب غریب حافظہ، عجیب و غریب تبحر وغیرہ کمالات علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص منصف مزاج ان میں تامل کر سکے جن حضرات کو مولانا سے کبھی بھی کسی قسم کے استفادہ کی نوبت آئی ہے، وہ اس سے بخوبی واقف ہیں ان ازمنۂ اخیرہ میں حسب وعدۂ ازلیہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اور ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ قدرت قدیمہ نے جس طرح امام الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کو بامحاورہ ترجمۂ قرآن کی طرف متوجہ فرما کر صلاح عباد کے لئے عظیم الشان سامان ہدایت مہیا فرا دیا تھا اسی طرح اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب موصوف کی توجہ تکمیل فوائد ارشاد المغلقات کی طرف منعطف فرما کر تمام عالم اسلامی اور بالخصوص اہل ہند کے لئے عدیم النظیر حجۃ بالغہ قایم کر دی ہے۔ ان حواشی اور مہتم بالشان فوائد سے نہ صرف ترجمہ مذکورہ میں چار چاند لگ گئے ہیں بلکہ ان بیشمار شکوک و شبہات کا بھی قلع قمع ہو گیا ہے جو کہ کوتاہ فہموں کو اس کتاب اللہ اور دین حنیف کے متعلق پیش آتے رہے ہیں یقیناً مولانا نے بہت سی ضخیم ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندروں کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ پھر مولانا محمد مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ کی مساعی جمیلہ اور حسن توجہ نے وہ خوبیاں اس میں اضافہ فرما دی ہیں جو کہ سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہیں۔ اس نسخہ کی تمام خوبیاں صرف دیکھنے اور غور کرنے پر معلوم ہو سکتی ہیں تحریر اور تقریر اس پر پوری روشنی ڈالنے سے عاجز ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ شائقین علوم صادقہ جلد تر اس نسخہ عجیبہ سے استفادہ کر کے اپنے دل و دماغ کو منور فرمائیں گے۔

ننگ اسلاف: حسین احمد غفرلہ خادم العلوم۔ دار العلوم دیوبند

مولانا محمد یوسف صاحب کی رائے

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

اما بعد خدائے تعالیٰ کا شکر! دفتر مدینہ کو دیکھا جناب محترم محمد مجید حسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کا شرف حاصل کیا اپنی زندگی میں قرآن کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ نظر سے گذرا۔ اپنے، آپ کے، اور سب کے بزرگ شیخ العالم حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن مجید و فوائد عصر حاضر کے متبحر عالم فقیہ محدث و مفسر حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی طال بقاءہ کے تکمیل کردہ فوائد یک بیک میرے سامنے آئے، میری مشتاق نگاہیں دیر تک وارفتگی کے ساتھ اِن سے سعادت اندوز ہوتی رہیں میں کیا! میری علمی بضاعت کیا۔ ایک طرف اپنے شیخ اور اپنے اُستاذ کا علمی کارنامہ اور دوسری طرف میری کم مایہ رائے۔ بہر حال دل یہ کہتا ہے کہ دونوں بزرگوں نے سلف صالحین کے اُن خزانوں کو جو موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جامع و مانع شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ جناب مولوی مجید حسن صاحب کو جزائے خیر دے جنھوں نے ایک بڑے کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا اور اس کی تکمیل میں اب تک ساعی ہیں وللہ الحمد والمنۃ

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہ مقیم پشاور گڈھی میر احمد شاہ مرحوم

مولانا خواجہ عبد الحیٔ صاحب کی رائے

حضرت شیخ الہند مرحوم نے قرآن پاک کا جو ترجمہ اُردو میں کیا تھا اور جس کے طبع و اشاعت کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مولانا مجید حسن صاحب کو عطا فرمائی تھی وہ قریب قریب حاشی کے بغیر تھا۔ وہی مترجم قرآن پاک پھر طبع کیا گیا ہے مگر اس مرتبہ اول سے لے کر آخر تک سب جگہ حواشی ہیں تو ضیحات ہیں اور تشریحیں ہیں اور یہ تمام تر اس بزرگ کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے جو آج ہندوستان میں بلاریب سرتاج مفسرین اور قرآنی حکم بصائر کے سب سے بڑے واقف مانے جاتے ہیں یعنی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اپنے قلم حقیقت رقم سے ایک طرف بلاغت قرآن کے دریا بہا دیئے اور دوسری جانب معارف فرقانی کے انمول موتی اوراق پر بکھیر دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مدظلہم کو عمر جاودانی عطا فرمائے کہ فرزندان اسلام کو آپ سے دیر تک مستفید ہونے کا موقع ملے۔ میں حضرت مولانا کی اس خدمت سعیہ پر مبارکباد دیتا ہوں اور مولانا محمد مجید حسن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مسلمانوں کو ان بے بہا خزائن سے فائدہ پہنچانے کی سعی و کوشش کی اللہ تعالیٰ آپ کو مزید حسن عمل کی توفیق دے۔

عبد الحیٔ استاد تفسیر (ناظم دینیات جامعہ ملیہ دہلی)

x F/57

29/9/2007

1